توحید

اور

شرک

سید حامد علی



توحید اور شرک

سید حامد علی

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳۔ کورٹ سٹریٹ، لوئر مال، لاہور (پاکستان)

نام کتاب	:	توحید اور شرک	
مصنف	:	سید حامد علی	
اشاعت	:	ایڈیشن	تعداد
		5	600
		فروری 2006ء	
اہتمام	:	پروفیسر محمد امین جاوید (مینجنگ ڈائریکٹر)	
		اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ	
		۳۔ کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور۔ پاکستان	
فون	:	042-7320961-7248676 فیکس 7214974	
ویب سائٹ	:	www.islamicpak.com.pk	
ای میل	:	Islamicpak@hotmail.com	
		Islamicpak@yahoo.com	
مطبع	:	حیدری پرنٹرز، لاہور	
قیمت	:	-/190 روپے	

فہرست مضامین

پہلا باب

دوسرا باب

تیسرا باب

باب چہارم

باب پنجم

باب ششم

بابِ ہفتم

بابِ ہشتم

باب نہم

باب دہم

باب یازدہم

باب دوازدہم

پہلا باب

خُدا کا اِنکار کیوں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنیادی مسئلہ

خدا ہے یا نہیں ؟ یہ صرف ایک مذہبی مسئلہ نہیں ، یہ محض ایک فلسفیانہ سوال بھی نہیں ، یہ اس کائنات کا سب سے اہم اور سب سے بنیادی مسئلہ ہے اور پوری زندگی اور تمام انسانوں سے متعلق ہے۔ ہم کیا ہیں ؟ ہم یہاں کیوں آئے ہیں ؟ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے ؟ ہمارے لیے کامیابی کس راہ کو اختیار کرنے میں ہے اور ناکامی کس میں ہے ؟ یہ ہماری زندگی کے بنیادی سوالات ہیں ، ان سوالات کا تمام انسانوں سے یکساں تعلق ہے اور ان کے صحیح جواب اور ان کے مطابق زندگی گزارنے ہی پر انسان کی فلاح اور کامرانی کا دارومدار ہے ، لیکن ان سوالات کا قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ جب تک کہ ایک اور سوال کو حل نہ کر لیا جائے۔ وہ سوال یہ ہے کہ کائنات اور نوعِ انسانی کسی خالق کی تخلیق ہیں جس نے کسی مقصد اور منصوبے کے تحت یہ سارا نظام بنایا ہے یا انسانوں سمیت یہ تمام عالم آپ سے آپ بن گیا ہے ، نہ کسی نے اسے پیدا کیا ہے اور نہ اس کے پیچھے کوئی منصوبہ اور کوئی مقصد ہے ۔

تھوڑے سے غور و فکر کے بعد آپ بھی اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس سوال کو حل کیے بغیر یہ طے نہیں ہو سکتا کہ ہم کیا ہیں اور ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے ؟ نہ انسان کی کامیابی و ناکامی کے سلسلے میں کوئی قطعی بات کہی جا سکتی ہے اگر کسی بنانے والے نے ہمیں بنایا اور مقصد و منصوبے

سے کے تحت بنایا ہے تو ہمیں اپنی عقل کے بجائے اس بنانے والے سے ہی ان سوالات کا جواب معلوم کرنا چاہیے۔ یقیناً اسی کا جواب صحیح جواب ہوگا اور جو جواب اس سے مختلف ہوگا اس کے غلط اور قابلِ رد ہونے کے لیے یہی بات کافی ہوگی کہ وہ خالق اور منصوبہ ساز کے جواب سے مختلف ہے۔

لیکن اگر ہمیں کسی نے پیدا نہیں کیا بلکہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر ہم آپ سے آپ وجود میں آ گئے ہیں تو اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ دنیا میں اپنی حیثیت، اپنی زندگی کے مقصد اور کامرانی و ناکامی کے بارے میں ہم اپنی محدود اور ناقص عقل ہی سے جواب چاہیں، یہ جوابات بہت سے ہو سکتے ہیں اور باہم مختلف بلکہ متضاد بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ فی الواقع ہیں مگر اس صورت میں، جبکہ کسی حکیم و دانا ہستی نے ہمیں کسی سوچے سمجھے مقصد و منصوبے کے تحت نہیں بنایا ہے، اندھیرے میں تیر تکے چلانے کے سوا ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے انکار یا اقرار کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے نظر انداز کیا جا سکتا ہو یا جسے حل کئے بغیر انسانی زندگی میں اہمیت رکھنے والے سوالات کا جواب دیا جا سکتا ہو۔ اس سوال کا کوئی جواب پانا ناگزیر ہے اور جو جواب بھی ہوگا اسی کے مطابق پوری انسانی زندگی کی عمارت اٹھے گی۔

کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے لوگ اس سوال پر ایک لمحہ غور کیے بغیر پوری زندگی گزارتے جاتے ہیں، لیکن آپ ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھیں تو صورتِ حال مختلف نظر آئے گی جس شخص کا ذہن کبھی اس طرف منتقل نہ ہوتا ہو کہ خدا اور اس کی مرضی بھی کوئی شے ہے اور کبھی اس کا خیال آتا بھی ہو تو فضول و لایعنی سمجھ کر دل و دماغ کے دریچے اس پر بند کر لیتا ہو، ایسا شخص

خدا کو بہر حال نہیں مانتا۔ وہ غیر شعوری طور پر سہی، لیکن یہ طے کر چکا ہے کہ جو کچھ ہے، یہ محسوس کائنات اور اس کے مادی مفادات ہی ہیں۔ اس کائنات کے ماوراء کوئی ہستی نہیں جس کی رہنمائی و دستگیری کا وہ محتاج ہو یا جس کی رضا اور غضب کا اسے خیال ہونا چاہیے۔ ایسے شخص کے بارے میں آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اس نے علمی اور عقلی انداز میں اس مسئلہ پر غور نہیں کیا۔ اور کتنے افراد ہیں جو مسائل پر علمی انداز میں غور کرتے ہیں۔ مگر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ خدا کا منکر نہیں ہے۔

بعض لوگ اس بنیادی سوال سے کتراتے ہیں اور زندگی کے مسائل کو درمیان سے حل کرنا چاہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انسانی زندگی کا اصل مسئلہ سیاسی یا معاشی مسئلہ ہے اور پھر وہ اس مسئلہ کے سلسلے میں اپنا مخصوص حل پیش کرنے لگتے ہیں۔ یہ حد درجہ خطرناک رہنمائی ہے۔ سیاست یا معاشیات کی خواہ کچھ بھی اہمیت ہو بہر حال وہ کل زندگی نہیں۔ کل زندگی کو سمجھے اور پوری زندگی کے مقصد کو متعین کیے بغیر زندگی کے کسی جزء کے بارے میں صحیح طور پر سوچا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ لوگ انسانی زندگی کو ایک وحدت تصور کرنے کے بجائے اسے اَنمل بے جوڑ شعبوں کا مجموعہ سمجھتے اور ان شعبوں کے بارے میں الگ الگ سوچنے کو صحیح خیال کرتے ہیں۔ یہ حضرات، جو بات بات میں سائنس کا حوالہ دیتے ہیں، سائنس کی اس عظیم حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ انسانی زندگی ہی نہیں، کل کائنات ایک وحدت ہے اور آج کسی بات کو صحیح باور نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ پوری انسانی زندگی بلکہ کل کائنات سے ہم آہنگ نہ ہو۔

اشتراکیت کے علمبردار اس حقیقت کو خوب جانتے ہیں مگر وہ جانتے بوجھتے اس تکنیک کو استعمال کرتے ہیں۔ عوام کے بھڑک اٹھنے کے ڈر سے یہ حضرات نہیں چاہتے کہ خدا کے منکر کی حیثیت سے ان کا تعارف ہو وہ لوگوں

سے کہتے ہیں کہ ان کے عقیدہ سے انھیں بحث نہیں ہے، وہ صرف ان کا معاشی مسئلہ حل کرنا چاہتے، وہ یقین دلاتے ہیں کہ خدا کو مانتے ہوئے بھی ایک شخص پکا کمیونسٹ ہو سکتا ہے، جس طرح خدا کو نہ ماننے والا شخص، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اشتراکیت کے اساطین، کارل مارکس، اینجلز، لینن اور اسٹالن، سب کے سب خدا کے منکر اور الحاد کے سرگرم داعی تھے، اور یہی حال اشتراکیت کے موجودہ اکابر کا بھی ہے، اس حد تک کہ باہم شدید اختلاف کے باوجود، اس مسئلہ میں اشتراکیت کے تمام اکابر متحد ہیں تو وہ اسے ان کا ذاتی فعل قرار دیتے ہیں، لیکن کیا حقیقی صورتحال بھی یہی ہے؟ کمیونزم سے باخبر ہر شخص اس کا جواب نفی میں دے گا۔

اشتراکیت کے لیے انکارِ خدا کی وہی حیثیت ہے جو کسی عمارت کے لیے اسکی بنیاد کی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اشتراکیت کے نقطۂ نظر سے انسان کا معاشی مسئلہ ہی وہ مرکزی مسئلہ ہے جس کے گرد پوری انسانی زندگی گردش کرتی ہے۔ اس کے نزدیک سماج کے عقائد و نظریات، معاشی حالات و وسائل کے تابع اور ان کا عکس ہوتے ہیں اور اسی لیے اشتراکیت وقت کے غلط معاشی نظام۔ سرمایہ دارانہ نظام۔ کی بیخ کنی میں اپنی قوت صرف کرتی نظر آتی ہے۔ اس سے بعض سطح بین افراد کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ اشتراکیت کا دائرۂ کار معاشیات تک محدود ہے۔ اور اشتراکیت کا پروپیگنڈا کرنے والے اپنی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اشتراکیت کے نزدیک انسانی زندگی میں معاشی مسئلہ کو بنیادی اہمیت کیوں ہے؟ اشتراکیت اس سوال کا جو جواب دیتی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات مادی کائنات ہے۔ یہاں جو کچھ ہے مادہ ہے۔ مادہ سے ماورا یہاں کوئی حقیقت نہیں (کوئی خدا نہیں) اس لیے مادی و معاشی مسائل ہی انسانی زندگی کے لیے حقیقی اہمیت رکھنے والے مسائل ہیں اور معاشی ذرائع پیداوار ہی وہ بنیادی

عامل ہیں جن کی کوکھ سے نظریات و اخلاق جنم لیتے ہیں۔

یہ ہے اشتراکیت کا فلسفہ! اس کے غلط یا صحیح ہونے سے اس وقت بحث نہیں، اس پر صرف اس حیثیت سے غور کیجیے کہ کیا اس مادہ پرستی اور الحاد کے جزو کو الگ کیا جا سکتا ہے اور کیا انکارِ خدا کو اس سے الگ کر کے اشتراکیت کے لیے کوئی وجہ جواز باقی رہ جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت کا فلسفہ، غلط ہو یا صحیح ایک مربوط فلسفہ ہے، اس کے کسی جزو کو اس سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، چہ جائیکہ مادیت و الحاد کو، جسے اس فلسفہ میں سنگِ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے، اگر خدا ہے تو مادہ اور مادی مسائل بنیادی اہمیت کے حامل نہیں رہتے، اس کے بجائے خدا کو اور اس کی مرضی کو اساسی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں کسی نظریہ یا کسی عمل کے حق ہونے کا یہ معیار باقی نہیں رہتا کہ وہ وقت کے معاشی ذرائع سے ہم آہنگ ہے۔ جیسا کہ اشتراکیت کہتی ہے۔ بلکہ ہدایتِ الٰہی حق کا واحد معیار قرار پاتی ہے جو اس کے مطابق ہے، حق ہے اور جو اس کے خلاف ہے، باطل ہے۔ اور یہ مانتے ہی اشتراکیت کی فلک بوس عمارت زمین پر آ رہتی ہے۔

لادین جمہوریت کا معاملہ بھی اشتراکیت سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہ نظام افراد کو تو اس بات کا حق دیتا ہے کہ وہ چاہیں، تو خدا کی پرستش کریں، لیکن خدا کو اس کا نہیں دیتا کہ وہ زندگی کے معاملات میں دخل دے یا اجتماعی مسائل میں انسان کی رہنمائی کرے۔ یہ حق وہ خدا کے بجائے سماج اور اس کے نمائندوں کو دیتا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ یہ نظام، بہ حیثیت نظام کے، خدا کو نہیں مانتا۔ اس نظام کے حق میں بہت سے بہت جو کہا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ ایک

ایسے خدا کو ماننے کی اجازت دیتا ہے جو انسان کی رہنمائی کی اہلیت نہ رکھتا ہو یا اس منصب سے دستبردار یا معزول ہو چکا ہو۔ (معاذاللہ)

حقیقت یہ ہے کہ رائج الوقت نظاموں ــــ اشتراکیت اور لادین جمہوریت کو ماننے نہ ماننے کا مسئلہ بھی براہِ راست خدا کے اقرار و انکار ہی سے والبستہ ہے، اور ان نظاموں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے قبل ناگزیر ہے کہ آپ کا ذہن خدا اور اس کی صفات کے بارے میں یکسو ہو چکا ہو۔ خدا کو مانتے ہوئے اشتراکیت کو آپ قبول نہیں کر سکتے کہ انکارِ خدا ہی کی بنیاد پر اس کی پوری عمارت اٹھی ہے، اسی طرح خدا کے سچے پرستار ہوتے ہوئے آپ لادین جمہوریت کو بھی نہیں اپنا سکتے، اِلّا یہ کہ آپ ایک ایسے خدا کے قائل ہوں جو بندوں سے اپنی پرستش تو کراتا ہو مگر زندگی کی پُرپیچ راہوں میں ان کی دستگیری اور رہنمائی اس کے بس کی بات نہ ہو یا وہ اس کا روادار نہ ہو۔ بہرحال خدا کے انکار یا اقرار کا مسئلہ زندگی کا بنیادی مسئلہ ہے اور کوئی انفرادی یا اجتماعی رویّہ اختیار کرنے سے پہلے ناگزیر ہے کہ آپ اس بنیادی مسئلہ سے فارغ ہو لیں۔

اپنا موقف متعیّن کیجیے

اس مسئلہ پر غور کرتے وقت سب سے بنیادی غلطی یہ ہوتی ہے کہ لوگ ٹھیک طور سے اپنا موقف متعیّن نہیں کرتے۔ دلائل کے لحاظ سے ان کا ایک موقف ہوتا ہے مگر ان کا طرزِ فکر اور ان کی عملی زندگی دوسرے موقف کی آئینہ دار ہوتی ہے اور موقف کا یہ اشتباہ بسا اوقات زندگی کی آخری سانس تک باقی رہتا ہے۔

خدا ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں ہم صرف تین موقف اختیار کر سکتے ہیں:

(۱) خدا ہے کہ نہیں، ہمیں نہیں معلوم۔ (۲) ہمیں معلوم ہے کہ خدا نہیں ہے۔

(۳) معلوم ہے کہ خدا ہے۔

ہم میں سے ہر شخص کو غور و فکر کے بعد یہ طے کرنا چاہیے کہ اس مسئلہ میں فی الواقع اس کا موقف کیا ہے اور جو کچھ اس کا موقف ہے اس کے دلائل کیا ہیں؟ اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ عموماً پہلے اور دوسرے موقف کے مابین اشتباہ ہو جاتا ہے۔ دلائل تو پہلے موقف کے ہوتے ہیں (اور ملحدین کے تقریباً تمام دلائل کا حال یہی ہے۔ بشرطیکہ انھیں دلائل کہا جا سکے) مگر لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کے پاس دوسرے موقف کے دلائل ہیں اور اسی لیے وہ فکر و عمل دونوں صورتوں میں دوسرا موقف اختیار کرتے ہیں۔

"نہ جاننا" "نہ ہونے" کے ہم معنیٰ نہیں ہے

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم پہلے اور دوسرے موقف کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ پہلے موقف کو ہم "عدمِ علم" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس موقف کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ ہمیں خدا کا علم نہیں۔ ہمارے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جس کی بنا پر ہم خدا کے ہونے کا یقین کریں، لیکن ساتھ ہی ایسی کوئی دلیل بھی ہمارے علم میں نہیں ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا نہیں ہے۔ گویا ہم خدا کا اقرار کرنے کی پوزیشن میں ہیں، نہ انکار کرنے کی۔

دوسرے موقف کو ہم "علم عدمِ وجود" سے تعبیر کر سکتے ہیں، یعنی ہم قطعیت کے ساتھ جانتے ہیں کہ خدا نہیں ہے۔ ہم پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے کہ کائنات خود بخود بن گئی اور آپ سے چل رہی ہے، اس کے پیچھے کوئی خالق و مدبر ہستی نہیں ہے۔ ہمیں عقلاً اس پر کلی اطمینان ہے اور اس لیے ہم خدا کا انکار کرتے ہیں۔

دوسرے اور پہلے موقف کے فرق کو ایک مثال سے سمجھیے، زمین کے علاوہ کسی سیارے میں زندگی پائی جاتی ہے یا نہیں ؟ یہ مسئلہ سائنسدانوں کے یہاں طے شدہ نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں بھی تین موقف ہو سکتے ہیں۔ (۱) کسی سیارے میں زندگی ہے یا نہیں، ہمیں نہیں معلوم۔ (۲) ہمیں معلوم ہے کہ کسی سیارے میں زندگی نہیں ہے۔ (۳) ہمیں معلوم ہے کہ بعض سیاروں میں زندگی پائی جاتی ہے۔

اگر آپ اس مسئلہ میں پہلا موقف رکھتے ہیں، ہمیں معلوم نہیں کہ کسی سیارے میں زندگی ہے یا نہیں۔ تو آپ دوسرا موقف اختیار نہیں کر سکتے، آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ دوسرے سیاروں میں زندگی نہیں ہے۔ اس کے برعکس آپ کو ان سیاروں میں زندگی کا امکان تسلیم کرنا ہوگا، اور زندگی فی الواقع موجود ہے یا نہیں، اسے معلوم کرنے کے لیے اپنی کوشش جاری رکھنی ہوگی۔ سائنسداں اس مسئلہ میں ٹھیک یہی موقف اور یہی روش اپنائے ہوئے ہیں۔

اور یہ کچھ اس مسئلہ کی خصوصیت نہیں ہے۔ مسائل کی تحقیق میں اہلِ علم اور اربابِ سائنس کی مستقل روش یہی ہے۔ (خدا کے ہونے، نہ ہونے کے مسئلہ کو چھوڑ کر، کہ بعض تاریخی اور نفسیاتی اسباب کے تحت، جن میں اہلِ کلیسا کی شدید مخالفت اور ان کی وحشیانہ و جابرانہ روش خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، اس مسئلہ میں بہت سے اہلِ علم جذبات کا شکار ہو گئے) "نہ جاننے" کو یہ حضرات "نہ ہونے" کا ہم معنی خیال نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو علمِ سائنس اور تمدن و معیشت کے میدان میں سرے سے کوئی ارتقاء نہ ہوتا اور انسان آج اسی مقام پر ہوتا جہاں وہ ہزاروں سال پہلے، بلکہ ابتدائے آفرینش میں تھا۔

اہلِ علم نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ کائنات کی ان گنت حقیقتوں میں سے ہم صرف چند گنی چنی حقیقتوں کو جانتے ہیں۔ اس لیے جو حقیقتیں ہمارے علم میں

نہیں ہیں ۔ ان کا علم نہ ہونا ہرگز اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہ فی الواقع نہیں ہیں ۔ اس کے برخلاف اس بات کا پورا امکان ہے کہ وہ موجود ہوں اس امکان کو تسلیم کرنے ہی کے نتیجہ میں انسان نئی نئی حقیقتوں کی کھوج میں لگا رہا اور ہر نیا دن اس کے لیے نئی حقیقتوں کے انکشاف کا پیغام لاتا رہا حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کا پورا ارتقاء اور سائنس کے تمام انکشافات اسی روش کا ثمرہ ہیں کہ "عدمِ علم" اور "عدمِ وجود" میں فرق کیا گیا ۔ اگر "نہ جاننے" کو "نہ ہونے" کا ہم معنی سمجھ لیا جاتا تو انسان جہالت کی تاریکیوں سے کبھی نہ نکلتا اور تمدن اور سائنس کی عظیم نعمتوں سے ہمکنار ہونے کے بجائے غار اور جنگل کی زندگی بسر کرتا ہوتا ۔

اس سلسلے میں مزید ایک مثال پر غور کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا ۔ رات کو کھلے آسمان کا منظر کتنا حسین اور کس قدر حیرت انگیز ہوتا ہے ، قدیم سے انسان اس منظر کو مسرت اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتا رہا ہے ۔ اس نظارہ سے اس کے ذہن میں بہت سے سوالات ابھرتے رہے ہیں ۔ ان سوالات میں ایک سوال یہ تھا کہ کیا تارے بس اتنے ہی ہیں جتنے نظر آرہے ہیں یا کچھ اور تارے بھی ہیں ، جو ہیں تو مگر نظر نہیں آ رہے ہیں ۔ اس سوال کا سطحی جواب تو یہی تھا کہ جب اور تاروں کا ہمیں علم نہیں ہے تو یقیناً وہ نہیں ہیں ۔ اس جواب کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جاتا تو تحقیق کی ضرورت ہی محسوس نہ کی جاتی اور انسان اسی جہلِ مرکب میں مبتلا رہتا کہ نظر آنے والے تاروں کے ماسوا تارے نہیں ہیں ، لیکن اہلِ سائنس کو اس جواب سے تشفی نہ ہوئی ۔ وہ ان دیکھے اور ان جانے تاروں کے تعاقب میں لگے رہے ۔ انھوں نے دُوربین ایجاد کی جس سے کچھ نئے تاروں کا مشاہدہ ہوا ، پھر اور زیادہ طاقت ور دُوربین بنائی اور کچھ اور تاروں کا انکشاف ہوا ۔ اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ طاقت ور دُوربینیں بناتے

اور ان کے ذریعے نئے نئے اور انجانے تاروں کا سراغ لگاتے رہے یہاں تک کہ آج انھیں اتنے ستاروں کا علم ہو چکا ہے کہ ان کا ذکر کرتے ہوئے پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ عالمِ مشاہدہ کی نہیں عالمِ تخیّل کی باتیں ہیں۔ وہ اتنے دور و دراز کے ستاروں پر اپنی نگاہ کی کمند ڈال چکے ہیں، کہ زمین سے ان کا فاصلہ سمجھنے میں ہمارے دماغ اور فاصلہ سمجھانے میں ریاضی کے اصول تھک جاتے ہیں۔ وہ اس سورج اور ہمارے نظامِ شمسی کے علاوہ ان گنت سورج اور نظام ہائے شمسی اور کہکشاں کے علاوہ بیشمار کہکشائیں دریافت کر چکے ہیں اور ابھی تحقیقِ سمندر رکنے کا نام نہیں لیتا اور انھیں یقین ہے کہ ابھی بہت سے نہ جانے ہوئے ستاروں، نظاموں، کہکشاؤں اور سحابیوں کو جاننا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جن اجرامِ فلکی کے وجود کا انھیں علم ہو چکا ہے ان کے بارے میں بھی ابھی بہت کچھ جاننا باقی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کے بارے میں ابھی ان کا علم گویا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اس سلسلے میں جو کچھ جانتے ہیں وہ اتنا کم ہے اور جن حقیقتوں کو وہ نہیں جانتے، وہ اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی نسبت کو کسی حساب اور کسی تناسب سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ان گنت حقیقتیں ہیں جنھیں انسان آج تک نہیں جانتا، لیکن وہ ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ فلکیات کا یہ مختصر سا جائزہ اس بات کی قطعی اور حتمی شہادت ہے کہ "نہ جاننا" "نہ ہونے" کے ہم معنیٰ نہیں ہے۔ اگر ہمیں کسی کا علم نہیں ہے تو اس بنا پر ہمیں اس کے انکار کا حق نہیں پہنچتا۔ ہمارے نہ جاننے کے باوجود اس کے ہونے کا اتنا ہی امکان ہے، جتنا اس کے نہ ہونے کا۔

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی واضح ہو گئی ہو گی کہ کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے وقت اپنے مؤقف کا تعین ازحد ضروری ہے۔ یہ محض نظریاتی یا فلسفیانہ سوال نہیں ہے خالص عملی ضرورت ہے اور عملی زندگی سے اس کا گہرا تعلق

ہے۔ موقف کی تعین میں غلطی یا موقف کے سلسلے میں اشتباہ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بس ایک فکری غلطی ہوگئی، بلکہ عملی زندگی میں اس کے نتائج بہت دور رس ثابت ہوتے ہیں۔

منکرینِ خدا کا موقف غلط ہے

موقف کی غلطی یا اس کے اشتباہ سے سائنس کے میدان میں بھی غلط نتائج نکلتے ہیں اور یہ نتائج دور رس اور عظیم بھی ہو سکتے ہیں مگر ضروری نہیں کہ اس غلطی کا خمیازہ پوری زندگی کو بھگتنا پڑے، لیکن اگر یہی غلطی خدا کے ہونے کے مسئلہ میں ہو جائے تو نتائج کتنے ہولناک، کتنے دور رس اور کس قدر عظیم ہوں گے، اس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مسئلہ زندگی کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے اور اس کے اثرات پوری زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس میں غلطی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ پوری زندگی غلط ہو کر رہ جائے۔ زندگی کا ہر شعبہ غلط رُخ اختیار کرلے اور تمام مادی ترقیات کے باوجود نوعِ انسانی ہلاکت و خسران کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جائے۔ موجودہ دور میں ہم اسی مصیبتِ عظمیٰ سے دوچار ہیں۔

آج ملحدین کے ہاتھ میں دُنیا کی زمام ہے، وہ انکارِ خدا کی اساس پر پوری زندگی اور کل انسانی دنیا کی تعمیر کر رہے ہیں اور اس پر بضد ہیں، اس غلط روش کے جو مہلک نتائج نکل رہے ہیں، اس وقت ان سے بحث نہیں ہے، وہ سب ہی کے سامنے ہیں۔ البتہ ان کی روش کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ان کے پاس خدا کے نہ ہونے کے قطعی دلائل ہوں گے جبھی تو وہ اس عظیم ذمہ داری اپنے سر لے رہے ہیں، اور قطعیت و وثوق کے ساتھ عالمِ انسانی کو الحاد اور ملحدانہ زندگی اختیار کرنے کی دعوت دے رہے ہیں، لیکن کیا واقعتہً ایسا ہی ہے؟ تحقیق اور مطالعہ اس کا جواب نفی میں

دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان عقل پرستوں پر خود ان کا عقلی موقف مشتبہ ہو گیا ہے۔ انھیں خبر نہیں کہ ان کے دلائل کے اعتبار سے ان کا ایک موقف قرار پایا ہے اور فکر و عمل میں وہ دوسرے موقف کو اپنائے ہوئے ہیں۔

عدمِ علم کی بنا پر انکار صحیح نہیں

منکرینِ خدا کے تمام دلائل کا حاصل —— جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس کے سوا کچھ نہیں کہ انھیں خدا کے وجود کا علم نہیں ہے، وہ اپنے حواس یا عقل سے خدا کو نہ پا سکے ہیں۔ یہ موقف واضح طور پر "عدمِ علم" کا موقف ہے، مگر انھوں نے "عدمِ علم" کو عدمِ وجود کا مترادف سمجھ لیا اور قطعیت کے ساتھ خدا کا انکار کر دیا۔ حالانکہ "نہ جاننے" کی صورت میں خدا کے ہونے کا بھی اتنا ہی امکان تھا جتنا اس کے نہ ہونے کا۔ اس قطعیت کے ساتھ اب وہ مزید غور و فکر کے لیے تیار نہیں۔ وہ خدا اور اس کے ماننے والوں کا اس طرح مذاق اڑاتے ہیں جیسے کہ خدا کے نہ ہونے کی کوئی قطعی دلیل ان کے ہاتھ آگئی ہو۔ اور خدا کو ماننا سخت جاہلانہ اور خلافِ عقل حرکت ہو۔ حالاں کہ کوئی پڑھا لکھا شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ کسی چیز کا علم نہ ہونا ایک بات ہے اور اس کا نہ ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ ان کے درمیان فرق کرنا ہی علم کی کلید ہے اور علم اور سائنس کا سارا ارتقاء اسی فرق کو ملحوظ رکھنے کی بدولت ہوا ہے۔ اگر انسان اس فرق کو ملحوظ نہ رکھتا تو جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں سے نکل کر علم اور سائنس کی دنیا میں کبھی نہ آسکتا۔

ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ "نہ جاننے" کے باوجود آپ خدا کو مان لیجیے۔ یقیناً یہ بات بھی صحیح نہ ہوگی۔ البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ "نہ جاننے" کی بناء پر آپ خدا کا قطعی انکار نہ کیجیے کیونکہ یہ ایک غیر علمی اور غیر سائنٹفک بات

ہے۔ اس کے بجائے آپ کم از کم خدا کے ہونے کے امکان کو تسلیم کیجیے جیسا کہ اس طرح کے تمام معاملات میں اہلِ علم کی روش ہے۔ ساتھ ہی آپ مزید غور و فکر اور بحث و تحقیق میں لگ جائیے تا آنکہ خدا کے موجود ہونے کے قوی دلائل آپ کے سامنے آجائیں یا خدا کے نہ ہونے کا ثبوت فراہم ہو جائے۔ اس درمیان میں آپ کی حیثیت طالبِ علم اور جویائے حق کی ہونی چاہیے نہ کہ منکر و معاند کی۔ دوسری بات ہم آپ سے یہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں انکارِ خدا کی بنیاد پر زندگی کی عمارت تعمیر نہ کیجیے۔ جب "عدمِ علم" کی وجہ سے انکار صحیح نہیں ہے تو انکار کی اساس پر زندگی کی تعمیر کیونکر صحیح ہو سکتی ہے۔ اس کے بجائے آپ خدا کے ہونے کے معاملہ میں جلد از جلد کسی آخری اور قطعی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ اس کے بعد ہی آپ یہ طے کرنے کے موقف میں ہوں گے کہ آپ اپنی زندگی کی تعمیر کن بنیادوں پر کریں۔ آپ کا یہ اقدام انتہائی خطرناک ہوگا کہ آپ اسی "نہ جاننے" کی حالت میں انکارِ خدا کی بنیاد پر کسی نظام کی تشکیل کر ڈالیں اور عالمِ انسانی کی قیادت کا بیڑا اٹھالیں۔ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کیجیے کہ عمل، اقدام اور قیادت کے لیے ہمیشہ علم و یقین کی ضرورت ہوتی ہے۔ "عدمِ علم" اور جہالت کے ساتھ معمولی سے معمولی اقدام بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ پوری زندگی کی تعمیر اور اس سے بھی آگے بڑھ کر دنیا کی قیادت و امامت!

اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھیے۔ آپ کو دہلی سے لکھنؤ جانا ہے۔ آپ دہلی جنکشن پر پہنچے تو کئی ٹرینوں کو کھڑا پایا۔ ان میں سے کون سی ٹرین لکھنؤ جاتی ہے، آپ کو اس کا علم نہیں، اس وقت آپ کیا کریں گے؟ کیا اسی "نہ جاننے" کی حالت میں آپ کسی ٹرین پر سوار ہو جائیں گے؟ نہیں! پہلے آپ تحقیق کریں گے کہ کون سی ٹرین لکھنؤ جاتی ہے، اس کے بعد

ہی ٹرین پر سوار ہوں گے۔ اس علم و تحقیق کے بغیر آپ ہرگز سفر شروع نہ کریں گے، خواہ اس تحقیق میں کتنی ہی دیر لگ جائے۔

یہ چند گھنٹوں اور چند میل کا سفر ہے جو علم و تحقیق کے بغیر طے نہیں ہوتا، اسی پر زندگی کے طویل سفر کو قیاس کیجیے جو طویل ہونے کے ساتھ حد درجہ پُر پیچ بھی ہے۔ اس سفر میں ان گنت نشیب و فراز آتے ہیں۔ پھر یہ سفر غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان کو یہ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے، خواہ وہ اسے برباد کر دے یا کامیاب بنا لے۔ سفرِ زندگی کا نتیجہ ابدی ناکامی بھی ہو سکتا ہے اور لازوال کامرانی بھی۔ ایک ایسے سفر کے لیے علم و تحقیق کی کتنی ضرورت ہوگی، یہ بات کچھ محتاج بیان نہیں ہے۔ لکھنؤ کے سفر میں آپ غلط ٹرین پر سوار ہو جائیں تو تھوڑی دیر کے بعد آپ کو اپنی غلطی محسوس ہو جائے گی، لیکن زندگی کے سفر میں غلطی کا علم مشکل ہی سے ہوتا ہے اور بسا اوقات ہوتا ہی نہیں۔ لکھنؤ کے سفر کو آپ ملتوی کر سکتے ہیں مگر زندگی کا سفر ملتوی نہیں کیا جا سکتا، اسے تو کسی نہ کسی طرح طے کرنا ہی ہے۔

صحیح سمت میں سفر کے لیے ضروری ہے کہ منزلِ مقصود اور طریقِ سفر دونوں متعین و معلوم ہوں ٹھیک یہی حال زندگی کے سفر کا بھی ہے۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ زندگی کا مقصود اور راہِ عمل دونوں معلوم ہوں، لیکن جیسا کہ گزر چکا۔ مقصدِ زندگی اور راہِ عمل کا تعین نہیں ہو سکتا۔ جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ انسانی زندگی کسی سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر آپ سے آپ ظہور میں آگئی ہے یا کسی حکیم و دانا ہستی نے متعینہ مقصد کے تحت اسے تخلیق کیا ہے۔ اس فیصلہ قطعی فیصلہ کے بغیر آپ نے سفرِ زندگی کا آغاز کر دیا اور انسانی کاروان کی رہنمائی بھی اپنے سر لے لی تو آپ خود بھی تباہ ہوں گے اور نوعِ انسانی کو بھی تباہ و برباد کر کے چھوڑیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ "عدمِ علم" کا موقف، خواہ کتنی ہی دیانت داری سے

اختیار کیا جائے، عملی پہلو سے ایک غیر مفید اور بے مصرف موقف ہے۔ عدم علم کی بنیاد پر ہم کوئی عملی اقدام نہیں کر سکتے۔ عمل کے لیے علم ناگزیر ہے، خواہ کسی شئے کے ہونے کا علم ہو یا اس کے نہ ہونے کا۔ خدا کے ہونے، نہ ہونے کے مسئلہ میں بھی یہ بات صحیح ہے۔ خدا کے بارے میں "عدم علم" کا موقف اختیار کر کے ہم زندگی کا کوئی رُخ متعین نہیں کر سکتے۔ ہم خدا کی بندگی کی راہ اختیار نہیں کر سکتے کہ ہمیں اس کے ہونے کا علم نہیں ہے اور خدا سے بے نیاز ہو کر بھی زندگی نہیں گزار سکتے۔ کیونکہ اس کے نہ ہونے کا بھی یقین نہیں ہے۔ بہرحال زندگی کے اہم سوالات کو حل کرنے کے لیے ہمیں علم کی ضرورت ہے۔ خواہ وہ خدا کے موجود ہونے کا علم ہو یا اس کے موجود نہ ہونے کا۔

الحاد کے لیے دلیل چاہیے

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خدا کو ماننے کے لیے تو دلائل کی ضرورت ہے، لیکن خدا کے انکار کے لیے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ اس کے لیے تو اتنی بات کافی ہے کہ خدا پرستوں کے دلائل کا کھوکھلا پن واضح کر دیا جائے۔ ان لوگوں کا اندازِ فکر یہ ہے کہ اگر مدعی اپنے دعوے کے لیے مضبوط دلائل و شواہد فراہم نہ کر سکے تو دعوے خود بخود ساقط ہو جاتا ہے اور تنہا یہی بات اس دعوے کے باطل ہونے کا قطعی ثبوت ہوتی ہے، لیکن یہ خیال متعدد وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ ہم روز دیکھتے ہیں کہ متعدد مقدمات جو صدفی صد صحیح ہوتے ہیں، محض اس لیے خارج ہو جاتے ہیں کہ مدعی کسی وجہ سے ان کی صحیح پیروی نہیں کر پاتے۔ وہ ایسے دلائل و شواہد فراہم کرنے سے قاصر رہتے ہیں، جن سے عدالت کی نگاہ میں ان کا کیس صحیح ثابت ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ دلائل کے فراہم نہ ہونے

کا حاصل صرف یہ ہے کہ دعوئے ثابت نہ ہو سکا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ دعوے کا باطل اور غلط ہونا قطعی طور پر ثابت ہو گیا۔ یہ بات نہ صرف عقلاً غلط ہے بلکہ تجربہ و مشاہدہ سے بھی اس کی تردید ہوتی رہتی ہے۔

لیکن زیرِ بحث مسئلہ کی نوعیت یہ نہیں ہے، خدا کے وجود کا مسئلہ محض ایک دعویٰ نہیں جو دلائل نہ ملنے کی صورت میں آپ سے رد ہو جائے۔

خدا پرست دعویٰ کریں یا نہ کریں، یہ مسئلہ اپنی جگہ موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ جو شخص بھی کائنات، نوعِ انسانی اور خود اپنے وجود پر غور کرے گا اور اپنی زندگی کے لیے کوئی مقصود اور اپنی قوتوں کے لیے کوئی راہِ عمل متعیّن کرنا چاہے گا اس کے سامنے فطری طور پر یہ سوال آئے گا کہ یہ کائنات اور خود اس کی زندگی کسی خالق کی تخلیق اور کسی منتظم کے تدبیر و انتظام کا ثمرہ ہیں یا آپ سے آپ قائم ہیں۔ اس سوال کو حل کیے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس سوال کا جو جواب بھی دیا جائے، خواہ کوئی جواب ہو، ضروری ہے کہ دلائل کی بنیاد پر ہو۔ دلائل کے بغیر وثوق اور قطعیت کے ساتھ کوئی راہ اختیار نہیں کی جاسکتی۔

ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ خدا کا اقرار اثبات ہے جس کے لیے دلیل کی ضرورت ہے اور خدا کا انکار نفی ہے جس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، لیکن یہ بھی مسئلہ کی صحیح تصویر کشی نہیں ہے۔ سوال دراصل یہ ہے کہ کائنات کسی ہستی کی تخلیق اور کسی منتظم کے نظم و انصرام سے قائم ہے یا آپ سے آپ موجود ہے اور آپ سے آپ رواں دواں ہے؟

یہ دونوں صورتیں واضح طور پر مثبت صورتیں ہیں۔ ان میں سے جس صورت کو بھی آپ اختیار کریں گے آپ کو بتانا ہو گا کہ آپ اسے کیوں صحیح قرار دے رہے ہیں اور دوسری صورت آپ کے نزدیک کیوں غلط ہے۔

اگر آپ کائنات کے لیے کسی خالق و مدبر ہستی کو ناگزیر خیال کرتے ہیں تو

آپ کو اس کے قوی دلائل دینا ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ دوسری صورت کے قائل ہیں، آپ کا یقین ہے کہ کائنات خود سے موجود اور خود سے جاری و قائم ہے تو آپ کو ثابت کرنا ہوگا کہ فی الواقع ایسا ہی ہے بہرحال آپ کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کائنات کے وجود اور اس کے نظم کی کوئی ایسی توجیہہ کرنی ہوگی جو معقول ہونے کے ساتھ مدلل بھی ہو۔ اس کے بغیر آپ کے نقطۂ نظر کی محض ایک خیال کی حیثیت ہوگی، اور یہ معلوم ہے کہ خیال کی ہوائی بنیاد پر انسانی زندگی کی عظیم عمارت تعمیر نہیں کی جا سکتی۔

ملحدین کے دلائل

یہ کائنات خدا کی تخلیق اور اس کے انتظام و انصرام سے جاری و قائم ہے۔ اس کے دلائل پیش کرنا اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ اس پر ہم اپنی کتاب "خدا ہے" میں گفتگو کریں گے۔ زیرِ نظر کتاب کا موضوع یہ ہے کہ ملحدین کے انکارِ خدا کے دلائل کیا ہیں اور علمی حیثیت سے اُن دلائل کا پایہ کیا ہے۔

عام طور پر یہ بات مشہور ہے۔ اور یہ کچھ تو اہلِ مذاہب کی ناخود شناسی اور احساس کمتری کا نتیجہ ہے اور کچھ ملحدین کے غیر معمولی پروپیگنڈہ کا کہ عقلی پہلو سے الحاد کا موقف مضبوط ہے۔ رہی خدا کی معرفت تو اس کا تعلق وجدان سے ہے۔ عقل سے خدا کے وجود پر استدلال نہیں کیا جا سکتا اور اگر کیا جا سکتا ہے تو اس کی حیثیت مضبوط استدلال کی نہیں ہے۔ حالانکہ حقیقی صورتحال اس کے برعکس ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ عقلی حیثیت سے الحاد کے پاس جذباتی باتوں اور مغالطوں کے سوا کوئی چیز نہیں ہے جسے حقیقتاً دلیل کہا جا سکے۔ جب کہ خدا پرستی کے حق میں عقل اور وجدان کی تمام شہادتیں ہیں۔

خدا کے نہ ہونے کے سلسلے میں ملحدین جو دلائل دیتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ، جس کا تعلق اس بات سے ہے کہ خدا موجود نہیں ہے۔ دوسری قسم وہ جس کا تعلق اس بات سے ہے کہ خدا کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ہم صرف پہلی قسم کے دلائل سے بحث کریں گے۔ دوسری قسم کے دلائل سے بحث کتاب "کیا خدا کی ضرورت نہیں" میں ملے گی۔

خدا نظر نہیں آتا

خدا کے انکار کے سلسلہ میں ملحدین کے پاس ایک ہی دلیل ہے جسے وہ مختلف پیرایوں میں دہراتے رہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں، خدا اگر ہے تو نظر کیوں نہیں آتا۔ کبھی کہتے ہیں اور یہ بات اشتراکیت کے اساطین نے کہی ہے کہ کائنات جس طرح محسوس ہوتی ہے بس اسی طرح اسے ماننا چاہیے" یعنی خدا چونکہ محسوس نہیں ہوتا اس لیے کائنات کو بے خدا ہی ماننا چاہیے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ آج سائنس کا دور ہے، آج تجربہ و مشاہدہ کے بغیر کسی شئے کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ مطلب یہ کہ خدا ہمارے تجربہ (لیبورٹری کا تجربہ، نہ کہ وجدان کا تجربہ) اور مشاہدہ میں نہیں آتا۔ اس لیے وہ نہیں ہے۔ کبھی فرمایا جاتا ہے کہ کائنات میں مادہ کے سوا کوئی شئے نظر نہیں آتی، اس لیے یہاں مادہ اور اس کے مظاہر کے سوا جو کچھ ہے، خدا اور روح وغیرہ۔ وہ انسانی ذہن کی پیداوار ہے جس کا خارج میں کوئی وجود نہیں (یہ فلسفہ اشتراکیت کے چوٹی کے اکابر کا ہے) کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ ہمارا راکٹ خلا میں سفر کر آیا مگر ہمارے آدمیوں کو کہیں خدا نہ ملا (یہ عظیم سائنسی انکشاف اشتراکیت کے موجودہ اکابر کا ہے) ان تمام باتوں کا حاصل ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ "خدا نہیں ہے کیوں کہ وہ ہمیں حواس کے ذریعے محسوس نہیں ہوتا"۔ یہی سادہ سی بات، جب کسی فلسفی کے قلم سے نکلتی ہے تو موٹی موٹی فلسفیانہ

اصطلاحوں کا پُر رعب لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ ان مرعوب کن اصطلاحات کا پردہ چاک کیجئے تو یہی سادہ اور مختصر سی بات عریاں نظر آجائے گی۔ یہی وہ "برہانِ قاطع" ہے جس کی اساس پر الحاد اور ملحدانہ نظام ہائے حیات کی عظیم عمارت قائم ہے۔ ملحدین اس دلیل کو اس قدر وثوق اور اتنی تکرار کے ساتھ پیش کرتے ہیں گویا خدا کے نہ ہونے کی یہ کوئی قطعی دلیل ہے۔ اتنی قطعی دلیل کہ اسے سننے کے بعد فوراً اس پر ایمان لے آنا چاہیے اور اسے نہ ماننا حماقت اور ہٹ دھرمی ہوگی، یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات اس دلیل کو دہراتے دہراتے خدا اور اس کے پرستاروں کا مذاق بھی اڑانے لگتے ہیں، لیکن کیا حقیقتہً یہ اتنی ہی قطعی دلیل ہے؟ کیا واقعتہً یہ علمی اور عقلی دنیا کا اتنا عظیم شاہکار ہے کہ انسان کو اس کے آگے سربسجود ہونا چاہیے۔ آئیے اس دلیل کا گہرا اور تفصیلی جائزہ لیں اور اسے علم، عقل اور سائنس کی ترازو میں اچھی طرح تول کر دیکھیں کہ اس میں فی الواقع کتنا وزن ہے۔

دلیل کا علمی تجزیہ

"خدا نہیں ہے کیونکہ وہ حواس کے ذریعے محسوس نہیں ہوتا" اس دلیل کا علمی تجزیہ کیجیے تو تین اجزا سامنے آئیں گے:

۱ : کسی شئے کے علم ہونے کا واحد ذریعہ حواس ہیں۔ حواس کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے کسی چیز کو جانا نہیں جا سکتا۔

۲ : کسی شئے کے معلوم نہ ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ موجود نہیں ہے۔

۳ : خدا حواس کے ذریعے محسوس نہیں ہوتا۔

دلیل انہی تین اجزا سے مل کر بنی ہے۔ ان میں سے کوئی جز بھی غلط ثابت ہو جائے تو دلیل آپ سے آپ ختم ہو جائے گی۔ مثلاً اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حواس علم حاصل ہونے کا واحد ذریعہ نہیں ہیں، دوسرے ذرائع

سے بھی ہم کسی شے کو جان سکتے ہیں تو استدلال کا سارا زور ختم ہو جائے گا۔

اگر تقریر و تحریر دونوں ذرائع سے علم حاصل ہو سکتا ہے تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جس شخص نے تقریر نہیں سُنی وہ علم سے بے بہرہ ہے۔ ممکن ہے اس نے کتابوں کے ذریعے علم حاصل کیا ہو۔ اسی طرح اگر حواس علم حاصل ہونے کا واحد ذریعہ نہیں ہیں، اس کے کچھ دوسرے ذرائع بھی ہو سکتے ہیں تو آپ کا استدلال آپ سے آپ ختم ہو جاتا ہے، آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ حواس کے ذریعے خدا محسوس نہیں ہوتا اس لیے وہ نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کسی اور ذریعے سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہو۔

یہی حال دلیل کے دوسرے جزو کا ہے۔ اگر "نہ جاننا"، "نہ ہونے" کے ہم معنی نہیں ہے تو پہلے جز کے ثابت ہو جانے کے بعد بھی استدلال کا طلسم ٹوٹ کر رہ جائے گا۔ خدا معلوم نہیں ہے، اس سے یہ لازم نہ آئے گا کہ خدا موجود نہیں ہے، اس کے برعکس خدا کے موجود ہونے کا امکان آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

اسی طرح اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خدا محسوس ہوتا ہے یا محسوس ہوا ہے تو پہلے دو اجزا کے صحیح ثابت ہونے کے باوجود استدلال کی پوری عمارت زمین پر آ رہے گی۔ پھر یہ کہنے کا موقع نہ رہے گا کہ خدا محسوس نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ نہیں ہے۔ بہر حال دلیل کی صحت کا دارومدار اس پر ہے کہ دلیل کے تینوں اجزا فی الواقع صحیح ہیں ؟ بہتر ہوگا کہ ہم ایک ایک جز پر الگ الگ غور کریں۔

کیا حواس علم حاصل ہونے کا واحد ذریعہ ہیں ؟

دلیل کا پہلا اور بنیادی جزو یہ ہے کہ حواسِ خمسہ علم حاصل ہونے کا واحد ذریعہ ہیں، لیکن کیا یہ کوئی ثابت شدہ حقیقت ہے ؟ جو لوگ اسے ثابت شدہ

حقیقت کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں حالانکہ جیسا کہ آگے علم ہوگا، کسی کے نزدیک، حتیٰ کہ ملحدین کے نزدیک بھی اس کی حیثیت ثابتہ کی نہیں ہے، اسے صرف انکارِ خدا کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ان سے یہ سوال ہے کہ اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟ کیا اس کے پیچھے کوئی عقلی استدلال ہے؟ یہ حضرات اس سوال کا جواب کبھی نہیں دے سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ عقلی استدلال سے زیادہ سے زیادہ یہ تو ثابت کر سکتے ہیں کہ حواس کے ذریعے علم حاصل ہوتا ہے، لیکن یہ کبھی ثابت نہیں کر سکتے کہ حواس کے علاوہ علم حاصل ہونے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

اگر عقل اس کی دلیل نہیں، تو کیا تجربہ اس کی دلیل ہے؟ کیا تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ حواس علم حاصل ہونے کا واحد ذریعہ ہیں؟ اس سوال کا جواب بھی نفی میں ہے۔ تجربہ اس کے لیے کوئی دلیل فراہم نہیں کرتا۔ تجربہ نام ہے اس چیز کا کہ اب تک کیا ہوتا رہا ہے، کیا کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں ہو سکتا، تجربہ اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ تجربہ یہ تو بتا سکتا ہے کہ کون سی شئے کس ذریعہ یا کن ذریعوں سے حاصل ہوتی رہی ہے، لیکن تمام ذرائع کا احاطہ کرنا تجربہ کے بس سے باہر ہے۔

اس چیز کو اس مثال سے سمجھیئے۔ انسانی علم کا ایک گوشہ یہ ہے کہ خود انسان کے نظامِ جسمانی کا صحیح حال معلوم ہو۔ اس کے لیے بہت سے طریقے اور بے شمار آلات ایجاد ہو چکے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ ایکسرے سے پہلے جسم کی داخلی حالت کے معائنہ کی کوئی سبیل نہ تھی، اس انکشاف نے ایک حد تک اس کی بھی سہولت بہم پہنچا دی، لیکن ابھی بہت کچھ جاننا باقی ہے، اور اس کے لیے نئے نئے طریقوں اور نئے نئے آلات کی ایجاد ناگزیر ہے۔ آپ تجربہ کے کسی مرحلہ میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ نظامِ جسمانی کا حال جاننے کے لیے ممکن ذرائع بس یہی ہیں، ان کے علاوہ اور ذرائع نہیں ہو سکتے، یہ علم

کے ایک چھوٹے سے گوشہ کا حال ہے۔ اسی پر آپ کائنات اور ماورائے کائنات کے بے پایاں علم کو قیاس کر سکتے ہیں۔

کائنات کے علم کی بات آئی تو ایک تازہ ترین مثال پر بھی غور کر لیجئے۔ خلا میں راکٹ کے سفر سے پہلے سائنس داں زمین، فضا اور خلا کے متعلق بہت سے نظریات رکھتے تھے جن پر انھیں یقین تھا، یہ نظریات ان ذرائع علم پر مبنی تھے جو اس وقت تک انھیں حاصل تھے۔ خلا میں سفر کی ابتدا ہوئی کہ علم کا ایک نیا دروازہ انسان پر کھل گیا۔ اسے اس بات کے مواقع حاصل ہو گئے کہ زمین سے بہت اوپر اٹھ کر اور خلا میں سائنس کے نازک ترین آلات پہنچا کر اور خود پہنچ کر زمین، فضا اور خلا کے حالات معلوم کرے۔ اس کے ذریعے انسان کو بہت سی نئی معلومات ہوئیں اور ان کے باعث متعدد نظریات میں تبدیلی کرنا پڑی۔ مثلاً پہلی مرتبہ اس بات کا انکشاف ہوا کہ زمین نہ گیند کی طرح گول ہے، نہ نارنگی کی مانند کچھ چپٹی اور کچھ گول۔ جیسا کہ اب تک یقین کیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ ایک بے ہنگم تودہ کی مانند ہے۔ زمین کے اوپر کتنی دور تک ہوا کا غلاف ہے اور اس کے حجم کا تناسب کیا ہے؟ بادل کس طرح بنتے ہیں اور موسمی تغیرات کیونکر ہوتے ہیں؟ فضا اور خلا میں کون کون سی لہریں اور شعاعیں (Rays) رواں دواں ہیں؟ نظام جسمانی پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ اور خطرناک اور مہلک شعاعوں سے تحفظ کی کیا سبیل ہے؟ ان سب امور کے سلسلے میں بہت سی نئی معلومات ہوئیں اور متعدد معلومات ہوئیں اور متعدد نظریات غلط ثابت ہوئے۔ زمین کی حدودِ کشش سے نکل کر بے وزنی کی حالت کیونکر طاری ہوتی ہے، کیسی محسوس ہوتی ہے اور کس حد تک قابلِ برداشت ہے۔ اس سلسلے میں بالکل نئے تجربات ہوئے۔ یہ بھی پہلی بار معلوم ہوا کہ خلا میں انسان کا سفر ممکن ہے۔ راکٹ کو خلا میں بھیجنے کے بعد اسے زمین پر واپس لایا جا سکتا ہے اور چاند اور

بعض دوسرے سیاروں تک انسان سفر کر سکتا ہے۔

یہ معلومات اسی لیے تو حاصل ہوئیں کہ علم کا ایک نیا دروازہ کھلا۔ حالانکہ یہ دروازہ نیا نیا کھلا ہے اور اس کے اندر داخل ہونے میں بہت سی مشکلات ہیں۔ ابھی تو خلا کے سفر کی ابتدا ہے، انسان دیر تک خلا میں نہ رہ سکا ہے اور نہ کسی سیارہ میں پہنچ سکا ہے۔ جب خلا میں سفر کی مشکلات پوری طرح حل ہو جائیں گی، انسان چاند اور دوسرے سیاروں میں پہنچ جائے گا، خلا میں بین السیاراتی راکٹ اسٹیشن قائم ہو جائیں گے اور مختلف سیاروں تک سائنسی آلات سے بھرپور راکٹ بھیجے اور واپس لائے جا سکیں گے اس وقت انسانی عقل کی کیا حدود ہوں گی کتنے مسلّم نظریات غلط ثابت ہو چکے ہوں گے اور علم کے کون کون سے نئے ذرائع دریافت ہو جائیں گے، ابھی اس کا ہلکا سا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی واضح ہو گئی ہو گی کہ تجربہ کی روشنی میں ذرائع علم کا احاطہ ناممکن ہے۔ آپ تجربہ سے یہ ضرور پوچھ سکتے ہیں کہ اب تک کس ذریعہ یا کن ذرائع سے علم حاصل ہوتا رہا ہے اور تجربہ آپ کو اس کا جواب بھی دے گا، لیکن علم حاصل ہونے کے تمام ممکنہ ذرائع کیا ہیں؟ تجربہ اس سوال کا کبھی جواب نہیں دے سکتا۔ آپ تجربہ یا عقل جس سے بھی اس بات کی شہادت چاہیں گے کہ "حواس علم حاصل ہونے کا واحد ذریعہ ہیں"، اس پر آپ ظلم ڈھائیں گے۔ اس بات کی شہادت نہ عقل دے سکتی ہے نہ تجربات!

کیا علم صرف حواس کے ذریعے حاصل ہوتا رہا ہے؟

علم حاصل ہونے کے تمام ممکنہ ذرائع کیا ہیں؟ تجربہ یقیناً اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن تجربہ یہ تو بتا سکتا ہے کہ اب تک کس ذریعے سے علم

حاصل ہوتا رہا ہے۔ پھر اس سلسلے میں اس کی شہادت کیا ہے؟ کیا یہ کہ اب تک انسان کو جو کچھ علم حاصل ہوا ہے صرف حواس کے ذریعہ ہوا ہے یا علم حاصل ہونے کے دوسرے ذرائع بھی رہے ہیں۔

اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ حواس علم حاصل ہونے کا واحد ذریعہ نہیں ہیں۔ متعدد ذرائع ہیں جن سے انسان کو مختلف اشیاء کا علم ہوتا ہے۔ حواس علم حاصل ہونے کا یقیناً ذریعہ ہیں، لیکن یہ ذریعہ بہت محدود اور حد درجہ ناقص ہے، بلکہ بسا اوقات گمراہ کن بھی ثابت ہوتا ہے۔ علم کا بہت بڑا حصہ حواس کے بجائے دوسرے ذرائع کا عطیہ ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے اور اس کا اعتراف ہر اس شخص کو ہوگا جو انسانی علوم اور خود سائنس کے مختلف شعبوں سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہو خود ملحدین کو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہے۔

لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جو حقیقت اس درجہ مسلّم اور ناقابلِ تردید ہو، جس کے تسلیم کیے جانے پر انسانی علوم، اور انسانی ارتقاء اور سائنس کے تمام انکشافات کا انحصار ہو اور جسے علمی و سائنسی دنیا میں بے چون وچرا تسلیم کیا جاتا ہو، خدا اور مذہب کے موضوع پر گفتگو کرتے وقت پوری جرأت و بیباکی کے ساتھ اس کا انکار کر دیا جائے اور اس طرح اس کی تردید کی جائے گویا وہ اوہام و جاہلانہ خرافات قسم کی چیز ہو۔

اس غیر صحت مندانہ صورتِ حال کے پیشِ نظر اندیشہ ہے کہ عام ذہن اس مختصر سے جواب سے مطمئن نہ ہوں گے، اس لیے مناسب ہوگا کہ ہم ذرا تفصیل میں جائیں اور دیکھیں کہ کن کن ذرائع سے ہمیں مختلف اشیاء کا علم ہوتا ہے اور یہ بھی دیکھیں کہ کیا کائنات کی تمام اشیاء کو جاننے کے لیے حواس کافی یا کارآمد ہو سکتے ہیں۔

حواسِ خمسہ اور اُن کے نقائص

علم حاصل ہونے کا پہلا ذریعہ حواسِ خمسہ ہیں۔ ہم آنکھ سے دیکھتے، کان سے سُنتے، ناک سے سونگھتے، زبان سے چکھتے اور ہاتھ اور پورے بدن سے چھو کر محسوس کرتے ہیں، یہ حواس علم حاصل ہونے کا اوّلین اور ابتدائی ذریعہ ہیں، لیکن بس ابتدائی ذریعہ ہی ہیں۔ یہ نہ آخری ذریعۂ علم بن سکتے ہیں اور نہ کُل ذریعۂ علم، غیر مادّی اور غیر محسوس اشیاء کا ذکر ہی کیا کہ انھیں تو حواس کے ذریعہ محسوس ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہم لاتعداد محسوسات میں سے ان کے ذریعہ صرف چند محسوسات کا ادراک کر سکتے ہیں۔ چکھنے اور چھونے کی قوت سے صرف وہی چیزیں محسوس ہوتی ہیں جو ہماری زبان اور ہمارے بدن سے چھو جائیں، ناک کچھ دُور تک کی خوشبو، بدبو، کو سونگھ لیتی ہے، سُننے کی قوت کچھ اور دُور تک کام کرتی ہے بشرطیکہ آواز زور سے آ رہی ہو۔ آنکھ اس سے آگے بھی دیکھ لیتی ہے، مگر وہ بھی بس ایک حد تک، دور کی صرف وہ چیزیں نظر آتی ہیں جو زیادہ بڑی یا زیادہ روشن ہوں۔ دُور کی چھوٹی اور کم روشن چیزوں کو آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ پھر دور کی جو چیزیں آنکھ کو نظر آتی ہیں وہ نہ صحیح حجم، صحیح رنگ، اور صحیح خد و خال کے ساتھ نظر نہیں آتیں۔ دُور کی چیزوں کا یہ ادراک اصل سے اس قدر مختلف ہوتا ہے کہ اسے علم کہنا علم کے لفظ کی توہین ہے۔

دُور کی چیزوں کے سلسلے میں ان حواس کی ناکامی یا خام کاری تو واضح ہی ہے۔ قریب کی بہت سی چیزوں کا احساس کرنے میں بھی یہ حواس کارآمد نہیں ہیں۔ دیکھنے کی قوت سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ کارآمد قوت ہے، مگر دُوربین کے بغیر جس طرح وہ دُور کی چیزوں کو نہیں دیکھ پاتی خوردبین کے بغیر زیادہ چھوٹی اور زیادہ باریک اشیاء کا مشاہدہ بھی اس

کی طاقت سے باہر ہے۔

یہ حواس محدود اور ناقص ہی نہیں، انسان کو دھوکے میں ڈالنے والے بھی ہیں۔ ریلوے لائن کی پٹڑیاں متوازی ہوتی ہیں، مگر ذرا فاصلہ ہی پر وہ آپ کو ملتی ہوئی معلوم ہوں گی، چلتی ٹرین سے باہر نظر ڈالیے۔ ہر چیز آپ کو مخالف سمت میں بھاگتی ہوئی نظر آئے گی، حالانکہ وہ چیزیں نہیں، ٹرین حرکت میں ہوتی ہے۔ ایک سیدھی لکڑی جس کا نصف حصہ پانی کے اندر ہو ہمیں ٹیڑھی نظر آتی ہے اور اگر پورا حصہ پانی میں ہو تو سیدھی نظر آتی ہے مگر پہلے کی نسبت کچھ موٹی محسوس ہوتی ہے۔ روز کا مشاہدہ ہے کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے اور آسمان کا سفر کرتا ہوا مغرب میں جا کر غروب ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس زمین ہمیں ساکن نظر آتی ہے اس مشاہدہ سے ہزاروں سال تک بڑے بڑے فلسفی اور ماہرین فلکیات پورے یقین کے ساتھ یہ سمجھتے رہے کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گردش کرتا ہے۔ اسی تصور کے تحت پورا علم ہیئت مرتب ہوا اور علمی و انسانی دنیا میں رائج رہا۔ حالانکہ یہ بالکل غلط تھا۔ ابھی تھوڑے سے زمانے سے انسان نے اس حقیقت کو پایا ہے کہ زمین متحرک ہے اور سورج کے گردش کرتی ہے۔ ہم زمین کو دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں واضح طور پر چپٹی نظر آتی ہے۔ حالانکہ وہ ہرگز چپٹی نہیں ہے۔ دیکھنے میں دھوپ کا رنگ ایک ہے لیکن وہ کم از کم سات رنگوں پر مشتمل ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ سورج اور چاند بہت بڑے اور باقی تمام ستارے بہت چھوٹے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے بے شمار ستارے ہیں جو سورج سے بہت بڑے سے بہت زیادہ بڑے ہیں۔ اور چاند تو بہت چھوٹا تابع سیارہ ہے جو زمین سے زیادہ قریب ہونے کے باعث زیادہ بڑا نظر آتا ہے۔

یہ بہت سی مثالوں میں سے صرف چند مثالیں ہیں اور وہ بھی صرف ایک حاسہ ـــ دیکھنے کی قوت سے متعلق۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ یہ حواس نہ صرف یہ کہ بہت محدود اور انتہائی ناقص ذریعۂ علم ہیں بلکہ بعض اوقات گمراہ کن بھی ثابت ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں نہ ان کی فراہم کردہ معلومات پورے اعتماد کے قابل ہیں اور نہ تنہا ان کے بل پر ہم علم کے میدان میں آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ان پر کلّی اعتماد اور علم حاصل کرنے کے لیے صرف انکی طرف رجوع کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم ہزاروں برس پہلے کے دورِ جاہلیت کی طرف پلٹ جائیں۔ اگر ہم ایسا کرنے پر راضی نہیں، اگر ہم کائنات کی زیادہ سے زیادہ اشیاء کو جاننا چاہتے ہیں اور صحیح طور سے جاننا چاہتے ہیں اور اگر ہم علم کی گہرائیوں میں اترنے کے خواہشمند ہیں تو ہمیں دوسرے صحیح تر، زیادہ قوی تر ذرائع علم کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو اس کی غلطیوں کی تصحیح کر سکیں اور جن اشیاء تک حواس کی رسائی نہیں ہوتی ان کا علم حاصل کرنے میں ہمارے مددگار ثابت ہوں۔

آلات اور اُن کی افادیّت

جوں ہی اس بات کا احساس ہوا، انسان نے دوسرے ذرائع علم کی طرف توجہ کی انہی ذرائع میں سے ایک ذریعۂ آلات ہیں۔ یہ آلات شروع میں سادہ تھے، لیکن رفتہ رفتہ زیادہ سے زیادہ پُر پیچ اور دقیق ہوتے چلے گئے، ان آلات نے حواس کی غلطیوں کو واضح کیا، مشاہدہ و احساس کی قوتوں کو بے پناہ حد تک وسیع کیا اور انسان کو بے شمار ایسی حقیقتوں کا علم دیا، جنھیں وہ حواس کے ذریعہ کبھی بھی نہ جان سکتا تھا۔

اس ذریعۂ علم نے انسانی علم میں کتنا اضافہ کیا اس کا ہلکا سا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ آج کا انسان مادّی علوم اور سائنس میں دورِ

دورِ قدیم کے انسان سے اتنا آگے ہے کہ کسی تناسب سے اسے بیان کرنا مشکل ہے اور ابھی علم کے لامحدود امکانات اس کے سامنے ہیں۔ ان آلات ہی کی بدولت انسان کیمیاوی تجربہ، خوردبینی مشاہدہ اور ذرّاتی (Molecular) اور جوہری (ایٹمی) مطالعہ کے قابل ہو سکا اور اب خلا کے نسبتۃً تفصیلی تجربہ و مطالعہ کا آغاز کر رہا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی حواس کے بس کی بات نہ تھی، بلکہ حواس کی دنیا میں محدود رہ کر ان میں سے اکثر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ آلات دو طرح علم کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ ہمارے حواس کو تیز تر اور قوی کر دیتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ آلات محسوس کرنے میں حواس کے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی وساطت سے حواس بہت سی اشیاء کو محسوس کر لیتے ہیں جنھیں تنہا محسوس نہیں کر سکتے۔ اس کی بہترین مثال دُوربین اور خوردبین ہیں۔ دُوربین کے ذریعے ہم بہت سے ایسے ستاروں کا مشاہدہ کر سکے جو ہماری آنکھوں سے اوجھل تھے اور اب بھی دوربین کی مدد کے بغیر ننگی آنکھ سے نظر نہیں آتے۔ اس کے علاوہ بعض قریبی ستیاروں — چاند وغیرہ — کا نسبتۃً زیادہ تفصیلی اور گہرا مطالعہ کیا جا سکا اور اجرامِ فلکی کے بارے میں بہت سی ایسی معلومات ہوئیں جو تنہا آنکھ سے کبھی نہیں ہو سکتی تھیں۔

اسی طرح خوردبین کے ذریعے ہم بے شمار دقیق اشیاء کا ادراک کر سکے جو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ تھیں۔ اس کے ذریعہ ہم نباتات، حیوانات، اور انسان کے — نظامِ جسمانی کا زیادہ تفصیلی اور گہرا مطالعہ کر سکے۔ آپ ایک پودے کو لیجیے اور پہلے اپنی آنکھ سے اس کے مختلف اجزاء کا مطالعہ کیجیے اور نوٹ کیجیے کہ آپ کو کیا نظر آ رہا ہے اس کے بعد ایک اچھی خوردبین لیجیے اور اس کے ذریعے اسی پودے اور اس

کے مختلف اجزاء کا مشاہدہ کیجئے، آپ کو حقائق کی ایک نیا عالم اپنے سامنے کھلا نظر آئے گا۔ پھر جتنی زیادہ طاقت ور خوردبین آپ استعمال کرتے جائیں گے آپ کے سامنے معلومات کی ایک نئی دنیا آتی جائے گی۔ اسی خوردبین کے ذریعے ہم جراثیم سے متعارف ہوئے ہیں جو ہمارے گردوپیش ہر جگہ غیر محدود تعداد میں موجود ہیں، یہ ننگی آنکھوں سے نظر نہیں آتے۔ مگر خوردبین کی وساطت سے بہ آسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ بلغم کی ایک پھٹک کو چھوٹے سے شیشہ پر مل دیجئے اس کے بعد خوردبین سے اس کا مشاہدہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ بہت سے جراثیم اچھل کود رہے ہیں، خون دیکھنے میں کس قدر سرخ ہوتا ہے مگر آپ خون کی ایک بوند کا اسی خوردبین سے معائنہ کیجئے آپ کو بہت سے دھبے نظر آئیں گے جن میں سے کچھ سفید ہوں گے اور کچھ سرخ۔ یہ خون کے سرخ و سفید ذرات ہیں۔ اسی طرح ہمیں خوردبین سے دوسرے بہت سے جراثیم کا علم ہوتا ہے جو ہوا اور پانی وغیرہ میں غیر محدود تعداد میں موجود ہیں مگر سادہ آنکھ سے نظر نہیں آتے۔

یہ ایک طرح کے آلات ہیں۔ یہ ہمارے احساس کی قوتوں، حواس خمسہ کو سہارا دیتے ہیں، ان کے ذریعے چیزوں کو ہم خود محسوس کرتے ہیں، لیکن آلات کی ایک اور قسم ہے۔ اور اس قسم میں بے شمار آلات ہیں۔ یہ آلات ہمارے حواس خمسہ کو سہارا نہیں دیتے، نہ ان کے ذریعے ہم اشیاء کو محسوس کرتے ہیں۔ یہ آلات بطور خود ہمیں معلومات فراہم کرتے ہیں یہ آلات ذریعۂ احساس نہیں، ذریعۂ علم ہیں۔ ان کے ذریعے ہم اشیاء کو محسوس نہیں کرتے، ہمیں ان کا علم ہوتا ہے۔ آپ پہلی قسم کے آلات سے فراہم شدہ معلومات کو محسوسات میں شمار کر سکتے ہیں کیونکہ ان کا ادراک حواس ہی کرتے ہیں۔ اگرچہ آلات کے توسط سے کرتے ہیں۔ مگر دوسری قسم کے آلات کی فراہم کردہ معلومات کو آپ محسوسات میں شامل نہیں کر سکتے۔

کیونکہ ان کا ادراک حواس سے نہ بلا واسطہ کیا ہے، نہ آلات کے توسط سے ان کا انکشاف صرف آلات سے کیا ہے اور آپ کو ان کا علم حواس سے نہیں، عقل سے ہوا ہے۔

آپ کی کلائی پر گھڑی بندھی ہے۔ یہ آپ کو وقت بتاتی ہے۔ آپ کتنی دیر سے کسی کام میں مصروف ہیں، آپ اس کے ذریعے یہ بات منٹ اور سیکنڈ کی تفصیل سے جان سکتے ہیں۔ مگر صرف جان سکتے ہیں محسوس نہیں کر سکتے۔ آپ کی گھڑی ایک چھوٹی سی مشین ہے۔ اس کی مشینری گھنٹہ، منٹ اور سیکنڈ کی سوئیوں کو ایک خاص رفتار سے حرکت دیتی ہے یہ حرکت کی رفتار ان ہندسوں سے معلوم ہوتی ہے جو ڈائل پر بنے ہوئے ہیں اور اسی سے آپ کو وقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ایک حسابی عمل ہے جس کا تعلق حواس سے نہیں، عقل سے ہے۔ آپ کی آنکھ ہندسوں اور سوئیوں کو دیکھتی ہے۔ وقت اور اس کی رفتار اسے نظر نہیں آتی۔

آپ تھرمامیٹر لگا کر یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ کسی شخص کے بدن کا ٹمپریچر کتنا ہے اور وہ نارمل سے کتنا کم یا کتنا زیادہ ہے، لیکن یہ آپ کو معلوم ہوتا ہے محسوس نہیں ہوتا۔ بدن کی حرارت کو تو آپ چھو کر ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ اگرچہ بعض اوقات چھونے سے بھی حرارت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ تھرمامیٹر میں آپ حرارت اور اس کی کمی بیشی کو نہیں، پارہ کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتے ہیں اور اسی سے آپ کو اندازہ ہوتا ہے کہ حرارت کتنی کم یا کتنی زیادہ ہے، یہ احساس نہیں علم ہے۔

آپ بس میں سفر کر رہے ہیں، بس کس رفتار سے جا رہی ہے، اس کا علم آپ کو اس گھڑی سے ہو گا جو بس کے انجن میں لگی ہے۔ آپ گھڑی سے بس کی رفتار کو نہیں دیکھ سکتے، آپ صرف سوئیوں اور ہندسوں کو دیکھتے ہیں اور انہی سے اندازہ کرتے ہیں کہ بس کی رفتار کیا ہے۔

آپ کو اپنا وزن معلوم کرنا ہے۔ آپ تولنے والی مشین پر جا کر کھڑے ہوتے ہیں اور دس نئے پیسے اس میں ڈال دیتے ہیں، مشین آپ کا وزن ایک ٹکٹ پر چھاپ کر آپ کو دے دیتی ہے، ظاہر ہے کہ اس میں آپ کے احساس کا کوئی دخل نہیں۔ تولنے کا کام مشین نے کیا اور اس کا ریکارڈ کر کے آپ کو دے دیا۔

یہ سادہ سے آلات کا حال ہے۔ اسی پر آپ پیچیدہ آلات کو قیاس کر سکتے ہیں۔ زندگی کے ہر گوشہ میں یہ آلات ہمارے لیے بیش بہا معلومات ـــــ وافر معلومات فراہم کرتے رہتے ہیں۔ ان کے ذریعے ہمیں زمین اور فضا کی موجودات اور ان کی کیفیات و حالات کا بہت کچھ علم حاصل ہوتا رہتا ہے۔ بڑی حد تک صحیح علم۔ اور نت نئے آلات کی ایجاد کے ساتھ یہ علم بے پناہ سُرعت و وسعت کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ آلات خلا اور اس کی موجودات کو جاننے کے سلسلے میں بھی ہماری مدد کرتے ہیں۔ حال ہی میں راکٹوں کے ذریعہ خلا میں اسی قسم کے سائنسی آلات بھیجے گئے تھے، ان میں سے کچھ آلات خلا میں اب تک موجود ہیں اور خلا اور فضا کے بارے میں معلومات ریکارڈ کر کے زمینی آلات تک بھیجتے رہتے ہیں اور زمینی آلات سے ان معلومات کو ہم حاصل کر لیتے ہیں، کچھ آلات زمین پر واپس لے آئے گئے ہیں۔ ان میں وہ آلات بھی شامل ہیں جو خلا میں بھیجے جانے والے جانوروں اور انسانوں کے لیے نصب کر دیے گئے تھے۔ یہ آلات بھی اپنے ساتھ معلومات کا ریکارڈ لائے ہیں۔ ان آلات نے یہ بھی بتایا کہ خلا کے سفر کا حیوانات اور انسانوں پر کیا ردِ عمل ہوا۔

یہ آلات ـــــ جیسا کہ مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا ـــــ حواس کے مددگار نہیں، مستقل ذریعۂ علم ہیں۔ یہ ہمیں محسوس نہیں کراتے، علم بخشتے

ہیں۔ اگر آپ ان آلات کی فراہم کردہ معلومات کو تسلیم کرتے ہیں اور انہیں علم کا ایک اہم جزو قرار دیتے ہیں اور آج کون ہے جو اس کے خلاف منہ سے ایک لفظ نکال سکے ـــــ تو دوسرے الفاظ میں آپ اس کے قائل ہیں کہ حواس واحد ذریعۂ علم نہیں، آلات بھی ذریعۂ علم ہیں اور مستقل ذریعۂ علم۔

عقل[1] ہی حقیقی ذریعۂ علم ہے

تیسرا ذریعۂ علم، جس کے ذریعے انسان کو بے پایاں علم حاصل ہوا عقل ہے۔ ابتدا ہی سے انسان اس ذریعۂ علم کا قائل رہا ہے، اور اس کے ذریعے علم کی وادیاں طے کرتا رہا ہے اور جب تک وہ روئے زمین پر آباد ہے اس ذریعۂ علم سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ تقریباً سارا انسانی علم اسی ذریعۂ علم کا نتیجہ و ثمرہ ہے۔ حتیٰ کہ حواس و آلات سے حاصل شدہ علم بھی۔ اس ذریعۂ علم سے انکار کا مطلب یہی نہیں ہے کہ سائنس سمیت تمام انسانی علوم غلط اور بے بنیاد قرار پائیں بلکہ اس کے بعد انسان کے لیے زمین پر زندگی گزارنا محال ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم بے شمار چیزوں کو حواس سے محسوس کیے بغیر صرف اس لیے مانتے ہیں کہ ہماری عقل اسے ماننے کا مطالبہ کرتی ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ہم حواس سے بہت کم چیزوں کا اور عقل سے بہت زیادہ چیزوں کا ادراک کرتے ہیں۔

ہم بہت سی چیزوں کو صرف اس لیے مانتے ہیں کہ ان کے افعال ہمارے سامنے آتے ہیں اور وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کا کوئی فاعل

---

[1] یہاں وحی زیر بحث نہیں۔

تسلیم کیا جائے۔ مثلاً ہم سب مانتے ہیں کہ انسان حواس رکھتا ہے، لیکن ان حواس کو کس نے محسوس کیا؟ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آنکھ، کان، ناک، زبان اور ہمارے جسم کی کھال، یہ حواس نہیں محض ان کے آلات ہیں، آنکھ کیمرہ ہے جو فوٹو اتارتا ہے اور قوتِ باصرہ اس فوٹو کو دیکھتی ہے۔ کان کا پردہ ڈھول کی کھال کی مانند آواز کی لہروں سے تھرتھراتا ہے۔ اور قوتِ سامعہ اس تھرتھراہٹ کو سنتی ہے۔ اسی طرح دوسرے حواس اور ان کے آلات کو سمجھئے۔ حواس کی یہ پانچوں قوتیں دماغ سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن آج تک حواس یا آلات کے ذریعے انھیں محسوس نہ کیا جا سکا۔ لیکن ہم انھیں ماننے پر مجبور ہیں کیونکہ ہم دن رات ان کے افعال کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ "حواس علم حاصل ہونے کا واحد ذریعہ ہیں" تو خود حواس کا وجود ثابت نہ ہو سکے گا۔ چہ جائیکہ ان کا ذریعۂ علم یا واحد ذریعۂ علم ہونا۔ اس طرح یہ ایک ایسی دلیل ہے کہ جونہی اسے تسلیم کر لیجئے، یہ آپ ہی اپنی تردید کر دیتی ہے۔ کتنی عجیب و غریب ہے الحاد کی یہ دلیل!

ہم سب مانتے ہیں کہ انسان صاحبِ عقل ہے اور وہ سوچنے کی قوت رکھتا ہے۔ لیکن آج تک کسی نے حواس یا آلات کے ذریعے اس عظیم قوت کو محسوس نہیں کیا۔ حالانکہ ایک لمحہ کے لیے ہم اس کے وجود میں شک نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سوچنے کے فعل سے سوچنے والی قوت کا ادراک کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم قوتِ حافظہ، قوتِ متخیلہ، قوتِ واہمہ اور دماغ کی دوسری قوتوں کو مانتے ہیں کیونکہ ان کے افعال سے ان کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ، حواس علم حاصل ہونے کا واحد ذریعہ ہیں، تو ہمیں عقل سمیت دماغ کی تمام قوتوں سے ہاتھ دھو لینا ہوگا۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ

سوچنا، یاد رکھنا اور خیالات و اوہام کی وادیوں میں بھٹکنا یہ افعال سر سے سے کوئی وجود نہیں رکھتے، کیونکہ یہ افعال بھی حواس سے محسوس نہیں ہوتے۔

آج کا انسان ایٹم بم اور ایٹمی دھماکوں پر تجربہ کر چکا ہے اور ایٹمی طاقت سے چلنے والی بھٹیوں اور جہازوں کو اپنی آنکھ سے کام کرتے دیکھ رہا ہے۔ اس لیے اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ ایٹمی طاقت، ایٹم کے اجزاء — الیکٹرون، پروٹون وغیرہ کا انکار کر سکے، لیکن ان میں سے کوئی شئے ہے جسے حواس کے ذریعے محسوس کر لیا گیا ہو یا محسوس کیا جا سکتا ہو، تو کیا ایٹم اور ایٹم کے اجزاء الیکٹرون، پروٹون، نیوٹرون، سب کا انکار کر دیا جائے۔

ہم بہت سی چیزوں کو ان کے آثار کی بناء پر مانتے ہیں اور پورے وثوق کے ساتھ مانتے ہیں۔ دورِ قدیم کا انسان دھواں اٹھتے دیکھتا تھا تو آگ کو دیکھے بغیر اسے آگ کے ہونے کا یقین ہو جاتا تھا۔ آج بھی اس صورتِ حال میں تبدیلی نہیں آئی ہے۔ عرب کے بدو صحرا میں مینگنیوں کو دیکھ کر یقین کر لیتے تھے کہ ادھر سے کوئی اونٹ ضرور گزرا ہے اسی سے ان کا ذہن خدا کی طرف منتقل ہو جاتا تھا جس کے آثار پوری کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم سگنل کو ڈاؤن دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ ٹرین آنے والی ہے، حالانکہ نہ ٹرین سامنے ہوتی ہے اور نہ ہم اس کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ایک بستی کو دیکھ کر فوراً ہمارا ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اسے کسی نے بسایا ہے۔ عمارتوں کے کھنڈرات دیکھ کر ہم یقین کر لیتے ہیں کہ یہاں پہلے کچھ انسان بستے تھے۔ ہم سے سینکڑوں، ہزاروں برس پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان کے وجود کو ہم ان کے آثار ہی کی بناء پر تسلیم کرتے ہیں۔ ہم حواس کے ذریعے انھیں محسوس نہیں کر سکتے نہ ہمارے آلات ان کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے موجود ہونے کی دلیل

بستیاں، عمارات، قبریں، کھنڈرات، کتابیں اور طبقات الارض کے آثار ہیں۔ یہ سب آثار ہی ہیں۔ اگر آپ اس پر اصرار کریں کہ حواس یا آلات کے ذریعے جب تک کوئی شے محسوس نہ ہو، اس کے وجود کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا تو سو ڈیڑھ سو برس کو چھوڑ کر پورے دورِ انسانیت، بے شمار انسانوں کے وجود اور ان کے سارے کارناموں کا انکار کرنا ہوگا۔ اگر حواس سے محسوس نہ ہونے کی بناء پر آپ خدا کا انکار کرتے ہیں تو آپ کو ساتھ ہی گزشتہ دور کے تمام انسانوں کا انکار کرنا ہوگا اور آئندہ دور کی نسلوں کے لیے خود آپ کا اور موجودہ دور کے تمام انسانوں کا وجود مشتبہ ہو جائیگا۔ کیوں کہ حواس یا آلات سے اسے جاننے کی کوئی شکل نہیں تو کیا ہم اس انکار واشتباہ کو اختیار کرنے کے لیے تیار رہیں؟ اور کیا یہ علم اور دانشمندی کی بات ہو گی؟

ہم بہت سی چیزوں کو دوسرے انسانوں پر اعتماد کر کے تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ اعتماد نہ حواس کا احساس ہے، نہ آلات کا ریکارڈ، یہ عقلی استدلال ہی کی ایک قسم ہے۔ ہم ایک شخص کو باخبر اور ذمہ دار خیال کرتے ہیں۔ اس لیے جب وہ ہمیں کسی شئے کے متعلق خبر دیتا ہے تو ہم اسے سچا جان کر اس کی بات کو صحیح باور کر لیتے ہیں۔ اس اعتماد کے بغیر انسانی زندگی کی گاڑی دو قدم بھی نہیں چل سکتی۔ یہ کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ ایک ایک شئے اور زندگی کے ہر ہر شعبے کا تفصیلی علم خود حاصل کر لے۔ یہ قطعاً ناممکن ہے۔ ایک شخص صرف چند چیزوں کو جان سکتا ہے اور بس ایک یا دو شعبوں کا ماہر ہو سکتا ہے۔ بقیہ چیزوں اور شعبوں کے سلسلے میں دوسروں پر اعتماد ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر نہ وہ علمی میدان میں آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ عملی زندگی میں کوئی قدم اٹھا سکتا ہے۔

آپ کو دہلی سے بریلی جانا ہے۔ یہ آپ کا پہلا سفر ہے۔ آپ سنتے

بریلی کو کبھی نہیں دیکھا، نہ ادھر سے آپ گزرے۔ آپ نے بریلی کو کیوں مان لیا اور بریلی جانے کا ارادہ کیوں کر لیا؟ آپ نے جغرافیہ پر اعتماد کیا، آپ نے ان لوگوں پر اعتماد کیا جو بریلی ہو آئے تھے۔ یہ صرف آپ ہی کی روش نہیں ہے۔ دنیا کے کسی انسان نے بھی سب ملکوں اور سب شہروں کو نہیں دیکھا، لیکن سب لوگ سب ملکوں اور سب بستیوں کو تسلیم کرتے ہیں اور یہ تسلیم کرنا ذاتی علم واحساس کی بنیاد پر نہیں، عموماً اعتماد ہی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

بریلی جانے کے لیے آپ دہلی اسٹیشن پر پہنچے۔ آپ ٹرین کو کس طرح معلوم کریں گے۔ آپ ریلوے کے ذمہ داروں سے دریافت کریں گے اور وہ جس ٹرین کی نشاندہی کریں گے، آپ اسے بے تامل تسلیم کر لیں گے۔ یا ریلوے کے ذمہ داروں نے ٹرینوں پر جو تختیاں لگا دی ہیں ان پر اعتماد کریں گے، لیکن اگر آپ اعتماد کرنے کو تیار نہ ہوں اور ذاتی علم واحساس کے بعد ہی کوئی قدم اٹھانے کے قائل ہوں تو آپ کبھی سفر نہیں کر سکتے یہ بات آپ کو حواس یا آلات کے ذریعہ محسوس ہونے سے رہی کہ یہ ٹرین واقعتہً بریلی جائے گی۔ اس کا احساس آپ کو صرف اس وقت ہو گا جب ٹرین میں بیٹھ کر بریلی پہنچ جائیں گے۔ لیکن اس وقت کے احساس کا کوئی حاصل نہیں، آپ کو اس کا احساس دہلی میں ہونا چاہیے۔

یہ صرف ایک واقعہ نہیں ہے، آپ کی زندگی ایسے بے شمار واقعات سے پُر ہے۔ ذاتی علم کی بنیاد پر آپ بہت کم کوئی اقدام کرتے ہیں۔ زندگی کے بیشتر معاملات میں آپ دوسرے انسانوں پر اعتماد کرتے ہیں اور اس کے لیے آپ بالکل مجبور ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات یہ اعتماد غلط ثابت ہوتا ہے، لیکن غلطی کا امکان تو ہر ذریعۂ علم میں ہے۔ حواس میں بھی، آلات میں بھی، عقلی استدلال میں بھی۔ غلطی کے اندیشہ کے باعث آپ

کسی ذریعۂ علم کو ترک نہیں کر سکتے۔

حواس کے ذریعے جو علم آپ کو حاصل ہوتا ہے، وہ فی الواقع حواس کے ذریعہ نہیں، عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ ایک چیز کو آپ بار بار دیکھیں گے یا اس کا بار بار تجربہ کریں، لیکن اپنے مشاہدات و تجربات کو مرتب کر کے ان سے کوئی نتیجہ نہ نکالیں تو ان مشاہدات و تجربات کی کوئی عملی قیمت نہیں اور نہ انھیں علم کہنا صحیح ہے۔ مشاہدات و تجربات کو مرتب کر کے جب آپ نتائج نکالیں گے تو یہ نتائج علم کی حیثیت اختیار کر لیں گے اور عملی زندگی میں بھی ان کی قیمت ہو گی۔

مثال کے طور پر آگ کو لیجئے۔ آگ کے بارے میں آپ کا علم یہ ہے کہ گرمی پہنچانا اس کی مستقل خاصیت ہے۔ یہ علم آپ کو کیوں کر ہوا؟ آپ فرمائیں گے، حواس سے، کیوں کہ آگ کی گرمی کو ہم نے خود محسوس کیا ہے، لیکن ذرا ٹھہر کر غور کیجئے۔ آپ نے کیا محسوس کیا؟ آگ کی گرمی کو یا اس بات کو کہ گرمی پہنچانا آگ کی مستقل خاصیت ہے؟ ظاہر ہے کہ آپ نے پہلی بات کو محسوس کیا ہے نہ کہ دوسری بات کو۔ آپ فرمائیں گے، ہم نے جتنی بار آگ کو روشن کیا ہمیشہ اس نے گرمی پہنچائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ گرمی پہنچانا آگ کی مستقل خاصیت ہے، آپ نے ٹھیک فرمایا کہ گرمی پہنچانا آگ کی مستقل خاصیت ہے، مگر جیسا کہ آپ نے فرمایا، یہ بات آپ کو معلوم ہوئی ہے محسوس نہیں ہوئی ہے۔ آپ نے جب آگ کو بار بار گرمی پہنچاتے دیکھا تو آپ کی عقل نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ آگ کی مستقل خاصیت ہے۔ یہ آپ کا عقلی فیصلہ ہوا، نہ کہ احساس۔ آپ فرمائیں گے کہ آگ کے بار بار گرمی پہنچانے کا مطلب ہی یہی ہے کہ یہ اس کی مستقل خاصیت ہے، لیکن آپ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ مستقل خاصیت کا مطلب تو یہ ہے کہ گرمی پہنچانا آگ کی دائمی و ابدی صفت ہے۔ جب سے آگ موجود ہے اور جب

تک موجود رہے گی اس کی یہی خاصیت رہی ہے اور یہی خاصیت رہے گی۔ لیکن اس بات کا تجربہ آپ کو کیا کسی کو بھی نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ آپ کو تجربہ چند بار کا ہے اور چند بار ہی کا ہو سکتا ہے اور اس سے آپ یہ دعوے نہیں کر سکتے کہ آپ نے آگ کی مستقل خاصیت کا تجربہ یا مشاہدہ کر لیا ہے وہاں بار بار گرمی پہنچانے کے فعل سے آپ کی عقل نے یہ قیاس کیا کہ آگ ہمیشہ گرمی ہی پہنچاتی ہوگی۔ بات یہی ہے مگر یہ احساس نہیں، عقلی نتیجہ اور قیاس ہے۔ یہ ایک مثال ہے، اسی پر آپ حواس سے حاصل شدہ باقی علم کو قیاس کر سکتے ہیں۔ انسان کی پوری زندگی کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ اسے مختلف اشیاء کے خواص معلوم ہوں تاکہ وہ انہی خواص کے مطابق ان سے تعلق رکھے، لیکن یہ خواص حواس سے نہیں عقل سے معلوم ہوتے ہیں، جس طرح کہ آگ کی خاصیت عقل سے معلوم ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے علم اور ہمارے عمل کی گاڑی حواس کے نہیں، عقل کے سہارے چل رہی ہے۔

آلات کے ذریعے جو کچھ ہمیں معلوم ہوتا ہے، اس کی قدر و قیمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ سائنس اپنے تمام شعبوں سمیت آلات سے فراہم شدہ علم ہی کا دوسرا نام ہے ——— یہ آلات کیا ہیں؟ یہ انسانی عقل کا کرشمہ ہیں، ان آلات کی بنیاد تین چیزوں پر ہوتی ہے۔ تجربات و مشاہدات سے حاصل شدہ نتائج، اعلیٰ ریاضی، سائنسی نظریات، اور یہ تمام امور حواس کے نہیں، عقل کی پیداوار ہیں۔ پھر ان آلات سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی اکثر و بیشتر حواس سے نہیں، عقل ہی کی معرفت حاصل ہوتا ہے، دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آلات کے ذریعہ حاصل شدہ علم فی الواقع عقل ہی کا ثمرہ ہے اور جو لوگ آلات کی فراہم کردہ معلومات پر اعتماد کرتے ہیں،

نہ گویا عقل کو ذریعۂ علم تسلیم کرتے ہیں۔

اور سب سے اہم بات یہ کہ سائنس سمیت تمام انسانی علوم حواس کی نہیں، عقل کی پیداوار ہیں۔ نوامیس، اصول، کلیات، فارمولے اور نظریات یہ سب کے سب خالص عقلی امور ہیں اور سائنس سمیت تمام انسانی علوم انہی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگر آپ حواس کو واحد ذریعۂ علم مانیں گے تو آپ کو تمام علوم کا انکار کرنا ہوگا، حتیٰ کہ سائنس کا بھی، کتنا عمدہ ہے علم کا یہ واحد ذریعہ جسے تسلیم کرتے ہی علم باقی نہیں رہتا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حواس کی فراہم کردہ معلومات صحیح اور قطعی ہوتی ہیں اور عقل کے نتائج فکر ظنی اور ان میں غلطی کا امکان بہت زیادہ رہتا ہے لیکن یہ خیال قطعاً بے بنیاد ہے۔ حواسِ خمسہ اور عقل دونوں دماغ کی قوتیں ہیں اور احساس کرنا اور سوچنا دونوں دماغ ہی کے کام ہیں، پھر آپ کس دلیل سے ان میں تفریق کرتے اور ایک کو قطعی اور دوسرے کو ظنی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ حواس کی فراہم کردہ معلومات عقل ہی کی بدولت علم کا درجہ حاصل کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ہی قسم کی معلومات ظنی ہوتی ہیں۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حواسِ خمسہ سے جو کچھ محسوس ہوتا ہے، وہ دراصل حقیقت نہیں، بلکہ ہمارے دماغ کا تاثر ہوتا ہے۔ اور غور و فکر کے بعد جو کچھ معلوم ہوتا ہے، وہ بھی دماغ کا تاثر ہی ہے۔ رہی غلطیاں تو وہ حواس اور عقل دونوں سے ہوتی ہیں فرق یہ ہے کہ حواس کی غلطیوں کا علم بھی ہمیں عقل سے ہوتا ہے یا آلات سے جو عقل ہی کا ثمرہ و نتیجہ ہیں۔

یہ ہے دلیل کے پہلے جز — حواسِ علم حاصل ہونے کا واحد ذریعہ ہیں۔ — کا علمی تجزیہ! آپ نے دیکھ لیا کہ یہ بات صدفی صد غلط ہے، اور اس کے غلط ثابت ہوتے ہی انکارِ خدا کی واحد دلیل — خدا محسوس

نہیں ہوتا۔ اس لیے نہیں ہے۔ کا طلسم چکنا چور ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دلیل کے بقیہ اجزا پر گفتگو کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاہم ان کے بارے میں مختصر اظہار خیال فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

دلیل کے دوسرے اجزاء

دلیل کا دوسرا جزء یہ تھا کہ "کسی شئے کے معلوم نہ ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ موجود نہیں ہے"۔ اس پر ہم شروع ہی میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں اور یہ ثابت کر چکے ہیں کہ "نہ جاننا" "نہ ہونے" کے ہم معنٰے نہیں ہے۔ ہم وہاں یہ بات بھی بتا چکے ہیں، کہ "نہ جاننے" کی حالت میں انکار صحیح نہیں ہے، نہ انکار کی بنیاد پر زندگی کی تعمیر صحیح، "خدا ہمیں محسوس نہیں ہوتا" یہ واضح طور پر "عدمِ علم" کا موقف ہے جس کے بعد "اس لیے خدا نہیں ہے" کہنا صحیح نہیں ہے۔ "عدمِ علم" عدم وجود کی دلیل نہیں ہے۔

دلیل کا تیسرا جزء تھا "خدا ہمیں محسوس نہیں ہوتا" مگر اس بات کا دعویٰ کرنے والے نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص اپنی چھوٹی سی کوٹھڑی میں بند ہو کر اس بات کا اعلان کر دے کہ وہ روئے زمین پر اس کے سوا کوئی انسان نہیں ہے، نہ کوئی حیوان ہے، نہ نباتاتی زندگی موجود ہے، اور آگے بڑھ کر وہ یہ بھی کہہ دے کہ کائنات میں کہیں بھی زندگی نہیں ہے۔ ایسا ہی حال اس شخص کا ہے جو زمین، فضا، خلا اور کائنات کی چھان بین کیے بغیر کائنات کے ایک سرے پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کر دے کہ خدا نہیں ہے، کیونکہ اس نے خدا کو نہیں دیکھا وہ کائنات کے حقیر ترین جزء، زمین کے بعض اجزاء کا تجربہ کرے اور دعویٰ کرنے لگے کہ اس نے اپنے تجربہ و مشاہدہ سے خدا کو نہیں پایا، حالانکہ کائنات کے اجزاء میں خدا کیوں کر مل سکتا ہے، خدا تو خالقِ کائنات اور ماورائے کائنات

ہے۔ اگر آپ انسان کی بنائی ہوئی مشین کے اجزاء میں سے انسان کے وجود کو نہیں نکال سکتے تو زمین، فضا اور خلا میں، جو خدا کی تخلیق ہیں اپنے حواس اور اپنے آلات کے ذریعہ خدا کے وجود کو پا لینے کے کیوں خواہشمند ہیں؟ ہاں مشین کو دیکھ کر آپ کی عقل گواہی دے گی کہ کسی صاحبِ عقل ہستی نے اسے بنایا ہے۔ اسی طرح کائنات کی عظیم مشینری پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ کسی حکیم و دانا ہستی نے اسے پیدا کیا ہے۔ اسی ہستی کا نام اللہ ہے۔

دوسرا باب

خُدا ہے

ایک خوبصورت اور مہکتے ہوئے چمن کو دیکھ کر آپ کا ذہن اس باغبان کی طرف منتقل ہوگا جس کی محنت سے زمین مہکتے ہوئے پھولوں میں منتقل ہوئی اور جس کی دیکھ ریکھ اور تراش خراش نے روشوں، کیاریوں اور تختہ ہائے گُل کو جنم دیا۔ ایک خوبصورت اور متناسب عمارت کو دیکھ کر آپ بے ساختہ اس کے معمار کی تعریف کریں گے۔ ایک مشینری کو دیکھتے ہی آپ کو اس کے میکر کا خیال آئے گا اور مشین جس قدر پُرپیچ اور جتنی زیادہ افادیت کی حامل ہوگی اسی قدر آپ صانع کی حکمت و مہارتِ فن کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے

مہمل مطالبہ

لیکن، ایک خوبصورت و متناسب چمن کو دیکھ کر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ یہ چمن آپ سے آپ اُگ آیا ہے، اس کی خوبصورتی و تناسب میں باغباں کا کوئی حصہ نہیں ہے، اور جب آپ بتائیں کہ ایسا آراستہ و پیراستہ چمن کسی باغباں کی محنت و کاوش کے بغیر نہیں اُگ سکتا تو وہ اسے نہ مانے۔ وہ کہے کہ اگر ایسا ہے تو چمن کے پودوں، پتّیوں اور پھولوں سے باغباں کو نکال کر دکھاؤ۔ تو آپ اس مطالبہ کو کیا کہیں گے؟

تاج محل کی سیر کرنے کے بعد ایک شخص اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ عظیم پیکر حسن وجمال آپ سے آپ وجود میں آگیا ہے۔ پہاڑوں سے سنگِ مرمر کی سِلیں اور زمین سے مختلف دھاتیں نکل کر خود بخود یکجا ہو گئیں اور ایک حد درجہ حسین وجمیل اور متناسب عمارت آپ سے آپ ڈھل کر کھڑی ہو گئی اور جب اس سے کہا جائے کہ ایسا ہونا عقلاً ناممکن اور واقعہ کی رُو سے غلط ہے۔ اسے بتایا جائے کہ یہ بے مثل عمارت مغل فرماں روا شاہجہان کی بنوائی ہوئی ہے جسے اس دور کے بہترین انجینئروں اور ماہر ترین معماروں اور سنگ تراشوں نے سالہا سال کی محنت وکاوش کے بعد بنا کر تیار کیا ہے تو وہ اسے تسلیم کرنے کے بجائے کہنے والے کا مذاق اڑائے وہ مطالبہ کرے کہ تاج محل کے در ودیوار سے انجینئروں، معماروں اور خود شاہجہاں کو برآمد کرو۔ وہ اصرار کرے کہ جب تک یہ مطالبہ پُورا نہ ہو گا، وہ اس بات کو ہرگز باور نہ کرے گا کہ دنیا کا یہ ساتواں عجوبہ آپ سے آپ نہیں بن گیا ہے، تو اس مطالبہ کو آپ کیا وزن دیں گے اور ایسے شخص کی ذہنی وفکری "بلندی" کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے۔

کسی عظیم وپیچیدہ مشینری کو دیکھ کر کوئی شخص یہ "فلسفہ" بگھارنے لگے کہ لوہے کی کان میں ایک دھماکہ ہونے کے نتیجے میں مشینری خود بخود ڈھل کر تیار ہو گئی اور دوسرے دھماکے میں سینکڑوں ہزاروں میل دُور پہنچ کر آپ سے آپ نصب ہو کر آپ سے آپ کام کرنے لگی۔ جب آپ اس کی اس خوش فہمی کی تردید کریں — اور بتائیں کہ یہ مشینری کچھ ذہین اور ماہر انسانوں کی ذہنی وعملی کاوش کا نتیجہ اور کچھ مشینوں کی پیداوار ہے اور کچھ دوسرے انسانوں اور مشینوں نے لے جا کر نصب کیا ہے تو وہ آپ کی بات ماننے کو تیار نہ ہو، اس کے برعکس وہ آپ کو احمق اور دقیانوسی بتلائے اور ضد کرے کہ مشین کے پرزوں میں سے ان انسانوں

اور مشینوں کو برآمد کرو جو اس کے بنانے اور نصب کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ وہ کہے کہ جب تک ایسا نہ ہوگا وہ ہرگز نہ مانے گا۔ کہ اس مشینری کو کسی انسان نے بنایا ہے۔ اور جب اس کا یہ مطالبہ پورا نہ ہو تو وہ اعلان کر دے کہ مشینری آپ سے آپ بن گئی ہے، آپ سے آپ نصب ہو گئی اور آپ سے آپ چل رہی ہے، تو کیا اس ہرزہ سرائی کو آپ فلسفہ اور سائنس کے شاندار الفاظ سے یاد فرمائیں گے یا اس شخص کے ذہنی اور فکری افلاس پر بے ساختہ ماتم کریں گے؟

ایسا ہی بلکہ اس سے زیادہ مہمل مطالبہ اس شخص کا ہے جو کہتا ہے کہ میں خدا کو اس وقت مانوں گا جب وہ مجھے حواس یا آلات کے ذریعے نظر آئے۔ حالانکہ وہ اپنے حواس یا آلات کے ذریعے کائنات کے اندر ہی کی چیزیں دیکھ سکتا ہے اور وہ بھی بس ایک حد تک، کائنات کے پرے جھانک کر نہیں دیکھ سکتا۔ گویا دوسرے الفاظ میں وہ شخص کہتا ہے کہ کائنات کے خالق اسے کائنات کے اندر نظر آنا چاہیے ورنہ وہ اسے نہ مانے گا۔ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی مہمل مطالبہ ہو سکتا ہے؟

صانع مصنوعات کے اندر نہیں پایا جاتا۔

مصنوعات کو دیکھ کر انسانی ذہن لازماً صانع کی طرف منتقل ہوتا ہے یہ انسانی فطرت اور عقلِ عام (Commonsense) کی بات ہے جس میں فلسفی، سائنسداں اور عام انسان، سب یکساں شریک ہیں۔ لیکن کسی خوردبین اور کسی آلے سے مصنوعات کے اندر ان کے صانع کو دیکھا نہیں جا سکتا، ایسی ہر کوشش لایعنی کوشش ہے جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا اور ایسا ہر مطالبہ لغو اور مہمل ہے جسے بے تامل ردّ کر دینا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنوعات اور صانع دو الگ الگ وجود رکھتے ہیں۔ اس لیے

یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ آپ مصنوعات کے وجود میں صانع کے وجود کو پالیں ـــــ ایسا صرف اُس وقت ہو سکتا تھا جب صانع کا وجود مصنوعات کے وجود کا جزو ہوتا ـــــ آپ کسی بنی ہوئی چیز کے صانع کو صرف عقل سے جان سکتے ہیں، حواس یا آلات سے اس کے جاننے کی کوئی شکل نہیں ہے۔

اگر خدا کو آپ عقلی دلائل کی بنیاد پر ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں حالانکہ دنیا کی اکثر و بیشتر چیزوں کو عقل ہی کے ذریعہ جانا اور مانا جاتا ہے[1] اور آپ خالقِ کائنات کو اسی وقت ماننا چاہتے ہیں جب وہ حواس یا آلات کے ذریعے آپ کو محسوس ہو جائے، بالفاظِ دیگر کائنات کے خالق کو آپ کائنات کے اندر دیکھنے پر مصر ہیں تو آپ خدا کو کبھی نہ پا سکیں گے، آپ کے لیے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ آپ خدا کا انکار کر دیں مگر اس انکار کے ساتھ ہی آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ دنیا کی تمام مصنوعات صانع کے بغیر آپ سے آپ وجود میں آگئی ہیں کیونکہ ان مصنوعات کے اندر بھی ان کے صانع کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ صانعِ کائنات کا انکار ہر صانع کا انکار ہے۔

کسی شئے کے بنانے والے کو حواس یا آلات سے دیکھنے کی دو لازمی شرطیں ہیں :

۱ : صانع کو صنعت کے اندر نہیں، اس کے باہر تلاش کریں۔

۲ : صنعت کی ابتدا سے لے کر انتہا تک سارے مراحل نظر کے سامنے ہوں۔

جس فاؤنٹن پن سے میں لکھ رہا ہوں، اس کے بنانے والے کو اگر میں دیکھنا چاہوں تو اسے فاؤنٹن پن کے اندر نہیں، باہر تلاش کرنا ہوگا۔ نیز فاؤنٹن پن بننے کے تمام مراحل کو دیکھنے کے بعد ہی یہ طے ہو سکے گا کہ اس

---

[1] اس پر مفصل بحث کے لیے "خدا کا انکار کیوں؟" پڑھیے۔

کے بنانے میں کتنے اور کون کون سے ہاتھ کارفرما رہے ہیں۔ اس کے ساتھ مجھے یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ فاؤنٹن پن بنانے کا کارخانہ کس نے قائم کیا اور اس میں کس کا دماغ اور کس کا روپیہ کام کر رہا ہے۔ ان سب مراحل کو اپنی آنکھ سے دیکھ لینے کے بعد ہی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ فاؤنٹن پن کے بنانے والے یا بنانے والوں کو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

لیکن اگر میں فاؤنٹن پن کے بنانے والے کو فاؤنٹن پن کے اندر دیکھنا چاہتا ہوں یا جب فاؤنٹن پن بن کر میرے ہاتھ میں آ چکا ہے۔ میں اس کے میکر کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کا خواہش مند ہوں تو میری یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو گی۔ فاؤنٹن پن کا میکر فاؤنٹن پن کے اندر سے کبھی برآمد نہ ہو گا۔ اسی طرح فاؤنٹن پن بن جانے کے بعد اس کے بنانے والے کو ہم اپنی آنکھ سے کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ یہ اسی وقت ممکن ہو گا جب فاؤنٹن پن بننے کا پورا عمل ہماری نگاہوں کے سامنے ہو۔ اس کے بغیر ہم جسے فاؤنٹن پن کا میکر تسلیم کر لیں گے۔ مشاہدہ سے نہیں، قیاس سے تسلیم کریں گے۔ مثلاً فاؤنٹن پن پر لکھی عبارت سے آپ کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ فاؤنٹن پن کس ملک میں بنا اور کس کمپنی کا بنایا ہوا ہے ــــــ اگرچہ بعض اوقات بنانے والا کوئی ہوتا ہے اور نام کسی اور کا پڑا ہوتا ہے ــــــ یا اگر فاؤنٹن پن پر کچھ لکھا ہوا نہیں ہے یا وہ مٹ گیا ہے تو آپ اپنی عقل سے سمجھ لیں گے کہ فاؤنٹن پن بہرحال کسی نہ کسی انسان ہی نے بنایا ہو گا ــــ اگرچہ آپ یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ ہو سکتا ہے، فاؤنٹن پن خود بخود بن گیا ہو ــــ لیکن ان دونوں صورتوں میں آپ نے بنانے والے کا مشاہدہ نہیں کیا، اسے عقل سے محسوس کیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو آپ ــــ اس کے دعویٰ کی بنا پر فاؤنٹن پن کا میکر مان لیتے ہیں تو یہ بھی مشاہدہ نہیں، عقلی فیصلہ ہی ہے

غرض اس صورت کے علاوہ جب کہ آپ فاؤنٹن پن بنانے کی پوری اسکیم اور پورے عمل کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہوں، باقی تمام صورتوں میں جسے بھی آپ فاؤنٹن پن کا میکر مانیں گے وہ آپ کا مشاہدہ نہیں قیاس ہی ہوگا۔ اور یہی حال تمام مصنوعات کا ہے۔

صانع کو ہم عقل سے جانتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ ہم صانع کو مصنوعات کے اندر نہیں، ہمیشہ خارج میں پاتے ہیں اور آنکھوں سے دیکھ کر نہیں، عموماً عقل ہی سے جانتے اور مانتے ہیں۔ اگر صانع کو ماننے کے لیے حواس یا آلات کے ذریعے جاننا لازمی شرط ہو تو چند مصنوعات کو چھوڑ کر جن کے بننے کے پورے عمل کو ہم اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہوں، باقی تمام مصنوعات کے بارے میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ ان کا کوئی صانع نہیں ہے وہ آپ سے آپ بن گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ انتہائی احمقانہ بات ہوگی۔ مگر اسے کیا کیجئے کہ خالق کائنات کے بارے میں اچھے اچھے مدعیانِ علم وخرد اس حماقت کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ایک طرف ان کا مطالبہ یہ ہے کہ خالقِ کائنات انھیں کائنات کے اندر نظر آنا چاہیئے اور دوسری طرف ان کا اصرار یہ ہے کہ خدا انھیں حواس یا آلات کے ذریعے محسوس ہونا چاہیے اور طرفہ تماشا یہ کہ اس دوہری حماقت کو روشن خیالی اور عقلیت پرستی خیال کرتے ہیں اور عقلی دلائل کی بنیاد پر خدا کے ماننے کو حماقت و دقیانوسیت!

لیکن اگر آپ کو اس پر اصرار ہے کہ اس مسئلہ کو حواس یا آلات کے ذریعے ہی طے ہونا چاہیے تو بسم اللہ مگر اس کی لازمی شرطیں آپ کو پوری کرنی ہوں گی۔ آپ خالقِ کائنات کو کائنات کے اندر نہیں، کائنات کے باہر تلاش کریں گے پھر آپ کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ کائنات کی ابتدا

سے ہے کہ اس کے اختتام تک پوری کائنات کے عمل کو اپنی آنکھوں یا اپنے آلات سے دیکھیں، لیکن اگر ان لازمی شرطوں کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ ان شرطوں کا پورا ہونا قطعاً ناممکن ہے ـــــ تو حواس یا آلات سے اس مسئلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کائنات کے لیے کسی خالق و منتظم کو تسلیم کریں یا آپ کا خیال یہ ہو کہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آگئی ہے، آپ جو فیصلہ کریں گے حواس یا آلات کی مدد سے نہیں، عقل ہی کی روشنی میں ہوگا اور اسی سے آپ کو چڑ ہے!

ہم جس وسیع و عریض کائنات میں رہتے ہیں۔ اس کی ابتدا و انتہا کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ کائنات ہمارے سامنے نہیں بنی ہے۔ بلکہ بنی بنائی ہمارے سامنے موجود ہے۔ کائنات ہم سے قبل نہ جانے کب سے موجود ہے اور ہمارے بعد نہ جانے کب تک رہے گی۔ ہم درمیان کے چند لمحات کے لیے اس کائنات میں آگئے ہیں اور اسے درمیان ہی سے دیکھ رہے ہیں ؎

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

ہم سائنس کے میدان میں خواہ کتنی ہی ترقی کر جائیں، ہم اپنے حواس یا آلات سے نہ کائنات کی ابتدا کو دیکھ سکتے ہیں، نہ انتہا کو، اور نہ اس کے باہر جھانک سکتے ہیں۔ ابتدار و انتہا ہی نہیں، اس کا بقیہ عمل بھی ہمارے سامنے نہیں ہے۔ کائنات کی عمر اور اس کی وسعت و عظمت کے مقابلے میں ہماری عمر اور ہمارے مشاہدہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جس کائنات کا تصور کرتے ہوئے انسانی عقل تھک تھک جاتی ہو، جس کی ابتدا و انتہا ہی نہیں۔ کسی بھی وقت اس کے پورے نظام کو ہم اپنے حواس یا آلات سے نہ دیکھ سکتے ہوں، جس کی ـــــ حدود سے باہر نکلنا اور

اور جس کی حدود سے باہر جھانکنا ہمارے لیے ممکن نہ ہو، کتنی عظیم حماقت ہوگی اگر ایک ایسی کائنات کی تخلیق، اس کے پورے عمل اور اس کے نظم وانصرام کے سلسلے میں ہم حواس وآلات کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنے بیٹھ جائیں اور اس پر اصرار بھی کریں! یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس معاملے میں ہمارے حواس یا ہمارے آلات ذرا بھی کام نہیں آسکتے۔ اس سلسلے میں تو عقل یا وجدان ہی سے کچھ رہنمائی مل سکتی ہے۔!

کائنات کی سب توجیہات عقلی ہیں

کائنات کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر خواہ یہ ہو کہ وہ محض ایک خیالی وجود ہے یا یہ کہ وہ ازلی وابدی ہے۔ اسی طرح خواہ آپ یہ تصور رکھتے ہوں کہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آکر آپ سے آپ چل رہی ہے یا یہ کہ ایک قادرِ مطلق ہستی نے اسے پیدا کیا اور وہی اپنی قدرت وحکمت سے اس کا نظام چلا رہا ہے۔ غلط اور صحیح سے قطع نظر، ان میں سے ہر ایک نقطۂ نظر خالص عقلی نقطۂ نظر ہے۔ حواس یا آلات سے نہ ان کا ادراک ہوا ہے، نہ ہو سکتا ہے، آپ نے کائنات کو ازل سے ابد تک رواں دواں نہیں دیکھا۔ کہ آپ اپنے مشاہدہ کی بنیاد پر اس کے ازلی وابدی ہونے کا فیصلہ کرسکیں آپ کائنات کی تخلیق کے وقت موجود نہیں تھے اور نہ کائنات کا پورا نظام آپ کے سامنے ہے کہ آپ حواس یا آلات کی بنیاد پر یہ فیصلہ کرسکیں کہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آئی اور آپ سے آپ قائم ہے یا وہ کسی قادر وحکیم ہستی کی تخلیق ہے۔ اور اس کے نظم وانصرام سے قائم ہے۔ آپ کو حواس یا آلات سے یہ بھی محسوس نہیں ہوا ہے کہ کائنات کا سرے سے کوئی وجود نہیں ہے اور وہ صرف انسانی واہمہ کی پیداوار ہے۔ حواس یا آلات کے ذریعے آپ کا مشاہدہ صرف اس قدر ہے کہ کائنات موجود ہے اور ہر دم

رواں دواں ہے اور بس ـــ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ آپ کا عقلی فیصلہ ہے احساس و مشاہدے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

سائنس کے پاس "کیوں" کا جواب نہیں ہے

رہی یہ بات کہ کائنات کیوں کر وجود میں آئی اور وہ کیوں رواں دواں ہے؟ اس کی کوئی ابتدا اور کوئی انتہا ہے یا نہیں؟ اس کا کوئی خالق و منتظم موجود ہے یا وہ آپ سے آپ پیدا ہو کر آپ سے آپ چل رہی ہے؟ حواس یا آلات کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ہے۔
آپ اپنے حواس و آلات بہ الفاظِ دیگر سائنس کے ذریعے کائنات کے حقیر ترین اجزا کے بارے میں بھی صرف یہ جان سکتے ہیں کہ انکی صفات اور اجزائے ترکیبی کیا ہیں، لیکن یہ صفات کیوں ہیں اور ان اجزائے ترکیبی سے فلاں چیز کیوں بن جاتی ہے۔ سائنس کے پاس اس "کیوں" کا جواب کوئی نہیں ہے۔ مثلاً ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے امتزاج سے پانی وجود میں آتا ہے، لیکن ان کے امتزاج سے پانی کیوں بنتا ہے اور پانی کے اندر وہ خاصیتیں کیوں پیدا ہو جاتی ہیں جو ہائیڈروجن اور آکسیجن میں نہیں ہیں۔ اس کا سائنس کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ مثلاً ہائیڈروجن ایک جلنے والی گیس ہے اور آکسیجن میں جلنے اور جلانے دونوں کی خاصیت ہے۔ مگر پانی میں جلنے اور جلانے کے بجائے آگ کو بجھانے اور تشنگی دور کرنے کی خاصیت ہے۔ اسی طرح یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ سوڈیم اور کلورین کے امتزاج سے کھانے کا نمک کیوں بن جاتا ہے جب کہ سوڈیم ہاتھ لگتے ہی جل اٹھتا ہے اور کلورین ایک زہریلی گیس ہے۔
یہ دو مثالیں ہیں، ان سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب ہمارے حواس یا ہمارے آلات کے پاس چھوٹے چھوٹے "کیوں" کا جواب نہیں

ہے تو وہ کائنات کے سب سے بڑے "کیوں" کا جواب کیسے دے سکتے ہیں۔ کائنات کا کوئی خالق و منتظم ہے یا نہیں؟ دوسرے الفاظ میں یہ سوال اس طرح ہے کہ یہ کائنات کیوں وجود میں آئی اور کیوں رواں دواں ہے؟ آپ حواس یا آلات سے اتنے بڑے "کیوں" کا جواب پانے کی توقع رکھتے ہیں۔ حالانکہ حواس و آلات تو حقیر سے حقیر "کیوں" کا جواب دینے سے بھی قاصر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کا اقرار ہو یا اس کا انکار، یہ دونوں عقلی نظریے ہیں اور عقلی دلائل ہی سے انھیں صحیح یا غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔ حواس یا آلات سے نہ الحاد ثابت ہو سکتا ہے نہ خدا کا وجود۔

کائنات کی مختلف توجیہیں

کائنات کیا ہے؟ کیونکر وجود میں آئی اور اس کا نظم کس طرح قائم ہے؟ عام طور پر اس کی چار توجیہات کی جاتی ہیں:

۱ : وہم و خیال سے زیادہ کائنات کی کوئی حقیقت نہیں۔

۲ : کائنات کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

۳ : کائنات آپ سے آپ پیدا ہوئی اور آپ سے آپ چل رہی ہے۔

۴ : کائنات کو ایک قادرِ مطلق ہستی نے پیدا کیا ہے اور وہی اپنی قدرت و حکمت سے اس کا نظم چلا رہا ہے۔

یہ چاروں توجیہات اس لحاظ سے یکساں حیثیت رکھتی ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی حواس یا آلات کے ذریعہ ثابت نہیں کی جا سکتی۔ صرف عقلی دلائل ہی سے انھیں ثابت کیا جا سکتا ہے اور ان کے صحیح یا غلط ہونے کو بھی عقل ہی کی روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے ـــــ آئیے! ایک ایک توجیہہ کو لے کر دیکھیں کہ وہ کس حد تک معقول ہے۔ کائنات کی گتھی اس سے کس حد تک سلجھتی ہے۔ اس توجیہہ کی پشت پر عقلی دلائل کیا ہیں اور ان

میں کتنا وزن ہے؟ اسی طرح ہم کسی نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

کیا کائنات محض واہمہ کی پیداوار ہے؟

سب سے پہلے پہلی توجیہہ کو لیجئے۔ اس توجیہہ کی رُو سے کائنات صرف انسان کے وہم وخیال کی پیداوار ہے۔ وہم وخیال سے باہر نہ اسکی کوئی حقیقت ہے اور نہ اس کا کہیں وجود۔ اس نقطۂ نظر کی ترجمانی ایک فلسفی شاعر نے اس طرح کی ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد :. عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اور اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے ؎

یاں کہا ثبوت مت فریب ہستی ۔۔۔ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

لیکن یہ کائنات کی توجیہہ کم اور انسانی فکر کی بے چارگی کا اعتراف زیادہ ہے۔ جب ہم فلسفہ اور سائنس کا سطحی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اپنے علم کا بہت زیادہ زعم ہوتا ہے اور ہم جلد بازی میں بہت سی ناپختہ اور سطحی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔ الحاد پر یقین بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے ـــــ لیکن جب ہم فلسفہ اور سائنس کی گہرائیوں میں اُترتے ہیں تو علم کا زعم ہم سے رخصت ہوتا ہے اور یقین کی جگہ ہم ظن وتخمین سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا بیشتر سرمایۂ علم ظنی ہے۔ یہاں تک کہ جب ہم اسی طرح آگے بڑھتے جاتے ہیں، تو شک اور گمان کے سوا ہمارے پلے میں کچھ نہیں رہتا۔ مشرق کے سب سے بڑے فلسفی ڈاکٹر اقبالؒ نے اس حقیقت کو بہت زور اور بہت تکرار سے بیان کیا ہے۔ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں ؎

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن ۔۔۔ عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین وظن

بندۂ تخمین وظن! کرمِ کتابی نہ بن ۔۔۔ عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

ایک اور مقام پر دہ فرماتے ہیں ؎

انجامِ خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری

اب تک یہ خیال تھا کہ شک صرف فلسفہ کی پیداوار ہے سائنس جو تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہے اس سے انسان شک کے بجائے یقین و اطمینان کی دولت پاتا ہے لیکن موجودہ صدی میں سائنس کا جو ارتقاء ہوا ہے، اس نے سائنس کی دنیا کو یکسر بدل دیا ہے۔ اب فلسفہ و سائنس دونوں کا حاصل ظن و تخمین ہی ہے۔ فلسفہ اور سائنس دونوں نے انسان کو شک اور گمان کی دلدل میں پھنسا دیا ہے اور اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دلدل سے اپنے آپ کو کس طرح نکالے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے پاس ظن و تخمین کے سوا اور کچھ نہیں۔ یقینی علم صرف خدا کے پاس ہے اور وہی لوگ یقین و اطمینان کی دولت پاتے ہیں جو اللہ کے بھیجے ہوئے علم (وحی) پر اعتماد کرتے ہیں۔ سائنس کے اس جدید ارتقاء کی طرف علمِ طبیعات کے مشہور ماہر جیمز جینز نے اپنی مشہور کتاب "پُراسرار کائنات" میں اس طرح اشارہ کیا ہے:

"علمِ طبیعات کے جدید تصورات کے مطابق کائنات کی کوئی مادّی توجیہہ ممکن نہیں اور اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ کائنات کا سارا معاملہ ہی اب ایک تخیلاتی معاملہ بن گیا ہے۔"

لیکن ایک چیز تو یہ ہے کہ کائنات کے متعلق انسانی علم ظن و تخمین کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسری چیز یہ ہے کہ کائنات محض وہم و خیال ہے۔ اس کا کوئی خارجی وجود نہیں، یہ دو بالکل مختلف چیزیں ہیں اور ہمیں ان دونوں میں فرق کرنا چاہیے۔ پہلی بات یقیناً صحیح ہے۔ انسانی علم، خواہ وہ فلسفہ کی راہ سے حاصل ہوا ہو یا سائنس کے ذریعے، ظن و تخمین ہی کی حیثیت رکھتا ہے اور فلسفہ اور سائنس کا خواہ کتنا ہی ارتقاء ہو جائے انسان

ظن و تخمین کی وادی سے نکل کر یقین کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ بجز اس کے کہ وہ وحی پر اعتماد کرے۔ لیکن دوسری چیز کی پشت پر کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے۔ یہ صرف عقل کی سراسیمگی اور غور و فکر کی اکتاہٹ کا اظہار ہے یا کائنات کی گتھی کو سلجھانے سے فرار کی راہ۔

کسی نظریہ یا مفروضہ کو جانچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک علمی، دوسرا عملی۔ علمی یہ کہ عقل کی کسوٹی پر اسے پرکھا جائے اور اس کے دلائل کو عقلی میزان میں تول کر دیکھا جائے کہ ان میں کتنا وزن ہے اور عملی طریقہ یہ کہ اس مفروضہ کو صحیح مان کر اس کی بنیاد پر عملی تجربات کئے جائیں اور دیکھا جائے کہ مفروضہ، تجربات کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہے یا نہیں۔ پہلا طریقہ فلسفہ کا ہے اور دوسرا سائنس کا۔ آئیے! ان دونوں طریقوں سے اس نظریہ کو پرکھ کر دیکھیں۔

نظریہ کو جانچنے کا علمی طریقہ

جو شخص کہتا ہے کہ کائنات کا کوئی وجود نہیں، جو کچھ نظر آتا ہے، وہ انسان کا وہم و خیال ہے۔ ہم اُس سے پوچھتے ہیں کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اُس کی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ بھی وہم و خیال ہی ہے؟ یا تم کسی حقیقت اور کسی سوچی سمجھی بات کا اظہار کر رہے ہو؟ اگر وہ کہتا ہے کہ میں جس نقطۂ نظر کا اظہار کر رہا ہوں اس کی حیثیت بھی وہم و خیال کی ہے تو بات آپ سے آپ ختم ہوگئی۔ وہم و خیال کا ہرگز یہ مقام نہیں ہوتا کہ اسے قبول کیا جائے یا اسے قابلِ غور سمجھا جائے۔

پھر سوال یہ ہے کہ قبول کس نقطۂ نظر کو کیا جائے؟ آیا اس بات کو کہ یہ کائنات ایک واہمہ ہے یا اس بات کو کہ یہ خیال خود ایک وہم ہے؟ پہلی بات کو قبول کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس نقطۂ نظر کو وہم نہیں ٹھوس

حقیقت سمجھ رہے ہیں حالانکہ اس نقطہ نظر کا قائل اسے قرار دے رہا ہے لیکن اگر ہم دوسری بات کو صحیح تسلیم کرتے ہیں تو یہ بات آپ سے آپ ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ کائنات وہم وخیال نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کیونکہ اسکے وہم وخیال ہونے کو خود اس کا قائل وہم وخیال قرار دے رہا ہے۔

لیکن اگر وہ کہتا ہے کہ یہ نقطہ نظر وہم نہیں، ایک ٹھوس حقیقت اور ایک سوچی سمجھی بات ہے اور وہ دوسرے انسانوں کو بھی دعوت دیتا ہے کہ وہ کائنات کو انسان کا وہم وخیال سمجھیں تو وہ بیک وقت کئی حقیقتوں کے موجود ہونے کا اعتراف کرتا ہے۔ اپنے نقطہ نظر کا، اپنے وجود کا، اپنے ذہن وفکر کا، دوسرے انسانوں کے موجود ہونے کا اور ان کے اذہان اور ان کے نقطہ ہائے نظر کا اور اس کے بعد کائنات نہ سہی، کم از کم نوع انسانی کا وجود تو ثابت ہو ہی جاتا ہے اور یہ سوال پھر ابھر کر سامنے آجاتا ہے کہ کیا انسان آپ سے آپ بن گیا ہے یا کسی ہستی نے اسے پیدا کیا ہے؟

یہی نہیں، یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ انسان موجود ہے، اس کا ذہن موجود ہے اور وہ اپنے ذہن سے حقیقت کو پا سکتا ہے۔ انسان کے آس پاس کی دنیا، زمین، ہوا، نباتات، حیوانات، گرمی، سردی، پانی، بارش، سورج وغیرہ جن سے انسان براہ راست متعلق رہتا ہے، جنہیں وہ محسوس کرتا، جن سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے اور جنہیں وہ استعمال کرتا ہے سب ثابت ہو جاتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ پوری کائنات ثابت ہو جاتی ہے اور سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ اس کائنات کو کس نے پیدا کیا اور کون اس کا نظم چلا رہا ہے؟

نظریہ کو جانچنے کا عملی طریقہ

عملی طریقہ سے اس نظریہ کو پرکھیئے تو یہ سرتاسر غلط ثابت ہوتا ہے۔

اس نظریہ کو صحیح مان کر آپ زندگی گزارنا چاہیں گے تو قدم قدم پر ٹھوکر کھائیں گے اور ہر لمحہ آپ کو نظریہ کے غلط ہونے کا احساس ہوگا۔ اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ، اپنا اور اپنے ذہن کا بھی انکار کردیں، لیکن ایسا کرنا آپ کے لیے آسان نہیں ہے اور نہ انکار کرکے آپ اس کے اوپر قائم رہ سکتے ہیں اور نہ عملی زندگی اختیار کرسکتے ہیں۔ اور بالفرض آپ اپنا اور اپنے ذہن کا انکار کردیں تب بھی فی الواقع آپ ان کا اقرار کررہے ہوں گے۔ کیوں کہ انکار کرکے آپ اس بات کا اعتراف کریں گے کہ ایک ہستی ہے جو انکار کررہی ہے اور اس کے پاس غور و فکر کی قوّت ہے جس کے ذریعے اس نے سوچ سمجھ کر انکار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

پھر اس نظریہ کی رُو سے کسی ماں نے آپ کو جنا ہے، نہ کسی باپ نے آپ کی پرورش کی ہے، نہ کوئی بیوی آپ کے لیے موجبِ سکون و راحت ہے، نہ آپ کے کوئی اولاد ہے اور نہ ان کے احساسات و ضروریات کی کوئی حقیقت ہے نہ آپ کا کوئی دشمن ہے، نہ کوئی آپ کا دوست، تو کیا عملی زندگی میں آپ اس روّیہ کو اپنا سکتے ہیں؟ آپ کا بچّہ اگر بھوک سے تڑپ رہا ہے تو کیا آپ یہ سوچ کر بے فکر ہوجائیں گے کہ نہ بچہ موجود ہے اور نہ بھوک کوئی حقیقت رکھتی ہے اور آپ اسے تڑپ تڑپ کر مرجانے دیں گے۔ اگر آپ کا دشمن آپ پر قاتلانہ حملہ کررہا ہو تو کیا آپ اپنے بچاؤ کی فکر نہ کریں گے اور یہ سوچ کر مطمئن ہوجائیں گے، کہ دشمن، اور حملہ، یہ سب خیالی باتیں ہیں۔

انسانوں سے ہٹ کر آپ آس پاس کی دُنیا میں بھی اس نقطۂ نظر کو اختیار نہیں کرسکتے، اس نظریہ کی رُو سے پانی محض خیالی شے ہے اور پیاس لگنے کی صورت میں اسے پینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے کپڑوں میں آگ لگ جائے تو آپ اسے بجھانے کی کوشش نہ کریں گے

کیوں کہ آگ موجود ہے، نہ کپڑا پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کے مکان کو ڈھا رہا ہے یا اس پر قبضہ کئے ہوئے بیٹھا ہے تو آپ اس سے مزاحمت نہ کریں گے کیونکہ خارج میں نہ کوئی شخص موجود ہے نہ کوئی مکان، آندھی، پانی اور اولوں کے طوفان میں آپ کھلے میدان ہی میں کھڑے رہیں گے کیونکہ آندھی، پانی اور اولوں کے طوفان یہ سب خیالی باتیں ہیں۔ دریا آپ کے سامنے ہو تو آپ کشتی یا پل ڈھونڈھنے کی زحمت نہ کریں گے، نہ تیر کر اسے پار کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ یوں ہی آگے بڑھتے چلے جائیں گے کیونکہ دریا، کشتی اور پل، ان میں سے کوئی شئے فی الواقع موجود نہیں ہے۔ آپ کے راستے میں پہاڑ آجائے تو آپ نہ تو کترا کر نکلنے کی کوشش کریں گے اور نہ پہاڑ کے اوپر چڑھنے کا راستہ تلاش کریں گے کیونکہ پہاڑ اور اونچائی، یہ سب فرضی امور ہیں۔ آپ رُکے بغیر آگے بڑھے چلے جائیں گے۔ چلتی ہوئی ٹرین سے آپ بلا تکلف باہر آجائیں گے کیوں کہ نہ کوئی ٹرین موجود ہے اور نہ وہ چل رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی انسان اس طرح کے اقدامات نہیں کرتا، اور نہ بہ سلامتی ہوش وحواس کر سکتا ہے اور اگر کوئی خرد باختہ اس طرح کے اقدامات کرنے پر تُل ہی جائے تو یا وہ کائنات کی ٹھوس حقیقتوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا یا بہت جلد کائنات کو ایک ٹھوس حقیقت ماننے پر مجبور ہو جائے گا۔

تمام نظریات میں سے یہ نظریہ وہ واحد نظریہ ہے جو عمل کی کسوٹی پر ایک لمحہ کے لیے پورا نہیں اُترتا اور جسے صحیح تسلیم کر کے آپ ایک قدم بھی نہیں چل سکتے حتیٰ کہ خود اس نظریہ کے قائل اور اس کے بڑے بڑے داعی بھی اپنی عملی زندگی میں بھُولے سے بھی اس نظریہ کو نہیں اپناتے۔ اتنا ہی نہیں، خود ان کا ذہن ہر آن اس نظریہ کے خلاف بغاوت کرتا رہتا اور اس کے برعکس عمل کرنے پر اُکساتا رہتا ہے۔ وہ زبان سے

اس نظریہ کی تبلیغ کرتے ہیں مگر ان کا ذہن، ان کا عمل اور ان کا پورا وجود ہر وقت اس کے خلاف شہادت دیتا رہتا ہے۔ یہ حضرات بھی کائنات کی ٹھوس حقیقتوں کو وہم و خیال نہیں، ٹھوس سمجھ کر ہی ان کی بنیاد پر اپنی عملی زندگی کی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ اس کے سوا وہ کوئی رویہ اختیار نہیں کرتے اور بہ سلامتی ہوش و حواس نہیں کر سکتے۔

علمی اور عملی دونوں طریقوں سے جانچ کر آپ دیکھ چکے ہیں کہ یہ نقطۂ نظر غلط اور بے بنیاد ہے۔

کیا کائنات ازلی و ابدی ہے؟

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کائنات نہ کبھی پیدا ہوئی ہے اور نہ کوئی اس کا خالق ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ پہلے نقطۂ نظر کی طرح یہ خیال بھی نیا نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ عموماً اس نقطۂ نظر کے قائل رہے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے زعم میں خالق کے تصور سے چھٹکارا پا لیتے ہیں۔ حالانکہ حاکم و مدبر کائنات کے بغیر کام پھر بھی نہیں چلتا۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ کائنات کو حادثات و مخلوق مانا جائے گا اور نہ کسی خالق کو ماننے کی ضرورت پیش آئے گی۔

اگر آپ اس نقطۂ نظر کے حاملین سے دریافت کریں کہ کائنات کے ازلی و ابدی ہونے کی ان کے پاس کیا دلیل ہے تو وہ اس کی کوئی معقول اور ٹھوس دلیل فراہم نہ کر سکیں گے۔ آپ کو صاف محسوس ہوگا کہ ان کا ذہن خدا کے وجود کو ماننے سے انکار کر رہا ہے اس لیے وہ کائنات کو ازلی و ابدی ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب تک کہ کسی ازلی و ابدی وجود کو تسلیم نہ کیا جائے، کائنات کی گتھی کسی طرح نہیں سلجھتی یا تو آپ خدا کو مانیئے جو ازلی و ابدی اور قائم بالذات ہے اور یہ تسلیم کیجیے

کہ اس نے کائنات کو وجود بخشا ہے یا خود کائنات کو ازلی و ابدی مانیے۔ کیوں کہ جو شئے تھی ہی نہیں، وہ آپ سے آپ کیونکر موجود ہو سکتی ہے۔ یا تو کسی شئے کا وجود ذاتی ہوگا۔ یعنی ہمیشہ سے ہوگا اور ہمیشہ رہے گا اور یا اسے کسی ہستی نے وجود بخشا ہوگا (اور اسی ہستی کو خالق کہتے ہیں) یہ دو ہی شکلیں ہیں۔ تیسری کوئی شکل نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔

کائنات ازلی و ابدی نہیں ہے

کائنات ازلی و ابدی ہے۔ اس دعوے کے کمزور ہونے کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ اس کے مدعیوں کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ کائنات کو ازلی و ابدی مانے بغیر کائنات کی گتھی سلجھتی نہ ہو۔ کائنات کی توجیہہ اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ ایک ازلی و ابدی خالق و مدبّر ہستی کو تسلیم کر لیا جائے۔ پھر زیادہ معقول اور صحت سے زیادہ قریب توجیہہ وہی مانی جاتی ہے جو متعلقہ تمام سوالات کو یا کم از کم اکثر و بیشتر سوالات کو اطمینان بخش طریقے پر حل کر سکے۔ کائنات کو ازلی و ابدی ماننے کی صورت میں کائنات کی تخلیق کا مسئلہ تو حل ہو جاتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ آپ کائنات کو قدیم اور غیر مخلوق مان کر اس مسئلہ سے اپنا پیچھا چھڑا لیتے ہیں باقی تمام سوالات جوں کے توں باقی رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک ازلی و ابدی خالق و مدبّر ہستی کو مان لینے کے بعد کائنات کی تخلیق کا مسئلہ بھی اطمینان بخش طریقے سے سلجھ جاتا ہے اور دوسرے تمام سوالات بھی ایک ایک کر کے حل ہوتے جاتے ہیں۔ پھر اس زیادہ معقول اور زیادہ صحیح توجیہہ کو چھوڑ کر کائنات کے ازلی و ابدی ہونے کی توجیہہ کیوں اختیار کی جائے جب کہ اس سے متعلقہ سوالات حل بھی نہیں ہوتے؟ کیا صرف اس لیے کہ کائنات کو ازلی و ابدی ماننے کی صورت میں ہمیں

کائنات سے ماوراء کسی ہستی کو تسلیم نہیں کرنا ہوتا اور خدا کو ماننے کی صورت میں ایک ماورائے کائنات ہستی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے؟ اگر کائنات سے ماوراء کسی ہستی کو ماننے بغیر کائنات کی گتھی سلجھتی ہو تو ہم بھی اصرار نہ کریں گے کہ خواہ مخواہ کسی ایسی ہستی کو تسلیم کیا جائے۔ لیکن اگر کسی ایسی ہستی کو ماننے بغیر کائنات کی گتھی نہ سلجھتی ہو۔ جیسا کہ فی الواقع نہیں سلجھتی[1] تو پھر عقلی اور سائنٹیفک رویہ کیا ہے؟ کیا یہ کہ اس توجیہہ کو قبول کر لیا جائے جس سے متعلقہ تمام سوالات حل ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اس میں کائنات سے ماوراء ایک ہستی کو تسلیم کرنا پڑتا ہو یا یہ کہ ایک غیر تسلی بخش اور غلط توجیہہ پر محض اس لیے اصرار کیا جائے کہ اسے ماننے کی صورت میں ہمیں کائنات سے ماوراء کسی ہستی کو ماننا نہیں پڑتا۔ حالانکہ خود یہ صورتحال اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ ماورائے کائنات ایک ہستی موجود ہے جبھی تو اس کے بغیر کائنات کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ عقلی اور سائنٹیفک رویہ یقیناً یہی ہے کہ ہم پہلی توجیہہ کو قبول کر لیں۔ فلسفہ، ریاضی اور سائنس ان تمام علوم میں ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسی توجیہہ کی جائے جو زیادہ سے زیادہ متعلقہ سوالوں کا جواب دے سکے۔ ان توجیہات کے سلسلے میں بے شمار ایسی حقیقتوں کو ماننا پڑتا ہے جن کے وجود کو ہم حواس یا آلات سے کبھی ثابت نہیں کر سکتے بلکہ بسا اوقات ان کا کوئی عقلی ثبوت بھی ہمارے پاس نہیں ہوتا۔ ہم ان حقیقتوں کو صرف اس لیے مانتے ہیں کہ انھیں ماننے بغیر متعلقہ سوالات کی اطمینان بخش توجیہہ نہیں ہو سکتی[2]

---

[1] بعض سائنس دان خدا کو تو نہیں مانتے لیکن کائنات کی گتھی سلجھانے کے لیے اس سے قبل ایک اور کائنات مان لیتے ہیں۔

[2] ایتھر (Ether) کو صرف اس لیے مانا جاتا ہے کہ اس کے بغیر روشنی اور مختلف لہروں کے سفر کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

جب کائنات کے اجزا کے سلسلے میں یہ رویہ صحیح ہے اور ہم پورے اطمینان سے اسے اختیار کرتے ہیں تو خود کائنات کے سلسلے میں یہ رویہ کیوں صحیح نہیں ہے؟ کائنات کے ان اجزا کو تو ہم زیادہ قریب سے دیکھ پاتے ہیں اور ان کا حسّی اور آلاتی تجربہ کر کے ان کی مادی توجیہ زیادہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ کل کائنات کے سلسلے میں تو ہمیں یہ سہولت بھی حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کائنات کی توجیہہ کرنے کے سلسلے میں اگر ہمیں کچھ غیر مادی اور غیر محسوس حقیقتیں تسلیم کرنا پڑیں تو یہ بات ہرگز غیر عقلی اور اَن سائنٹیفک نہ ہوگی۔

کائنات عرصۂ دراز سے موجود ہے۔ اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ قدیم ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اربوں اور کھربوں سال سے ہے۔ اور ہم معمولی غور و فکر کے بعد اسے مان لیں گے لیکن جب آپ کہیں گے کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، تو ہم آپ سے اس کا ٹھوس ثبوت کریں گے۔ ہم کائنات کی بے شمار چیزوں سے واقف ہیں جو پہلے نہیں تھیں اور آیندہ بھی نہیں رہیں گی۔ وہ ایک محدود عرصے کے لیے موجود ہیں اور خود ہمارا شمار بھی انہی میں سے ہے، لیکن اس کائنات میں ہم کسی ایک شئے سے بھی واقف نہیں جس کے ازلی و ابدی ہونے کا ہمیں علم ہو۔ اس لیے جب آپ کائنات کو ازلی و ابدی قرار دیتے ہیں تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں سخت زحمت ہوتی ہے، کیوں کہ یہ بات کائنات کے بارے میں ہماری معلومات سے کوئی جوڑ نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس اگر آپ کائنات کو حادث و فانی کہتے ہیں تو ہمارا ذہن اسے آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ کیوں کہ ہم کائنات میں حدوث و فنا کے آثار پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں۔

ایک اور پہلو سے غور کیجیے : ایک کل، جس کے بہت سے اجزاء ہوں اُسے آپ اسی وقت ازلی وابدی کہہ سکتے ہیں جب کہ اس کے سب اجزاء ازلی وابدی ہوں۔ اگر اس کے کچھ اجزاء کے بارے میں یقین سے معلوم ہو کہ وہ قدیم نہیں، حادث، ابدی نہیں، فانی ہیں، تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہو گا کہ وہ شئے ازلی وابدی نہیں، کائنات کو آنکھ کھول کر دیکھئے۔ اس میں آپ کو ہر طرف فنا و حدوث کے آثار نظر آئیں گے۔ بے شمار انسان ہیں جو پہلے نہیں تھے پھر پیدا ہوئے اور کچھ عرصے کے بعد موت کے گھاٹ اتر گئے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہی حال حیوانات و نباتات کا ہے اور یہی زمین کی دوسری بہت سی موجودات کا، زمین پر یہ تماشا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ بہت سی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، کچھ دنوں رہتی ہیں اور پھر فنا ہو جاتی ہیں۔ اسی پر باقی کروں کی موجودات کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں، ہم بہت سے تاروں کے ٹوٹنے کا بھی مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کُروں پر پائی جانے والی موجودات ہی نہیں، خود کُرے بھی ٹوٹ پھوٹ اور فنا کی نذر ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح دُوربین کے ذریعے سحابیوں کے مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی تک بہت سے تارے زیرِ تخلیق ہیں۔ یہ سب اس بات کا ثبوت ہے کہ کائنات کے بہت سے چھوٹے بڑے اجزاء ازلی وابدی نہیں، حادث و فانی ہیں اور اس سے آپ سے آپ یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ خود یہ کائنات بھی ازلی وابدی نہیں، حادث و فانی ہے۔

کائنات کے قدیم ہونے کے قائلین اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ نہ کوئی چیز پیدا ہوتی ہے اور نہ فنا ہوتی ہے۔ جسے آپ پیدا ہونا اور فنا ہونا کہتے ہیں۔ وہ مادہ کا مختلف شکلوں میں ظاہر ہونا ہے۔ مختلف مادی عناصر جب ایک خاص ترتیب و تناسب سے جمع ہو جاتے ہیں تو اس کے نتیجے

میں ایک خاص شئے ظہور میں آتی ہے اور جب وہ ترتیب ختم ہو جاتی ہے تو آپ کہتے ہیں کہ فلاں چیز فنا ہو گئی ہے

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

مادّہ فنا نہیں ہوتا، مادّہ کی خاص شکلیں اور مادّی عناصر کی خاص ترتیب فنا ہوتی رہتی ہے۔

یہ بات اگر صحیح مان لی جائے ــــ اگرچہ سائنسی تجربات کی روشنی میں یہ بھی غلط ثابت ہو چکی ہے ــــ تو اس کا اصل حاصل صرف اسی قدر ہے کہ مادّہ نہیں، مادّے کے مختلف مظاہر پیدا ہوتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں۔ گویا مادّہ ازلی و ابدی ہے اور اس کے مظاہر حادث و فانی، مگر اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ کائنات ازلی و ابدی نہیں، حادث و فانی ہے کیونکہ مادّہ کے مظاہر کا دوسرا نام کائنات ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ مظاہر کے حادث و فانی ہونے سے کائنات حادث و فانی ثابت نہیں ہوتی۔ کیوں کہ چند مظاہر فنا ہوتے ہیں تو اس کی جگہ دوسرے مظاہر لے لیتے ہیں۔ اسی مادے کے مظاہر فنا ہوتے رہتے ہیں مگر کائنات کا تسلسل جاری رہتا ہے، لیکن اس دلیل میں ذرا بھی وزن نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حادث و فانی مظاہر کا مجموعہ ــ خواہ مظاہر کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں ــــ حادث و فانی ہی ہوگا، ازلی ابدی نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مادے کے مظاہر میں سے ہر ایک محدود مدّت رکھتا ہے۔ مظاہر کی یہ محدود مدّتیں جمع ہو ہو کر کسی طرح لامحدود مدّت نہیں بن سکتیں، کائنات کی مدّت بہر حال محدود ہی ہوگی خواہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔ ایک اور طرح غور کیجئے۔ مادے کے مظاہر میں سے ہر مظہر کی ابتدا اور انتہا ہے۔ کائنات جب ایسے مظاہر کا

مجموعہ ہے جن میں سے ہر ایک مظہر ابتداء اور انتہاء رکھتا ہے تو کائنات کس طرح لامتناہی ہو سکتی ہے۔ لازماً اس کی بھی ایک ابتدا اور ایک انتہا ہوگی اور یہی مطلب ہے کائنات کے حادث وفانی ہونے کا اور اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ خود مادّہ بھی ازلی وابدی نہیں ہے کیونکہ مادہ اپنے مظاہر ہی کے روپ میں پایا جائے گا اور ان کا حادث وفانی ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

ایک اور پہلو سے غور کیجیے۔ زمین پر نوعِ انسانی ہمیشہ سے موجود نہیں ہے۔ آثارِ قدیمہ اور طبقات الارض دونوں سے بس ایک خاص مدت تک انسان کے وجود کا پتہ لگتا ہے۔ اس سے آگے انسان کے آثار نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ ہمارا مشاہدہ اور مردم شماری کے اعداد وشمار دونوں اس کے شاہد ہیں کہ انسانی آبادی برابر بڑھ رہی ہے اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ اب سے سو سال قبل انسانی آبادی آج کے مقابلہ میں کم تھی اور اس سے سو سال قبل اس سے بھی کم۔ اسی طرح آپ پیچھے ہٹتے جائیے، آپ اس زمانہ کا تصور کر سکیں گے جب زمین پر نوعِ انسانی کی آبادی صرف ایک جوڑے تک محدود تھی اور اس سے قبل کے زمانے کا تصور کیجئے تو آپ انسان کو موجود نہ پائیں گے۔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسی طرح آپ حیوانات ونباتات کے سلسلہ میں بھی بہ آسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ ایک وقت زمین پر ان کا بھی وجود نہ تھا، گویا زمین پر زندگی پائی نہ جاتی تھی جس طرح عموماً دوسرے سیاروں کا حال ہے۔ زمین کے تمام آثار اور خود دوسرے سیاروں کا حال اس بات پر شاہد ہے کہ ایک زمانے میں زمین بھی دوسرے سیاروں کی مانند تھی اور اس پر زندگی موجود نہ تھی۔ سائنس دان بھی اس حقیقت کے معترف ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں تھا؟ اگر آپ کسی خالق ومدبر ہستی کو نہیں مانتے

تو اس کے سوا آپ کوئی جواب نہیں دے سکتے کہ اس وقت زمین اور فضا کی حالت ایسی نہ تھی کہ اس میں زندگی پیدا ہو کر پروان چڑھ سکے۔ اس کے بعد زمین اور فضا کے حالات میں ارتقا ہوا اور زندگی نمودار ہوئی۔ دوسرے الفاظ میں زمین کی ایک حالت اب ہے اور ایک اس سے بالکل مختلف ایک مدت قبل تھی، لیکن زمین کی اس حالت کو بھی آپ ہمیشہ سے تسلیم نہیں کر سکتے۔ ایک تو اس لیے کہ تغیر، مادہ کی مستقل خاصیت ہے ــــ اور سارے ہی سائنس داں مادے کی اس خصوصیت کے قائل ہیں ــــ دوسرے اس لیے کہ وہ حالت اگر ہمیشہ سے ہوتی تو اس میں تغیر ممکن نہ ہوتا اور زمین پر زندگی پیدا ہی نہ ہوتی یا پھر زمین پر زندگی ہمیشہ سے ہوتی۔ اور تغیرات کا دور دورہ نہ ہوتا۔ آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے کہ موجودہ حالت تو ایک معین مدت سے ہو اور اس سے قبل کی حالت ہمیشہ سے ہو۔ اگر آپ اس کے قائل ہوں تو آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ اس ازلی حالت میں تغیر کیوں ہوا اور اگر ہوا تو اس معین مدت کے نقطۂ آغاز پر کیوں ہوا؟ اس سے قبل کیوں نہیں ہوا؟ آپ اس سوال کا اس کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکتے کہ حالات کے ارتقا کے لیے مدت درکار ہے۔ جب وہ مدت پوری ہوئی تو حالات میں ارتقا ہوا اور زمین پر زندگی نمودار ہوئی۔ آپ کا یہ جواب ٹھیک ہے، لیکن آپ اس مدت سے قبل کی حالت کا تصور کیجیے تو آپ کو زمین اور فضا کے حالات لازماً مختلف معلوم ہوں گے اور اس طرح آپ مختلف معین مدتوں کے فیصل زمین اور فضا کے مختلف حالات ماننے پر مجبور ہوتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ آپ اس دور میں پہنچ جائیں گے جب نظامِ شمسی کا مادہ یکجا تھا اور اس سے قبل اُس دور میں جب کہ پوری کائنات کا مادہ یکجا تھا اور کائنات کی صورت گری نہ ہوئی تھی۔ اسے آپ کائنات کا نقطۂ آغاز کہہ سکتے ہیں اور یہاں تک تو اب

سائنسداں بھی پہنچ چکے ہیں لیکن آپ اس حالت کو بھی ازلی فرض نہیں کر سکتے مادہ تو ہمیشہ سے ہو اور کائنات صرف پچاس کھرب سال پہلے وجود میں آئے جیسا کہ سائنس دانوں کا تازہ ترین اندازہ ہے۔ آپ مجبور ہوں گے، کہ مادہ بھی موجود نہ تھا۔ پھر مادہ وجود میں آیا اور پھر اس سے پوری کائنات کی صورت گری ہوئی۔ اس ایک توجیہ کے علاوہ آپ کائنات کی کوئی معقول توجیہ نہیں کر سکتے۔ متغیر کائنات اگر ازلی و ابدی نہیں ہے تو متغیر مادہ بھی ازلی و ابدی نہیں ہو سکتا۔ اگر کائنات کا کوئی نقطۂ آغاز مانتے ہیں تو مادہ کا نقطۂ آغاز بھی آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کہہ دینا تو بہت مشکل ہے کہ فی الواقع کیا چیز ازلی و ابدی ہے۔ زمین پر زندگی کے ہنگامے؟ زمین؟ نظامِ کائنات؟ ان میں سے کوئی بھی ازلی و ابدی ثابت نہیں ہوتا۔ لے دے کر مادہ رہ جاتا ہے، لیکن کائنات کے ازلی و ابدی نہ ہونے کی صورت میں مادے کو ازلی و ابدی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

مادہ ازلی و ابدی نہیں ہے

ابھی کچھ عرصہ قبل تک سائنسدانوں کا یقین تھا کہ مادہ غیر فانی ہے۔ انھیں تجربہ سے معلوم ہوا کہ جلنے سے کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔ صرف حالت بدل دیتی ہے اگر پہلے ٹھوس تھی تو جلنے کے بعد گیس کی حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جلنے سے مادہ کی مقدار میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ اگرچہ اس تجربے سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ جلنے سے مادہ فنا نہیں ہوتا، نہ یہ کہ کسی حال میں اور کسی طریقے سے بھی فنا نہیں ہوتا اور اسی سے بہت سے لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مادہ ازلی و ابدی ہے، لیکن مادہ کے ایٹمی مشاہدہ نے اس یقین کو ختم کر دیا ہے۔ ریڈیم، تھوریم، یورنیم

وغیرہ عناصر کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان کے ایٹم ٹوٹ ٹوٹ کر فضا میں غائب ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک پتہ لگایا جا چکا ہے کہ یہ ایٹم توانائی میں تبدیل ہو جاتے ہیں، لیکن یہ قطعاً معلوم نہ ہو سکا کہ یہ توانائیاں کہاں چلی جاتی ہیں۔ اس کے بعد دوسرے عناصر کا بھی ایٹمی تجزیہ کیا گیا اور اس کا حاصل بھی یہی نکلا کہ ان کے ایٹم الیکٹرون اور پروٹون میں ٹوٹ ٹوٹ کر فنا ہو جاتے ہیں، اس طرح مادہ مستقل طور پر توانائی میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اور یہ توانائی غائب ہوتی رہتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں مادہ غیر فانی نہیں ہے، فانی ہے۔ لینن جیسے مادہ پرست کو بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا اس نے اپنی کتاب "مادی اور تجربی تنقید" میں ایک فرانسیسی سائنسدان کے حوالے سے لکھا ہے:

> "بحرانی کیفیت صرف یہیں تک محدود نہیں ہے کہ ریڈیم جو ایک عظیم انقلابی حیثیت کا عنصر ہے، دوامِ توانائی کے اصول کو جڑ سے کھوکھلا کر رہا ہے، اور دوسرے اصول بھی خطرے میں پڑ گئے ہیں۔ مثلاً دوامِ کمیت کا اصول تو پہلے ہی مادہ کے جوہری نظریہ کے ذریعے جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکا جا چکا ہے۔"
> (کتاب مذکور، عنوان "موجودہ طبیعات میں بحرانی کیفیت" صفحہ ۲۶۰)

اسی کتاب میں لینن نے صفحہ ۲۶۷ پر ایک الگ عنوان قائم کیا ہے جو یہ ہے: "مادہ فنا ہو گیا"، اس عنوان کے تحت اس نے مختلف ممالک کے ماہرین طبعیات کے تاثرات پر، جو مادہ اور اس کی فنا پذیری سے متعلق ہیں، بحث کی ہے۔ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مادہ فنا ہو جاتا ہے۔

سر ولیم سسل ڈیمپیر نے اپنی کتاب "تاریخ سائنس" میں "مادہ کی فنا پذیری" کے عنوان کے تحت انیسویں صدی سے لے کر اب تک کے بڑے بڑے ماہرین طبیعات کے نظریات اور ان کے تجربات پر

بحث کی ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ :

"مادی حقیقت ایک ماہر طبیعیات ہملٹن کے ریاضی مساوات کے طویل سلسلے میں تبدیل ہو چکی، قدیم مادیت فنا ہو چکی اور الیکٹرون بھی جنھوں نے مادی جوہروں کی کچھ عرصے کے لیے جگہ لی تھی محض ایک غیر مجسم روح کے سوا کچھ نہیں رہ گئے الیکٹرون بھی صرف ایک لہر کا تصور پیدا کرتے ہیں۔ یہ لہریں بھی ہمارے جانے بوجھے خلا میں پیدا ہونے ہونے والی لہریں نہیں ہیں اور نہ میکسویل کے مقرر کردہ ایتھر میں ہوتی ہیں بلکہ ایک ابعاد اربعہ والے زمان و مکان میں ایک قیاسی اور وہمی منصوبہ میں پیدا ہوتی ہیں جنھیں ہمارا دماغ قابلِ فہم الفاظ میں تصور نہیں کر سکتا" ص ۴۷۸)

غرض سائنس کی دنیا میں اب یہ یقین بڑھتا جا رہا ہے کہ مادہ فانی ہے یہ صرف حالت ہی نہیں بدلتا بلکہ اپنی ساری خصوصیات کھو کر فنا بھی ہوتا رہتا ہے۔ گویا مادہ ابدی نہیں ہے اور ابدی نہ ہونے کے باعث وہ ازلی بھی نہیں ہے۔ کوئی چیز جس کی انتہا ہو، لا متناہی عرصے سے موجود نہیں ہو سکتی جس کی انتہا ہے، اس کی ابتدا آپ کو لازماً ماننی پڑے گی۔

یہ طے ہو جانے کے بعد کہ مادہ ازلی و ابدی نہیں ہے۔ یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ کائنات ازلی و ابدی نہیں ہے، تاہم بہتر ہو گا کہ اس سلسلے میں بھی سائنس کا جدید ترین رجحان سامنے آ جائے۔ ایڈورڈ لوتھر کیسل ایک ماہر سائنس داں، اپنے مضمون "آئیے ہم کسی تعصب کے بغیر حقائق

لہ اس بحث میں ہم نے "سائنس اور ضابطۂ حیات" مصنفہ جناب اکرم الدین صاحب سے استفادہ کیا ہے۔

کا مطالعہ کریں" میں لکھتا ہے :

"بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کا کہنا یہ ہے کہ اگر خدا کے بارے میں یہ مانا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ازلی وابدی ذات ہے تو آخر یہ کیوں نہ مان لیا جائے کہ کائنات ہی ازلی وابدی ہے، حرکیاتِ حرارت، کا دوسرا قانون جسے "ضابطۂ ناکارگی" کہا جاتا ہے اس آخری تصور کی نفی کرتا ہے، یہ حقیقت سائنس نے ثابت کردی ہے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود نہیں ہے۔ "ضابطۂ ناکارگی" بتاتا ہے کہ حرارت ہمیشہ با حرارت وجود سے بے حرارت وجود میں منتقل ہوتی رہتی ہے، لیکن اس چکر کو الٹا نہیں کیا جا سکتا کہ خود بخود حرارت کم حرارت کے وجود سے زیادہ حرارت کے وجود میں منتقل ہونے لگے، ناکارگی، دستیاب اور غیر دستیاب توانائی کے درمیان تناسب کا نام ہے۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کائنات کی ناکارگی برابر بڑھ رہی ہے اور ایک وقت آنے والا ہے جب کہ تمام موجودات کی حرارت یکساں ہو جائے گی اور کوئی کارآمد توانائی باقی نہ رہے گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کیمیائی اور طبعی عمل کا کوئی میدان باقی نہ رہے گا۔ زندگی نابید ہو جائے گی اور ایک ہمہ جہتی جمود طاری ہو جائے گا، لیکن اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ کیمیائی اور طبعی عمل جاری اور زندگی کے ہنگامے قائم ہیں، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کائنات کا وجود ازلی نہیں ہے ورنہ اس کی توانائی کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی اور یہاں زندگی کی ہلکی سی رمق بھی موجود نہ ہوتی۔ اس طرح غیر ارادی طور پر سائنس کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کائنات کا کوئی نہ کوئی نقطۂ آغاز ضرور ہے، اور اگر یہ بات ثابت ہو جائے

تو پھر خدا کا وجود آپ سے آپ ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہر وہ چیز جو اپنی ذات میں ازلی نہیں ہے اس کا وجود یقیناً کسی محرکِ اول اور کسی خالق یعنی خدا کے کرشمۂ قدرت کا رہینِ منت ہے۔"

"سائنس کی تحقیقات نے صرف یہی ثابت نہیں کیا کہ یہ کائنات ازلی نہیں، اور اس کی ایک ابتدا اور اس کا آغاز ہے بلکہ تازہ انکشاف یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اب سے تقریباً پچاس کھرب سال پہلے ایک تخلیقی دھماکے کے نتیجے میں آنِ واحد میں یہ کائنات وجود میں آگئی، اور آج بھی اس میں توسیع کا عمل جاری ہے، جو لوگ سائنس کی تحقیقات کو کوئی وزن دیتے ہیں، وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ کائنات کی تخلیق کی گئی ہے اور یہ عملِ تخلیق لگے بندھے قوانینِ فطرت سے ماوراء کسی طاقت کا کرشمہ ہے کیونکہ یہ قواعدِ فطرت تو خود کسی کی تخلیق کا نتیجہ ہیں، اسی ذات کو ہم خدا کہتے ہیں" (خدا موجود ہے۔ مغرب کے چالیس سائنسدانوں کی شہادت" ص۸۷ تا ۹۸)

اس اقتباس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بالکل واضح ہے۔ اس کی تشریح یا اس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

فرینک ایلن، ایک اور ماہر سائنس داں اپنے مضمون "تخلیقِ کائنات ایک حادثہ یا ایک منصوبہ" میں اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"تیسرا خیال کہ یہ کائنات ازلی و ابدی ہے، نظریۂ تخلیق سے کم از کم اس پہلو سے میل کھاتا ہے کہ یا تو یہ جامد مادہ اپنے اندر مستور توانائی کے ساتھ ازلی و ابدی وجود رکھتا ہے یا پھر اس کے خالق کی ذات ازلی و ابدی ہے۔ اس پہلو سے ان دونوں کے دلائل بھی تقریباً یکساں ہیں، لیکن "حرکیاتِ حرارت"

کے قوانین سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کائنات بتدریج انحطاط پذیر ہے اور ایک وقت آنے والا ہے جب تمام موجودات اپنی حرارت کھو بیٹھیں گی، توانائی و قوت فنا ہو جائے گی اور زندگی ناممکن ہو جائے گی ۔۔۔ یہ دہکتا ہوا سورج، یہ جھلملاتے ہوئے تارے اور زندگی کے ہنگاموں سے بھرپور یہ زمین اس حقیقت کے جامع شواہد ہیں کہ اس کائنات کا کوئی نہ کوئی نقطۂ آغاز ضرور ہے اور ایک متعین و مقرر ساعت میں یہ کائنات وجود میں آئی ہے اور یہی حقیقت اس امر کی رہنمائی کرتی ہے کہ یہ کائنات خود بخود وجود میں نہیں آگئی۔ بلکہ یہ کسی کی قوتِ تخلیق کا کرشمہ ہے۔ یہ تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ علتِ اولیٰ کی حیثیت سے ایک ازلی و ابدی ذات اور ایک علیم و قدیر ہستی لازماً ہونا چاہیے جس نے اس کائنات کو پیرہن وجود بخشا اور اس کی صورت گری کی ۔" (خدا موجود ہے"۔ مغرب کے چالیس سائنس دانوں کی شہادت صـ ۲۹)

جان کلیوہ ی لینڈ۔ ایک اور ماہر سائنس داں، اس مسئلہ پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے :

"علمِ کیمیا یہ بتاتا ہے کہ مادہ بتدریج فنا ہو رہا ہے، اس کے بعض انواع کے معدوم ہونے کی رفتار سست ہے اور بعض کی انتہائی تیز، اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مادہ اپنی ذات میں ازلی و ابدی نہیں ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر لامحالہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مادہ کی کوئی ابتدا اور اس کا کوئی نقطۂ آغاز بھی ضرور ہو گا۔ نہ صرف علمِ کیمیا بلکہ دوسرے علوم عقلی بھی اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے

ہیں کہ مادہ کسی طویل تدریجی عمل کا نتیجہ میں وجود میں نہیں آیا۔ ایک دم اور اچانک وجود میں آیا۔ مختلف آثار و شواہد سے یہ بھی متعین کیا جاتا ہے کہ اندازاً یہ واقعہ کب ہوا ــــ اب اس بات کو لیجئے کہ اگر یہ عالمِ مادی از خود وجود میں نہیں آسکتا اور اگر وہ اس وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ایسے ہمہ گیر اور دائمی ضوابط و قوانین بھی از خود وضع نہیں کر سکتا تو پھر یہ کارنامہ یقیناً کسی غیر مادی وجود ہی نے انجام دیا۔" ("خدا موجود ہے" مضمون "ایک ناگزیر فیصلہ" صفحہ ۶۹-۷۰)

گویا سائنسی حقائق کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ نہ کائنات ازلی و ابدی ہے اور نہ وہ مادہ جس سے کائنات بنی ہے۔ مادہ اور کائنات دونوں کے دونوں حادث و فانی ہیں اور اسے تسلیم کرتے ہی خدا کا وجود آپ سے آپ ثابت ہو جاتا ہے۔ جو شئے ازلی نہیں ہے وہ ایک نہ ایک وقت ضرور معدوم تھی اور جو شئے کسی وقت معدوم ہو وہ آپ سے آپ موجود نہیں ہوسکتی۔ کسی ہستی کے وجود بخشنے ہی موجود ہوسکتی ہے۔

اسی ہستی کو خالقِ کائنات یا خدا کہتے ہیں۔

کیا کائنات آپ سے آپ رواں دواں ہے؟

اب تیسری توجیہ کو لیجئے۔ یعنی یہ کہ کائنات آپ سے آپ پیدا ہوئی اور آپ سے آپ چل رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس توجیہ کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ کہ کائنات معدومِ محض تھی۔ پھر آپ سے آپ وجود میں آگئی اور آپ سے آپ چل رہی ہے۔ یہ تو مہمل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ جو شئے معدومِ محض ہو وہ آپ سے آپ کیسے موجود ہوسکتی ہے۔

اس توجیہ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ کائنات، خالق کے بغیر مادہ سے خود بخود پیدا ہو گئی اور کسی منتظم کے بغیر آپ سے آپ رواں دواں ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اس بات سے قطع نظر کیجئے کہ مادہ ازلی و ابدی نہیں ہے خود اس کے لیے خالق درکار ہے۔ فرض کر لیجئے کہ مادہ ازلی و ابدی ہے اس کے بعد غور کیجئے کہ کیا اس توجیہ سے ان سوالات کا جواب مل جاتا ہے جو کائنات کی تخلیق اور اس کے نظم وغیرہ کے متعلق پیدا ہوتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مادہ سے یہ مخصوص قسم کی کائنات ایک متعینہ وقت پر کیوں وجود میں آ گئی؟ الیکٹرون، پروٹان اور نیوٹرون سے ۱۰۲ کیمیائی عناصر کیوں پیدا ہو گئے؟ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے مخصوص نوعیت کے اجرام فلکی کیوں بن گئے؟ زمین سورج سے ایک متعینہ فاصلہ پر رہ کر ایک منفرد جھکاؤ کے ساتھ ایک مخصوص رفتار کے ساتھ کیوں گردش کر رہی ہے؟ اور اس کی ایک مخصوص جسامت کیوں ہے؟ جب کہ ان امور کا زندگی کے ہنگاموں اور زمین کی رنگارنگی اور تنوع سے خصوصی تعلق ہے ــــ کیمیائی عناصر کی یکجائی سے زندگی کیوں پیدا ہو گئی؟ زندگی نے بے شمار نوعیتیں اور شکلیں کیوں اختیار کر لیں؟ دو خوردبینی جراثوموں کے ملنے سے انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق کیوں وجود میں آ گئی؟ یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوالات بنیادی نوعیت کے سوالات ہیں اور جب تک ان سوالات کا جواب فراہم نہ ہو جائے، کائنات کی کوئی توجیہ مکمل اور معقول توجیہ نہیں کہی جا سکتی۔ ان سوالات کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟

ان سوالات کا ایک جواب یہ ہے کہ جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے، یہ مادہ کی طبعی و لازمی خاصیت ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔

ان سوالات کا دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض اتفاق کا نتیجہ ہے۔ اتفاق سے کائنات پیدا ہو گئی اور اتفاقات ہی کے بل پر اس کا ارتقاء

ہو رہا ہے۔

ان سوالات کا تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایک باشعور، ذی ارادہ اور حکیم و قدیر ہستی نے اپنے ارادہ و شعور سے کیا ہے۔ اسی کی مرضی نے کائنات کی صورت گری کی، اسی نے قوانینِ فطرت وضع کئے اور وہی ان قوانین کو نافذ کر رہا ہے۔

جہاں تک پہلے جواب کا تعلق ہے، اس پر سوال از آسمان و جواب از ریسماں کی مثل صادق آتی ہے۔ آپ مادہ کی طبعی خاصیتوں کا ذکر فرما رہے ہیں، اور میں یہ سوال کر رہا ہوں کہ الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون جیسی غیر مادی اشیاء سے خود مادہ کیوں کر وجود میں آگیا؟ آپ فرماتے ہیں کہ مادہ کی لازمی و طبعی خاصیت یہ ہے کہ اس سے اس نوعیت کی ایک کائنات وجود میں آئے، لیکن قطع نظر اس کے یہ بات بالکل بے ثبوت اور بے بنیاد ہے اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو دوسرا سوال یہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ مادہ کو تو آپ ازلی و ابدی مانتے ہیں۔ پھر کائنات کیوں ایک متعینہ وقت پر پیدا ہوئی اسے بس مادہ کے ساتھ ہی وجود میں آنا چاہیئے تھا۔ آپ فرمائیں گے کہ جب ایک طویل مدت تک مادہ کا ایک خاص نہج پر ارتقاء ہوا تو کائنات وجود میں آئی، لیکن اس بات کو منہ سے نکالتے ہی آپ نے اعتراف کر لیا کہ کائنات مادہ کا لازمی و طبعی نتیجہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ مادہ کا ایک خاص نہج پر ارتقا کیوں ہوا؟ آپ اس کے دو ہی جواب دے سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ اتفاقاً ایسا ہو گیا اور دوسرے یہ کہ ایک ہستی نے اپنے شعور و ارادہ سے مادہ کو اس نہج پر ڈالا۔ تیسرا جواب ممکن نہیں ہے۔

ہمیں یہ معلوم ہے کہ الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون ہی سے کیمیائی عناصر بنتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان سے مختلف و متضاد خواص رکھنے والے ۱۰۲ کیمیاوی عناصر کیوں کر تشکیل پا جاتے ہیں جب کہ یہ خواص الیکٹرون، پروٹون

اور نیوٹرون میں نہیں پائے جاتے۔ پھر ان ۱۰۲ کیمیاوی عناصر سے بے شمار جماداتی، نباتاتی اور حیواناتی مخلوقات اپنی مختلف و متضاد خاصیتوں کے ساتھ کیونکر پیدا ہو جاتی ہیں جب کہ یہ خاصیتیں ان کیمیاوی عناصر میں موجود نہیں ہوتیں؟ پھر آپ کبھی یہ نہیں بتا سکتے کہ ان کیمیاوی عناصر سے مخصوص نوعیت کے اجرامِ سماوی اپنی مخصوص جسامتوں، مخصوص ماحول اور مخصوص قوانین کے ساتھ کیوں بن گئے اور وہ مخصوص رفتار سے اپنے متعینہ محور پر کیوں گردش کر رہے ہیں، جیساکہ یہی سوال خود زمین سے متعلق ہے۔ مادہ کی طبعی خاصیتوں میں اس کا کوئی جواب نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ پھر آپ کبھی اس کی توجیہ نہیں کر سکتے کہ دو خوردبینی جرثوموں کے ملنے سے انسان جیسی ذی حیات ذی شعور اور پیچیدہ مشینری کیوں کر وجود میں آجاتی ہے۔

پھر جسے آپ مادہ کی طبعی خاصیت کہتے ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے۔ آپ اب تک صرف اتنا ہی جان سکے ہیں کہ مختلف اشیاء کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور ان کے خاص تناسب کے ساتھ امتزاج سے فلاں شئے بن جاتی ہے جس کی یہ اور یہ خاصیتیں ہیں، لیکن آپ کو آج تک یہ نہیں معلوم اور نہ سائنس کے ذریعے کبھی معلوم ہو سکے گا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ آپ جسے مادہ کی طبعی خاصیت کہتے ہیں، وہ صرف "کیسے" کا جواب ہے۔ اس جواب سے کائنات کی توجیہ نہیں ہوتی۔ اس کیلئے "کیوں" کا جواب درکار ہے، لیکن آپ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

پھر اس حقیقت کو آپ کیوں نظر انداز کر جاتے ہیں کہ مادّہ کے ایٹمی مشاہدہ کے بعد سے مادّہ اور اس کے قوانین و اصول، سب کے سب متزلزل ہو کر رہ گئے ہیں۔ حتیٰ کہ لینن جیسے مادہ پرست کو بھی تسلیم کرنا پڑا ہے:

" مادّہ کی صفتِ کمیت فنا ہو جاتی ہے۔ میکانکس کی بنیادیں

جبڑے سے اکھڑ گئیں۔" (مادیت اور تجربی تنقید صہ ۲۹۱)

لینن کے اس قول میں لوگوں پر بھرپور تنقید ہے جن کے نزدیک کائنات ایک مادی مشینری ہے جو اپنے طبعی خواص کے ساتھ خود بخود چل رہی ہے۔ سائنسدانوں نے پہلے ضرور یہ اعلان کیا تھا کہ قدرت ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی ہے جو علت و معلول کی مسلسل کڑیوں کے تحت آغاز سے انجام تک متعین ہو چکا ہے، لیکن کوانٹم تھیوری نے، جو کائنات کے بارے میں جدید ترین اور مقبول ترین تھیوری ہے اور علمِ طبیعات کے اہم اصولوں میں شمار ہوتی ہے، اس خیال کی تردید کر دی ہے، اس نظریہ کی رو سے کائنات ایک چالو مشین نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی مشین ہے جسے ہر آن چلایا جا رہا ہو۔

کیا جو کچھ ہو رہا ہے محض اتفاق سے ہو رہا ہے؟

پہلے جواب کے غلط ثابت ہو جانے اور تیسرے جواب کو تسلیم نہ کرنے کی صورت میں صرف دوسرا جواب رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ کائنات محض بخت و اتفاق سے بن گئی اور اتفاقات ہی کے بل پر اس کا ارتقاء ہو رہا ہے۔ لیکن یہ جواب فی الواقع کوئی جواب نہیں ہے، نہ اس سے انسانی ذہن مطمئن ہوتا ہے، لیکن یہ جواب صرف اس لیے گھڑا گیا ہے کہ کائنات کے خالق و منتظم کے وجود کا اعتراف نہ کرنا پڑے۔

کیا فی الواقع آثارِ کائنات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے الل ٹپ ہو رہا ہے اور اس کے پیچھے کوئی نظم اور کوئی منصوبہ اور کوئی منتظم و منصوبہ ساز نہیں؟ اس سوال پر ہم تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب "کیا خدا کی ضرورت نہیں" میں بحث کریں گے۔ اس میں صرف دو تین سائنس والوں کے بیانات پر اکتفا کروں گا جو اس سوال کا شافی

جواب ہیں۔

فرینک ایلن، اپنے مضمون "تخلیقِ کائنات" ایک حادثہ یا ایک منصوبہ" میں رقمطراز ہے:

"اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس عالمِ وجود کے پیچھے کوئی منصوبہ اور کوئی قوت کارفرما موجود نہیں ہے تو لامحالہ یہ قرار دینا پڑے گا کہ یہ عالم رنگ و بو محض ایک اتفاقی حادثہ کے نتیجے میں ظہور پذیر ہو گیا۔ اب دیکھئے بخت و اتفاق محض ایک فرضی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت ہی ترقی یافتہ حسابی نظریہ ہے۔ جس کے ذریعے ہم حق و ناحق میں بہ آسانی امتیاز کر سکتے اور کسی خاص نوعیت کے واقعہ کے امکاناتِ صدور کا حساب لگا کر صحیح صحیح اندازہ کر سکتے ہیں کہ اتفاقاً اس کا پیش آجانا کس حد تک ممکن ہے۔

پروٹین، جو تمام ذی حیات خلیوں کے لیے اجزائے لازم کی حیثیت رکھتے ہیں، پانچ عناصر پر مشتمل ہیں، کاربن، ہائیڈروجن نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک۔ پروٹینی سالمہ ان عناصر کے ....۴۰ ہزار دقیق ایٹم پر مشتمل ہوتا ہے۔ کائنات میں ۹۲ کیمیائی عناصر بالکل منتشر اور بے ترتیب بکھرے ہوئے ہیں۔ اب اس امر کا امکان کس حد تک ہے کہ ان عناصر کے بے ترتیب ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آسکے۔ مادہ کی وہ مقدار جسے مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ نکل سکتا ہو اور وہ مدت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو، حساب لگا کر معلوم کی جا سکتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے ایک حساب داں چارلس ایوجین گائی

نے اس کا حساب لگایا ہے اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان ۱۶۰ اور ۱۰ اس کے مقابلے میں صرف ایک درجہ ہو سکتا ہے۔ واضح رہے کہ ۱۶۰ و ۱۰ کا مطلب یہ ہے کہ دس کو ایک سو ساٹھ مرتبہ پے در پے ضرب دی جائے (دس کو دس میں صرف آٹھ مرتبہ ضرب دینے سے ایک ارب بن جاتے ہیں) گویا یہ ایک ایسا بعید از امکان قیاس ہے کہ اعداد کی زبان میں اس کا اظہار بھی مشکل ہے۔

صرف ایک پروٹینی سالمہ کے اتفاقاً وجود میں آنے کے لیے اس پوری کائنات کے موجودہ مادے سے کروڑوں گنا زیادہ مقدار مادہ مطلوب ہوگی، جسے یک جا کرکے ہلایا جائے اور اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان ارب ہا ارب (۲۴۳ و ۱۰) سال کے بعد ہوگا۔

پروٹین، لمینو ایسڈس، کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقے کی ہے جس سے یہ سلسلے باہم ملیں، اگر یہ غلط شکل میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کے بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں۔ پروفیسر جے بی لیدرنر (انگلستان) نے حساب لگایا ہے کہ ایک سادہ سے پروٹین کے سلسلوں کو لاکھوں (۴۸ و ۱۰) طریقے سے یکجا کیا جا سکتا ہے۔ یہ کسی طرح عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ ایک پروٹینی سالمے کو وجود میں لانے کے لیے اتنے بعید از امکان اتفاقات بہ یک وقت صادر ہو جائیں۔

پھر پروٹین خود ایک کیمیاوی شئے ہے جس میں زندگی موجود

نہیں ہوتی۔ اس میں زندگی کی حرارت تو جبھی پیدا ہوتی ہے جب
اس کے اندر رُوح پھونکی جائے۔ صرف ایک عقلِ کُل، ایک
بے حد و بے نہایت ذہین یعنی خدا ہی یہ سوچ سکتا تھا کہ زندگی
کی آماجگاہ بننے کے لیے اس طرح کا سالمہ موجود ہو سکتا ہے
وہی اس سلسلے کی تخلیق کر سکتا تھا اور وہی اسے زندگی بخش
سکتا تھا"۔ (خدا موجود ہے۔ صہ ۲۵ تا ۳۰)

ملاحظہ فرمایا آپ نے صرف ایک پروٹینی سالمہ کا اتفاقاً وجود میں آجانا کتنا بعید از امکان ہے۔ اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ زندگی کا یہ سارا ہنگامہ جو زمین پر نامعلوم مدت سے قائم ہے، اتفاق سے کس طرح وجود میں آسکتا ہے۔ جان کلیوی لینڈ، ایک ماہر سائنس دان لکھتا ہے:

"ذراتی ترکیب سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ کیمیائی عمل
کی مختلف مثالیں مقررہ قوانینِ فطرت کے مظاہر ہیں۔ ان میں
بخت و اتفاق اور بدنظمی اور بے تکے پن کو بالکل دخل نہیں ہے
غور کیجئے کہ ۱۰۲ کیمیائی عناصر میں کیسے عجیب اختلافات اور کیسی
انوکھی مماثلتیں اور مناسبتیں پائی جاتی ہیں۔ پھر اس تمام گوناگونی
اور اختلاف کے باوجود ان سارے ۱۰۲ کیمیائی عناصر کا ہر
ذرہ، یکساں طور پر تین قسم کے برقی اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔
پروٹون (مثبت) الیکٹرون (منفی) اور نیوٹرون بظاہر ایک
مثبت اور ایک منفی جزو کے اشتراک سے وجود میں آتا ہے
اب مادے کو اس حیثیت سے لیجئے کہ سالموں اور ایٹموں کا
مجموعہ ہے خود سالمے اور ذرات، ان کے ترکیبی اجزاء پروٹون
الیکٹرون اور نیوٹرون، کہربائی قوت حتیٰ کہ توانائی بھی سب
کے سب اپنے اپنے دائرے میں ایک مقرر ضابطہ کے

پابندِ نظر آتے ہیں اور ان کے عمل میں کہیں اتفاقات و حوادث کارفرما نہیں معلوم ہوتے۔ نظم و ترتیب کی اس سے بہتر مثال کیا ہو سکتی ہے کہ کیمیائی عنصر ۱۰۱ کی شناخت اور اس کے محض ۱۷ ذرّات کے مطالعہ سے کر لی گئی ہے۔ یہ اس حقیقت کا ایک ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ یہ عالمِ رنگ و بُو ایک سوچے سمجھے نظام اور ایک مقررہ نقشے کے مطابق چل رہا ہے۔ کیا کوئی باخبر اور استدلالی ذہن یہ باور کر سکتا ہے کہ جامد و بے شعور مادہ کسی حادثے کے نتیجے میں از خود وجود میں آگیا اور بلا کسی ارادہ اور کسی کارفرما قوت کے خود بخود ایک نظام میں ڈھل گیا اور محض اتفاق ہی سے اس نے نظام کی پابندی بھی شروع کر دی اور اس کے بعد اس نظم کا اس طرح قائم و دائم رہنا بھی ایک حسنِ اتفاق کے سوا کچھ نہیں۔" ؟ ("خدا موجود ہے" صفحہ ۶۶ — ۶۹)

جیبرلڈٹی، ڈین ہارٹمک ایک اور ماہر سائنس داں، تحریر کرتا ہے:

"اس مضمون نگار کو یقین ہے کہ ایک خدائے جلیل موجود ہے جو متواتر اپنا وجود، پودوں کی حیرت انگیز زندگی، ان کے اسرار اور ناقابلِ تغیّر قوانین کی صورت میں جلوہ گر رہتا ہے اور اس کے یہ جلوے درج ذیل صورتوں میں ہوتے ہیں:

۱ **تنظیم**: پودوں کا نشوونما اور پھر پھلنا پھولنا جو ایک خلیے کے بڑے ہو جانے اور تقسیم ہو جانے کا نام ہے، انتہائی مرتب، باقاعدہ اور حیرت انگیز و قابلِ تعریف طریق سے سرانجام پاتا ہے۔

۲ **پیچیدگی**: ایک سادہ سے پودے کے نشوونما اور

اور اس قسم کے پودوں کی پیدائش میں جو پیچیدہ طریق کار ہے انسانی دماغ آج تک ایسی پیچیدہ مشین نہیں بنا سکا ہے۔

۳: حسن : پودوں، تنوں، پتوں اور پھولوں کو جو آسمانی یا خدائی حسن عنایت ہوا ہے، وہ نابغہ قسم کے انسان بھی اپنی مصنوعات کو نہیں دے سکے۔

۴: تولید و توارث : پودے اپنے ہم شکل اور ہم مثل نباتات پیدا کرتے رہتے ہیں اور یہ تولید و توارث سب بے معکم طریق پر نہیں سرانجام پاتا۔ بلکہ گندم از گندم بروید جو ز جو۔ بہر حال ہر دور اور ہر زمانے میں زیتون کے درخت سے دوسرا درخت زیتون ہی کا اُگے گا۔

مضمون نگار کے لیے یہ ساری باتیں اس امر کا ثبوت ہیں کہ ایک خلاقِ اعظم خدائے جلیل موجود ہے جس کے علم اور جس کی طاقت کا کوئی ٹھکانا نہیں۔" (خدا موجود ہے" صفحہ ۱۸۱)

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ یہ کائنات اتفاق سے پیدا نہیں ہوئی، اور نہ اتفاقات کے بل پر چل رہی ہے۔ ایک خالق و منتظم اور منصوبہ ساز ہستی کا وجود خود بخود ثابت ہو جاتا ہے اور اسی ہستی کو ہم خدا کہتے ہیں۔

کیا خدا کی ضرورت نہیں؟

"خدا کی ضرورت نہیں" یہ بات دو طرح کے لوگ کہتے ہیں، ایک وہ جن کے نزدیک خدا کا اقرار یا انکار زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خدا کے ہوتے ہوئے بھی خدا کے بغیر کائنات کی توجیہ ہو جاتی ہے اور زندگی کے مسائل حل ہو سکتے ہیں، اس لیے خدا ہے تو بھی ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو "خدا کی ضرورت نہیں" کہہ کر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ خدا موجود نہیں ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ خدا موجود ہوتا تو اس کے بغیر ہم کائنات کی توجیہ نہ کر سکتے، نہ اس سے بے نیاز ہو کر مسائلِ زندگی سلجھائے جا سکتے، خدا سے بے نیاز ہو کر ہم کائنات کی توجیہ کرنے اور انسانی مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو گئے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا نہیں ہے۔

دو متضاد باتیں

اس طرح ایک ہی بات کے پردے میں دو مختلف گروہ دو متضاد باتیں کہتے ہیں جن میں ہر بات بجائے خود دوسری بات کی تردید ہے۔

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خدا کے بغیر کائنات کی توجیہ نہیں ہو سکتی، نہ اسے تسلیم کیے بغیر انسانی مسائل کو سلجھایا جا سکتا ہے تو یہ بات دونوں گروہوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کافی ہوگی، پہلے گروہ کے سامنے یہ حقیقت نکھر کر آجائے گی کہ انسان کسی حال میں خدا سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، دوسرے گروہ پر خود اس کے طرزِ استدلال سے یہ واضح ہو سکے گا کہ خدا موجود ہے، جب خدا کو مان کر کائنات کی توجیہہ ہو جاتی ہو اور خدا کے بغیر کائنات کی کوئی توجیہہ نہ ہو پاتی ہو، جب خدا کو مان کر انسانی مسائل حل ہو جاتے ہوں اور خدا کا انکار کرنے کی صورت میں بری طرح الجھ کر رہ جاتے ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا ہے اور انسانی زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔

کائنات کا معمّہ

خدا کو ماننے کے بعد ہی کائنات کا مسئلہ حل ہوتا ہے یا اس کے بغیر کائنات کی توجیہ کی جا سکتی ہے؟ اس سوال پر ہم "خدا ہے" میں بحث کر چکے ہیں، دلائل و شواہد سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ کائنات ازلی و ابدی نہیں ہے اور جب وہ ازلی و ابدی نہیں ہے تو لازماً ایک وقت موجود نہ تھی، پھر کسی ہستی نے اسے وجود بخشا، اسی ہستی کو ہم خدا کہتے ہیں۔

اس بحث کے بعد یہاں اس مسئلہ پر دوبارہ بحث بظاہر اعادہ معلوم ہوتی ہے مگر فی الواقع ایسا نہیں ہے، کائنات کے بہت سے پہلو ہیں جن میں سے کچھ پر "خدا ہے" میں روشنی ڈالی جا چکی ہے، لیکن بہت سے پہلو ہیں جو ابھی تشنۂ بحث ہیں، ان میں سے چند بنیادی پہلوؤں پر یہاں گفتگو ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ پوری کائنات ایک حل طلب سوال ہے، اس کا ہر پہلو ایک عظیم استفہامی نشان (؟) ہے جو ہر سوچنے والے کو پیہم

دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ انسان جب تخلیق، ربوبیت، نظم، حکمت، اور حسن کے بے شمار مظاہر ہر سُو پھیلے دیکھتا ہے تو اس کا ذہن بے ساختہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ سب کچھ کیا اور کیوں ہے؟ مرزا غالب کے الفاظ میں:

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

بعض لوگ زندگی کے ان مظاہر کو دیکھتے ہیں مگر ان کی کوئی توجیہ نہیں کر پاتے، وہ کہہ اٹھتے ہیں ؎

اک معمّہ ہے سمجھنے کا، نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے، دیوانے کا

لیکن کچھ دوسرے لوگوں کو کائنات معمّہ نظر آنے کے بجائے حقائق کا بولتا ہوا ساز محسوس ہوتی ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ان کی نظریں ہنگامۂ وجود کے پیچھے شاہدِ حقیقی کے جلوؤں کا ادراک کر لیتی ہیں ؎

ہے تجلّی تری سامانِ وجود ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں

حقیقت یہ ہے کہ یا تو آپ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے کہ کائنات ایک لاینحل معمّہ ہے اور یہ اعترافِ عجز ہی نہیں، اعترافِ جہل بھی ہے، جو کتنا ہی قیمتی ہو مگر اس کی بنیاد پر عملی زندگی کی عمارت تعمیر نہیں کی جا سکتی یا آپ یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ کائنات ایک خالق، منتظم اور منصوبہ ساز ہستی کی مرہونِ منت ہے، ان دو باتوں کے سوا جو کچھ کہا جاتا ہے اس کی حیثیت فریبِ نظر یا مغالطے سے زیادہ نہیں ہے۔

پُرپیچ اور خودکار مشینیں

ایک سادہ سی مشین کو دیکھ کر بھی آپ کی عقل گواہی دے گی کہ یہ اتفاق سے یا آپ سے آپ نہیں بن گئی، بلکہ کسی بنانے والے نے خوب سوچ سمجھ کر اسے بنایا ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص اس بات کا تصور نہیں کر سکتا کہ زمین سے مختلف دھاتیں نکل کر اتفاق سے یک جا ہو جائیں، پھر اتفاق ہی سے وہ مختلف پُرزوں میں ڈھل جائیں، پھر اتفاق ہی سے یہ تمام پُرزے ایک خاص ترتیب سے فِٹ ہو کر مخصوص مشین کی شکل اختیار کر لیں، کوئی ہوشمند انسان اس طرح کے "اتفاقات" کو تسلیم نہیں کر سکتا، پھر مشین جتنی زیادہ پُرپیچ اور دقیق ہو گی اسی قدر اتفاق سے اس کا بن جانا اور بھی ناقابلِ تصور ہو گا اور اگر مشین دقیق اور پیچیدہ ہونے کے ساتھ خود کار (آٹومیٹک) بھی ہو تو ہر شخص یہ ماننے پر مجبور ہو گا کہ یہ دقیق اور خودکار مشین کسی ماہر صنّاع کی مہارتِ فن کا ثبوت ہے۔

اُوپر جو کچھ کہا گیا ہے اگر وہ صحیح ہے اور اس کے صحیح ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے تو پھر یہ بات بدرجۂ اولیٰ صحیح ہے کہ کائنات کی تمام موجودات ایک حکیم و قدیر ہستی کی تخلیق ہیں، آپ اس کائنات کی کوئی سادہ سے سادہ شئے لے لیجئے اور سائنسی آلات کے ذریعے اس کا مطالعہ کیجئے، آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ آپ انتہائی پُرپیچ اور خودکار مشینری کا مطالعہ کر رہے ہیں جسے حل کرنے کی ہر کوشش پیچیدگی میں مزید اضافہ کا موجب ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ انسان کا سارا سرمایۂ علم وفن اور اس کے مطالعہ و فکر کی تمام قوتیں جواب دینے لگتی ہیں اور وہ ایک سادہ سی شئے کی مشینری کو پُوری طرح سمجھنے سے خود کو قاصر پاتا ہے۔ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان کا مطالعہ ہو یا کیمیائی عناصر، سالمہ اور ایٹم کا، ہر جگہ آپ کے

سے سائنٹیفک مطالعہ کا حاصل یہی کچھ ہوگا، ہر چیز آپ کو پیچیدہ مشینری نظر آئے گی۔ آپ یہ یقین کرنے پر مجبور ہوں گے کہ کائنات ایک عظیم کارخانہ ہے، جو اَن گنت چھوٹی بڑی، پُرپیچ اور خود کار مشینوں سے بھرا ہوا ہے اور یہ تمام مشینیں مسلسل اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں۔

البرٹ میکومبس ونچسٹر، ایک ماہرِ حیاتیات رقم طراز ہے:

"تپتیا گھاس کے چھوٹے سے پودے ہی کو لیں جو سڑک کے کنارے اگتا ہے، انسان کی بنائی ہوئی تمام حیرت انگیز مشینیں کہاں اس کی برابری کر سکتی ہیں۔ یہ ایک ایسی زندہ مشین ہے جو بغیر کسی دخل اندازی کے، دن رات مسلسل ہزاروں پیچیدہ قسم کے کیمیائی اور طبیعیاتی اعمال کا مظاہرہ کرتی رہتی ہے، یہ پیچیدہ ذی حیات مشین کہاں سے آ گئی؟" (خدا موجود ہے" صفحہ ۲۷۵، ۲۷۶)۔

ایڈمنڈ کارل کورنفیلڈ، ایک ماہر کیمیا لکھتا ہے:

"جتنا کوئی شخص سالمے کی ساخت کا سائنسی مطالعہ کرتا ہے اور اس کے ردِ عمل پر غور کرتا ہے اتنا ہی وہ اس چیز کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی اعلیٰ مدبر اور عظیم خالق کے وجود پر ایمان لے آئے۔ ایک جانور کے عضویاتی نظام میں ایسے پیچیدہ نامیاتی اور کیمیاوی عمل ہوتے ہیں کہ کوئی انسان انھیں پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ انسان کی بنائی ہوئی معمولی مشین کے لیے بھی ایک بنانے والے کی ضرورت ہے، پھر یہ دس ہزار گنا زیادہ پیچیدہ مشین کس طرح خود بخود بن سکتی ہے اور ارتقاء پذیر ہو سکتی ہے۔" (خدا موجود ہے"، صفحہ ۲۹۲)۔

یہی نہیں کہ ہر حیوان اور ہر انسان کی حد درجہ پیچیدہ مشین ہے بلکہ اس

مشینری کا ہر جزو بجائے خود ایک پیچیدہ مشینری ہے، مارلن بکس کریدر، ایک ماہرِ عضویات، تحریر کرتا ہے:

"ایک ماہرِ طبیعیات کی حیثیت سے مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متأثر کیا، وہ انسانی وحیوانی ڈھانچہ کی دقیق ساخت اور پیچ در پیچ ترتیب ہے۔ انسانی یا حیوانی جسم کے کسی عضو کی تخلیق یا ساخت بھی دُنیا کے ذہین ترین انسان کے بس کی بات نہیں۔" ("خدا موجود ہے"۔ ص ۱۱۴)

آگے چل کر یہی سائنسداں بطور مثال کے ایک دو اعضاء کا ذکر کرتے ہوئے دماغ کے بارے میں لکھتا ہے:

"درحقیقت دماغ کی اس مشینری کے ان گنت کام ہیں، جن کا بیان کرنا ہی ممکن نہیں۔ یہ دماغ ہی ہے جو اعضاء کو حرکت میں لاتا ہے اور صرف حرکت ہی میں نہیں لاتا، بلکہ ان پر پُورا پُورا ضبط بھی رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ دل کی حرکت اور سانس کی آمدورفت بھی اسی کے تابع ہے، قوتِ حافظہ اسی کا کرشمہ ہے، اور اسی کے نہاں خانہ میں ہزاروں شکلیں اور خاکے محفوظ رہتے ہیں اور ذرا سے اشارے پر وہ ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں، پھر کیا کسی کے لیے ممکن ہے کہ وہ دماغ کی اس صلاحیت کی کوئی طبعی توجیہ پیش کر سکے کہ وہ مشکل سے مشکل مسائل کی عقدہ کشائی کس طرح کر لیتا ہے، یا اُس میں استدلال وتدارک، خواہش وتحریک اور سکون و اطمینان کی گوناگوں خصوصیات کس طرح پیدا ہو جاتی ہیں، اسی طرح جمالیاتی ذوق اور حسن کا ادراک یا جذبات یا غیر مرئی حقائق مثلاً محبت، خودداری اور شخصیت کا ارتقاء یہ سب اسی

نفز مایہ[1] کے ایک ذرا سے مادے کے کرشمے ہیں، لیکن ان میں سے کون سی چیز ایسی ہے جس کی کوئی طبعی توجیہ پیش کرنا تو خیر الگ بات رہی، کوئی عقلی توجیہہ ہی پیش کی جا سکے۔" (خدا موجود ہے"، صفحہ ۱۱۵، ۱۱۶)

اور یہ کچھ حال دماغ ہی کا نہیں، آپ ناک، کان، زبان، آنکھ، کسی بھی عضو کا سائنسی مطالعہ کرنے بیٹھ جائیے۔ آپ اسے انتہائی پیچیدہ مشین پائیں گے۔

ان چھوٹی چھوٹی مشینوں سے مل کر ایک عظیم اور زیادہ پُرپیچ مشینری بن جاتی ہے جو بہ یک وقت بہت سے کام کرتی ہے۔ ہر حیوانی یا انسانی جسم ایک چلتی پھرتی، پُرپیچ، خود کار اور کثیر المقاصد مشینری ہے۔

اس مشینری میں سب سے زیادہ پیچیدہ چیز خود "زندگی" ہے، بے جان مادے میں زندگی کہاں سے آجاتی ہے اور وہ ہوتی کیا ہے، آج تک اسے دریافت نہ کیا جا سکا۔ یہی ماہر عضویات رقم طراز ہے:

"پھر جسمانی نظام کے ان گوناگوں کرشموں اور مظاہر کی بات نہیں، زندگی بذات خود ایک راز ہے اور ایک گتھی ہے جس کی عقدہ کشائی ساری کوششوں کے باوجود آج تک کسی سائنسدان کے لیے ممکن نہ ہو سکی۔ وہ قوتِ ناظمہ کون سی ہے جو بے شمار چھوٹے چھوٹے اور ناقابلِ امتیاز خلیوں کو حالتِ جنین میں پروان چڑھا کر مختلف صنفی ساختوں کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔" (خدا موجود ہے"۔ ص ۱۱۸، ۱۱۸)

زندگی کی اس عظیم خصوصیت کے علاوہ ان فطری مشینوں میں

---

[1] مادۂ اولی

متعدد دوسری خصوصیات ہیں جن سے انسانی مشینیں باوجود ارتقاء اب تک محروم ہیں اور یقین ہے کہ آیندہ بھی محروم رہیں گی۔

یہ فطری مشینیں، انسانی مشینوں کی طرح جامد اور بے لچک نہیں ہیں، یہ ارتقاء پذیر اور نموپذیر ہیں۔ یہ ابتدا میں بہت چھوٹی اور بہت حقیر ہوتی ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ بڑی ہو کر درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہیں۔ اگر انسان نے اس صورتِ حال کو متواتر نہ دیکھا ہوتا تو وہ یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ برگد کا عظیم الشان درخت اسی انکھوے کی ارتقایافتہ شکل ہے جو حد درجہ حقیر صورت میں زمین سے اُبھرا تھا، یا وقت کا سب سے بڑا مفکر، قائد، خطیب، شاعر، سائنٹسٹ اور موجد وہی ناتواں بچہ ہے جو عہدِ طفولیت میں علم، فکر اور اقدام و عمل، ہر چیز سے عاری تھا۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ فطری مشینیں خارج سے ان اجزاء کو پیہم جذب کرتی رہتی ہیں جو ان کے وجود سے ہم آہنگ اور ان کی زندگی کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں اور اندر سے ان اجزاء کو مسلسل خارج کرتی رہتی ہیں جو ان کے لیے مضر یا ان کی ضرورت سے زائد ہوتے ہیں، جذب کرنے اور خارج کرنے کا یہ عمل اس قدر پُرپیچ اور حیرت انگیز ہے کہ ان فطری مشینوں کے باہر ان کا دُہرانا انسان کے بس سے باہر ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان فطری مشینوں کا داخلی نظام اپنے دشمن عناصر سے لڑنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے، مارلن بکس کریدر اس خصوصیت کی طرف اس طرح اشارہ کرتا ہے:

> "جسم پر بیماریوں کے جراثیم کے حملہ آور ہونے کی صورت میں خون کے اندر دفاعی ذرّات وجود میں آتے اور نظامِ جسمانی کو بیماری سے بچاتے ہیں، پھر ہر بیماری کے لیے ان دفاعی ذرّات کی الگ اور متعین نوعیت ہوتی ہے"۔ (خدا موجود ہے ص۶۱)

چوتھی اہم خصوصیت یہ کہ ان فطری مشینوں میں سے ہر مشین اپنی جیسی بہت سی مشینوں کی پیدائش کا ذریعہ بنتی ہے، ہر درخت کے، اس کی عمر میں، بے شمار بیج پیدا ہوتے ہیں جن میں سے ہر بیج ویسا ہی ایک درخت بن سکتا ہے بشرطیکہ اُسے اُگنے کا موقع مل جائے اور یہ درخت بھی اپنے پیش رو درختوں کی طرح اپنی زندگی میں بہت سے بیج پیدا کرتا ہے اور یہ چکر یوں ہی چلتا رہتا ہے، اسی طرح ایک ایک انسان کے مادۂ منویہ میں اَن گنت خوردبینی جراثیم ہوتے ہیں جن کا ہر جرثومہ صنفِ مقابل کے اسی طرح کے جرثومہ سے مل کر انسانی قالب اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پھر یہ انسان بھی اپنے وجود کے اندر بے شمار جراثیم مخفی رکھتا ہے، جو صنفِ مقابل کے اسی طرح کے جراثیم سے مل کر انسانی قالب اختیار کر سکتے ہیں اور یہ سلسلہ یوں ہی آگے بڑھتا رہتا ہے، نباتات حیوانات اور نوعِ انسانی میں توالد و تناسل کا یہ حیرت انگیز سلسلہ اس طرح چلتا رہتا ہے کہ ہر وجود اصل نوع کی خصوصیات برقرار رکھتے ہوئے اپنی امتیازی خصوصیات کے لحاظ سے جُداگانہ و ممتاز وجود ہوتا ہے اور آپ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ توالد و تناسل کا یہ سلسلہ اندھا بہرا مشینی عمل ہے جس سے یکساں وجود ڈھل کر برآمد ہو رہے ہیں۔

تخلیق کا یہ عمل کائنات کا سب سے بنیادی پہلو ہے۔ یہ عالمِ رنگ و بُو مختلف اور بے شمار نوعیت کی اَن گنت پُرپیچ اور خودکار مشینوں سے بھرا ہوا ہے جو طویل اور غیر متعیّن عرصے سے پیدا ہوتی اور فنا ہوتی چلی آرہی ہیں اور تخلیق کا یہ عمل ایک لمحہ کے توقف کے بغیر جاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ کائنات کے اس بنیادی پہلو ــــ سلسلۂ تخلیق ــــ کی توجیہ کیا ہے؟ وہ خوردبینی جرثوموں کے ملنے سے انسانی وجود جیسی پُرپیچ، خودکار، ذی حیات اور صاحبِ ادراک و استدلال مشینری، جس کی صلاحیتوں کا کوئی

ٹھکانا نہیں، کیوں کر بن جاتی ہے؟ حیوانات و نباتات کی بے شمار قسمیں اپنی مخصوص ہیئتوں اور پُرپیچ اور دقیق مشینری کے ساتھ کس طرح وجود میں آجاتی ہیں؟ غیر نامیاتی اشیاء، کیمیاوی عناصر، زمین اور تمام اجرامِ سماوی اپنی مختلف تراکیب، مختلف ہیئتوں، مختلف خواص اور پُرپیچ مشینری کے ساتھ کس طرح پیدا ہو گئے ہیں؟

کیا یہ سب کچھ محض اتفاق سے ہو گیا؟ اگر ایک سادہ سی مشین اتفاق سے نہیں بن سکتی تو حد درجہ پُرپیچ اور خود کار مشین اتفاق سے کیسے بن سکتی ہے؟ پھر معاملہ ایک دو مشینوں کا نہیں کہ آپ "اتفاق" کہہ کر چھوٹ جائیں، سوال اَن گنت مشینوں کا ہے، اور بے شمار نوعیت کی مشینوں کا ہے، اور ذرا سی دیر کا نہیں، ہزاروں لاکھوں، بلکہ اربوں سال کے سلسلۂ تخلیق کا ہے، کیا یہ سب کچھ محض اتفاق سے ہے؟ کیا یہ سب کچھ محض اتفاق سے ہو سکتا ہے؟ ریاضی کی رُو سے ایک پروٹینی سالمے (Molecule) کی اتفاقیہ تخلیق بھی انتہائی بعید از قیاس بلکہ بعید از امکان بات ہے، چہ جائیکہ اتنے طویل و عریض سلسلۂ تخلیق کا اتفاقیہ وجود میں آجانا اور اتفاقات ہی کے بل پر چلتے رہنا[1] کلاڈ۔ ایم۔ ہیتھ وے۔ ایک ماہر سائنس داں کہتا ہے:

"چند سال پیشتر مجھے بجلی سے کام کرنے والی ایک ایسی مشین کا خاکہ بنانا تھا جو سُرعت کے ساتھ مساوات کے مشکل سوالات کا حل کر سکے، یہ مشکل مسئلہ ایک ایسی خود کار مشین کی ایجاد سے حل کر دیا گیا جو اب تک لینگلے فیلڈ میں نیشنل ایڈوائزری کمیٹی کے دفتر میں کام دے رہی ہے، اس مشین پر سال دو سال کام کرنے اور اس کی مدد سے خاکہ سازی و منصوبہ سازی کے مسائل حل کرنے

---

[1] تفصیل کے لیے "خدا ہے" کا مطالعہ کیجئے۔

سکے بعد میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایسی عمدہ مشین ایک کارفرما ذہن اور منصوبہ ساز کے بغیر وجود میں آسکتی ہے۔

ہمارے ارد گرد ربط وتنظیم ومنصوبہ سازی کا وسیع نمونہ کائنات کی صورت میں پھیلا ہوا ہے جو ہر پابندی سے آزاد بھی ہے اور ایک دوسرے سے مربوط بھی اور میرے ایجاد کردہ کہربائی دماغ سے زیادہ پیچیدہ ہے، اگر میری تیار کردہ کہربائی مشین کو ایک موجد و مدبر کی ضرورت تھی تو میری جسمانی مشین جس میں نباتیاتی، طبیعیاتی اور کیمیاوی پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں تو بطریقِ اولیٰ ایک بہترین خاکہ ساز اور منصوبہ ساز کی محتاج ہے۔" (خدا موجود ہے" صفحہ ۲۴۳، ۲۴۴)

اگر یہاں سب کچھ محض اتفاق سے ہو رہا ہے تو ہمیں سائنس کی ساری بساط لپیٹ کر رکھ دینی چاہیئے۔ کیونکہ سائنس نام ہے ان دوامی اصول وضوابط کا، جس پر کائنات اور اس کی موجودات کا قافلہ ہمیشہ گامزن رہے گا، لیکن آپ فرماتے ہیں یہاں سب کچھ محض اتفاق سے ہو رہا ہے، اتفاقات اور دوامی اصول وضوابط، ایک دوسرے کی عین ضد ہیں، اگر آپ دوامی اصول وضوابط کے قائل ہیں گے اور کون ہے جو انکار کر سکے ـــــ اور اگر آپ "اتفاقات" کے ذریعے عملِ تخلیق کے مسئلہ کو حل کرتے ہیں تو دوامی اصول وضوابط کو اور سائنس کو ہمیشہ کے لیے بھول جائیے۔

پھر اتفاقات کے ذریعے کائنات کے مسئلہ کو حل کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان اپنے اور کائنات کے مستقبل سے بالکلیہ مایوس ہو جائے جب یہاں کوئی اصول اور کوئی ضابطہ نہیں اور سب کچھ محض "اتفاق" سے ہو رہا ہے تو نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت کیا صورتِ حال پیش آئے؟ اندھے اتفاقات اندھے کی لاٹھی کی طرح ہیں جو اندھیرے میں تیزی سے گھمائی

جا رہی ہو اور جس کی گھمانے کی جگہ اور سمت بھی متعین نہ ہو، کائنات کی یہ توجیہ ناممکن ہونے کے ساتھ کس درجہ بھیانک ہے!

کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ "قانونِ فطرت" کے تحت ہو رہا ہے لیکن یہ "فطرت" کیا چیز ہے جس کے قانون کا آپ ذکر فرما رہے ہیں؟ اگر یہ مادہ سے ماورا کوئی شئے ہے تو وہ کیا ہے؟ پھر آپ خدا ہی کو کیوں تسلیم نہیں کرتے جس کا قانون مادہ پر حکمرانی کر رہا ہے؟ لیکن اگر اس لفظ سے مادہ ہی مراد ہے تو "قانونِ فطرت" کہہ کر آپ خود کو اور دوسروں کو مغالطہ میں کیوں ڈالتے ہیں؟ آپ صاف اور سیدھے الفاظ میں یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ سب کچھ مادے کے کرشمے ہیں، لیکن کیا کوئی ہوشمند شخص یہ باور کر سکتا ہے کہ بے شعور اور غیر ذی ارادہ مادہ نے خود ہی لاتعداد قوانین بنائے اور خود ہی پوری سختی کے ساتھ انہیں اپنے اوپر نافذ کر لیا؟ پھر کیا کوئی سمجھدار شخص اس بات کا یقین کر سکتا ہے کہ فکر و شعور اور ارادہ و منصوبہ سے عاری مادہ آپ سے آپ بے شمار نوعیت کی پُرپیچ اور خودکار مشینریوں کے قالب میں ڈھل گیا، جن میں کی ہر مشینری کمالِ صنعت، کمالِ حکمت اور کمالِ منصوبہ بندی کا لاجواب شاہکار ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ایک حکیم و مدبر اور مختارِ کل ہستی کو مانے بغیر - جس نے تمام اشیاء کو اپنی قدرت و حکمت سے پیدا فرمایا اور ہر شئے کو اپنی مرضی سے مخصوص وجود اور خصوصیات عطا فرمائیں ــــــ اس سلسلۂ تخلیق کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ مخلوقات کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں تو خالق کا وجود آپ کو لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا ورنہ آپ اس پورے سلسلۂ تخلیق کا انکار کرنے پر مجبور ہوں گے۔ مشرق کے عظیم فلسفی و شاعر ڈاکٹر اقبالؒ نے اس حقیقت کو ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے ؎

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود   مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

اس سلسلۂ تخلیق کو دیکھ کر، جس کی ہر کڑی قدرت، حکمت اور حسن کا لاجواب شاہکار ہے، بے ساختہ انسان کے منہ سے نکلتا ہے:

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ!

ربوبیت کے کرشمے

کائنات کا دوسرا توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ یہاں ہر شئے کے نشو و نما کا پورا سامان موجود ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک، یہاں کی بے حد و بے نہایت اشیاء کو، اپنی زندگی اور اپنے ارتقا کے لیے، بے شمار نوعیت کا بے حد و بے نہایت سامان چاہیے۔ یہ سامانِ زیست موجود ہے اور وافر مقدار میں موجود ہے۔ ایک انکھوا، جونہی زمین سے سر نکالتا ہے، ہوا، روشنی، پانی، نمکیات و معدنیات اور اُن تمام چیزوں کو اپنے اردگرد مہیا پاتا ہے جو اس کی زندگی اور اس کے نشوونما کے لیے ناگزیر ہیں۔ یہی حال حیوانات کا ہے۔ زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کے لیے انھیں جو کچھ درکار ہے وہ سب بے کم و کاست زمین پر پایا جاتا ہے۔ سب سے زائد ضروریات انسان کی ہیں۔ وہ جُوں، تُوں گزر بسر کر لینے پر قانع نہیں، اُسے متمدّن اور ترقی یافتہ زندگی درکار ہے، وہ مادّی ضروریات ہی کی تکمیل نہیں، ذوقِ جمال اور لطیف احساسات کی تسکین بھی چاہتا ہے، وہ علمی اور سائنسی ارتقا کا بھی طالب ہے، انسان کی ان گوناگوں ضروریات کی تکمیل کا سامان بھی پوری طرح موجود نظر آتا ہے۔ یہی نہیں، تمدنی، علمی اور سائنسی ارتقا کے ساتھ انسانی ضروریات جس قدر بڑھتی جاتی ہیں، نئی نئی قوتیں انسان پر منکشف ہوتی جاتی ہیں، گویا فطرت نے ان قوتوں کو اس وقت تک کے لیے چھپا کر رکھا تھا۔ جب انسان کو واقعتہً ان کی ضرورت پیش آنے والی تھی، اور نہ جانے اور کتنے ذخائر ہیں جو فطرت نے انسان کی خدمت و پرورش کے لیے

محفوظ رکھ چھوڑے ہیں۔

نباتات، حیوانات اور انسان کی ضروریات کی تکمیل کا یہ نظم صرف زمین سے متعلق نہیں ہے، زمین، سمندر، ہوا، سورج، چاند اور فضا اور خلا کے دوسرے بہت سے عوامل مل کر پیہم مصروفِ عمل رہتے ہیں تب کہیں جا کر ان ضروریات کی تکمیل کا سامان بہم پہنچتا ہے۔ زمین کے نمکیات و معدنیات ہوا کی حیات بخش لوریاں، سورج کی جانفزا حرارت، چاند کی ٹھنڈک شبنم کی تراوت اور سمندری مون سون کی روح افزا آبیاری، یہ اور اس طرح کے دوسرے عوامل جمع ہو کر کام کرتے ہیں تب کہیں جا کر گیہوں کا ایک پودا عہدِ طفولیت سے عہدِ جوانی میں قدم رکھتا ہے۔

ربوبیت کا یہی ایک پہلو نہیں ہے۔ ربوبیت کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ہر شئے کو اس کے حسبِ حال ایسا جسم ملا ہے جو اس کی ضروریات کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے اور جس کے ذریعے زمین اور فضا میں پھیلے ہوئے اجزائے حیات کو بخوبی اخذ و جذب کیا جا سکتا ہے۔ سب سے بہتر جسم انسان کو ملا ہے جو اس کی بڑھتی ہوئی تمدنی اور سائنسی ضروریات کے عین مطابق ہے۔ اسے فطرت کی طرف سے ایسا دماغ عطا ہوا ہے جس کی صلاحیتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں، اور جس کے ذریعے وہ زمین، فضا اور خلا سے متمتع ہونے کی بہترین صلاحیت رکھتا ہے۔

اگر آپ کے اردگرد ہوا موجود ہوتی، مگر آپ کے جسم میں ہوا کو جذب کرنے کا کوئی سسٹم نہ ہوتا تو ہوا کا ہونا، نہ ہونا آپ کے لیے برابر تھا۔ زمین حیات بخش غذاؤں اور لذیذ پھلوں سے معمور ہوتی مگر آپ کے پاس کھانے کے لیے منھ اور ہضم کرنے اور جزوِ بدن بنانے کے لیے معدہ اور دوسرے اعضا نہ ہوتے تو غذائیں اور پھل موجود ہوتے ہوئے بھی آپ کے لیے بیکار تھے۔ اگر آپ کے پاس حواسِ خمسہ نہ ہوتے تو دنیا میں ہوتے ہوئے بھی

آپ دنیا سے بے بہرہ ہوتے۔ دنیا آپ کے لیے تاریک اور بھیانک خلا ہوتی اور آپ کے لیے جینا ناممکن ہو جاتا۔ اگر حواسِ خمسہ ہوتے مگر قوتِ حافظہ اور قوت مفکرہ نہ ہوتیں تو آپ دنیا کو محسوس کرتے ہوئے محسوس نہ کر پاتے۔ آپ محسوس کرتے اور فوراً بھول جاتے اور بفرضِ محال کچھ یاد رہ بھی جاتا تو اس سے نتائج اخذ نہ کر سکتے۔ ذرا تصور تو کیجیے، زندگی کس قدر دشوار اور المناک ہوتی!

سوال یہ ہے کہ ربوبیت کا یہ دوہرا نظم کیا محض اتفاق سے ہے؟ کیا بے حد و بے نہایت اشیاء کی ضروریات کی تکمیل محض اتفاق سے ہو رہی ہے؟ کیا کائنات کی مختلف اور دُور دراز طاقتیں محض اتفاق سے باہمی تعاون پر آمادہ ہو گئی ہیں اور اتفاق ہی سے ان کا تعاون اشیاء کی پرورش اور ساخت و پرداخت کے کام آ رہا ہے۔ پھر کیا ہر شئے محض اتفاق سے ایسا جسم مل گیا ہے جو اس کے حسبِ ضرورت ہے اور جس کے ذریعے وہ سامانِ ربوبیت سے پوری طرح متمتع ہو سکتی ہے؟ اور کیا یہ سب کچھ لاکھوں کروڑوں سال سے محض اتفاق سے ہو رہا ہے اور آئندہ نہ جانے کب تک ربوبیت کا یہ عالم گیر نظم محض اتفاق کے بل پر چلتا رہے گا؟

پھر کیا یہ سب کچھ اندھے بہرے مادّے کی کارفرمائی ہے؟ کیا بے شعور اور غیر ذی ارادہ مادّہ ایسا عظیم، ایسا دقیق و پُرپیچ اور ایسا ہمہ گیر و عالم گیر نظم کر سکتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو آپ کو ایک ایسی ہستی کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا جسے کائنات کی گزشتہ، موجودہ اور آئندہ تمام اشیاء کا اور ان کی ضرورتوں کا علم ہو، جو اپنی بے پناہ قدرت سے ان تمام ضروریات کی تکمیل کر سکتا ہو، ساتھ ہی وہ مہربان اور پالنہار بھی ہو اور اپنی رحمت سے اپنی مخلوقات کی ضرورتیں پوری کرنا چاہتا ہو۔ ایسی ہی ہستی کا نام اللہ ہے۔

ٹامس ڈیوڈ پارکس، ایک ماہر کیمیا لکھتا ہے:

"ہم اپنے گردوپیش جو نظم و ترتیب پاتے ہیں، وہ محض قدرت کاملہ کا کوئی قہرمانی مظاہرہ نہیں، بلکہ اس کے اندر خیر خواہی کی گہری چاشنی پائی جاتی ہے۔" ("خدا موجود ہے" ص ۱۲۳)

پھر وہ مثال کے طور پر پانی کو لیتا ہے اور اس کی خصوصیات کا ذکر کرتا ہے جن کے باعث زمین پر زندگی قائم اور انسان کا جینا آسان ہے۔ پھر وہ لکھتا ہے:

"بے شمار سائنسدانوں نے پانی کی ان حیرت انگیز خصوصیات کا مطالعہ کیا ہے اور ان عجائب کی توجیہ کے سلسلے میں متعدد نظریات گھڑے ہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ عقل لڑا کر ہم چاہے اس بات کو جان لیں کہ یہ سب کچھ کس طرح ہوتا ہے لیکن یہ بتانا ہمارے بس سے باہر ہے کہ یہ سب کیوں ہوتا ہے۔ پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ معاملہ صرف پانی کی عجیب و غریب خصوصیات تک محدود نہیں، اس کائنات میں اور نہ جانے کتنے بے حد و حساب مادّے جن کی خصوصیات اتنی حیران کن ہیں کہ انسانی عقل ان کے مظاہر دیکھ کر مبہوت رہ جاتی ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، ان معجزاتِ فطرت کی میں نے تو ایک توجیہ پالی ہے ــــ ایک نہایت اطمینان بخش توجیہ ــــ اور وہ توجیہ یہ ہے کہ کائنات کا یہ بے مثل نظم و ضابطہ ایک حکیم کی حکمت کا کرشمہ ہے اور اس کائنات کا وجود ایک عظیم خالق کی کاری گری کا شاہکار ہے اور اس کائنات میں صرف یہی نہیں کہ ہر چیز کی منصوبہ بندی نہایت جامع اور مکمل ہے بلکہ اس منصوبہ بندی کے پیچھے خالقِ کائنات کی اپنی مخلوق کے لیے رحمت و

شفقت اور محبت و خیر خواہی بھی پوری طرح نمایاں ہے۔"
(زندہ موجود ہے" صفحہ ۱۳۶ ، ۱۳۷)

حقیقت یہ ہے کہ ربوبیت کے ان مظاہر کی اس کے سوا کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی کہ ایک رب کو تسلیم کیا جائے۔

نظم اور منصوبہ بندی

کائنات کا تیسرا توجیہ طلب پہلو اس کا وہ بے مثال نظم ہے جو کائنات کے گوشہ گوشہ میں جاری وساری ہے۔ آپ روز دیکھتے ہیں کہ سورج مقررہ وقت پر مقررہ سمت میں طلوع ہوتا ہے اور مقررہ وقت پر مقررہ سمت میں ڈوب جاتا ہے۔ طلوع کے ان اوقات میں اس قدر باقاعدگی ہے کہ آپ برسوں پہلے یہ پیشین گوئی کر سکتے ہیں کہ فلاں سنہ کی فلاں تاریخ کو سورج اتنے بج کر اتنے منٹ پر طلوع ہوگا اور اتنے بج کر اتنے منٹ پر غروب۔ چاند کے طلوع و غروب کا بھی یہی حال ہے۔ سورج گرہن اور چاند گرہن کے دن، تاریخ اور وقت کی بھی اسی طرح بہت پہلے سے پیشین گوئی کی جا سکتی ہے اور یہ بھی بتایا جا سکتا ہے کہ کن ممالک میں گرہن پورا یا ادھورا دکھائی دے گا اور کن ممالک میں بالکل نظر نہ آئے گا۔ سورج، چاند اور تمام سیاروں اور ستاروں کی رفتار اور ان کی گردش کے راستے متعین ہیں اور وہ اربوں سال سے اسی رفتار سے انہی راستوں پر گردش کر رہے ہیں، یہی حال خود ہماری زمین کی رفتار اور اس کی گردش کے راستے کا بھی ہے۔ کائنات کی کوئی شے اس نظم و ضبط سے باہر نہیں، یہاں جس شے کے لیے جو قوانین و ضوابط ہیں وہ ہمیشہ انہی کے تحت کام کرتی ہے خواہ وہ ایٹم اور اس کے اجزاء کی طرح حد درجہ چھوٹی ہو یا سیاروں اور ستاروں کی طرح عظیم سے عظیم تر۔

پھر یہ نظم بے مقصد نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ اشیاء کو قوانین کے

شکنجہ میں خواہ مخواہ جکڑ دیا گیا ہو۔ جہاں تک انسان کا مشاہدہ و مطالعہ اور اس کا علم کام کرتا ہے۔ اس کے نظم کے پیچھے عدیم المثال منصوبہ بندی نظر آتی ہے۔ آپ چھوٹی سے چھوٹی شئے کو لے لیجئے اور اس کا خوردبینی مطالعہ کیجئے، آپ دیکھیں گے کہ انتہائی باریک بینی کے ساتھ اسے وہی جسم ملا ہے جس کی اسے فی الواقع ضرورت تھی اور جو اس کی تمام ضروریات کو بدرجہ اتم پورا کرتا ہے۔ یہی نہیں کہ ہر شئے کی ساخت اور اس کے اعضاء میں حیرت انگیز منصوبہ بندی نظر آتی ہے۔ بلکہ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ زمین پر زندگی کا سارا ہنگامہ ایک واضح اور متعین منصوبہ کے تحت قائم ہے، جس میں ہر شئے اپنا متعین پارٹ ادا کر رہی ہے۔ پھر ——— اسی طرح کا نظم اور اسی طرح کی منصوبہ بندی ہمیں نظام شمسی بلکہ کل کائنات میں نظر آتی ہے یہ ہمہ گیر اور حیرت انگیز نظم اور فقید المثال منصوبہ بندی کیوں اور کیسے ہے؟ کیا یہ محض اتفاق کی کارفرمائی ہے؟ نظم و منصوبہ بندی اور اتفاق میں تضاد کی نسبت ہے جہاں نظم و منصوبہ بندی ہو گی وہاں "اتفاقات" کا گزر نہ ہو گا اور جہاں اتفاقات کی کارفرمائی ہو گی وہاں نظم و منصوبہ بندی کا فقدان ہو گا تو کیا مادہ کے طبعی قوانین سے اس نظم اور منصوبہ بندی کی توجیہہ کی جا سکتی ہے؟ ایسی کوئی توجیہہ نہ اب تک کی جا سکی ہے، نہ آئندہ کی جا سکے گی۔ اس کی توجیہہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک منظم اور منصوبہ ساز ہستی موجود ہے جو اپنی قدرت و حکمت سے ایک ہمہ گیر منصوبہ کے تحت کائنات کا نظم چلا رہی ہے۔

فرینک ایلن ایک ماہر سائنسداں لکھتا ہے:

"اگر یہ کرۂ زمین چاند جتنا چھوٹا ہوتا یعنی اس کا قطر اصل کی نسبت ¼ ہوتو ..... اس میں پانی اور ہوا کا وجود ممکن نہ رہتا، اس میں درجۂ حرارت چڑھتا تو انتہائی حد تک پہنچتا اور گرتا تو انتہائی

حد تک گر جاتا۔ اس کے برعکس اگر کرۂ زمین کا قطر اب کی نسبت دو گنا ہوتا تو ..... ہوا کے غلاف کا حجم خطرناک حد تک گھٹ جاتا اور اس کے دباؤ میں فی مربع انچ ۵ تا ۲ پونڈ کا اضافہ ہوتا جس کا ردِ عمل زندگی پر نہایت مہلک ہوتا۔ ہمیشہ سرد رہنے والے علاقوں میں نمایاں اضافہ ہو جاتا اور بہت تھوڑے ایسے علاقے باقی رہ جاتے جہاں زندگی اور آبادی ممکن ہو سکتی۔ ذرائع رسل و رسائل اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں آمد و رفت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہو جاتی۔ کرۂ زمین کی موجودہ جسامت، اس کے سورج کے موجودہ فاصلے اور اس کی مقررہ رفتارِ گردش ہی کے برقرار رہنے کا نتیجہ ہے کہ اس زمین پر جینا ممکن ہے اور بنی نوع انسان طبعی، ذہنی اور روحانی زندگی کی مسرتوں سے ہمکنار ہے۔" (خدا موجود ہے ص ۳۳، ۳۴)

جارج ارل ڈیوس، ایک ماہرِ طبیعات کہتا ہے:۔

" ایک عالمِ طبیعیات کی حیثیت سے مجھے کائنات کے اس ناقابلِ یقین حد تک پیچیدہ نظام کے مطالعہ کا موقع ملا ہے اور میں نے ایک ذرہ سے لے کر بڑے بڑے ستارے میں حیرت انگیز ضابطہ بندی اور نظم پایا ہے۔ اس کائنات میں روشنی کی ہر شعاع، ہر طبیعیاتی اور کیمیائی ردِ عمل اور ہر ذی حیات شئے کی ہر خصوصیت اس نظم اور اس ضابطہ کے تابعِ فرمان نظر آتی ہے۔" (خدا موجود ہے۔ ص ۱۲۵)

میرٹ اسٹینلے کان ڈان، ایک فلسفی سائنسداں رقمطراز ہے:

" آخر اس بات کو کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ سارا نظام محض کسی اتفاقی حادثے یا کوئی ٹیک لڑ جانے سے وجود میں آگیا ہے۔

یہ کس طرح ممکن ہے کہ فطری ضوابط، ہر لمحہ تغیر پذیر کائنات میں قرناً قرن سے قائم و برقرار چلتے چلے آئیں اور ان تمام ضوابط پر کائنات کے ہر گوشہ میں عمل بھی ہو، لیکن یہ سب کچھ کسی کارفرما قوت و ہستی کے بغیر ہو۔" (خدا موجود ہے صفحہ ۵۸)

کلاڈ، ایم، ہیتھ وے، انجنیئرنگ کا ایک ماہر لکھتا ہے:

"ہم جس طرح کے منصوبہ و تنظیم کے درمیان اپنے آپ کو محصور پاتے ہیں وہ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں چھوڑتا کہ ہم خدا پر ایمان لے آئیں۔" (خدا موجود ہے صفحہ ۲۴۲)

سیسل بائیس ہامان، ایک اور ماہر سائنس داں کہتا ہے:

"جب ہم آسمان پر ایک نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہم لاتعداد ستاروں کو ایک نظام میں منسلک دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ ایک رات نہیں، ایک موسم اور ایک سال نہیں، بلکہ ان گنت صدیوں سے اس فضائے بسیط میں جو گیندیں معلق ہیں وہ ایک ہی معین راستے پر گردش کرتی چلی جاتی ہیں۔ وہ اپنے مداروں پر اس نظم کے ساتھ واپس آتی اور جاتی ہیں کہ ان کے گہن کا صدیوں پیشتر بالکل صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پانی کے ایک حقیر قطرے سے لے کر جو خوردبین میں بھی بہ مشکل نظر آتا ہے فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے ان دُور دراز ستاروں تک نگاہ دوڑاؤ جنھیں دُوربین کی مدد سے ہی دیکھا جا سکتا ہے، تو تمھیں ان میں ایک فقید المثال نظم و ضبط نظر آئے گا۔ ان کے وظائف میں اس قدر یکسانیت ہے کہ ہم اس بنیاد پر قوانین مرتب کر سکتے ہیں۔ کائنات کا یہ حسنِ انتظام اس بات پر شاہد ہے کہ اس کا کوئی ناظم ضرور ہے کیوں کہ ناظم کے بغیر کسی کام

میں یکسانیت پیدا نہیں ہو سکتی"۔ (خدا موجود ہے" ص ۳۶۷، ۳۶۸)
مارلن مکس کریدر ایک اور ماہر سائنسداں لکھتا ہے:

"ایک ایسی کائنات جس میں مختلف فطری قوتیں پوری ضابطگی سے مصروف عمل ہیں اور ہر چیز میں ایسا نظم و ضبط کسی ناظم کے بغیر بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ باضابطگی اس درجہ ہے کہ سیاروں کی نقل و حرکت اور یہی نہیں بلکہ اب تو انسانوں کے خلا میں پھینکے ہوئے مصنوعی سیاروں تک کے بارے میں پیشگی یہ بتا نا ممکن ہو گیا ہے کہ وہ کس وقت کہاں ہوں گے۔ یہی باضابطگی کیمیائی ردِ عمل میں جوہری اور برقی اثرات کے تعامل میں پائی جاتی ہے اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ طبعی تغیّرات کے فارمولے اور ضابطے حساب کی رو سے متعین کرنے ممکن ہو گئے ہیں، انسانی فہم و مشاہدہ کی رو سے اس نوعیت کا نظم و ضابطہ ایک ناظم و کارفرما ذہن کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا، کیوں کہ جہاں بھی کسی کام کے پسِ پردہ کوئی منصوبہ اور اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی طاقت موجود نہ ہو، ہمارا مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ وہاں نظم و ضبط کے بجائے انتشار اور افراتفری رونما ہو گی"۔ (خدا موجود ہے" ص ۱۱۳، ۱۱۴)

یہ ہیں کائنات کے چار بنیادی پہلو، تخلیق[۱]، ربوبیت[۲]، نظم[۳] اور منصوبہ[۴] بندی۔ خدا کا انکار کرنے کے بعد ان میں سے کسی پہلو کی توجیہ نہیں ہو پاتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، گویا کائنات ایک سربستہ راز اور ایک لاینحل معمّہ ہے جسے سمجھنے کی کوئی شکل نہیں، لیکن جونہی خدا کے وجود کو تسلیم کر لیا جاتا ہے، کائنات کے ہر پہلو کی معقول اور اطمینان بخش توجیہ ہو جاتی ہے، کائنات ایک کھلا ہوا صحیفہ معلوم ہونے لگتی ہے، جس کا ہر ورق بلکہ ہر سطر

بامقصد و مربوط ہو۔ کیا یہ اس بات کا قطعی ثبوت نہیں کہ خدا موجود ہے اور کائنات کی زندہ و پائندہ اور بنیادی حقیقت ہے؟

انسانی مسائل کا حل

خدا کے بغیر کائنات کی توجیہ ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب ہم پا چکے ہیں۔ دلائل و شواہد کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ خدا کے بغیر کائنات کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ اب ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہے کہ خدا سے بے نیاز ہو کر انسانی مسائل حل ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

انسانی مسائل کیا ہیں؟ اگر ہم تمام انسانی مسائل کا استقصا کرنے بیٹھیں تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو جائے گا اور بحث کا حق پھر بھی ادا نہ ہو سکے گا، اس لیے ہم ان مختصر صفحات میں صرف بنیادی مسئلوں سے تعرض کریں گے اور یہ مسائل دو قسم کے ہیں۔ اخلاقی مسئلہ، سیاسی مسئلہ۔

اخلاقی مسئلہ

انسان کا سب سے بنیادی مسئلہ اس کا اخلاقی مسئلہ ہے۔ ہر چیز سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انسان انسان بنے، اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے اور احساسِ ذمہ داری کے تحت زندگی کے سارے کام انجام دے، ہر حال میں انصاف اور حق پر قائم رہے اور ہر حال میں انصاف ہی کا ساتھ دے۔ صرف جائز اور صحیح مقاصد کو اپنا مطمع نظر بنائے اور ان کے حصول کے لیے جائز ذرائع ہی اختیار کرے، خیانت بے ایمانی اور استحصال کی گندگی سے اپنا دامن ملوث نہ ہونے دے، جھوٹ، نفاق اور فریب دہی سے اس طرح بچے جیسے کوئی شیر کے منہ میں جانے سے بچتا ہو، عصبیت بے جا طرف داری اور اقربا پروری سے گریزاں رہے حق تلفی،

ایذا رسانی اور ظلم و تعدی کے پاس نہ پھٹکے۔ نفرت، عداوت اور بغض و حسد کے مذموم اور قابلِ نفرین جذبات سے اپنے دل کو پاک رکھے، انسانوں سے محبت کرے اور دکھ درد میں ان کے کام آئے۔ انسانی جان، مال اور آبرو کو محترم سمجھے، عہد اور قول و قرار کو ہر قیمت پر نباہے اور راستبازی اور ایفائے عہد کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے نہ چھوڑے، دیانت، امانت، اور حق شناسی حق پرستی کو اپنا شعار بنائے اور حق ناشناسی، احسان فراموشی اور حمیتِ جاہلیہ سے اپنی زندگی کو پاک صاف رکھے۔ مختصر یہ ہے کہ اخلاق، کردار اور انسانیت کا پیکر بنے۔ معمولی سے غور و فکر سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ انہی اخلاقی اوصاف پر افراد، قوموں اور پوری بنی نوعِ انسانی کی فلاح و ارتقاء کا انحصار ہے۔ مادّی و سائنسی ارتقاء انسان کے لیے اسی وقت حیات آفرین اور تعمیر بخش ثابت ہوگا۔ جب نوعِ انسانی ان اوصاف سے متصف ہو ورنہ یہی مادّی و سائنسی ارتقاء عالمگیر و ہمہ گیر ہلاکت و بربادی کا موجب بنے گا، جیسا کہ اس وقت بن رہا ہے۔

دورِ حاضر کا اہم ترین سوال یہ ہے کہ انسان اخلاقی اوصاف سے جن پر اس کی فلاح و ارتقاء کا دار و مدار ہے کیونکر متصف ہو؟ اس سوال کا تجزیہ کیجیے تو دو اہم سوالات سامنے آئیں گے۔ پہلا سوال یہ کہ اخلاقی اقدار کو تسلیم کیوں کیا جائے؟ ان اخلاقی اقدار (Moral values) کے پیچھے آخر کونسی تصدیق اور کون سا امضا و سینکشن (Sanction) ہے جس کے باعث انسان لازماً ان اقدار کو تسلیم کرے اور انھیں اپنی زندگی کی اساس بنالے۔ یہ بات کہ اخلاقی قدروں کو انسان ہمیشہ سے مانتا آیا ہے، آج کے انسان کے لیے کسی طرح قابلِ تسلیم نہیں۔ وہ گزشتہ دور کو دورِ جہالت سمجھتا ہے۔ اس نے تمام پرانے سانچوں اور نقشوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے وہ کسی چیز کو تسلیم کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اسے تسلیم کرنے

کی وجہ کیا ہے ؟ آپ بعض اوصاف کو اچھا اور بعض کو بُرا سمجھتے ہیں ۔ دورِ حاضر کا انسان پلٹ کے آپ سے پوچھتا ہے کہ اس کے اچھے اور اس کے بُرے ہونے کی سند کیا ہے ؟ خیر و شر کے یہ پیمانے آپ کو کس ماخذ سے ملے ؟ یہ سوال معقول اور فطری ہے ۔ دورِ حاضر کے معلمینِ اخلاق نے اس بنیادی سوال کا جواب دینے کی اپنی سی کوشش کی ہے ۔ مگر خدا سے بے نیاز ہو کر وہ کوئی ایسا ماخذ نہ پا سکے جو اخلاقی اقدار کے لیے واقعی سند بن سکتا ۔ علم عقل ، وجدان اور تجربہ ان میں سے جسے بھی سند اور ماخذ کا مقام دیا جائے گا وہ سند صرف اُس شخص کے لیے بنے گا جس کا علم ، جس کی عقل ، جس کا تجربہ ، یا جس کا وجدان ، ان اخلاقی قدروں کے حق میں شہادت دے ، دوسرے انسانوں کے لیے یہ شہادت بے کار ہے اور متعلقہ شخص کے لیے بھی یہ شہادت اسی وقت تک کارآمد ہے جب تک اس کی شہادت اور اس کا تجربہ بدل نہ جائے ۔ پھر یہ سوال اپنی جگہ پر رہا کہ آخر ان چیزوں کا فیصلہ انسان کے لیے ایسا حکمِ ناطق کیونکر بن سکتا ہے کہ انسان بے چون وچرا اسے مان لے ۔ مختلف چیزوں کو اخلاقی اقدار کا ماخذ ماننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قدریں متعیّن نہ رہیں ۔ جس شخص نے جس اخلاقی اقدار کو چاہا ، مان لیا ، اور اس کے لیے جو دائرۂ کار چاہا تجویز کر لیا اور جس اخلاقی قدر کا جی چاہا ، انکار کر دیا ۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بہت سے ذہنوں نے ان اقدار ہی کا انکار کر دیا انھوں نے اس بات کے ثابت کرنے میں پورا زورِ استدلال صرف کیا کہ اخلاقی اقدار کوئی حقیقت اور کوئی قیمت نہیں رکھتیں ۔ کچھ دوسرے افراد نے ۔ جن کا اثر موجودہ دور کے اجتماعی نقشہ میں بہت اُبھرا ہوا ہے ، یہاں تک کہہ دیا کہ یہ قدریں خوب صورت اور سُنہری جال ہیں ۔ استحصال کرنے والے طبقات جاگیردار اور بورژوا کے بُنے ہوئے جال ، جو غریب اور سیدھے سادے عوام کو پھانسنے کے لیے تیار کیے گئے ہیں ۔ اس بنیادی بات پر یہ پورا گروہ متفق

تھا کہ اخلاقی اقدار انسان کے پیر کی بیڑیاں ہیں جنھیں کاٹ پھینکا نہ گیا تو انسانی کارواں ٹھٹھر کر رہ جائے گا اور ارتقاء و کامرانی سے کبھی ہمکنار نہ ہو سکے گا۔

انسان چلا کہاں سے تھا اور پہنچ کہاں گیا انسان نے سفر کی ابتدا یہاں سے کی تھی کہ اخلاقی اقدار نوعِ انسان کی فلاح و ارتقاء کے لیے ناگزیر ہیں اور پہنچ یہاں گیا کہ اخلاقی قدریں انسانیت کے ارتقاء کی راہ کا سب سے بڑا روڑا ہیں، اس لیے جس قدر جلد انھیں درمیان سے ہٹا دیا جائے، بہتر ہے، ایسا کیوں ہوا؟ انسان اُس اتھارٹی کی جستجو میں نکلا تھا جس کے بل پر ان اقدار کو تسلیم کیا اور کرایا جا سکے۔ خدا سے بے نیاز ہو کر اُس نے مسئلہ کو حل کرنا چاہا مگر مسئلہ نہ حل ہونا تھا، نہ حل ہوا۔ اخلاقی اقدار کے لیے مستقل اتھارٹی نہ مل سکی جو اس مقام کی اہل ہوتی اور جس کے آگے انسان سر جھکا دیتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اخلاقی قدریں بے وزن اور بے سہارا ہو کر رہ گئیں۔ سوچنے والے دماغوں نے محسوس کیا کہ بلا کسی سند کے بعض چیزوں کو اچھا اور بعض کو بُرا کہا جا رہا ہے اور بلا کسی معقول وجہ کے، کچھ کاموں سے رُکنے اور کچھ کاموں کے کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ان میں سے جو لوگ زیادہ جری تھے۔ انھوں نے کھُلم کھُلا ان اقدار کا انکار کر دیا جو لوگ جرأت کی کمی کے باعث انکار نہ کر سکے وہ بھی تذبذب کا شکار ہو گئے اور اخلاقی اقدار پر اعتماد انھیں بھی نہ رہا۔ جو اخلاقی اصول قدیم ترین زمانے سے مسلّمات میں شمار ہوتے تھے۔ وہ اس طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیے گئے گویا وہ جہالت و حماقت کا سب سے بڑا نشان ہوں۔ اس صورتِ حال کے خوفناک نتائج منھ کھولے سامنے کھڑے ہیں۔ اخلاقی اقدار کے خاتمہ کا مطلب ہے انسانیت کا خاتمہ اور نوعِ انسانی کی مکمل تباہی و بربادی۔ جن افراد کو اس نازک صورتِ حال کا احساس ہے، وہ چاہتے ہیں کہ اخلاقی اقدار کو اُن کا کھویا ہوا مقام واپس مل جائے، مگر یہ مقام کیسے ملے؟ اس بات

سکنے سوچنے سے اُن کے دماغ عاجز ہیں۔

یہی وہ پیچیدہ صورتِ حال ہے جس کی تصویر کشی ہمارے ملک کے دماغ، پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک امریکن نامہ نگار کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کچھ عرصہ قبل کی تھی۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ پنڈت جی خدا اور مذہب کے قائل نہیں ہیں ـــــ انٹرویو کا حاصل یہ تھا کہ قوموں کی فلاح و کامرانی کے لیے اخلاقی ارتقا ناگزیر ہے، مگر اخلاقی ارتقاء کیوں کر ہو؟ یہ ایک پیچیدہ سوال ہے، پہلے اس ارتقا کا ذریعہ مذہب تھا، مگر اب، جب کہ مذہب کی گنجائش نہیں ہے، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اخلاقی اقدار کو لوگوں سے تسلیم کیسے کرایا جائے۔

پنڈت جی نے جو بات فرمائی ہے وہ موجودہ صورتِ حال اور موجودہ ذہن کی بہت بڑی حد تک صحیح تصویر کشی ہے۔ اخلاقی اقدار انسانیت کے لیے ناگزیر مگر وہ اس بنیاد پر مانی جاتی رہی ہیں کہ خدا اور مذہب نے انھیں بنیادی اہمیت دی ہے۔ خدا اور مذہب کے انکار کے بعد اخلاقی اقدار کے لیے کوئی اتھارٹی باقی نہیں رہتی اور اس کے بعد یہ توقع فضول ہے کہ انسان اپنی امنڈتی ہوئی خواہشات اور حسین و پُرکشش مفادات کے علی الرغم اِن بے سہارا اور بے قوت اقدار کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے گا نظری طور پر انکارِ خدا کا یہی نتیجہ نکلنا چاہیے اور انسانیت کا عملی تجربہ بھی اسی کی تصدیق کرتا ہے ـــــ اور اخلاقی اقدار کی پامالی کے بعد کسی کو یہ امید نہ رکھنی چاہیے کہ نوعِ انسانی ہلاکت و بربادی سے بچ سکے گی۔

لیکن جونہی آپ خدا کے وجود کو تسلیم کر لیتے ہیں، اخلاقی اقدار کو اُن کا کھویا ہوا مقام واپس مل جاتا ہے۔ خدا کی ہستی نظری طور پر بھی ان اقدار کا ماخذ اور سند بننے کی اہلیت رکھتی ہے اور نوعِ انسانی کا عملی تجربہ بھی اس کے حق میں ہے کیونکہ انسانی تاریخ میں ہمیشہ اسی بنیاد پر اخلاقی اقدار کو

تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔

خدا کو تسلیم کرتے ہی آپ اُسے اتھارٹی مان لیتے ہیں، خدا کائنات کا خالق اور فرمانروا ہے۔ اس لیے وہ اس کائنات کی آخری اور حقیقی اتھارٹی ہے، اس کی ہر بات سند اور اٹل حکم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُس کے امضا (سینکشن) کے بعد کسی امضا اور کسی سینکشن کی ضرورت نہیں۔ جب اس نے اخلاقی اصولوں کو مستقل اقدار کا درجہ دے دیا اور انھیں نظامِ زندگی کی اساس بنا دیا تو کوئی نہیں جو اس کے فیصلے کو چیلنج کر سکے۔ انسان اُس کا بندہ ہے اور بندہ کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مالک و آقا کو آخری اتھارٹی مانے اور اس کے فیصلہ اور حکم کے آگے بے چون وچرا سرِ تسلیم خم کر دے۔ یہی نہیں، خالقِ کائنات کا علم اور مدبرِ کائنات کی حکمت شک وشبہ سے بالاتر ہے، جب اس کے علم و حکمت کی رُو سے اخلاقی اقدار انسان کے لیے موجبِ فوز و فلاح ہیں تو انسان کا ناقص علم و دانش اس کی تصدیق کرے یا نہ کرے، بات ہمیشہ کے لیے طے ہو جاتی ہے اور بحث و نزاع کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

خدا اور اس کی تعلیمات کو ماننے سے صرف یہی سوال حل نہیں ہوتا بلکہ اس ضمن کی کئی الجھی ہوئی گتھیاں بھی آپ سے آپ سلجھ جاتی ہیں۔ خدا کا دین اخلاقی اقدار کی تصدیق و توثیق ہی نہیں کرتا، ان اخلاقی اقدار کو واضح اور غیر مبہم انداز میں بیان بھی کرتا ہے، پھر انہی کی بنیاد پر پوری انسانی زندگی کے لیے تفصیلی ضوابط بھی دیتا ہے، اس طرح کہ زندگی کا کوئی انفرادی یا اجتماعی گوشہ اخلاقی اصولوں کی گرفت سے نکلنے نہیں پاتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پوری انسانی زندگی اخلاق کے حسین سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ خدا کا انکار کرتے ہی یہ سارا نظام درہم وبرہم ہو جاتا ہے۔ خدا کے انکار کے ساتھ ہی خدائی تعلیمات کا انکار خود بخود ہو جاتا ہے اور خدائی تعلیمات کے درمیان

سے ہٹتے ہی اخلاقی اقدار واضح و متعیّن نہیں رہتیں، نہ وہ تفصیلی ضوابط باقی رہ جاتے ہیں جن کے ذریعے اخلاقی اصولوں کا زندگی پر انطباق ہوتا ہے، اس صورت میں اگر اخلاقی اقدار کو مار سے باندھے کسی طرح مان بھی لیا جائے تو مسائل زندگی میں ان کی کوئی عملی افادیت نہیں رہ جاتی، اخلاقی مسئلہ جُوں کا تُوں لاینحل رہتا ہے۔

دوسرا اہم سوال جس نے موجودہ دور کے علمائے اخلاقیات کو بڑی طرح پریشان کر رکھا ہے۔ اخلاقی اقدار کی پیروی کے محرکات کا سوال ہے جہاں تک اخلاق شکنی کے محرکات کا معاملہ ہے، وہ ہر طرف موجود ہیں اور بکثرت موجود ہیں۔ انسان کے اپنے سینہ میں خواہشات و جذبات کا طوفان امنڈتا رہتا ہے جو اخلاقی اصولوں کو بھلا لے جانے کے لیے بالکل کافی ہے

؎ جبر ہے، قہر ہے قیامت ہے   دل جو بے اختیار ہوتا ہے

خارجی دنیا بھی بڑی حسین اور جاذب قلب و نظر واقع ہوئی ہے، یہ رندی و ہوسناکی کی دعوت دیتی رہتی ہے؎

ساقی بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ، رہزن تمکین و ہوش ہے

پھر مادّی مفادات اور عزّت و اقتدار کے بلند مناصب ہیں جو رہ رہ کر انسان کا دامن کھینچتے اور اُسے اخلاق شکنی ہی نہیں، خود فراموشی میں بھی مبتلا کر دیتے ہیں ان روپہلے اور سنہرے فتنوں کے علاوہ قدم قدم پر شیاطین ملتے ہیں جو اس تگ و دو میں لگے رہتے ہیں کہ بدی سے دُور بھاگنے والا شخص کس طرح بدی کا لذّت آشنا ہو جائے۔ پھر تو انسان مرتے مر جائے گا مگر بدی کو چھوڑنے کا نام نہ لے گا ؎

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے!

کچھ خیالی قسم کے فلسفی کہتے ہیں کہ اخلاقی اقدار کے لیے کسی محرک کی ضرورت نہیں ہے۔ نیکی کا نیکی ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ اسے اختیار کیا جائے اور بدی، بدی ہونے کی حیثیت سے اس قابل ہے کہ انسان اس سے دُور بھاگے۔ اس کے لیے کسی اور محرک کی ضرورت نہیں؟ ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

لیکن یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ حضرات انسان کی فطرت سے قطعاً ناواقف ہیں۔ اگر ان کی بات صحیح ہوتی تو انسان جانتے بوجھتے کبھی نیکی سے انحراف نہ کرتا اور نہ بدی کا عمداً کبھی مرتکب ہوتا۔

انسان کے ہر کام کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوتا ہے اور مخالف محرکات کی موجودگی میں تو ایجابی محرکات کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ہمارے اندر اور ہمارے باہر اخلاق شکنی کے بے شمار محرکات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ بدی کے تمام خارجی موانع کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں ؎

کسی کے روکنے سے کب نزا دیوانہ رکتا ہے
بہار آئی! چلا میں! یہ دھری ہیں بیڑیاں میری

کیا یہ صورتِ حال اس کی متقاضی نہیں کہ پیرویٔ اخلاق کے شدید اور پُر زور محرکات موجود ہوں تاکہ انسان اخلاق شکنی کے بجائے پیرویٔ اخلاق کی طرف مائل ہو سکے ___ تو یہ محرکات کہاں ہیں؟

دورِ حاضر کے معلّمین اخلاق نے خدا سے بے نیاز ہو کر اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ کسی نے کہا، اخلاقی اصولوں کو اختیار کرنے کا محرک خوشی کے حصول کی توقع ہے۔ کسی نے کہا، یہ محرک تحصیل کمالات کا جذبہ ہے، کسی نے کہا سوسائٹی کے خوف اور سوسائٹی میں نیکنام

ہونے کی خواہش سے انسان برائیوں سے بچ سکتا ہے اور نیکیوں کو اختیار کر سکتا ہے۔ کسی نے اسٹیٹ کے خوف اور اس کی رضا جوئی کو محرک کا مقام دیا۔ لیکن جیسا کہ آپ کو خود محسوس ہو رہا ہوگا ان میں سے ایک شئے بھی حقیقتاً نیکی کا محرک نہیں ہے۔ خوشی یقیناً نیکی سے بھی حاصل ہوتی ہے لیکن دنیا کے اکثر و بیشتر افراد خوشی ہی کے حصول کے لیے برائیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کمال ایک مبہم شئے ہے اور بہت سے لوگ برائیوں میں سبقت لے جانے ہی کو کمال خیال کرتے ہیں اور اگر سوسائٹی میں منافیٔ اخلاق قدریں عام ہو جائیں تو تحصیلِ کمال کا جذبہ ہی ہر شخص کو اخلاق شکنی پر آمادہ کرے گا۔ سوسائٹی اور اسٹیٹ کا خوف اور اُن کی رضا جوئی کا جذبہ اسی وقت محرک بن سکتا ہے جب کہ سوسائٹی اور اسٹیٹ کی بنیاد اخلاقی اصولوں پر ہو، بہ صورتِ دیگر یہی جذبہ اخلاقی قدروں کی پامالی کا باعث بنے گا اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ انسان سوسائٹی اور اسٹیٹ کو دھوکا دے دے اور یہ سوال اپنی جگہ پر رہا کہ خود سوسائٹی اور اسٹیٹ کیونکر پابندِ اخلاق ہوں؟

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ محرکات میں سے کوئی ایک محرک بھی انسان کو بدی و اخلاق شکنی سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتا اور نہ ان میں سے کسی میں اتنا زور ہے کہ پابندیٔ اخلاق پر لوگوں کو ابھار سکے۔ یہ صورتِ حال کس قدر دردناک ہے! اخلاق شکنی کے تمام محرکات موجود ہیں اور پابندیٔ اخلاق کا کوئی محرک موجود نہیں۔ اس صورتِ حال کے کتنے خوفناک نتائج نکل سکتے ہیں، اس کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلّمہ اخلاقی اقدار کی پامالی۔ عالمگیر و ہمہ گیر پامالی جس قدر اس دور میں ہوئی اور ہو رہی ہے، چشمِ فلک نے ایسی پامالی کبھی نہیں دیکھی۔

یہ ہے خدا سے بے نیاز ہو کر اس مسئلہ کو حل کرنے کا حاصل! لیکن

خدا کو تسلیم کر لیجئے تو یہ لاینحل مسئلہ آپ سے آپ حل ہو جاتا ہے۔ انسانی اعمال پر ایک نظر ڈالیے، یا یہ اعمال کسی نقصان سے بچنے کے لیے ہوتے ہیں یا کسی فائدہ کے حصول کے لیے یا محبت و نفرت کے جذبات کے تحت آگ سے ہر شخص بچتا ہے کیونکہ آگ سے نقصان پہنچ جانے کا خوف ہوتا ہے۔ دوا کڑوی ہوتی ہے مگر فائدہ کی توقع میں انسان اسے پی جاتا ہے۔ بچہ کی پرورش سخت کٹھن کام ہے۔ مگر ماں باپ، محبت کے باعث خوشی خوشی ساری کٹھنائیاں برداشت کرتے ہیں اور اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص ان کے بچہ کا جان لیوا ہے تو وہ اس سے شدید نفرت کرنے لگتے ہیں اور یہ جذبۂ انتقام میں اندھے ہو کر وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو ان کے بس میں ہوتا ہے۔

خدا کو تسلیم کرنے کی صورت میں یہ سب محرکات پوری شدت کے ساتھ اندر جمع ہو جاتے ہیں۔ خدا کائنات کا خالق و فرمانروا ہے، اس سے یہ بات بخوبی سامنے آتی ہے کہ اس کی طاقت بے پناہ ہے، وہ اگر ناراض ہو جائے تو اس کا عذاب حد درجہ شدید ہوگا۔ اور اگر وہ راضی ہو جائے تو اس کا اجر بھی بے پایاں ہوگا کیوں کہ اس کے خزانے لامحدود ہیں۔ پھر انسان دنیا کو دھوکا دے سکتا ہے مگر خدا کو نہیں دے سکتا، انسان کا ایک ایک عمل اور اس کے دل کا ایک ایک ارادہ اور جذبہ، سب کچھ اس کی نظر میں ہے اور وہ اندھیرے، اجالے، خلوت، جلوت، ہر حال میں اسے دیکھ رہا ہے۔ انسان اس کی گرفت سے بچ کر کہیں جا بھی نہیں سکتا کیونکہ کائنات کے ذرہ ذرہ پر اس کی حکمرانی ہے۔

پھر جب خدا کی قدرت، حکمت اور اس کے اوصاف کمال کا انسان تصور کرتا ہے کائنات کے حسن و جمال میں شاہد حقیقی کے حسن کا پرتو دیکھتا ہے اور خود اس کی ذات پر خالق کائنات کی طرف سے انعامات و احسانات

کی جو بے پایاں بارش ہر دم ہو رہی ہے، ان کا اسے ادراک و احساس ہوتا ہے تو اس کا دل محبوبِ حقیقی اور محسنِ ازلی کے شکر و محبت کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے، اس کا رونگٹا رونگٹا اپنے محبوب رب کی حمد و ثنا کے ترانے گاتا ہے اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا محبوب آقا زندگی کو اخلاقی اقدار کے تحت دیکھنا پسند کرتا ہے اور بداخلاقی اور اخلاقی بے قیدی سے سخت ناراض ہوتا اور ایسے لوگوں سے نفرت کرتا ہے جو بداخلاقی کے مجرم ہوتے ہیں تو وہ خوف و طمع اور محبت کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ والہانہ اپنی زندگی کو اخلاقی اقدار کا پابند بنا لیتا ہے اور اخلاق شکنی سے اس طرح نفرت کرنے لگتا ہے جس طرح کوئی شخص اپنے شدید دشمن یا اپنی محبوب ترین ہستی کے جانی دشمن سے نفرت کرتا ہو۔

سیاسی مسئلہ

اخلاقی مسئلہ کے بعد انسان کا دوسرا اہم اور بنیادی مسئلہ، سیاسی مسئلہ ہے۔ حکومت و سیاست نے ہر دور میں سوسائٹی کے بناؤ و بگاڑ اور قوموں کے عروج و زوال میں نمایاں اور مؤثر پارٹ ادا کیا ہے، لیکن موجودہ زمانے میں تو اس کی اہمیت و طاقت پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی ہے ایک تو اس وجہ سے کہ حکومت کے ذرائع و وسائل پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ ہو گئے ہیں اور وہ اس نوعیت کے ہیں کہ افراد کو ان پر دسترس حاصل نہیں ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ حکومت کے مقابلہ میں افراد کی اب کوئی حیثیت نہیں رہی ہے۔ دوسرے اس لیے کہ حکومت نے زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پر قبضہ کر لیا ہے اور اگر ایک دو شعبوں کو بظاہر چھوڑ بھی دیا ہے تو اپنے وسیع ذرائع نشر و اشاعت اور اپنی سیاسی و معاشی چالبازیوں سے ان پر بھی اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ پھر یہ سیاست ہی ہے جس کا بین الاقوامی

اور عالمی صورتِ حال پر براہِ راست اثر پڑتا ہے اس لیے اگر سیاسی مسئلہ حل ہوتا ہے تو اس سے صرف سیاست کے مسائل نہیں ہوتے، بلکہ قوموں کے تمام داخلی و خارجی مسائل کے سلجھنے کی راہیں پیدا ہو جاتی ہیں اور بین الاقوامی صورتِ حال کے ٹھیک ہونے کے امکانات بھی روشن ہو جاتے ہیں اسی طرح اگر سیاسی مسئلہ الجھ جاتا ہے تو قوموں کے تمام داخلی و خارجی مسائل الجھ کر رہ جاتے ہیں اور بین الاقوامی فضا بھیانک اور خطرناک ہو جاتی ہے جس کا انجام موجودہ دور میں یہ ہے کہ عالمِ انسانی ایٹمی جنگ کا شکار ہو کر تباہی و بربادی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جائے۔

سیاست اپنے دائرۂ کار کی وسعت کے لحاظ سے اپنے ذیل میں گوناگوں نوعیت کے بے شمار مسائل رکھتی ہے، لیکن ان میں سے چار مسئلے بنیادی نوعیت کے حامل ہیں۔ ایک یہ کہ مقتدرِ اعلیٰ (Sovereign) کون ہو؟ دوسرے یہ کہ قانونِ زندگی کس نوعیت کا ہو اور وہ کہاں سے ملے؟ تیسرے یہ کہ قانون کو نافذ اور حکومت کو چلانے والے افراد کن اوصاف کے مالک ہوں؟ چوتھے یہ کہ قانون کی پیروی اور اس کے احترام کا جذبہ عوام اور حکمران گروہ میں کیونکر پیدا کیا جائے؟ آجکل لادین سیاست (Secularism) کا دور دورہ ہے اور دورِ حاضر کے علمائے سیاست کو اس سیکولرزم پر اس قدر ناز اور اس کے مفید اور سیاسی مسائل کے کارگر حل ہونے پر اس قدر یقین ہے کہ وہ خدائی سیاست یا حکومتِ الٰہیہ کے بارے میں کچھ سننے کے روادار بھی نہیں ہیں۔ آئیے، دیکھیں، کیا خدا سے بے نیاز ہو کر مذکورہ بالا سوالات کا اطمینان بخش جواب، علمائے سیاست پیش کر سکتے ہیں، اگر پیش کر سکتے ہیں تو وہ کیا ہیں؟

مقتدرِ اعلیٰ کون ہو؟

سیاست کا سنگِ اساس، جس پر پورے نظامِ سیاست کی عمارت

تعبیر ہوتی ہے۔ مقتدرِ اعلیٰ کا وجود ہے۔ کیونکہ جب تک فائنل اتھارٹی اور مقتدرِ اعلیٰ (SOVERIGN) کی بات طے نہیں ہو جاتی، نہ ریاست (STATE) وجود میں آسکتی ہے، نہ قانون اور دستورِ حکومت کے تشکیل پانے کا سوال پیدا ہوتا ہے، نہ عاملہ اور انتظامیہ وجود پذیر ہو سکتی ہے نہ قانون سازی کی پیروی اور اس کے احترام کے پیدا ہونے کا امکان رونما ہوتا ہے، لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بے خدا نظامِ سیاست کے صدیوں سے جاری و نافذ ہونے کے باوجود علمائے سیاست سے آج تک یہی مسئلہ، جو پورے نظامِ سیاست میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے حل نہ ہو سکا اور نہ خدا کا انکار کر کے، جو کائنات اور نوعِ انسانی کا حقیقی مقتدرِ اعلیٰ ہے اس گتھی کو سلجھایا جاسکتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ نظری طور پر اس سوال کو حل کیے بغیر، محض طاقت کے بل بوتے پر حکومتوں، قانون سازاداروں اور عاملہ و انتظامیہ کی تشکیل کر لی جائے، جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے، مگر یہ دھاندلی ہے، مسئلہ کا حل نہیں ہے اور نہ اس طرح کے جبری، غیر معقول، غیر فطری اور غیر آئینی حل سے انسانی مسائل سلجھ سکتے ہیں۔

مقتدرِ اعلیٰ کون ہو؟ یہ سوال اُسی وقت طے ہو سکتا ہے جب اُن صفات کا تعین کیا جائے جن کا مقتدرِ اعلیٰ میں پایا جانا ناگزیر ہو۔ عقلِ عام اور علمِ سیاست دونوں کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ اوصاف حسبِ ذیل ہیں:

۱ : اقتدار ذاتی ہو
۲ : اقتدار ناقابلِ انتقال ہو۔
۳ : اقتدار غیر محدود ہو۔
۴ : اس کا علم محیط اور دانش بے خطا ہو اور وہ غلطی نہ کر سکتا ہو۔

اگر اقتدار ذاتی نہیں، کسی کا عطا کردہ ہو تو مقتدرِ اعلیٰ وہ ہوگا جس نے اقتدار عطا کیا ہے، نہ کہ وہ جس نے اقتدار پایا ہے، پھر وہ دیے ہوئے

اقتدار کو چھین بھی سکتا ہے، ایسا اقتدار نہ اپنے پیچھے کوئی طاقت رکھتا ہے اور نہ وہ باقی رہنے والی چیز ہے ـــــ انسانی اقتدار کے سلسلے میں ہم دن رات یہ تماشا دیکھتے ہیں کہ جو افراد کوس لِمَن الملک بجاتے ہوتے ہیں، اچانک ان کا اقتدار ان سے رخصت ہو جاتا ہے اور پھر کوئی انھیں دو کوڑی میں بھی نہیں پوچھتا، بلکہ وہ اپنی زندگی اور اپنے اہل وعیال کی سلامتی کے لیے دوسروں کے رحم و کرم کے محتاج ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح اقتدار اگر قابلِ انتقال ہو تو اس کے صاف اور صریح معنیٰ یہ ہیں کہ اقتدار نہ ذاتی تھا، نہ حقیقی، اقتدار کی محض نمائش تھی، ایسا اقتدار کس طرح مستحکم ہو سکتا ہے اور ایسے اقتدار کو اطاعت کرانے کا کیا حق ہے؟

یہی بات اس ہستی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے جس کا اقتدار کچھ حدود کے اندر محدود ہو۔ اس صورت میں مقتدرِ اعلیٰ یہ نہیں، بلکہ وہ ہستی ہے جس نے اقتدار کو حدود کا پابند بنا دیا ہے۔ پھر یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ایسا اقتدار حدود و قیود کا پابند ہونے کے باعث نہ صحیح شکل میں نافذ کر سکتا ہے یا نافذ کرا سکتا ہے۔ جمہوری حکومتوں کی ناقص قانون سازی اور ان کی انتظامی نااہلی اس کا واضح ثبوت ہے۔ اسی طرح اگر اقتدار کا علم محیط اور دانش بے خطا نہ ہو اور وہ غلطیاں کر سکتا ہو تو ایسی ہستی نہ صحیح قانون بنا سکتی ہے نہ اسے قانون بنانے اور اطاعت کرانے کا حق ہے اور نہ ایسی ہستی کو مقتدرِ اعلیٰ بنا کر نوعِ انسانی یا کوئی قوم فلاح و کامرانی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔

پھر وہ ہستی کون ہے جو ان اوصاف سے متصف ہے؟ کون ہے جس کا اقتدار ذاتی، ناقابلِ انتقال اور غیر محدود ہے، جس کا علم کامل اور حکمت بے خطا ہے اور جو غلطیوں سے پاک ہے؟ لادینی سیاست کے علماء ایسی کسی ہستی کی نشاندہی نہ کر سکے جو حقیقتاً ان صفات کی حامل ہو۔ ان صفات کا

حامل نہ بادشاہ ہے، نہ شاہی خاندان، نہ ڈکٹیٹر اور اس کے ساتھی۔ نہ عوام کے نمائندے، نہ کوئی مخصوص طبقہ یا پارٹی، نہ کوئی قوم، نہ پوری نوعِ انسانی۔ یہ صفات ان میں سے کسی میں نہیں ہیں، یہ صفات صرف خدا میں ہیں اور خدا کا اقتدار ذاتی ہے، ناقابلِ انتقال ہے، غیر محدود ہے، اس کا علم کامل، اس کی حکمت بے خطا اور غلطی اور عیب و نقص سے پاک ہے۔ اس لیے اس کا اقتدار اقتدار ہے، اس کا قانون قانون اور وہی کائنات اور نوعِ انسانی کا مقتدرِ اعلیٰ ہے۔

ان صفات سے متصف کسی مقتدرِ اعلیٰ کو مانے بغیر سیاست کی گاڑی نہیں چلتی" لیکن لادین سیاست کے امام اس واحد ہستی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے جو حقیقتاً ان صفات سے متصف ہے۔ ان دونوں باتوں کے امتزاج نے ایک ایسے "شاہکار" کو جنم دیا جس کی نظیر علمی دنیا میں ملنی مشکل ہے یعنی اُن ہستیوں کو مقتدرِ اعلیٰ مان لیا گیا جو ان صفات کی حامل نہ تھیں اور سیاست کی گاڑی کو چلانے کے لیے بالکل غلط طور پر یہ فرض کر لیا گیا کہ مذکورہ بالا صفات ان ہستیوں میں موجود ہیں۔ علمائے سیاست کی اس حماقت و جہالت کا خمیازہ عوام کو بھگتنا پڑا۔ بادشاہ یا ڈکٹیٹر کو مقتدرِ اعلیٰ مانا گیا، نتیجہ یہ نکلا کہ مطلق العنانی اور ظلم و جور کا طوفان امنڈ آیا، عوام جور و استبداد کی اس چکی میں کب تک پستے، بالآخر انھوں نے ملوکیت و آمریت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا۔

آمریت و شہنشاہی کے خاتمہ کے بعد عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کا نظریہ سامنے آیا، اس نظریہ کو قبولِ عام حاصل ہوا اور اسے اب تک معقول ترین نظریہ کہا جاتا ہے لیکن عوام کو مقتدرِ اعلیٰ ماننے کا لازمی مطلب یہ ہے کہ اُن کے سروں پر کوئی نظامِ حکومت نہ ہو یعنی حکومت کے بجائے انارکی اور لاقانونیت کا دور دورہ ہو مگر اربابِ سیاست نہ تو عوام کے اقتدارِ اعلیٰ

کا انکار کرنا چاہتے تھے اور مدمنادرکی کا خیر مقدم کرنے کو تیار تھے چنانچہ ایک "سیاسی حیلہ" تصنیف کیا گیا۔ عوام سے کہا گیا کہ وہ اپنا اقتدار اپنے نمائندوں کے حوالے کر دیں ـــــ اگرچہ جیسا کہ جمہوریت کے امام روسو نے کہا تھا، نمائندگی بے معنیٰ اور ناممکن شئے ہے ـــــ اس سیاسی شعبدہ بازی کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام جو مقتدرِ اعلیٰ تھے، محکوم قرار پائے۔ اور چند ہوشیار افراد پوری قوم کے مقتدرِ اعلیٰ بن گئے اور شہنشاہی نے پھر جنم لے لیا۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری

جب عوام کو اس بات کا احساس ہوا کہ عوامی حکومت کے پردے میں فی الواقع چند سرمایہ داروں کی حکومت ہے تو انھوں نے اشتراکیت کے دامن میں پناہ لی، لیکن انھیں بہت جلد محسوس ہو گیا کہ پرولتاریہ ـــــ مزدور طبقہ ـــــ کی نام نہاد ڈکٹیٹرشپ فی الواقع چند آہنی اور متشدد افراد کی ڈکٹیٹرشپ ہے جو سرمایہ داروں کی حکومت سے کسی طرح مختلف نہیں۔ بلکہ وسائلِ حکومت اور ذرائعِ پیداوار، دونوں کے چند ہاتھوں میں یکجا ہونے سے ظلم و استبداد کے مواقع کئی گنا ہو گئے اور عوام کی رہی سہی آزادی بھی موت کے گھاٹ اتر گئی ہے۔ اشتراکیت کے امامِ حاضر ـــــ خروشچیف ـــــ نے اشتراکیوں کے سابق امام اور اشتراکیت کے اہم ستون ـــــ اسٹالن ـــــ کے مظالم کا جو بھیانک نقشہ کھینچا ہے، اس نے اس امر میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ اشتراکی حکومت بدترین ڈکٹیٹرشپ ہوتی ہے۔

جمہوریت و اشتراکیت دونوں سے گھبرا کر بہت سی قوموں نے فوجی آمریت کے مہیب دیو کو اپنے سروں پر مسلط کر لیا ہے، لیکن یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص پریشانیوں سے عاجز آ کر ٹرین کے سامنے لیٹ جائے۔ ظلم و استبداد اور حماقت کا یہ چکر لادین سیاست کا لازوال تحفہ ہے۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے رہ جاتی ہے چنگیزی

اور اس چکر سے اسی وقت نجات مل سکتی ہے جب کہ غلط اور فرضی باتوں پر زندگی کی عمارت تعمیر کرنے کے بجائے آپ حقیقی صورت حال کو جُوں کا تُوں قبول کر لیں۔ خُدا کائنات اور نوعِ انسانی کا فرمانروا اور مقتدرِ اعلیٰ ہے، اسے مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کیجیے۔ انسان اس کا بندہ اور نائب ہے، اس لیے اس کے بندہ اور نائب بن کر رہیے اپنے اقتدار اور اپنے قانون کو نافذ کرنے کے بجائے اس کے اقتدار اور اس کے قانون کو دنیا میں نافذ کیجئے اور جو لوگ خدا کی اطاعت اور نیکی و اخلاق میں سب سے بہتر ہوں، نظمِ حکومت چلانے کے لیے انہیں اپنا سربراہ چُنیئے۔ نظری طور پر بھی یہی بات صحیح ہے اور اسی راہ پر چل کر انسان کو امن اور عدل و انصاف کی نعمت نصیب ہوتی ہے۔

صحیح قانون کہاں ہے ؟

انسان کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے ایک قانون چاہیے۔ یہ قانون کیا ہو ؟ معمولی سے غور و فکر کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ قانون میں حسب ذیل خصوصیات ہونی چاہئیں :

۱ : اس کی بنیاد صحیح علم اور بے خطا فکر پر ہو۔

۲ : اس میں تمام انسانوں کے ہمہ جہتی ارتقا کا سامان ہو۔

۳ : ہر فرد، ہر گروہ، ہر فرقہ، ہر صنف اور ہر طبقہ کو اس سے عدل و انصاف کی نعمت ملے۔

۴ : وہ اس ہستی کی طرف سے ہو جو اقتدار اور قانون سازی کی مستحق ہو۔

کیا اس طرح کا قانون کوئی ڈکٹیٹر یا کوئی شہنشاہ دے سکتا ہے ؟ یقیناً

نہیں، نہ اس کے پاس ایسا علم ہے اور نہ وہ اس طرح کا قانون بنانے کی کوشش کرکے اپنی آمریت یا شہنشاہی کو خطرہ میں ڈالنا گوارا کرے گا تو کیا عوامی نمائندے اس طرح کا قانون بنا سکتے ہیں؟ یقیناً نہیں، کیوں کہ وہ بھی صحیح علم اور بے خطا فکر سے محروم ہیں اور اس کے اندر بھی ایسا ظرف نہیں ہے کہ وہ سب انسانوں کے ساتھ یکساں انصاف اور سب کے لیے یکساں ارتقا کی بات سوچ سکیں، نہ انھیں اقتدار جمانے یا قانون بنانے کا حق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا قانون بنانا کسی بھی انسان یا انسانوں کے کسی بھی چھوٹے بڑے مجموعے کے بس کی بات نہیں، انسان کا علم سخت ناقص ہے، اس کی فکر بہت زیادہ غلطیاں کرتی ہے، پھر خدا اور اخلاق سے بے نیاز ہونے کے باعث وہ حددرجہ تنگ نظر، ظالم اور متعصب ہو گیا ہے اس لیے اس سے کسی صحیح اور عادلانہ قانونِ حیات کی توقع رکھنا حد درجہ حماقت کی بات ہے اور انسان کا پورا سرمایۂ علم، اس کی دستوری و قانونی کاوشیں اور اس کے ہاتھوں تشکیل پائے ہوئے نظام ــــ بادشاہت، آمریت، نازی ازم، جمہوریت اور کمیونزم ــــ اس حقیقت کے شاہدِ عدل ہیں۔ انسان کو ان میں سے کسی نظام اور کسی دستور میں عدل، امن، سکون اور ارتقا کی نعمت نہ مل سکی ــــ صحیح قانون صرف اس ہستی کا ہے، جو کائنات اور نوعِ انسانی کا مقتدرِ اعلیٰ ہے، جس کا قانون پوری کائنات میں نافذ ہے جس کا علم فطرتِ انسانی اور نظامِ کائنات کے مخفی سے مخفی گوشوں کو محیط ہے اور جو سب انسانوں کا خالق و پروردگار ہونے کے باعث سب کے ساتھ انصاف اور سب کے لیے ارتقا کے مواقع فراہم کرنا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قانون سازی کا اقتدارِ اعلیٰ سے بہت گہرا رشتہ ہے، اگر انسان مقتدرِ اعلیٰ نہیں بن سکتا تو وہ قانون بنانے کا بھی حقدار نہیں، نہ وہ صحیح

قانون بنا سکتا ہے ۔ خدا کائنات اور انسان کا مقتدرِ اعلےٰ ہے اس لیے وہی قانون بنانے کا اہل ہے اور اسی کا بنایا ہوا قانون صحیح ہوسکتا ہے ۔

حکمران گروہ کے اوصاف

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ سیاست کا نظریہ اور حکومت کا دستور خواہ کچھ ہو اگر نظمِ حکومت چلانے والا گروہ عدل وانسانیت کے اوصاف سے متصف ہے تو ناقص سے ناقص دستور میں انسان کو کچھ نہ کچھ امن وسکون مل سکتا ہے ، لیکن اگر حکمران گروہ بددیانت ، خائن اور ظالم ومتعصب ہو تو اچھے سے اچھے دستور کے ہوتے ہوئے بھی ظلم واستبداد کا دَور دورہ رہے گا ۔ حکومتوں کے کاغذی دستور کے مقابلے میں حکمران پارٹی اور انتظامیہ کا عملی رویہ وہ حقیقی قانون ہوتا ہے جس سے افراد اور قوموں کی زندگیاں بنتی اور بگڑتی ہیں ، لیکن خدا اور مذہب کو سیاست سے خارج کرنے کے بعد ، اخلاقی قدریں خود بخود رخصت ہوجاتی ہیں ، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لادین سیاست میں ایسے افراد اُوپر آتے اور پارٹیوں اور قوموں کے سربراہ بنتے ہیں جو اخلاق وکردار سے عاری اور مکروفن اور دروغ گوئی وفریب دہی میں طاق ہوتے ہیں ان بے اخلاق بلکہ اخلاق باختہ افراد سے دیانت وامانت اور عدل وانسانیت کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی ۔ لادینی سیاست کی اسی فطرت کی بدولت ، عدل ، امن مساوات اور انسانیت کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود عالمِ انسانی ، انصاف ، آشتی ، اور انسانیت کو ترس رہا ہے ۔

اس المناک صورتِ حال کا اس کے سوا کوئی حل نہیں کہ انسان دین و اخلاق کو پھر سے زندگی کی اساس بنائے ، خدا کو مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کرکے پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اس کی بندگی میں دے دے اور سیاست میں ایسے ہی افراد کو آگے بڑھنے کا موقع دے ، جو خدا ترسی کا پیکر ، انسانیت کا

نمونہ اور اخلاق کا مجسمہ ہوں۔ ایسے ہی افراد کے سایۂ حکومت میں انسان عدل، آشتی، انسانیت اور ارتقا کی نعمتیں پاسکتا ہے اور پاتا رہا ہے۔

قانون کا احترام

اگر قانون کسی ایسی ہستی کا بنایا ہوا ہے جو حقیقی مقتدرِ اعلیٰ ہے، اگر قانون صحیح علم اور بے خطا حکمت پر مبنی ہے اور اگر قانون میں سب کے لیے عدل اور ارتقاء کی ضمانت ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی پیروی اور اس کے احترام کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں پیدا نہ ہو۔ جیسا کہ خدائی قانون کے سلسلے میں ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے جو خدا کو تسلیم کرتا ہے اور اگر قانون ان صفات سے تہی دامن ہوگا۔ جیسا کہ ہر انسانی قانون ہوتا ہے تو اس قانون کے احترام کا جذبہ پیدا کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوگی اور عوام اور حکمران گروہ دونوں قانون شکنی کا ارتکاب کرتے رہیں گے۔ جیسا کہ آج پوری دنیا میں ہو رہا ہے۔

خدا اور اس کے قانون کو تسلیم کیے بغیر انسانی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

باب چہارم

ملحدین کے شبہات

کیا خدا انسانی کمزوری کی پیداوار ہے؟

خدا انسانی کمزوری کی پیداوار ہے؟ یہ ایک خیال ہے جسے ملحدین پوری سنجیدگی سے پیش کرتے ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک انسان قدیم ترین زمانے سے خدا کو صرف اس لیے مانتا رہا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو کمزور محسوس کیا، اسے سہارے کی تلاش ہوئی اور اس نے ایک ہستی کو فرض کر کے اُسے خدا کا نام دے دیا۔ دورِ حاضر کا انسان فطرت پر فتح پا چکا ہے اس لیے اسے ایسی ہستی کو فرض کرنے کی ضرورت نہیں، آج کا انسان خود اپنی طاقت پر بھروسا رکھتا ہے، وہ آپ اپنا مشکل کشا ہے، وہ آپ اپنا خدا ہے۔

لیکن کیا یہ صورت واقعہ کی صحیح تصویر کشی ہے؟ کیا خدا کو صرف اس لیے مانا گیا کہ انسان کو ایک سہارے کی تلاش تھی اور اس نے کسی ٹھوس دلیل کے بغیر ایک خیالی ہستی کو سہارا بنا لیا۔ کیا آفاق و انفس میں وجودِ باری تعالیٰ پر کوئی دلیل نہیں ہے؟ کائنات کے آثار، انسانی نفسیات اور مذاہب عالم کا وسیع اور مدلل لٹریچر اس کی تردید کے لیے کافی ہیں اور خود ہم "خدا کا انکار کیوں" "خدا ہے" اور "کیا خدا کی ضرورت نہیں" میں اس مسئلہ پر فیصلہ کن

بحث کر چکے ہیں۔

پھر کیا ہزاروں سال کی طویل مدت میں وہمیوں اور تھڑدلوں نے خدا کو مانا اور ارباب علم و دانش اور اصحاب شجاعت و عزیمت نے خدا کا انکار کیا ہے؟ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب کے غلبہ سے قبل نوعِ انسانی عموماً خدا کو مانتی رہی ہے اور جن اساطینِ علم اور اکابر رجال کے آگے انسانی سر اعتراف عظمت سے جھک جاتا ہے اور جن ارباب شجاعت و عزیمت نے دنیا سے اپنی شجاعت و اولوالعزمی کا لوہا منوایا ہے، تقریباً وہ سب کے سب خدا کو ماننے والے تھے۔

آج بھی، جب کہ الحاد کے ہاتھوں میں زمام اقتدار اور امامت تہذیب و فن ہے انسانوں کی عظیم اکثریت خدا کی قائل ہے اور مشرق و مغرب کے بہت سے مفکرین، فلاسفہ اور ارباب علم و دانش خدا کی ہستی کے معترف ہیں۔ سائنس اور سائنسدانوں کا نام الحاد کی تائید میں خصوصیت سے لیا جاتا ہے، لیکن کیا یہ صحیح ہے؟ جو شخص بھی سائنس اور اہلِ سائنس کے جدید ارتقاء سے باخبر ہوگا۔ وہ اس کا جواب نفی میں دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور الحاد کے مابین کوئی ربط نہیں، اس کے برعکس سائنس کے تمام انکشاف وجودِ باری تعالے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اسی طرح جن سائنس دانوں نے سائنس کی دنیا میں گہرے اثرات چھوڑے ہیں ان کی اکثریت خدا کی معترف یا کم از کم اس مسئلہ میں خاموش ہے اور اس خاموشی کی وجہ یہ ہے کہ خدا ہونے کا مسئلہ اصلاً سائنس کا نہیں، فلسفہ کا موضوع ہے۔ سائنس مادہ، مادی کائنات اور کائنات کے قوانین سے بحث کرتی ہے، کائنات کے اوپر کوئی طاقت ہے کہ نہیں، سائنس کا براہ راست اس سے کوئی تعلق نہیں۔ سائنس کی اسی خصوصیت کے باعث سطحی نظر رکھنے والوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ سائنس مادیت کی قائل اور خدا کی منکر ہے اور جب کہ کچھ

سائنس دانوں نے خدا کا انکار کر دیا تو لوگوں نے اس انکار کو سائنس اور اس کی تحقیقات کا نتیجہ سمجھ لیا، حالانکہ سائنس خدا کا انکار کرتی ہے۔ یہ کہنا سائنس اور اس کے موضوع سے عدمِ واقفیت کا نتیجہ یا دانستہ اس کا غلط استعمال ہے۔ "خدا ہے یا نہیں" یہ مسئلہ سائنس کے موضوع سے فی الحقیقت خارج ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ خدا کو صرف اس لیے مان لیں کہ قدیم ترین زمانے سے نوعِ انسانی اسے مانتی آئی ہے اور ان ماننے والوں میں بڑے بڑے لوگ شامل ہیں۔ یقیناً خدا کا اقرار یا انکار دلائل ہی کی بنیاد پر ہونا چاہیے ہم اسی کو صحیح سمجھتے اور ہم نے اسی راہ کو اختیار کیا ہے۔ ملحدین سے بھی ہمارا مطالبہ یہی ہے کہ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بجائے وہ اپنے موقف کو دلائل سے ثابت کریں۔ خدا انسانی کمزوری کی پیداوار ہے، یہ کوئی دلیل نہیں محض ایک دعوے ہے جس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں اور اس کی تردید کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ تاریخی تسلسل کے ساتھ بہت سے اربابِ علم و فکر اور اصحابِ عزیمت و شجاعت خدا کے آگے سر جھکاتے رہے ہیں۔ ہاں جو لوگ اپنے سوا تمام انسانوں کو وہمی اور بزدل سمجھتے ہیں؟ وہ چاہے فرما سکتے ہیں، لیکن ایسے برخود غلط لوگ ہم انسانوں کی قیادت و رہنمائی اور انسانی مسائل کو حل کرنے کے اہل نہیں ہیں، خدا انسانی کمزوری کی پیداوار ہے، اس طرح کی پھبتی باتیں کر کے ملحدین خدا پرستی کے موقف کو تو کمزور نہیں کر سکتے البتہ خود اپنے موقف کو کمزور کر لیتے ہیں وہ اس طرح اس بات کا ثبوت فراہم کر دیتے ہیں کہ ان کے پاس طنز، استہزا اور لغو و بے بنیاد باتوں کے سوا کوئی بھی سنجیدہ دلیل نہیں ہے، کتنی حیرت انگیز ہے یہ حقیقت کہ جن لوگوں نے خدا پرستوں کا نفسیاتی تجزیہ کر کے انھیں وہمی اور کم عقل ثابت کرنا چاہا تھا۔ انھوں نے اپنی اس حرکت سے خود اپنی نفسیاتی اور عقلی کمزوری پر سے پردہ اٹھا دیا۔

آج کا فریب خوردہ انسان اس تصوّر سے سرشار ہے کہ اس نے فطرت پر فتح پالی ہے اور اسی لیے اس کا سر کبر و غرور خدا کے آگے جھکنے میں اپنی ذلت محسوس کرتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں۔

فطرت پر فتح پانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان قوانینِ فطرت (Laws of Nature) کی غلامی سے آزاد ہو جائے اور ان کا محکوم ہونے کے بجائے ان کا حاکم بن جائے، لیکن اس میں انسان کو شمّہ بھر بھی کامیابی نہیں ہوئی ہے اور آئندہ بھی کامیابی کا کوئی امکان دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔ انسان قوانینِ فطرت میں جس طرح پہلے جکڑا ہوا تھا ٹھیک اسی طرح آج بھی جکڑا ہوا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے انسان کو فطرت کے تھوڑے سے قوانین کا علم تھا اور اب اسے کچھ زیادہ قوانین کا علم ہو گیا ہے، لیکن اس سے انسان کی حیثیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ وہ پہلے بھی قوانینِ فطرت کا پابند اور فاطرِ کائنات کا تابع فرمان تھا اور آج بھی اس کی یہی حیثیت باقی ہے۔ پہلے بھی ذرائع و وسائل کی فراوانی اور دولت کی بہتات اور اقتدار کے نشے میں انسان آپے سے باہر ہو جاتا اور خدا کے آگے سر جھکانے میں اپنی ذلت محسوس کرتا تھا اور آج کا انسان بھی علم و تہذیب سے آراستہ ہو کر کبر و غرور کی اسی جاہلی تاریخ کو دہرا رہا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہوا ہے کہ دورِ قدیم کا متکبر و خود سر انسان خدا کی نافرمانی تو کرتا تھا مگر اس کا انکار نہ کرتا تھا، لیکن آج کا متکبر انسان خدا کے وجود ہی سے انکار کر رہا ہے اور اس طرح اس نے کبر و غرور کے جاہلی جذبہ کی تکمیل کر دی ہے۔

انسان کی کمزوری

انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ دولت و اقتدار پا کر بہت جلد بہک جاتا ہے اور اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ وہ مصالح و مصلح بننے کے

بجائے ظلم وفساد اور شیطنت کا پیکر بن جاتا ہے۔ پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے اور علم وتہذیب کے سارے ارتقاء کے باوجود انسان آج بھی اسی کمزوری کا شکار ہے اور پہلے سے زیادہ شکار ہے۔ آج دنیا میں ہر سمت فتنہ و فساد کے جو اکھاڑے "قائم ہیں اور دنیا کے "بڑے" جس طرح ان اکھاڑوں کو پروان چڑھا رہے ہیں اور دنیا کو جانتے بوجھتے مہیب ایٹمی جنگ کی طرف دھکیل رہے ہیں اس کے پیچھے انسان کی یہی کمزوری کارفرما ہے۔ دورِ حاضر کا انسان علم وسائنس کی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود اس کمزوری کا، جو پوری انسانیت کو ڈبو دے گی، کوئی علاج دریافت نہ کر سکا۔ وہ جو خلا میں سفر کرنے، زمین کے گرد چکر لگانے اور چاند پر کمند ڈالنے کے قابل ہو گیا اسے زمین پر انسان کی طرح چلنا نہ آیا۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا اقبالؒ

اس کمزوری کا آزمودہ کارگر علاج ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ انسان پر اس کی صحیح حیثیت واضح کردی جائے۔ اس کے اندر اس بات کا یقین پیدا کر دیا جائے کہ وہ معدوم تھا، خالقِ کائنات نے اسے وجود بخشا۔ اسے بہترین صلاحیتوں سے نوازا اور اسی کی ربوبیت وپروردگاری کے سہارے اس کی زندگی کی گاڑی چل رہی ہے۔ وہ سراپا اس کا محتاج ہے، اس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اس کا بندہ اور اس کا محکوم ہے اور اپنے اعمال واقوال میں اس کے سامنے جواب دہ ہے۔ اگر اس نے خدا فراموشی، ظلم وفساد اور انسانیت کشی کی راہ اختیار کی تو وہ کائنات کے عظیم فرمانروا کے سخت عذاب سے بچ نہ سکے گا حتیٰ کہ موت بھی اس عذاب کی راہ میں

حائل نہ ہو گی۔ اس شدید اور ابدی عذاب سے نجات پانے کی اس کے سوا کوئی شکل نہیں ہے کہ وہ خدا کا بندہ اور انسان بن کر رہے۔

خدا کے تصور اور اس کے حضور جواب دہی کے اس یقین نے دولت و اقتدار کی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد انسان کو بہکنے سے بچایا ہے اسے اور ظالم اور خود سر بننے نہیں دیا ہے۔ اس ایک یقین کے علاوہ انسانیت کی پوری تاریخ انسان کو قابو میں رکھنے کی کسی اور تدبیر سے ناآشنا ہے۔ کل بھی یہی نسخہ کارآمد تھا اور آج بھی یہی نسخہ کارآمد ہے، ملحدین اس نسخے کو پوری بے دردی سے ضائع کر دیتے ہیں مگر نوع انسانی کو کوئی اور نسخہ فراہم کر کے نہیں دیتے، اب اگر انسان ظالم اور خود سر بنتا ہے اور دنیا تباہی و بربادی کے مہیب کھڈ میں جا گرتی ہے تو ان کی بلا سے، وہ اس کے ذمہ دار تھوڑا ہی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انسان پہلے کمزور تھا اس لیے خدا کو ماننے پر مجبور تھا۔ آج کا انسان کمزور نہیں ہے، وہ بے پایاں طاقت رکھتا ہے، اس لیے اسے کسی ان دیکھی طاقت کے آگے سر جھکانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ آپ اپنے مسائل سے نمٹ سکتا ہے۔

لیکن بدترین خود فریبی ہے جس میں کوئی انسان مبتلا ہو سکتا ہے۔ انسان پہلے بھی کمزور تھا اور آج بھی ہے، وہ پہلے بھی مخلوق اور سراپا احتیاج تھا اور آج بھی اس حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ قدرت انسان کو جو جسم، جو صورت اور جو صلاحیتیں دے کر دنیا میں بھیجتی ہے، انہی کو لیے ہوئے وہ دنیا میں آجاتا ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو حسبِ منشا منتخب کرنے کی آزادی نہ انسان کو پہلے حاصل تھی، نہ آج ہے، نہ آئندہ کبھی حاصل ہو گی۔ حالانکہ انسانی زندگی کی تعمیر اسی بنیاد پر ہوتی ہے۔ انسان کو پہلے بھی یہ قدرت حاصل نہ تھی کہ وہ اپنی پیدائش کے لیے خاندان، مقام، وقت

اور حالات کا اپنی مرضی سے انتخاب کر لے۔

آج بھی اسے یہ قدرت حاصل نہیں ہے اور وہ آئندہ بھی اس معاملہ میں مجبورِ محض رہے گا! حالاں کہ یہ سب امور انسان کی زندگی اور اس کے مستقبل کے سلسلہ میں فیصلہ کن پارٹ ادا کرتے ہیں۔ پیدائش کے وقت انسان ایک مضغۂ گوشت ہوتا ہے جس کی پرورش و نگہداشت نہ کی جائے تو اس کی صلاحیتوں کا ارتقاء درکنار، اس کا زندہ رہنا بھی ناممکن ہے۔ انسان کی یہ بے بسی علیٰ حالہ قائم ہے۔ انسان معدومِ محض ہوتا ہے، پھر وہ کمزوری و بے چارگی کے عالم میں پیدا ہوتا ہے، پھر دورِ شباب میں قوتوں سے مالا مال ہوتا ہے، پھر وہ بڑھاپے کا شکار ہوتا ہے اور اس کی قوتیں ایک ایک کر کے جواب دینے لگتی ہیں حتّیٰ کہ موت کے مہیب جبڑے اس کے وجود کو چبا کر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ انسان جس طرح اس معاملے میں پہلے بے بس تھا آج بھی بے بس ہے اور اس بے بسی سے چھٹکارا پانے کا کوئی امکان نہیں ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (بقرہ)

تم کیونکر اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم زندگی سے محروم تھے تو اللہ نے تمھیں زندگی بخشی۔ پھر وہ تمھیں موت دے گا پھر وہ تمھیں زندہ فرمائے گا۔ پھر تم اسی کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً (روم)

اللہ وہ ہے جس نے تمھیں کمزوری سے پیدا کیا پھر کمزوری کے بعد قوت بخشی، پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا پیدا کیا۔

انسان پہلے بھی ہوا، گرمی، پانی اور غذا کا محتاج تھا اور ان کے بغیر زندہ نہ رہ سکتا تھا اور آج بھی اس کی یہ کمزوری جوں کی توں باقی ہے۔ بیماریاں پہلے بھی انسان کو پریشان کرتی تھیں اور اس کی زندگی کیلئے خطرہ بن جاتی تھیں اور یہی صورتِ حال اب بھی برقرار ہے، بیماریوں پہ غلبہ پانے کا جو غلغلہ ہے اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ کچھ پرانے امراض گھٹے ہیں تو کچھ دوسرے نئے اور پیچیدہ امراض نے جگہ لے لی ہے اور ٹی بی اور کینسر اور ہارٹ اٹیک جیسے مہلک امراض عام ہوتے چلے جا رہے ہیں جنگی اسلحہ انسان کے لیے پہلے بھی وجۂ ہلاکت تھے اور آج بھی ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ قدیم اسلحہ کے ساتھ بے شمار نئے اسلحہ کا اضافہ ہو گیا ہے جو پرانے اسلحہ سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں اور ان میں سے بعض بعض تو پوری انسانی دنیا کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہیں مثلاً ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم۔ اور انسان ہے کہ اپنی اس ہلاکت کے عظیم سرو سامان کے آگے بالکل بے بس ہے۔ پہلے انسان پر خشکی، تری اور ہوا سے موت اور ہلاکت کی بارش ہوتی تھی، اب یہ بارشِ ہلاکت خلا سے بھی ہو سکے گی۔ قدرتی حوادث کا شکار انسان پہلے بھی ہوا کرتا تھا، مگر اب تیز رفتار سواریوں اور سائنسی ایجادات نے قدرتی حوادث کے ساتھ مشینی حوادث کا ہولناک اضافہ کر دیا ہے۔ انسانی مسائل آج سے قبل بھی پیچیدہ تھے، لیکن آج وہ لاینحل ہو کر رہ گئے ہیں اور کسی ناخنِ تدبیر سے سلجھنے کا نام نہیں لیتے۔ مختصر یہ کہ عام انسان بھی آتنا ہی کمزور و لاچار ہے جتنا پہلے کبھی تھا۔ بلکہ پہلے سے بہت زیادہ ہے ارباب اقتدار اور اربابِ ثروت تو وہ پہلے کی طرح آج بھی دوسرے انسانوں کے محتاج ہیں۔ اگر یہ سہارا ختم ہو جائے تو بڑے سے بڑا انسان بھی عام انسانوں سے زیادہ کوئی مقام نہیں رکھتا اور یہ سہارا آئے دن دھوکا دیتا رہتا ہے۔

اُمید اور بے خوفی کا راز

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ انسان اپنی بہترین صلاحیتوں اور اعلیٰ ترقیات کے باوجود بے بس ہے۔ اب یا تو آپ یہ مانیے کہ وہ کائنات کی اندھی بہری طاقتوں کے ہاتھ میں بے بس کھلونا ہے جو اسے نہ جانے کب توڑ پھوڑ کر رکھ دیں اور اس کے سارے منصوبوں کو آن کی آن میں خاک میں ملا دیں یا آپ یہ مانئے کہ انسان اس ہستی کا محکوم اور اس کے آگے سراپا احتیاج ہے جس کے قوانین میں پوری کائنات جکڑی ہوئی ہے، ان دو باتوں میں سے ایک بات آپ کو تسلیم کرنا ہو گی۔ اگر آپ پہلی بات کے قائل ہیں تو آپ کو ایک سوال کا جواب دینا ہو گا۔ اور وہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کائنات کی اندھی بہری طاقتوں کے آگے کمزور و بے بس نظر آتا ہے۔ اسی طرح خود یہ قوتیں قوانینِ فطرت کے آگے لاچار اور مجبور نظر آتی ہیں۔ پھر وہ کون ہے جس کے مقرر کردہ قوانین میں یہ تمام قوتیں جکڑی ہوئی ہیں؟ جس ہستی کا قانون پوری کائنات میں نافذ ہے اسی کے قانون کی حکمرانی انسانی وجود پر بھی ہے۔ لیکن اس بات سے قطعِ نظر مادی جبریت کا یہ نقطۂ نظر انسان کو خوف اور مایوسی کے عمیق غار میں دھکیل دینے والا ہے۔ ذرا تصور تو کیجیے، کوئی ایک طاقت نہیں بے شمار طاقتیں ہیں جو انسان کو کھا جانے کے لیے ہر طرف منہ کھولے کھڑی ہیں۔ یہ طاقتیں شعور نہیں رکھتیں کہ ان سے کسی رحم یا انصاف کی توقع کی جا سکے یا انھیں راضی کر کے ان کے غضب سے بچنے کی کوئی تدبیر اختیار کی جا سکے۔ اس نقطۂ نظر کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ انسان اپنے مستقبل سے مایوس ہو جائے اور اس کی پوری زندگی خوف و ہراس کی نذر ہو جائے۔ برطانیہ کے مشہور ملحد فلسفی، برٹرینڈ رسل، کائنات کی مادی توجیہ کو ان الفاظ میں بیان

کرتا ہے :

"انسان اندھی بہری طاقتوں کے ہاتھ میں ایک ایسا بے بس کھلونا ہے جس کا کوئی مقصد نہیں، اس کی پیدائش اور ارتقاء، اس کی آرزوئیں اور تمنائیں اس شے کے اعتقادات و تصورات، سالمات کے تعامل کا نتیجہ ہیں۔ اس کی زندگی کی انتہا قبر ہے اور اس کے بعد کوئی احساس اور کوئی نظریہ اسے زندگی عطا نہیں کر سکتا، صدیوں کی جدوجہد، نصب العین سے وابستگی، عبقریت کے کارہائے نمایاں، سب نظام شمسی کے ساتھ ختم ہونے والی چیزیں ہیں۔ جب کائنات زیر و زبر ہو گی تو انسانی کمالات بھی اس کے ملبے کے نیچے دب کر رہ جائیں گے۔"

کس قدر بھیانک اور یاس انگیز ہے یہ نظریہ، جس کسی کو یہ نقطۂ نظر اپیل کرتا ہو۔ وہ بے تامل اسے اپنائے۔ ہمیں تو جو بات مبنی بر حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کائنات کی اندھی بہری طاقتوں کے ہاتھ میں بے بس کھلونا ہونے کے بجائے فرمانروائے کائنات کا محکوم ہے جو کامل شعور اور عمیق حکمت کے ساتھ کائنات کا نظم چلا رہا ہے وہ اپنی مخلوقات پر انتہائی مہربان ہے اور جو بندے اس کی مرضی پر چلتے ہیں ان کے لیے اس کی رحمت و نصرت کے دروازے وا ہو جاتے ہیں اور کائنات کی قوتیں ان کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہیں، دنیا کی کوئی طاقت ایسے افراد کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ خدا پرستی کا یہ نقطۂ نظر صحیح ہونے کے ساتھ انسان کو خوف و ہراس اور یاس و نومیدی سے بچانے والا اور امید اور بے خوفی کی راہیں اس پر کھولنے والا ہے۔

یہ ایک تاریخی و نفسیاتی حقیقت ہے کہ خوف اور مایوسی فرد اور قوم دونوں کے لیے سم قاتل ہیں، اس کے برعکس بے خوفی اور امید دو ایسی

تعمیری طاقتیں ہیں جو افراد و اقوام کو حیاتِ نو بخشتیں، انھیں ارتقاء کی بلندیوں پر پہنچاتیں اور ان کے دکھوں کا مداوا ثابت ہوتی ہیں۔ ان دو طاقتوں کا دامن اگر ہاتھ سے نہ چھوٹے تو حالات کے حد درجہ ناسازگار ہونے کے باوجود یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ حالات بدلے جا سکیں گے بر خلاف اس کے اگر کسی قوم کو خوف یا مایوسی کا گھن لگ جائے تو کثرتِ تعداد اور ذرائع و وسائل کی فراوانی بھی اسے ذلت و نکبت اور پستی و محکومی سے نہیں بچا سکتی۔

اس بے رحم مادّی دنیا میں جہاں کائنات کی اندھی بہری طاقتیں منھ پھیلائے ہوئے انسان کو کھانے کے لیے ہر طرف موجود ہیں اور جہاں اربابِ اقتدار اور اصحابِ دولت کے ہاتھوں ہر سو ظلم و فساد کی گرم بازاری ہے۔ خدا کے جاں بخش تصور کے علاوہ کمزوروں کے لیے خوف اور مایوسی سے بچنے کی کوئی راہ نہیں۔ یہی وہ یقین ہے جو بے سہارا لوگوں کے لیے سہارا بنتا ہے، جو ذرائع و وسائل کے فقدان کے باوجود انسان کو خوف اور مایوسی کا شکار نہیں ہونے دیتا اور کمزوروں کی کمزوری کا مداوا ثابت ہوتا ہے ؎

لا دینی و لاطینی کس پیچ میں اُلجھا تو

دارو ہے ضعیفوں کا لا غالب الّا ھُو (اقبالؒ)

خدا پرستوں کو یقین ہوتا ہے کہ نفع و نقصان اور زندگی و موت نہ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہیں، نہ دوسرے انسانوں کے اختیار میں، نہ کائنات کی اندھی بہری طاقتوں کے بس میں، بلکہ یہ سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے، اس لیے نہ اصحابِ اقتدار و اربابِ ثروت سے ڈرنے کی ضرورت ہے نہ کائنات کی قوتوں سے۔ ساری طاقت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ تنہا تمام قوتوں سے نمٹنے کے لیے کافی ہے:

أَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (بقرہ) "قوت ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔"

هُوَ الَّذِيْ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ (المؤمنون) "وہی ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے۔"

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيْمَانًا وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (آل عمران) "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ لوگوں (دشمنوں) نے تمھارے (مقابلے) کے لیے (بہت سازوسامان) جمع کیا ہے تو تم ان سے ڈرو تو اس سے ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے کہا، اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔"

اسی طرح اگر حالات ناسازگار ہوں تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں فیصلہ کن چیز حالات نہیں، اللہ ہے۔ وہ ایک آن میں حالات کو بدل سکتا ہے اور بدلتا رہتا ہے۔ وہی ہے جو افراد و اقوام کو اقتدار و عزت سے نوازتا اور وہی ان سے عزت و اقتدار سلب کر لیتا ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (آل عمران) "کہو! اے اللہ! اقتدار کے مالک! تُو جسے چاہتا ہے اقتدار عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے عزت بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل و خوار کر دیتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں ساری دولت و نعمت ہے۔ یقیناً تُو ہر شے پر قادر ہے۔"

اگر ہم اللہ کی مرضی پر چل رہے اور اس کی نافرمانی سے بچنے کا اہتمام کر رہے ہیں، تو ناسازگار حالات سے مرعوب ہونے کی کوئی وجہ نہیں، جب اللہ ہمارا پشت پناہ ہے تو کسی چیز سے ڈرنے کا کیا سوال!

وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ (طلاق) "اور جو اللہ کی نافرمانی سے بچے گا اللہ اس کے لیے راہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے مقام سے روزی دے گا جس کا اسے گمان تک نہ ہوگا اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا اللہ اس کے لیے کافی ہوگا۔ یقیناً اللہ اپنے فیصلہ کو نافذ کر کے رہتا ہے (البتہ) اس نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ (منصوبہ) مقرر کر رکھا ہے۔"

اللہ پر یقین اور مایوسی دونوں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے، جہاں خدا پر یقین ہوگا وہاں مایوسی نہ ہوگی اور جہاں مایوسی ہوگی وہاں خدا پر یقین نہ ہوگا۔

لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (یوسف) "اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ یقیناً خدا کی رحمت سے صرف کافر و منکر مایوس ہوتے ہیں۔"

خدا کا انکار کرنے ہی پر عظیم طاقت ہم سے چھن جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ خدا کے منکر جب مادی ذرائع و وسائل سے محروم ہو جاتے ہیں تو دنیا ان کے لیے تاریک ہو جاتی ہے اور وہ خودکشی کر کے اپنی

مصیبت بھری زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں یا ظلم و طغیان کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں، جیسا کہ اشتراکیت کے امامِ حاضر — خروشچیف — اور ان کے ساتھیوں نے خود ان کے اپنے اعتراف کے بموجب اشتراکیت کے سابق امام — اسٹالن — کے ظلم و طغیان کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔

خدا پرستی اور الحاد دو متضاد نقطہ ہائے نظر ہیں اور انسانی زندگی پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان میں سے کونسا نقطۂ نظر صحیح ہے، اسے طے کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دونوں نظریات کے دلائل و براہین پر غور کیا جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ زندگی پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا جائے اس پہلو سے جب آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دونوں نقطہ ہائے نظر زندگی پر متضاد اثرات ڈالتے ہیں۔ خدا کا منکر دولت و اقتدار پاکر شیطنت کا پیکر بن جاتا ہے۔ کیونکہ اسے اپنے سے بالاتر کسی ہستی کے آگے جواب دہی کا خوف نہیں ہوتا، اس کے برعکس خدا کے حضور جواب دہی کا خوف خدا پرست کو ظالم و مفسد بننے سے باز رکھتا ہے۔ اسی طرح خدا کا منکر مادّی سہاروں کے مفقود ہونے کی حالت میں خوف و ہراس اور مایوسی و نومیدی کا شکار ہو جاتا ہے کیوں کہ تمام مادّی سہارے اس سے چھن چکے ہوتے ہیں۔ اور ان سہاروں سے ماورا کسی سہارے کا وہ قائل نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں بھی خدا کا سہارا خدا پرست کو خوف و مایوسی میں مبتلا ہونے نہیں دیتا۔ یہ نفع و نقصان کا کھلا ہوا میزانیہ ہے اور اس کو سامنے رکھ کر ہم بہ آسانی یہ طے کر سکتے ہیں کہ کون سا نقطۂ نظر حق اور انسانیت کے لیے موجبِ فلاح ہے اور کون سا نقطۂ نظر باطل اور انسانیت کے لیے مہلک۔

الحاد یا مظاہرِ فطرت سے مرعوبیّت؟

ملحدین کا خیال ہے کہ مذہب مظاہرِ فطرت سے مرعوبیت کے نتیجہ میں پیدا ہوا انسان نے ہوا پانی آگ زمین پہاڑ اور اسی طرح کی دوسری زمینی مخلوقات کو طاقت ور اور خطرناک محسوس کیا، اسے خیال ہوا کہ یہ فوق الفطرت طاقت کی حامل ہیں، چنانچہ اس نے انھیں دیوتا مان لیا۔ وہ سورج، چاند کی عظمت سے بھی متأثر ہوا اور بے تامل ان "دیوتاؤں" کے آگے بھی جھک گیا۔ اس نے اپنے سر پر تاروں کو جگمگ جگمگ کرتے دیکھا اسے خیال ہوا کہ یہ میری قسمت کے مالک ہیں اور وہ ان کی پرستش میں لگ گیا۔ اس نے بعض انسانوں کو دولت، اقتدار یا روحانیت و کردار میں اپنے سے بلند تر پایا اور وہ بے تامل ان کے آگے جھک گیا۔ اس طرح خداؤں کی ایک طویل فہرست تیار ہو گئی جو حالات کے تحت گھٹتی بڑھتی رہی، یہاں تک کہ حالات کے ارتقا ہی کے نتیجہ میں یہ فہرست گھٹتے گھٹتے صرف ایک خدا پر مشتمل رہ گئی اور اب جب کہ مظاہرِ فطرت سے مرعوبیت کا دور ختم ہو چکا ہے اور انسان نظامِ کائنات کو بخوبی سمجھ چکا ہے، ایک خدا کو بھی ماننے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔

یہ بات یقیناً صحیح ہے کہ مظاہرِ قدرت سے مرعوبیت ہی کے نتیجہ میں مظاہر پرستی پیدا ہوئی۔ انسان نے بغیر کسی عقلی ثبوت کے، محض مرعوبیت کے تحت، یہ فرض کر لیا کہ مظاہرِ قدرت میں فوق الفطری اور خدائی طاقت موجود ہے حالانکہ یہ طاقتیں خود قوانین طبیعی میں جکڑی ہوئی ہیں اور زبانِ حال سے اعلان کر رہی ہیں کہ وہ حاکم نہیں، محکوم، خدا نہیں خدا کی تابع فرمان ہیں۔

لیکن یہ بات کسی طرح صحیح نہیں کہ مظاہرِ فطرت سے مرعوبیّت ہی کے نتیجہ میں ایک خدا کا تصوّر پیدا ہوا ہے توحید کی عظیم عمارت مظاہرِ فطرت

سے مرعوبیت پر نہیں اس کی نفی پر قائم ہوتی ہے۔ توحید کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ انسان ہو، جن ہو، فرشتہ ہو یا اور کوئی زمینی و آسمانی مخلوق، کسی کے پاس کوئی طاقت نہیں، زندگی و موت، نفع اور نقصان قسمت اور رزق، ہر چیز صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پوری کائنات مخلوق، محکوم، محتاج اور بے بس ہے، خالق، مالک، حاکم، معبود اور صاحب تصرف و اختیار صرف اللہ ہے۔ شرک خدا سے ماسوا طاقتوں کا اقرار و اعتراف ہے اور توحید ماسوا طاقتوں کا کلی انکار، پھر بھی ملحدین کو اصرار ہے کہ توحید مظاہر قدرت سے مرعوبیت کی پیداوار ہے

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اسی طرح یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ مظاہر پرستی اور شرک نے "ارتقا" کر کے توحید کی شکل اختیار کر ڈالی۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء (Evolution) ابھی تک محتاجِ ثبوت ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس میں بڑے بڑے خلا ہیں جنھیں اب تک پُر نہیں کیا جا سکا ہے، لیکن یہ نظریہ اگر صحیح ثابت ہو بھی جائے تو اس کا تعلق طبیعیات سے ہے، نہ کہ انسان کی اختیاری زندگی اور اس کے افکار و خیالات سے یہ علم و سائنس پر ایک صریح زیادتی ہوگی کہ ایک طبیعی نظریہ کو کسی ثبوت کے بغیر انسان کی فکری و اخلاقی دُنیا پر زبردستی چسپاں کر دیا جائے۔ حقیقتہً اس بات کا کوئی عملی ثبوت موجود نہیں ہے کہ انسان کی فکری و اخلاقی زندگی میں بھی اسی طرح ارتقاء ہوا ہے جس طرح ڈارون کے نقطۂ نظر کے مطابق طبیعی دنیا میں ہوا ہے۔ اس کے برعکس تاریخ اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ جو برائیاں ہزاروں سال پہلے موجود تھیں وہ آج بھی موجود ہیں اور جو نیکیاں آج پائی جاتی ہیں ان کا وجود ہزاروں سال پہلے بھی تھا۔ اسی طرح شرک

آج سے ہزاروں سال پہلے بھی پایا جاتا تھا اور آج بھی دنیا کی بہت بڑی آبادی شرک میں مبتلا ہے۔ بائبل اور قرآن کے بیان کو نہ مانا جائے تب بھی تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ توحید کے ماننے والے کم از کم چار پانچ ہزار سال قبل موجود تھے اور آج بھی دنیا کے بہت سے لوگ توحید کے قائل ہیں۔ الحاد کو فکری ارتقار کی آخری کڑی اور دورِ حاضر کی پیداوار سمجھا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کا عام رواج موجودہ دور ہی میں ہوا ہے، لیکن اب سے ہزاروں سال پہلے یہ نقطۂ نظر یونان اور ہندوستان میں موجود تھا اور ہندوستان میں تو شرک کے دوش بدوش الحاد کے داعی موجود تھے جن کی کوششوں سے الحاد کے ایک مکتبِ فکر (School of Thought) اور ایک ملحد فرقے نے جنم لے لیا تھا۔ بہر حال انسانی تاریخ قطعیت سے اس بات کی تردید کرتی ہے کہ شرک نے ارتقا کر کے توحید کی اور توحید نے ارتقا کر کے الحاد کی شکل اختیار کی ہے۔

ملحدین کا خیال ہے کہ مظاہرِ قدرت سے مرعوبیت کا دور ختم ہو گیا اس لیے خدا پرستی کو بھی رخصت ہو جانا چاہیے اور اس کی جگہ الحاد کو لے لینی چاہیئے، لیکن شاید وہ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہیں کہ شرک و الحاد، یہ دونوں نقطہ ہائے نظر مظاہرِ فطرت سے مرعوبیت کی پیداوار ہیں جب کہ توحید کا تصوّر ہی وہ واحد تصوّر ہے جو مادّی قوتوں سے مرعوبیت کا کلّی خاتمہ کر دیتا ہے۔ علم، سائنس اور مغرب کی تاریخ سے باخبر حضرات جانتے ہیں کہ اسلام کے تصوّرِ توحید اور مسلمانوں کے علمی و سائنسی ارتقاء ہی کی بدولت یورپ علم و سائنس کی موجودہ بلندیوں تک پہنچا ہے اور اگر اسے مظاہر پرستی اور توہمات کی بیڑیاں کاٹنے میں دیر لگی ہے تو اس کے ذمہ دار عیسائیت کے وہ غلط رہنما ہیں جنھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوتِ توحید میں شرک کی آمیزش کر دی۔ عیسائیت کو ایک مشرکانہ مذہب

بنا دیا اور علم و سائنس کے ارتقا کی راہ میں آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے توحید اور مظاہر پرستی میں تضاد کی نسبت ہے ، توحید مظاہرِ قدرت کی کی مرعوبیت کو دل و دماغ کے ایک ایک گوشہ سے نکال پھینکتی ہے اس لیے اگر مظاہرِ قدرت سے مرعوبیت ختم ہو رہی ہے تو اس میں توحید کے لیے موت کا پیغام نہیں ، یہ توحید کی عین کامیابی ہے ، ایسے ماحول اور ایسے دور میں توحید کا تصوّر بہت تیزی سے پھیل سکے گا ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ علم وسائنس کے ارتقا میں شرک والحاد دونوں کے لیے پیغامِ موت ہے اور توحید اور سچی خدا پرستی کے لیے نویدِ زیست و مژدۂ کامرانی ہے ۔

یہ بات بظاہر عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ شرک کی طرح الحاد بھی مظاہرِ فطرت سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے ، مگر کیا کیا جائے ، حقیقتِ نفس الامری یہی ہے ، اور غور کرنے پر آپ بھی اسے ماننے پر مجبور ہوں گے ، مشرک مادی طاقتوں سے مرعوب ہو کر انھیں خدا کی خدائی میں شریک کر لیتا ہے جب کہ ملحد مادّہ اور مادّی طاقتوں ہی کو اوّل و آخر سب کچھ قرار دیتا اور مادّہ کو خدائی مقام عطا کر کے خدا کا انکار کر دیتا ہے ۔ ملحد کی نظر مادہ اور اس کے مظاہر میں پھنس کر رہ جاتی ہے اور وہ مادّہ کی نیرنگیوں میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ بالکل سامنے کی حقیقتیں اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں ۔ وہ یہ نہیں سوچ پاتا کہ جب مادہ اور کائنات ازلی و ابدی نہیں ہیں تو انھیں کسی ہستی نے ضرور پیدا کیا ہو گا ۔ جب کائنات میں محکم نظام قائم ہے تو لازماً کوئی ہستی کائنات کی منتظم ہو گی ۔ جب عالمِ رنگ و بُو میں بے مثال حکمت اور لاجواب منصوبہ بندی ہے تو لا محالہ اس کے پیچھے کسی حکیم اور منصوبہ ساز ہستی کی حکمت و منصوبہ سازی کارفرما ہو گی اور جب کائنات کی ہر ہر شئے قوانین طبیعی میں جکڑی ہوئی ہے تو لازماً ایک مقنن و فرمانروا ہو گا جس نے قانون بنا کر بہ زور اسے نافذ کیا ہو گا ، لیکن ان عریاں حقائق تک رسائی اسی وقت

ممکن ہے جب مادّی دنیا کے عجائبات سے نگاہیں خیرہ نہ ہو جائیں لیکن ہوتا یہی ہے کہ مشرک و ملحد دونوں مظاہرِ قدرت سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور انھیں یہ موقع نصیب نہیں ہوتا کہ اس مادی طلسم سے نکل کر اس ہستی کا صحیح ادراک کر سکیں جس کی تخلیق، جس کی ربوبیت اور جس کی قدرت و حکمت کے مظاہر کائنات میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مشرک خدا کا انکار نہیں بلکہ خدا کا اقرار کرتے ہوئے بہت سے خداؤں کو اس کی خدائی میں شریک کر لیتا ہے جب کہ ملحد مادہ کے مظاہر اور ان کی بوالعجبیوں میں گم ہو کر خدا ہی کا انکار کر دیتا ہے اور مادّہ کو خدائی کے مقامِ جلیل پر بٹھا دیتا ہے۔ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے یہ کہ انسان نظامِ کائنات سے آگاہ ہونے کے بعد بھی مظاہرِ قدرت کی مرعوبیت کے جال سے نکل نہ سکا بلکہ اس "طلسمِ ہوشربا" میں پہلے سے زیادہ پھنس کر رہ گیا ہے آہ! انسان کی بے خبری و سطح بینی!

کیا خدا کے لیے خالق چاہیے ؟

کہا جاتا ہے کہ برطانیہ کے مشہور فلسفی، برٹرینڈ رسل کے سامنے یہ سوال آیا کہ "خدا کائنات کا خالق ہے تو خدا کا خالق کون ہے ؟ وہ اس سوال کا کوئی جواب نہ پا سکا چنانچہ اس نے خدا کو ماننے سے انکار کر دیا ________ لیکن یہ شبہ نہ تو نیا ہے اور نہ برٹرینڈ رسل تک محدود ہے۔ اب سے کم از کم چودہ سو برس پہلے یہ شبہ ذہنوں میں موجود تھا، چنانچہ اللہ کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر کر کے اسے "وسوسۂ شیطانی" کی حیثیت دی ہے اور وہ طریقہ بتایا ہے جس کے ذریعے اہلِ ایمان اس وسوسہ سے نجات پا سکیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کے ملحدین ـــــــ عام طور پر اس شبہ میں مبتلا ہیں یا کم از کم وہ اس سوال کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں کیونکہ جب بھی کسی ملحد سے گفتگو ہوتی ہے اور وہ خدا کو ماننے پر مجبور ہونے لگتا ہے تو آخر میں وہ اس سوال کو اس طرح سامنے لاکر رکھ دیتا ہے گویا خدا کے نہ ہونے کی یہ کوئی قطعی دلیل ہو۔

یہ سوال بظاہر پیچیدہ بلکہ لاینحل نظر آتا ہے مگر آپ جب اس پر غور کرنے بیٹھیں گے تو آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہ ایک لچر اور لایعنی بات ہے جس کی حیثیت فی الواقع شیطانی وسوسہ سے زیادہ نہیں ہے۔

دراصل وہ ذہنیت اصلاح طلب ہے جس نے اس سوال کا سہارا لے کر خدا کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس سوال کا خدا کے ہونے نہ ہونے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کائنات کے آثار سے کائنات کے خالق منتظم اور فرمانروا کا پتہ لگتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں، تو اس سوال کا سہارا لینے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، اس سہارے کے بغیر بھی خدا کو تسلیم نہ کیا جائے گا، لیکن کائنات کے آثار اگر صراحتہً کسی خالق و فرمانروا کا پتہ دیتے ہیں اور خدا کے بغیر نہ کائنات کی توجیہ ہو پاتی ہے اور نہ انسانی مسائل حل ہو پاتے ہیں تو خدا کو ماننے سے صرف اس بناء پر گریز نہ کیا جائے گا کہ اس کی ذات سے متعلق ایک سوال حل نہیں ہو رہا۔ علوم کی دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ تمام متعلقہ سوالات حل ہو جائیں، نہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ بیشتر سوالات حل ہو جائیں، اسی کو عین کامیابی تصور کیا جاتا ہے۔ سائنس کے پیش کردہ نتائج کو قطعی سمجھ کر بے چون و چرا قبول کر لیا جاتا ہے، لیکن جیسا کہ ایک مغربی سائنسداں نے برٹرینڈ رسل کے اس شبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے ـــ سائنس کے تقریباً تمام کلیات کا یہی حال ہے۔ ان کے بارے میں بہت سے

ایسے سوالات اُٹھتے ہیں جن کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ہے، مگر ان سوالات کے باعث نہ ان کلیات کا انکار کیا جاتا ہے اور نہ انکار کر کے سائنس کے میدان میں ایک قدم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ پھر اس کی کیا تک ہے کہ صرف ایک سوال کا جواب نہ پانے کے باعث۔ بشرطیکہ اس کا فی الواقع کوئی جواب نہ ہو۔ اُس حقیقتِ عظمیٰ کا انکار کر دیا جائے جس کی شہادت زمین و آسمان کی ہر ہر شئے دے رہی ہے۔ غالباً ذہنیت کی اسی خرابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وسوسۂ شیطانی سے تعبیر کیا ہے۔

لیکن کیا واقعتہً یہ کوئی لاینحل سوال ہے؟ سوال کا تجزیہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کی حیثیت مغالطہ یا غلط فہمی سے زیادہ نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر خدا کائنات کا خالق ہے تو خدا کا خالق کون ہے؟ مغالطہ کا پہلو یہ ہے کہ خدا اور کائنات کو سوال میں ایک ہی سطح پر رکھ دیا گیا ہے۔ گویا پہلے سے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ خدا اور کائنات ایک ہی نوعیت کی چیزیں ہیں اور کائنات کے لیے کوئی خالق ماننا ناگزیر ہو تو یہ بھی لازمی ہے کہ خدا کا کوئی خالق مانا جائے۔

مگر یہ بات اسی وقت صحیح ہوگی جب یہ معلوم ہو جائے کہ خدا اور کائنات دونوں کی نوعیت و حالات یکساں ہیں، لیکن اس یکسانیت کے لیے کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، یہی نہیں کوئی معقول اور سنجیدہ آدمی بہ سلامتی ہوش و حواس اس بات کا قائل نہیں ہو سکتا کہ خدا اور کائنات بہ الفاظ دیگر خالق و مخلوق نوعیت اور حالات کے لحاظ سے یکساں ہو سکتے ہیں۔ حقیقت میں یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ پوچھ بیٹھے کہ ہم اور زمین کی تمام دوسری چیزیں زمین پر ٹھہری ہوئی ہیں تو زمین کس چیز پر ٹھہری ہوئی ہے؟ یہ سوال اسی لیے تو غلط ہے کہ سائل نے زمین کو، اور ان چیزوں کو جو زمین پر ٹھہری ہوئی ہیں یکساں حیثیت دے دی، اس

نے خیال کیا کہ جس طرح ہم ٹھہرے ہوئے ہیں اور ہمیں ٹھہرنے کے لیے زمین کے سہارے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح زمین بھی ٹھہری ہوئی ہوگی اور اسے بھی سہارے کی ضرورت ہوگی، لیکن یہ خیال اس لیے صحیح نہیں ہے کہ زمین کی، اور ان چیزوں کی جو زمین پر ٹھہری ہوئی ہیں یکساں حالت نہیں ہے حالانکہ زمین پر پائی جانے والی تمام چیزیں زمینی مادے ہی سے بنی ہیں اور ان کا زمین سے شدید تعلق ہے۔ اس شدید تعلق کے ہوتے ہوئے بھی زمین اور ان کے مابین شدید تفاوت ہے تو خالق اور مخلوق کے درمیان کتنا عظیم فرق ہوگا اور دونوں کو یکساں حیثیت دے کر سوچنا اور سوال کرنا کس قدر غلط ہوگا۔

جو لوگ یہ سوال کرتے ہیں، شاید انھوں نے کائنات، خدا اور فعل تخلیق کسی پر سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا ورنہ وہ اس طرح کی مہمل بات نہ کہتے۔ تخلیق کے معنیٰ اس کے سوا اور کیا ہیں کہ ایک شئے کو، جو پہلے موجود نہ تھی، پیرایۂ وجود بخشا گیا۔ جو شخص کہتا ہے کہ "خدا کائنات کا خالق ہے" دوسرے لفظوں میں وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ کائنات پہلے موجود نہ تھی، پھر خدا نے اسے پیدا کیا۔ اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ کائنات مخلوق نہیں، ازلی و ابدی ہے تو اس کے نقطۂ نظر کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ کائنات کا کوئی خالق نہ ہو مگر اس نقطۂ نظر کے حامل کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں ہے کہ "خدا کائنات کا خالق ہے تو خدا کا خالق کون ہے"۔ یہ سوال اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب آپ کسی درجہ میں اس بات کو تسلیم کر لیں کہ کائنات کا کوئی نہ کوئی خالق ہو سکتا ہے۔ یعنی آپ تسلیم کر لیں کہ کائنات پہلے موجود نہ تھی، پھر وجود میں آئی لیکن اگر آپ کائنات کو ازلی و ابدی مانتے ہیں تو اس طرح کا سوال کرنے کے بجائے آپ سیدھے سیدھے یہ کہیے کہ کائنات ازلی و ابدی ہے اس کیلئے کسی خالق کا سوال خارج از بحث

بحث ہے۔

اسی طرح کائنات کسی ایک شئے کا نام نہیں ہے۔ ہر چیز جو موجود تھی، موجود ہے اور موجود ہوگی اور وہ مخلوق ہے کائنات۔ کائنات صرف زمین اور اس کی مخلوق کا نام نہیں ہے۔ وہ صرف نظام شمسی پر بھی مشتمل نہیں ہے جو تارے ہمیں ننگی آنکھ سے اور بڑی بڑی دُوربینوں کے ذریعے نظر آرہے ہیں، ان سب کے مجموعہ کا نام بھی کائنات نہیں ہے۔ جو نظام ہائے شمسی اور نظام ہائے فلکی خلاؤں میں موجود ہیں (اور ایک نظامِ فلکی میں بہت سے شمسی نظام ہوتے ہیں) وہ اپنی گزشتہ، موجودہ اور آئندہ موجودات سمیت کائنات کا محض ایک جزو ہیں۔ کائنات میں وہ تمام تارے بھی داخل ہیں جو ابھی تک زیرِ تشکیل ہیں اور ان کے وہ نظام بھی جو ان کے تشکیل پانے کے بعد وجود میں آئیں گے۔ نیز وہ تارے بھی جو آئندہ کبھی تخلیق پائیں گے۔ اسی طرح خلاؤں میں جو لہریں، جو شعاعیں اور جو قوتیں موجود ہیں وہ سب کائنات میں داخل۔ مختصر یہ کہ کائنات ــــ نام ہے گزشتہ، موجودہ اور آئندہ تمام مخلوقات کے مجموعہ کا، جس سے کوئی مخلوق باہر نہیں ہے۔ "خدا کائنات کا خالق ہے" اس کے کھلے ہوئے معنیٰ ہیں کہ خدا اس ہستی کا نام ہے جو ہماری کائنات ــــ گزشتہ، موجودہ اور آئندہ تمام مخلوقات ــــ کا خالق ہے۔ کائنات موجود نہ تھی اور وہ موجود تھا۔ پھر اس نے اپنی قدرت سے تمام مخلوقات کو پیدا کیا۔ بہ الفاظِ دیگر خدا کائنات سے پہلے ہے، خدا کائنات سے ماورا ہے، خدا کائنات کا جزو نہیں ہے۔ وہ تمام مخلوقات سے ماسوا ہے، وہ مخلوق نہیں ہے، وہ خالق ہے۔

اس تشریح کے بعد ذرا اس فقرے کی معنویت پر غور کیجئے کہ خدا کائنات کا خالق ہے تو خدا کا خالق کون ہے؟ کتنا حسین اور بامعنیٰ سوال ہے یہ!

کائنات تو ازلی و ابدی نہیں ہے اس لیے اس کا خالق ہونا لازمی ہے لیکن

خدا کے لیے یہ سوال کیوں پیدا ہو گیا کہ اس کا خالق کون ہے ؟ کیا خدا ازلی و ابدی نہیں ہے ؟ کیا وہ پہلے موجود نہ تھا اور بعد میں کسی کے پیدا کرنے سے پیدا ہوا ؟ اگر ایسا ہے تو وہ یقیناً خدا نہیں ہے، وہ مخلوق ہے اور کائنات ــــ مجموعۂ مخلوقات ــــ کا ایک جزو، حالانکہ سوال کائنات یا اس کے کسی جزو کے بارے میں نہیں، خدا کے بارے میں تھا جو کائنات کا پیدا کرنے والا ہے۔

اگر خدا کائنات سے ماورا ہے اور مخلوقات کے دائرہ میں شامل نہیں ہے، تو اس کے لیے خالق کا تصور آخر کہاں سے پیدا ہو گیا ؟ خالق مخلوق کے لیے ہوتا ہے خالق کے لیے نہیں۔ جو مخلوق نہیں خالق ہے، جو معدوم سے موجود نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ سے موجود ہے اس کے بارے میں یہ سوال کرنا کہ اس کا خالق کون ہے حد درجہ بے عقلی کی بات ہے۔

اس سوال کا مطلب تو یہ ہوا کہ خدا، جو مخلوق نہیں ہے اور جو کبھی پیدا نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ سے ہے، اسے پیدا کرنے والا اور عدم وجود میں لانے والا کون ہے ؟ کیا یہ سوال تضادات کا مجموعہ نہیں ہے ؟ کیا اسے آپ مہمل کے سوا اور لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں ؟ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا کائنات ــــ تمام گزشتہ، موجودہ اور آئندہ مخلوقات ــــ سے ماورا ہے یعنی وہ مخلوق نہیں ہے اور کبھی پیدا نہیں ہوا مگر اسی لمحہ آپ سنجیدگی سے یہ سوال جڑ دیتے ہیں کہ خدا کو کس نے پیدا کیا ؟ اور جب کوئی شخص مہمل سمجھ کر سوال کو نظر انداز کر دیتا ہے تو آپ پکار اٹھتے ہیں کہ دیکھو، خدا پرستوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے اور آپ پورے اطمینان کے ساتھ خدا کا انکار کر دیتے ہیں۔ یہ فلسفہ کی آخر کون سی قسم ہے ؟ کیا فلسفۂ الحاد کی عمارت اسی قسم کی شاندار بنیادوں پر اٹھی ہے ؟ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں خالقِ کائنات کو ازلی وابدی تسلیم نہیں کرتا، جس طرح کائنات مخلوق ہے اور خدا اس کا خالق ہے، اسی طرح، ہو سکتا ہے کہ خالقِ کائنات بھی مخلوق ہو تو اس کا پیدا کرنے والا اور خالق کون ہے؟

مندرجہ بالا تشریح کو نظر انداز کرتے ہوئے، کسی بحث و تمحیص کے بغیر اگر یہ بات جوں کی توں مان لی جائے تب بھی ہم کسی لاینحل مسئلہ سے دوچار نہیں ہوتے۔ دو راہوں میں سے ایک راہ آپ کو بہرحال اختیار کرنا پڑے گی۔ خالقِ کائنات کو ازلی وابدی مانیے، اس صورت میں اس کے لیے کسی خالق کا سوال خارج از بحث اور مہمل ہے، یا اسے ازلی وابدی نہ مانیے اور مخلوق تصور کیجیے۔ اس صورت میں خود آپ کے اپنے نقطۂ نظر سے لازماً اس کا بھی کوئی خالق ہو گا۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کوئی شئے از خود عدم سے وجود میں نہیں آ سکتی جب تک کہ اسے وجود میں لانے والی ہستی موجود نہ ہو۔ اس "خالق" کا آپ جو نام چاہیں فرض کر لیں، بہرحال آپ کو خود اپنے نقطۂ نظر کی رُو سے اسے تسلیم کرنا ہو اور یہ آپ کی ذمہ داری ہو گی کہ آپ بتائیں کہ وہ کون ہے اور اس کی صفات کیا ہیں؟

پھر خالقِ کائنات کے اس "مزعومہ خالق" کے بارے میں سوال پیدا ہو گا کہ وہ ازلی وابدی ہے یا مخلوق؟ اگر آپ اسے ازلی وابدی مانتے ہیں تو خیر، یہ سوال پیدا نہ ہو گا کہ اس کا خالق کون ہے؟ ورنہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی خالق آپ کو تسلیم ہی کرنا ہو گا۔ بہرحال اس طرح کے "فرضی خالقوں" کا جن میں سے ہر ایک خالق بھی ہو اور مخلوق بھی، خواہ آپ کتنا طویل سلسلہ کیوں نہ ہو، جو عدم سے وجود میں نہ آئی ہو بلکہ ازلی وابدی ہو، مختصر یہ کہ جس کا کوئی خالق نہ ہو بلکہ قائم بالذات ہو، ایسی ہی ہستی کو ہم

اللہ کہتے ہیں۔ مخلوق کو ہم خدا نہیں کہتے خواہ وہ دوسروں کے لیے وجۂ تخلیق ہی کیوں نہ ہو۔

رہے درمیان کے "فرضی خالق" تو آپ خود فرمائیں کہ ان کو ماننے کا حاصل کیا ہے؟ آپ نے انھیں اسی لیے تو مانا تھا کہ خدا کے لیے خالق منوانے پر آپ مُصِر تھے مگر آپ کو اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ اس ایک ضرورت کے علاوہ ان فرضی ہستیوں کو ماننے کی کوئی ضرورت تھی، نہ ان کے موجود ہونے کا کوئی ثبوت۔ اس طرح یہ "مزعومہ خالق" جنھیں کسی دلیل و ثبوت کے بغیر خواہ مخواہ فرض کر لیا تھا آپ سے آپ پردۂ عدم میں مستور ہو جاتے ہیں۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ آپ کوئی نہ کوئی ازلی و ابدی اور موجود بالذات ہستی ماننے پر مجبور ہیں۔ یا آپ کائنات کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات مانیں یا خدا کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات تسلیم کریں۔ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ کائنات کو ازلی و ابدی مانتے ہیں اور جو لوگ کائنات کو مخلوق سمجھتے ہیں وہ خدا کو ازلی و ابدی اور موجود بالذّات تسلیم کرتے ہیں ـــ یہ قطعی ناممکن ہے کہ کائنات مخلوق بھی ہو اور خدا بھی۔ کسی شئے کے مخلوق ہونے کے معنیٰ اس کے سوا اور کیا ہیں کہ وہ پہلے موجود نہیں تھی، پھر کسی نے اسے وجود بخشا۔ اگر خدا اور کائنات دونوں کے دونوں مخلوق ہوں تو اس کا صاف صریح مطلب یہ ہے کہ ایک وقت تھا جب کہ ان میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ پھر موجودات کیونکر پیدا ہو گئیں اور وجود کہاں سے آگیا؟ عدمِ محض اور بالکلیہ عدم سے تو وجود نمودار نہیں ہو سکتا۔ کوئی چیز بھی نہ ہو اور سب کچھ موجود ہو جائے، یہ کیسے ممکن ہے؟ اب یا تو یہ کہیے کہ کوئی نہ کوئی ازلی و ابدی اور موجود بالذات ہستی موجود ہے جس سے سب کو وجود ملا ہے، تیسری کوئی شکل ممکن نہیں۔

اگر آپ ایک ازلی و ابدی وجود تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں تو اس سارے ہنگامۂ وجود کا آپ کو انکار کرنا ہوگا جو کائنات کی شکل میں آپ کے گردوپیش موجود ہے۔ آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ یہاں نہ وجود ہے، نہ کوئی موجود، عدم کے بھیانک خلا کے سوا یہاں کچھ بھی نہیں۔

لیکن اگر آپ اپنے وجود اور اپنے گردوپیش کی کائنات کو ایک ٹھوس حقیقت سمجھتے اور اس عالم کو عالمِ ہست و بود خیال کرتے ہیں تو آپ کے لیے ناگزیر ہے کہ یا تو آپ کائنات کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات تسلیم کریں اور خدا کا انکار کریں یا خدا کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات مانیں۔ گویا آپ کے لیے یہ راہ تو کھلی ہوئی ہے کہ آپ چاہیں تو خدا کا انکار کر دیں، لیکن اگر آپ خدا کو مانتے ہیں تو آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ اسے ازلی و ابدی اور موجود بالذات مانیں۔ آپ کسی ایسی صورت کا تصور نہیں کر سکتے کہ خدا تو ہو مگر ازلی و ابدی اور موجود بالذات نہ ہو۔

"خدا کا خالق کون ہے؟" دونوں صورتوں میں یہ سوال مہمل قرار پاتا ہے۔ پہلی صورت میں اس لیے کہ آپ کائنات کو ازلی و ابدی مانتے ہیں اور اس کے لیے کسی خالق کے قائل نہیں۔ جب آپ کے نقطۂ نظر سے خدا موجود ہی نہیں ہے تو اسے وجود بخشنے والے کا سوال کیونکر پیدا ہوتا ہے؟ اور دوسری صورت میں اس لئے کہ آپ خدا کو ازلی و ابدی اور موجود بالذات مانتے ہیں، جب خدا ہمیشہ سے ہے اور اس کا وجود اپنا ہے تو یہ سوال کہاں سے پیدا ہو گیا کہ اسے کس نے وجود بخشا؟ دونوں ہی صورتوں میں یہ سوال بداہۃً غلط ہے، اور آپ ملحد ہوں یا خدا پرست کسی بھی نقطۂ نظر سے آپ کے لیے اس سوال کے کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

شیطان کی وسوسہ اندازی نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ ایک مہمل و

یعنی سوال کی آڑ لے کر اس ہستی کا انکار کر دیا جائے جس کی نشانیاں پوری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں جب اس سوال سے پھر بھی چھٹکارا نصیب نہ ہو جس کی خاطر خدا کا انکار کیا گیا تھا۔ اگر "خالق کون ہے" کا جواب نہ ملنے کے باعث آپ خدا کا انکار کر دیتے ہیں تو اس سوال کا جواب نہ ملنے کی وجہ سے آپ کائنات کا انکار کیوں نہیں کر دیتے، آپ خدا کو ازلی وابدی اور موجود بالذات ماننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے مگر خدا کا انکار کرتے ہی آپ کائنات، ہر دم تغیر پذیر کائنات ـــ کو ازلی وابدی اور موجود بالذات مان لیتے ہیں! ؎

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

ان حضرات کے سوچنے کا انداز یہ ہے کہ خدا کو خالق کے بغیر ماننا ہی ہے تو کیوں نہ کائنات کو خالق کے بغیر مان لیا جائے اور اگر خدا ازلی وابدی اور موجود بالذات تسلیم کرنا ہی ہے تو کیوں نہ کائنات کو ازلی وابدی اور موجود بالذات تسلیم کر لیا جائے۔ بہ الفاظ دیگر خالقیت کے اس سلسلہ کو کیوں تسلیم کیا جائے جو خدا کے آگے کسی طرح نہیں بڑھتا۔

کیا کسی سلسلے کو اسی وقت ماننا چاہیے جب وہ لامتناہی چلتا رہے اور کبھی ختم نہ ہو۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو کائنات میں کوئی سلسلہ ایسا نہیں ہے جسے مانا جا سکے۔ یہاں کا ہر سلسلہ کہیں نہ کہیں جا کر ضرور ختم ہو جاتا ہے، مثلاً سب مانتے ہیں کہ کائنات کا پورا نظام علت (Cause) اور معلول (Effect) کے سہارے قائم ہے۔ ہر واقعہ جو کائنات میں نمودار ہوتا ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے اور پھر اس سبب کا بھی سبب ہوتا ہے مگر کائنات اور مادہ کی علت کیا ہے؟ ملحدین کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے تو کیا سلسلۂ علت ومعلول کا اس لیے انکار کر دیا جائے کہ وہ کائنات یا مادہ کے آگے نہیں چلتا۔ ایک دوسری مثال لیجیے، کائنات کی ہر شئے کیمیاوی عناصر سے مرکب ہو کر بنی ہے۔ پھر یہ کیمیاوی عناصر الیکٹرون

پروٹون، اور نیوٹرون کا مرکب ہیں، مگر الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون کس سے بنے اور کس سے مرکب ہیں؟ کسی سائنس دان کے پاس اس کا جواب نہیں ہے تو کیا اس سلسلے کا بھی انکار کر دیا جائے کہ یہ چند قدم بھی نہ چل سکا۔ اگر آپ خدا کو اس لیے کائنات کا خالق نہیں مانتے کہ یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھتا اور خدا کا خالق اور پھر اس خالق کا خالق نہیں ہوتا تو آپ کو کائنات کے ہر سلسلے، بہ الفاظ دیگر کائنات کے پورے نظام کا انکار کرنا ہوگا۔ کیوں کہ یہاں کا ہر سلسلہ چند قدم پر جا کر رک جاتا ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ خدا کو ازلی وابدی اور موجود بالذات ماننا ہے تو کیوں نہ کائنات ہی کو ازلی وابدی اور موجود بالذات مان لیا جائے؟ بلاشبہ اس طرح آپ خالقِ کائنات کو ماننے سے بچ جائیں گے، لیکن کیا اسی کا نام علم وتحقیق ہے؟ کیا کسی شئے کو فرض کر لینے سے وہ ثابت شدہ حقیقت بن جاتی ہے؟ کیا محض آپ کے فرض کر لینے سے کائنات ازلی وابدی اور موجود بالذات ثابت ہو جائے گی اور آپ یہ طے کرنے میں حق بہ جانب ہوں گے کہ کائنات کو کسی نے پیدا نہیں کیا، بلکہ وہ ہمیشہ سے ہے اور آپ سے آپ موجود ہے؟ اور کیا آپ پورے یقین کے ساتھ اسی فرضی بنیاد پر زندگی کی عمارت تعمیر کر سکیں گے؟

یہ ایک حقیقت ہے۔ خواہ آپ اس کا اعتراف کریں یا نہ کریں۔ کہ کائنات کے ازلی وابدی اور موجود بالذات ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ناقص تجربات کی بنیاد پر بعض سائنسدانوں کو غلط فہمی ہو گئی تھی کہ مادہ غیر فانی ہے اور اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ وہ ابدی ہونے کے ساتھ ازلی بھی ہے، لیکن مزید تجربات سے اس خیال کی غلطی واضح ہو گئی، سائنس کا عام رجحان اب یہ ہے کہ مادہ فانی ہے یعنی وہ ازلی ہے نہ ابدی، رہی کائنات تو اس کے بارے میں اب یہ بھی اندازہ کیا جا چکا

ہے کہ کتنے ارب سال پہلے اس کی تخلیق ہوئی تھی۔ اس صورتِ حال کی موجودگی میں آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کائنات ازلی و ابدی ہے اور اس کا کوئی خالق نہیں ہے۔ اس کے برعکس عقل اور سائنس کی روشنی میں آپ جتنا آگے بڑھتے جائیں گے آپ کا یقین فزوں سے فزوں تر ہوتا چلا جائے گا کہ کائنات ازلی ابدی نہیں، حادث ہے، موجود بالذات نہیں، مخلوق ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے۔

پھر سوال صرف کائنات کی تخلیق کا نہیں کہ کائنات کو ازلی و ابدی کہہ کر آپ خالق سے پیچھا چھڑا لیں، نظم، منصوبہ بندی اور حکمت و ربوبیت کے جو آثار کائنات میں ہر سمت بکھرے ہوئے ہیں، وہ ایک علیم و حکیم، مدبّر و منتظم اور رحمان و رحیم ہستی کی موجودگی کی طرف کھلا ہوا اشارہ کرتے ہیں، تو کیا اندھے بہرے اور بے شعور مادے میں آپ یہ صفات پاتے ہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو خدا کو ماننے کے بغیر چارۂ کار بھی کیا ہے؟ مادّہ سے کائنات کے ان پہلوؤں کی توجیہ ممکن نہیں[۱]

یہ ایک حقیقت ہے کہ ملحد و خدا پرست، دونوں ایک ایسی ہستی کو ماننے پر مجبور ہیں جو ازلی و ابدی ہو اور کسی خالق کے بغیر آپ سے آپ موجود ہو، ملحدین کے نزدیک یہ ازلی و ابدی ہستی، جو خالق کے بغیر موجود ہے، مادّہ ہے اور خدا پرستوں کے نزدیک خدا، اس لحاظ سے دونوں کی پوزیشن یکساں ہے۔ اور "خدا کا خالق کون ہے"؟ یہ سوال اگر خدا پرستوں سے کیا جا سکتا ہے تو مادہ پرستوں سے بھی یہ سوال ہو سکتا ہے کہ "مادہ کا خالق کون ہے؟" فرق جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ملحدین جب مادہ کو ازلی و ابدی مانتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ ازلی و ابدی نہیں ہے بلکہ اسے تسلیم کرنے

---

[۱] "خدا ہے" میں اس پر تفصیلی بحث ملے گی۔
[۲] "کیا خدا کی ضرورت نہیں" میں اس پر تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

سے کائنات کے مختلف پہلوؤں کی توجیہ بھی نہیں ہو پاتی اور نہ اسے بنیاد بنا کر سوچنے اور زندگی بسر کرنے سے انسانی مسائل حل ہوتے ہیں، اس کے برعکس خدا پرست جس ازلی وابدی اور موجود بالذات ہستی ــــ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اسے ماننے سے کائنات کے تمام پہلوؤں کی تشفی بخش توجیہ ہو جاتی ہے۔ نیز اس اعتراف وتسلیم کو بنیاد بنا کر زندگی کی عمارت تعمیر کرنے سے انسانی زندگی کے سارے لاینحل مسائل ایک ایک کر کے حل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ طے کرنا غالباً کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ الحاد و خدا پرستی میں کون سا مسلک حق اور انسانیت کے لیے موجب فوز و فلاح ہے اور کون سا مسلک باطل اور وجہ ہلاکت و خسران۔

کیا دنیا میں اندھیر ہے؟

کہا جاتا ہے کہ خدا ہوتا تو دنیا میں اندھیر نہ ہوتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سیلاب آتے ہیں اور نباتات اور انسانوں کے لیے عظیم تباہی لاتے ہیں۔ قحط پڑتے ہیں اور ذی حیات مخلوق پر سخت مصیبت ڈھاتے اور کثیر جانی ومالی نقصان کا موجب ہوتے ہیں۔ وبائیں پھوٹتی ہیں اور بہت سے افراد ان کے ہاتھوں لقمۂ اجل بن جاتے ہیں یا اپنی صحت گنوا دیتے ہیں۔ طبیعی دنیا ہٹ کر انسانی دنیا میں آئیے تو آپ کو اور بھی اندھیر نظر آئے گا۔ کمزور اور غریبوں کے لیے جینا دوبھر ہے اور ان کی جان ومال اور آبرو کی کوئی قیمت نہیں، ظالم، مفسد اور بدکار دنیا میں دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی نہیں جو ان کا ہاتھ پکڑ سکے، نیکی، اخلاق اور انسانیت مظلوم ومقہور ہیں اور بدی، مکر وفریب اور حیوانیت وبربریت کا دور دورہ ہے۔ جنگیں ہوتی ہیں اور بے شمار انسان ان کی خون آشامی کی بھینٹ ــــ ہو جاتے ہیں۔ قوموں کی اقتصادی و سیاسی حالت زیروزبر ہو جاتی ہے، اور بسا اوقات ان کے تلخ نتائج

آئندہ نسلوں تک کو بھگتنا پڑتے ہیں۔ یہ سب اندھیر نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ اندھیر اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ کسی حکیم و رحیم اور دانا و بینا ہستی کے ہاتھ میں کائنات کا نظم نہیں ہے، بہ الفاظ دیگر یہ کہ خدا نہیں ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے یہ کہ جو واقعات خدا کے ہونے کی واضح دلیل ہیں، انہی کو خدا کے نہ ہونے کی محکم دلیل سمجھا جا رہا ہے! یہ انسانی فکر کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی دو ہی توجیہیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں کا ہر واقعہ علّت و معلول کے اصول کے تحت آپ سے آپ وقوع پذیر ہوتا ہے، اس کے پیچھے کوئی شعور اور کوئی ارادہ کارفرما نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ ایک باشعور اور ذی ارادہ ہستی اپنے ارادہ و منصوبہ کے تحت کائنات کا نظم کر رہی ہے۔ ان دو کے علاوہ تیسری کوئی توجیہ ممکن نہیں۔ پہلی توجیہ کے سلسلے میں ایک دقت تو یہ ہے کہ سائنس کے جدید ترین نظریات و انکشافات اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ علّت و معلول کا یہ سلسلہ جس پر مادیت کی عمارت قائم تھی۔ سائنس کے نئے انکشافات کی روشنی میں بہت کچھ مشتبہ و متزلزل ہو گیا ہے[1]۔ لیکن اس سائنسی حقیقت سے قطع نظر ایک دقت یہ بھی ہے کہ اس اصول کے تحت طبیعی حوادث کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ سمندر سے مون سون اٹھتا ہے اور خشکی کا رخ کرتا ہے۔ اس مون سون سے ایک علاقہ میں اتنی بارش ہوتی ہے کہ فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں اور سیلاب امنڈ آتا ہے جب کہ اس سے متصل یا قریب دوسرے علاقے میں، جو مون سون کی گزرگاہ میں واقع ہے بالکل بارش نہیں ہوتی یا برائے نام ہوتی ہے۔ آپ علّت و معلول کے اصول کے تحت اس کی کیا توجیہ کر سکتے ہیں؟ حالات بالکل پرسکون ہوتے

---

[1] ملاحظہ ہو "خدا ہے"۔

ہیں کہ اچانک ساحلِ سمندر کے علاقے شدید سمندری طوفان سے دوچار ہوتے ہیں۔ سمندر کی تیز و تند موجیں خشکی میں بہت دُور دُور تک گھس آتی ہیں اور شدید جانی و مالی نقصان کے بعد یہ طوفان ختم ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ طوفان اس مقررہ وقت پر کیوں آیا۔ اس سے قبل یا اس کے بعد کیوں نہیں آیا؟ اور اس مخصوص علاقے میں کیوں آیا، دُور و نزدیک کے دوسرے علاقوں میں کیوں نہیں آیا؟ یہی سوال ہوائی طوفان اور برفباری سے بھی متعلق ہیں بسلسلۂ علت و معلول کے تحت ان سوالات کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ وبا کا ایک خاص علاقہ میں بہت زور ہوتا ہے، قریب کے دوسرے علاقوں میں وبا نہیں ہوتی یا بہت کم ہوتی ہے کیا آپ اس کی وجہ بیان کر سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ پھر جہاں وبا کا زور ہوتا ہے وہاں پر بھی کچھ افراد پر وبا کا مطلقاً اثر نہیں ہوتا اور جو افراد وبا کی لپیٹ میں آتے ہیں اُن میں سے بھی کچھ ہلاک ہوتے ہیں اور کچھ چند دنوں بیمار رہ کر اچھے ہو جاتے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے کہ ایک ہی نسخے کے یہ مختلف نتائج کیوں نکلتے ہیں؟ بعض لوگ اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ کمزور افراد وبا کا شکار ہوتے ہیں اور تندرست و طاقتور بچ جاتے ہیں مگر واقعاتی لحاظ سے یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ وباؤں میں بہت سے بچے جن میں قوتِ مدافعت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور جوان اور طاقتور اشخاص ہلاک ہو جاتے ہیں اور بوڑھے اور کمزور افراد بچ جاتے ہیں۔

آپ "اتفاق" کے ذریعہ ان واقعات کی توجیہ نہیں کر سکتے کیونکہ فی الواقع یہ کوئی معقول اور اطمینان بخش توجیہ نہیں ہے، نہ یہ چند گنے چنے واقعات کا معاملہ ہے کہ آپ "اتفاق" کہہ کر چھوٹ جائیں بے شمار واقعات ہیں جن کی توجیہ آپ کو کرنی ہے۔

ان تمام واقعات کی اس کے سوا کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی کہ ایک ذی ارادہ اور باقتدار ہستی، جو اسباب وعلل سے بالاتر ہے، مادی قوتوں سے جس طرح چاہتی ہے کام لیتی ہے اور جس وقت، جس جگہ اور جس طرح جس واقعہ کو مناسب خیال کرتی ہے، ظہور میں لے آتی ہے۔ اس ہستی کا نام اللہ ہے۔

یہ توجیہ کچھ طبیعی حوادث اور غیر معمولی واقعات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اگر آپ عمیق نظری سے کام لیں گے تو کائنات کے ہر وجود اور عالم کون وفساد کے ہر واقعہ کی آخری کڑی اور اطمینان بخش توجیہ یہی ہے۔ علت ومعلول کا جو سلسلہ آپ کو عام واقعات میں کارفرما نظر آتا ہے، اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ فلاں واقعہ، فلاں واقعہ کے بعد ظہور پذیر ہوا یا بہت سے بہت یہ کہ فلاں واقعہ فلاں واقعہ کا نتیجہ ہے۔ مثلاً آگ روشن کرنے کے نتیجہ میں حرارت حاصل ہوئی۔ اگرچہ اس طرح کی تمام مثالوں میں یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ بعد کا واقعہ حقیقتاً پہلے واقعہ کا نتیجہ ہے۔ مگر یہ بات کہ ایک واقعہ دوسرے واقعہ کا نتیجہ کیوں ہے اور اور ان میں لازم ملزوم کا رشتہ کیوں پیدا ہو گیا؟ علت ومعلول کا اصول اس کا کوئی جواب فراہم نہیں کرتا۔ ہم جب مسلسل اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے تو ہم یہ قیاس کرتے ہیں کہ دوسرا واقعہ پہلے کا نتیجہ ہے اور دونوں میں لازم وملزوم کی نسبت ہے مگر یہ جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ ایسا "کیوں" ہوتا ہے؟ گویا علت ومعلول کا اصول صرف "کیا" کا جواب ہے "کیوں" کا نہیں حالانکہ اصل اہمیت "کیوں" کے جواب کی ہے۔ جس سے ملحدین بالکل عاجز ہیں۔

اس بنیادی سوال کا اس کے سوا کوئی جواب ممکن کہ ایک قادر مطلق

اور حکیم خالق و مدبّر نے اپنی مرضی اور اپنی حکمت سے قوانینِ فطرت وضع کیے اور اپنی قوتِ قاہرہ سے انھیں کائنات میں نافذ کیا۔ پھر وہی ہے جو اپنی مرضی اور حکمت کے مطابق ان قوانین سے کام لیتا ہے اور اپنی مشیت سے اس کائنات کا نظم چلا رہا ہے۔

قوانینِ فطرت کی بلاشبہ اہمیت ہے مگر اصل اہمیت فرمانروائے کائنات کی مشیت و مرضی کی ہے۔ خدا نے ان قوانین کو وضع کیا ہے اور وہی ان قوانین کو نافذ کر رہا ہے وہ نہ ان قوانین کا محکوم ہے، نہ ان کا پابند، وہ ان کا واضع و حاکم ہے اور ان سے بالاتر ہے۔ وہ چاہے تو قوانینِ فطرت کے ذریعے کائنات کا نظم چلائے اور چاہے تو ان سے ہٹ کر امورِ کائنات کا نظم و انصرام کرے۔

اس جواب سے کائنات کے تمام معمولی اور غیر معمولی واقعات کی توجیہ ہو جاتی ہے اور کائنات کی بنیادی "کیوں" کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ علت و معلول کے سلسلہ کی ہمہ گیری قائم رہے یا سائنس کے نئے نئے اکتشافات سے وہ متزلزل ہو کر رہ جائے دونوں صورتوں میں یہ توجیہ علیٰ حالہ قائم رہتی ہے۔ کیونکہ اس کی رو سے اصلی چیز علت و معلول کا سلسلہ نہیں، اللہ کی قدرت و حکمت ہے۔ کائنات کے پورے سوال کا یہی ایک اطمینان بخش اور معقول جواب ہے، اس کے ماسوا کوئی جواب نہ اطمینان بخش ہے نہ معقول۔

طبعی حوادث کے پیچھے کوئی حکمت کارفرما نہیں اور وہ سراسر ناانصافی و بے رحمی کا مظہر ہیں، اس طرح کا وسوسہ صرف اس شخص کے دل میں آسکتا ہے جس کی نظر حد درجہ سطحی ہو اور جو جلد بازی سے نتائج اخذ کرنے کا عادی ہو۔ جو شخص بھی کائنات کا عمیق مطالعہ کرے گا وہ لامحالہ اس یقین تک پہنچ کر رہے گا کہ یہ کائنات ایک عظیم حکیمانہ منصوبہ ہے جس کا ہر گوشہ

اپنے اندر بے شمار حکمتیں رکھتا ہے اور یہی وہ یقین ہے جو سائنس کے ذریعے نہیں حاصل ہوتا ہے اور اس یقین تک پہنچنے والا انسان یہ کبھی بھی نہیں سوچ سکتا ہے کہ طبعی حوادث کے پیچھے کوئی حکمت کارفرما نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حوادث نہ صرف طبعی دُنیا کے لیے بے شمار فوائد رکھتے ہیں۔ بلکہ انسانی دنیا کے لیے بھی ان کے فوائد عظیم ہیں اور فوائد سے قطعِ نظر ان کا یہی ایک فائدہ کیا کچھ کم ہے کہ ان کے باعث انسان کی بند آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ دنیا کی بے ثباتی اور اپنی بے بسی و بے چارگی کو سر کی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ دولت و اقتدار پاکر انسان دو حقیقتوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ ایک یہ کہ متاعِ دنیا سخت بے ثبات ہے اور دوسرے یہ کہ انسان ایک کمزور و عاجز بندہ ہے،

اس کے سوا اس کی کوئی حقیقت نہیں یہ حوادث انسان پر ان دونوں بنیادی حقیقتوں کو واشگاف کر دیتے ہیں ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان، شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل، راہ بے خبر
میں بھی کبھو[1] کسو[2] کا سر پُر غرور تھا (میرؔ)

آج کا انسان دولت و اقتدار کے علاوہ سائنسی ترقیوں کے نشہ میں بھی مست ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس نے فطرت پر فتح پالی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں کیوں کہ جو طاقت خدا کی طرف منسوب کی جاتی تھی وہ سب اسے حاصل ہے۔ اشتراکیت کے علمبردار اور ان کے روسی امام اس طرح کی باتیں آئے دن کہتے رہتے ہیں۔ یہ طبعی حوادث

---

[1] کبھی کا قدیم تلفظ [2] کسی کا قدیم تلفظ

اچھی طرح واضح کر دیتے ہیں کہ ان دعووں کی حقیقت کیا ہے، دیکھنے والی آنکھیں دیکھ لیتی ہیں کہ طبعی حوادث کے مقابلہ میں روس اور امریکہ جیسے سائنسی ترقی کے مراکز ممالک اسی طرح بے بس ہیں جیسے دوسرے ممالک اور خروشچیف، ماؤزے تنگ اور چو این لائی جیسے اکابرِ اشتراکیت والحاد بھی ویسے ہی عاجز و بے بس انسان ہیں جیسے دوسرے انسان، اس حقیقت کا انکشاف کوئی معمولی انکشاف نہیں ہے۔ یہ انسان کی پوری زندگی کا رخ بدل دیتا ہے اور اسے مغرور و خود سر اور ظالم و مفسد بننے سے بچاتا اور خدا ترس، مجسمۂ اخلاق اور پیکرِ انسانیت بناتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی ایک فائدہ بڑے سے بڑے نقصان پر بھاری ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ حوادث بھی اللہ کی حکمت و رحمت ہی کا ایک پرتو ہیں۔

یقیناً ان حوادث کے باعث سے لوگ لقمۂ اجل بن جاتے ہیں اور ان کی موت سے ہر صاحبِ احساس کو دکھ ہوتا ہے، لیکن اس دکھ سے بچنے کی صورت کیا ہے؟ حوادث اگر رونما نہ ہوں تب بھی لوگ موت کا شکار ہوں گے اور کوئی نہ کوئی چیز موت کے لیے بہانہ بن جائے گی۔ موت انتہائی دردناک ہے مگر ہر ذی حیات کے لیے مقدر ہے۔ موت، خواہ کسی بھی شکل میں ہو، مرنے والے کے لیے یکساں حیثیت رکھتی۔ انسان خواہ عزیزوں، متعلقوں اور ماتحتوں کے جھگھٹے میں مرے یا اسے یکہ و تنہا موت آئے۔ دونوں حالتوں میں اسے موت کی تلخی چکھنا پڑے گی اور ————— سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ دنیا سے جانا ہو گا ؎

چہ آہنگِ رفتن کند جانِ پاک
چہ بر تختِ مردن، چہ بر روئے خاک (سعدیؒ)

یہ ہے طبعی دُنیا کے اس "اندھیر" کی حقیقت جسے خدا کے نہ ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اب انسانی دُنیا کے "اندھیر" پر غور کیجئے۔ سوال یہ ہے کہ انسانی دنیا کے بھیانک نقشے کو پیش کرنے سے ملحدین کا منشا کیا ہے؟ کیا انسان کا ظلم و فساد اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا نہیں ہے؟ کیا آپ کائنات کے لیے کسی خالق و منتظم کو اس وقت مانیں گے جب انسان کو مجبور محض پائیں گے؟ کیا آپ خدا کو صرف اس وقت تسلیم کریں گے جب انسان اپنے اختیار سے نہ نیکی کر سکے نہ بدی؟ یا کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ بدی کے عام ہونے کے باوجود دُنیا میں اندھیر نہ ہو؟ کیا حکمت و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ بدی و ظلم کے عام ہونے کا نتیجہ اچھا ہو اور نیکی کے عام ہونے کا نتیجہ بُرا یا دونوں کا نتیجہ یکساں ہو؟ آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ انسانی دنیا کی موجودہ صورتِ حال ہرگز اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ خدا نہیں ہے۔ یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان صاحبِ شعور اور صاحبِ اختیار ہے، وہ آزاد ہے، خواہ نیکی کی راہ اختیار کرے یا بدی اور شیطنت کا مجسمہ بن جائے۔ آج کل کے انسانوں کی عظیم اکثریت نے اپنے آزاد ارادہ سے بدی اور ظلم و ستم کی راہ اختیار کی، نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا شر و فساد سے بھر گئی، اگر انسانوں کی اکثریت نیکی کی راہ پر چلتی تو صورتِ اس کے برعکس ہوتی اور دنیا امن و سکون اور خیرِ انسانیت کی نعمتوں سے مالا مال ہوتی۔

اگر انسان صاحبِ شعور اور صاحبِ اختیار نہ ہوتا تو وہ نیکی کی طرح بدی اور ظلم و فساد کی راہ بھی اختیار نہ کر سکتا تھا۔ اس صورت میں انسانی دنیا یقیناً "اندھیر" سے پاک ہوتی مگر انسان انسان نہ ہوتا۔ پتھر، درخت یا جانور ہوتا اور انہی کی طرح فطرت کے لگے بندھے طریقہ پر مجبورانہ زندگی

گزارتا۔ یہی نہیں، انسانی دنیا تمدن علم اور سائنس کی تمام ترقیوں سے بھی محروم ہوتی کیوں کہ علم، سائنس اور تمدن، ان میں سے ہر شے کا وجود اور اس کا سارا ارتقا اسی "اختیار" کا مرہونِ منّت ہے۔

انسان کے صاحبِ فکر وشعور اور صاحبِ اختیار ہونے سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خدا نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہ بات اس کی واضح دلیل ہے کہ خدا موجود ہے۔ آپ خدا کا انکار کرنے کے بعد انسان کے صاحبِ شعور وارادہ ہونے کی کوئی توجیہ نہیں کر سکتے۔ بے شعور، بےارادہ اور غیر ذی اختیار مادہ کے جبری نظام میں شعور، ارادہ اور اختیار کہاں سے نمودار ہو گئے؟ لیکن اگر آپ ایک صاحبِ شعور، صاحب ارادہ اور صاحب اختیار واقتدار ہستی کو کائنات کا خالق مانتے ہیں تو انسان کے صاحبِ اختیار وشعور ہونے کی آپ سے آپ توجیہ ہو جاتی ہے۔ انسان کا شعور، ارادہ اور اختیار اللہ کے شعور، ارادہ اور اختیار کا پرتو اور عکس ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف قرآنِ مجید ان لفظوں میں اشارہ کرتا ہے:

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ؕ "تو جب میں اسے ٹھیک طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں"

اگر آپ خدا کا انکار کرتے ہیں تو آپ کو ماننا ہو گا کہ انسان صاحبِ اختیار نہیں مجبورِ محض ہے۔ وہ جو کچھ سوچتا اور جو کچھ کرتا ہے وہ مخصوص کیمیاوی عناصر وسالمات کے خصوصی امتزاج کا نتیجہ ہے۔ "جبریت" کے اس فلسفہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس آزادی واختیار کا انکار کر دیں جسے آپ اور ہر انسان بداہتہً محسوس کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس فلسفہ کی رُو سے کوئی انسان اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہیں رہتا اور اس کے بعد آپ مجبور ہیں کہ مذہب، اخلاق، قانون، عدالت اور نظم ہر چیز کا انکار کر دیں۔ کیونکہ ان

سب امور کی بنیاد اس بات پر ہے کہ انسان آزادی و اختیار رکھتا اور اپنے اعمال کا ذمہ دار و جوابدہ ہے تو کیا آپ ان بنیادی ارادوں کا انکار کرنے کو تیار ہیں؟ اور کیا اس کے بعد انسانی سماج تباہی و بربادی سے محفوظ رہ سکے گا؟ نہیں، نہیں، کیا اس کی اصلاح کا کوئی امکان باقی رہ جائے گا؟ —— حقیقت یہ ہے کہ انسان بذاتِ خود خدا کے موجود ہونے کا بہت بڑا ثبوت ہے اور خدا کے انکار کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ نے انسان اور انسانیت سب کا انکار کر دیا ہے

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا (اقبالؒ)

انسان نیک یا بد جو اعمال بھی کرتا ہے، اس کے فوری نتائج برآمد نہیں ہوتے، اس سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ خدا موجود نہیں ہے اور کائنات میں اندھیر ہے۔ یہ بات آپ اس وقت سوچ سکتے تھے جب نتائج بالکل نہ نکلتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ظلم و فساد جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو قدرت کا تازیانہ نمودار ہوتا اور مفسدین کا زور ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ بے شمار ظالم و مفسد گروہ دنیا میں ابھرے اور اپنی مہلتِ عمل ختم ہونے کے بعد کے بعد صفحۂ ہستی سے اس طرح مٹا دیئے گئے کہ آج کوئی انھیں جانتا بھی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر صبر و استقلال سے کام لیا جائے تو نیکی اور انسانیت کا بہتر نتیجہ نکل کر رہتا ہے۔ یہ صورتِ حال اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک قادرِ مطلق اور منتظم ہستی موجود ہے جو حالات پر کنٹرول کرتی رہتی ہے اور انھیں ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔

جہاں تک نتائج کے دیر سے برآمد ہونے کا تعلق ہے، یہ کچھ اخلاقی اقدار و امور تک محدود نہیں ہے۔ کائنات میں بہت سی چیزوں اور بہت سے واقعات کے نتائج دیر سے نکلتے ہیں۔ کائنات کو موجودہ حالت تک

پہنچتے ہیں اربوں سال لگتے ہیں، زمین کروڑوں سال کے پیہم انقلابات کے بعد اس قابل ہو سکی ہے کہ اس سے زندگی نمودار ہو اور حیوانات اور انسان اس پر بس سکیں۔ کاشت کار بعض فصلیں تین مہینوں میں کاٹ لیتے ہیں، بعض چھ مہینے میں، بعض سال بھر میں۔ اسی طرح اگر انسانی اعمال کی کھیتی کٹنے میں دیر لگے تو یہ عجیب کیوں ہے؟ اور یہ اس بات کا ثبوت کیوں کر ہے کہ خدا نہیں ہے؟

بدی اور ظلم و فساد کے عام ہونے سے دنیا کا امن و سکون رخصت ہو گیا ہے اور وہ سخت مصائب و آلام کا شکار ہے، یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ بے دینی و بداخلاقی انسانیت کے لیے مہلک ہیں اور انسانی ارتقاء کے لیے اصل اہمیت مادی ترقی کو نہیں، دینی و اخلاقی قدروں کو حاصل ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ خدا، مذہب اور اخلاق ثابت شدہ حقائق ہیں۔ ان کا اعتراف انسانیت کے لیے موجبِ فلاح ہے اور ان کا انکار موجب ہلاکت و خسران۔

خدا پرستی ملحدین کی نظر میں

مُلحدین کا معیارِ علم و تحقیق

"خدا ہے یا نہیں" بلاشبہ کچھ لوگ اس مسئلہ پر عقلی اور سائنٹیفک انداز میں غور کرتے ہیں، لیکن ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جانے کے قابل ہیں اور ان میں بھی ایسے لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں جو اس بنیادی مسئلہ کی تحقیق کا حق ادا کرتے ہوں۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ لوگ مذہب اور اہلِ مذاہب کے پیشِ نظر خدا کے ہونے، نہ ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ مذہب کے سلسلے میں ان کا اُلٹا سیدھا، جو مطالعہ ہوتا ہے اور اہلِ مذاہب کے بارے میں، غلط صحیح ان کا جو احساس ہوتا ہے، اس کی بنیاد پر یہ وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ مذہب غلط اور مہمل ہے اور اس لیے خدا کو ماننے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ان حضرات کے نزدیک مذہب تمام خرابیوں کا سرچشمہ ہے اور اہلِ مذاہب میں دنیا جہاں کی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہبی تعلیمات سراسر خلافِ عقل اور حد درجہ طفلانہ و احمقانہ ہوتی ہیں۔ مذہب علم، سائنس اور عقلی ارتقاء کا سب سے بڑا دشمن ہے، وہ جہالت اور جاہلانہ تصورات کو پروان چڑھاتا اور انہی کے سایہ میں پروان چڑھتا ہے، یہ

مذہب ہی ہے جس کے باعث انسان اوہام اور دور از کار تخیلات کا پرستار بن جاتا ہے کیوں کہ مذہب کی بنیاد ہی خرافیات پر ہے، مذہب کی بدولت لوگ تقدیر کے چکر میں پھنس جاتے اور پستی و بدحالی پر قانع و مطمئن رہتے ہیں، مذہب عوام کی افیون ہے، اس کی تعلیم یہ ہے کہ غریب اور محکوم عوام سرمایہ دار اور ارباب اقتدار کے ظالمانہ جوئے کے نیچے پستے رہیں مگر اُف نہ کریں کیونکہ جو کچھ ہو رہا ہے خدا کی مرضی سے ہو رہا ہے اور خدا کے سچے بندوں کو اس کی مرضی پر راضی رہنا چاہیے۔ علاوہ ازیں مذہب کی رُو سے چندروزہ زندگی میں مصیبتوں پر مصیبتیں جھیلنے اور صبر کرنے سے جنت کی ابدی نعمتیں ملتی ہیں یا ایک دوسرے عقیدے کے مطابق جو کچھ ہو رہا ہے پچھلے جنم کے کرموں کا نتیجہ ہے اس لیے اسے برداشت ہی کرنا چاہیے۔ اس طرح مذہب، سرمایہ داروں اور ظالم اور مستبد فرمانرواؤں کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے اور ان کا آلۂ کار بنتا ہے۔ نہیں، نہیں، مذہب دراصل سرمایہ داروں اور ہوشیار ارباب اقتدار کا بنا ہوا جال ہے جو انھوں نے عوام کو پھانسنے اور بیوقوف بنانے کے لیے تیار کیا ہے۔ مذہب مادّی ارتقاء کی راہ میں پہاڑ بن کر حائل ہو جاتا ہے۔ تہذیب و تمدّن کی بزم آرائی اور مادی و معاشی ترقیوں کی چہل پہل اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ مذہب کے نزدیک دنیا مایا کا جال ہے۔ جس میں پھنس جانے کے بعد مکتی (نجات) کی کوئی راہ نہیں۔ سچا ایشور بھگت وہ ہے جو دنیا کے لذائذ اور رنگینیوں ہی سے نہیں جسم و جان کے بنیادی مطالبات سے بھی خود کو محروم کرے۔ تمام مادّی علائق کو توڑ کر اور متمدن و آباد دنیا کو خیرباد کہہ کر جنگلوں، غاروں اور برف پوش پہاڑوں میں پناہ لے اور جسم کو گھلا گھلا کر اور شدید ترین اذیتیں دے دے کر آتم شکتی (روحانی طاقت) کو پروان چڑھائے۔ اور ان تمام خرابیوں سے بڑھ کر یہ کہ مذہب انسان کو خونخوار

جنگ جو بناتا ہے۔ مذہب کی بنیاد پر انسانی خونریز جنگیں ہوئی ہیں اور جنگ و فساد کا یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہ ہے مذہب! یہ ہے خدا پرستانہ نظام زندگی! اگر انسان خدا کو نہ مانتا ہوتا تو اس سے ان حماقتوں اور برائیوں کا صدور بھی نہ ہوتا۔ (معاذ اللہ)

یہ ہے مذہب اور اہل مذاہب کے خلاف ملحدین کے افکار و اقوال کا محتاط خلاصہ! بظاہر یہ باتیں بڑی وزنی معلوم ہوتی ہیں اور ملحدین تو ان کو اتنا وزنی خیال کرتے ہیں کہ ان کی بنیاد پر خدا کا انکار کر دیتے ہیں، لیکن کیا سچ مچ یہ باتیں اتنی ہی وزنی ہیں؟ اور کیا ان کی بنیاد پر خدا کا انکار صحیح ہے؟ فی الحقیقت خدا کے ہونے نہ ہونے کے مسئلہ سے ان باتوں کا ادنیٰ تعلق بھی نہیں ہے، نہ برائیاں (اگر وہ فی الواقع ہوں) خدا کو ماننے کا نتیجہ ہیں!

ملحدین کے ان افکار کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کی بنیاد علم و تحقیق پر نہیں ہے۔ یہ حضرات اپنے آپ کو علم و تحقیق کا اجارہ دار سمجھتے ہیں اور خدا پرستوں کو جاہل و احمق کہتے ان کی زبان نہیں تھکتی، لیکن یہی حضرات مذہب اور اہل مذاہب کے خلاف علم و تحقیق کے بغیر فیصلہ کن رائے قائم کرتے ہیں۔ پھر وہ اسی پر بس نہیں کرتے، اسی فکر بلا تحقیق کی اساس پر زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرتے ہیں، اسی نقطۂ نظر کی طرف انتہائی بے باکی سے دعوت دیتے اور جو شامت زدہ اس سے اختلاف کی جرأت کرے، اسے رجعت پسند، احمق اور کودن ذہنی قرار دیتے ہیں اور ذرا نہیں سوچتے کہ فکر بلا علم اور اندھے اعتقاد (Blind Faith) کی یہی وہ بدترین روش ہے جس کا طعنہ وہ اہلِ مذاہب کو دیتے ہیں۔

یہ حضرات جو مختلف علوم و فنون میں تحقیق کرتے وقت اعداد و شمار کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ مذہبیات کے سلسلے میں اعداد و شمار کی

ضرورت بھی نہیں محسوس کرتے۔ ان حضرات نے سنجیدگی سے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اہلِ مذاہب کی جن خامیوں کا عام طور سے تذکرہ کیا جاتا ہے ان میں سے کتنی واقعتہً ان کے اندر موجود ہیں اور کتنی غلط طور سے ان کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں یا اُن میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ معلوم کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ یہ خامیاں تمام مذاہب کے ماننے والوں میں پائی جاتی ہیں یا کچھ مذاہب کے ماننے والوں میں۔ یا کچھ خامیاں ایک مذہب کے پیرؤں میں ملتی ہیں اور کچھ دوسری خامیاں دوسرے مذہب کے معتقدوں میں۔ انھوں نے یہ بھی پتہ نہیں لگایا کہ یہ خامیاں صرف عوام میں پائی جاتی ہیں یا پڑھا لکھا اور سمجھدار طبقہ بھی ان میں ملوّث ہے اور اگر یہ طبقہ بھی ان میں ملوث ہے تو اس کا تناسب کیا ہے؟ انھوں نے اس بات کی بھی تحقیق نہیں کی کہ اہلِ مذاہب کا یہ حال ابتداء سے ہے اور ہمیشہ سے رہا ہے یا اُن کے انحطاط کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے یہ معلوم کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ یہ برائیاں مذہب سے اُن کے تعلق و وابستگی کا ثمرہ ہیں یا مذہب سے اُن کی دوری و جہالت کا۔ انھوں نے اس کھلی ہوئی حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ اُن میں سے بعض خامیاں لا مذہب یا مذہب سے بے نیاز افراد میں بھی شدت سے پائی جاتی ہیں مگر ان کے سلسلہ میں بھی مذہب اور اہلِ مذاہب ہی کو ہدفِ ملامت بنایا جا رہا ہے۔ مثلاً اہلِ مذاہب کے خلاف ایک سنگین الزام یہ ہے کہ وہ سخت جنگ جو اور فسادی ہوتے ہیں، لیکن کیا مذہب سے بے نیاز اور ملحد افراد میں یہ برائی بدرجۂ اتم موجود نہیں ہے؟ کیا یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت نہیں ہے کہ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد یورپ کی تقریباً تمام جنگیں، مذہب کی بنیاد پر نہیں، قوم پرستی (Nationalism) اور مادہ پرستانہ مفادات کی بنیاد پر ہوئی ہیں؟ کیا تاریخِ انسانی کی سب

سے زیادہ بھیانک اور ہلاکت خیز جنگوں ۔۔۔ جنگِ عظیم و جنگِ عالمگیر ۔۔۔ کا محرک مذہب تھا یا قوم پرستی اور لادینی سیاست (Secularism) اور کیا تیسری ہولناک ترین جنگ ۔۔۔ ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور خلائی راکٹ کی جنگ کو جو سروں پر منڈلا رہی ہے اور جو بہت تھوڑے سے عرصہ میں پوری دنیا کو فنا کے گھاٹ اتار دے گی، نوعِ انسانی پر مسلط کرنے کی ذمہ داری بھی مذہب پر ہی ڈالی جائے گی؟

دورِ حاضر کی سیاست سیکولر (Secular) ہے، یعنی وہ مذہب و اخلاق کی "آلودگی" سے قطعاً پاک ہے۔ سیاست کی یہ "تطہیر" اسی لیے عمل میں آئی ہے کہ اربابِ سیاست کے نزدیک مذہب فساد کی جڑ ہے۔ لیکن مذہب و سیاست کی اس تفریق کے بعد صورت حال کیا ہے؟ کیا سیاسی فضا پر جنگ کے بادل منڈلاتے نہیں رہتے؟ کیا گھر گھر کشمکش و تصادم کا ہنگامہ برپا نہیں ہے؟ اور کیا پوری دنیا جنگ کا اکھاڑہ نہیں بن گئی ہے؟ یہ سب کچھ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ دین نہیں، لادینیت ہی جنگ و فساد کا سرچشمہ ہے ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی (اقبالؒ)

یہاں تفصیل کے ساتھ ان تمام خرابیوں سے بحث مقصود نہیں، جو اہلِ مذاہب کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ یہ بحث آگے آئے گی۔ اس مثال سے تو صرف یہ واضح کرنا تھا کہ اہلِ مذاہب کے "معائب" کی جو طویل و عریض اور بھیانک فہرست پیش کی جاتی ہے اس کی بنیاد علم و تحقیق پر نہیں، تعصب، بدگمانی اور بہتان تراشی پر ہے اور یہی وجہ ہے کہ لادینیت و الحاد کے معائب کو بھی دین و اخلاق کے معائب کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔

یہ حضرات اگر اہلِ مذاہب کے بارے میں انصاف سے کام لیتے

اور ان پر عائد کردہ الزامات کی غیر جانب دارانہ تحقیقات کرتے تو معائب کی فہرست ہرگز اتنی طویل اور بھیانک نہ ہوتی۔ یہ بات بھی بآسانی معلوم ہوجاتی کہ اس معاملہ میں تمام مذاہب کے پیروؤں کا حال یکساں نہیں ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی منکشف ہوجاتی کہ بیشتر خرابیاں مذہب سے جہالت یا سرتابی کا نتیجہ ہیں نہ کہ مذہب سے واقفیت و وابستگی کا۔

یہ حضرات بلا استثناء تمام مذاہب کو جہالت و خرافات کی پوٹ اور عوام کے حق میں ہر مذہب کو زہر ہلاہل سمجھتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی نے بھی۔ بڑے سے بڑے ملحد نے بھی۔ تمام ادیان کا تحقیقی مطالعہ نہیں کیا۔ یہی نہیں، ان میں ایسے لوگ بھی شاذ و نادر ہی ملیں گے جنھوں نے اپنے آبائی مذہب ہی کا گہرا تحقیقی اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہو۔ یہ حضرات اپنی گفتگوؤں، تقریروں اور کتابوں میں مذہب کا جس انداز سے تعارف کراتے اور مذہب پر تنقید کرتے وقت جیسی بیگانہ اور سطحی باتیں کرتے ہیں، اُس سے یہ بات خود بخود ثابت ہوجاتی ہے کہ انھوں نے مذاہبِ عالم کا تحقیقی مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

لیکن اگر آپ کا خیال یہ ہو کہ یہ تو قیاس ہے، جو غلط بھی ہوسکتا ہے تو بسم اللہ آپ بطورِ خود ملحدین کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کا جائزہ لیجئے۔ سب سے پہلے یورپ سے ابتداء کیجئے کہ گزشتہ چند صدیوں سے اس کو الحاد کا گہوارہ اور ملحدین کا امام بننے کا شرف حاصل ہے۔ آپ مغربی ممالک کے چوٹی کے ملحدین کو لے لیجئے۔ ان کی زندگیوں کا تفصیلی مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ انھوں نے اپنی عمر کا کتنا حصّہ مذاہبِ عالم کے تحقیقی مطالعہ اور ان پر غور و فکر میں صرف کیا ہے۔ انھوں نے کس کس مذہب کو اس کے حقیقی ماخذ سے سمجھنے کی غیر جانبدارانہ کوشش کی، کن کن مذہبی صحیفوں کا براہِ راست ان کی اپنی زبان میں مطالعہ کیا اور کن کن دینی صحائف کا مطالعہ مستند تراجم یا معتمد شارحین

کی وساطت سے لیے کیا اور اس مطالعہ کے ٹھوس نتائج کیا ہیں؟ اس تفصیلی تجزیہ کے بعد آپ بھی انشاء اللہ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے جس پر ہم پہنچ چکے ہیں۔

مغربی ممالک سے فارغ ہونے کے بعد مشرق میں آپ اپنے ملک کا انتخاب کریں کہ اس کا حال آپ سب سے زیادہ جانتے ہیں اور اسے مختلف وجوہ سے امتیازی حیثیت بھی حاصل ہے۔ یہاں کے معروف ترین ملحدین کی فہرست مرتب کیجئے اور ان کی زندگیوں کا گہرا جائزہ لے کر دیکھیئے کہ اس میں سے کس کس نے کن کن مذاہب کا عمیق اور تحقیقی مطالعہ کیا ہے۔ اس جائزہ کے نتیجہ میں آپ کو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ "مذہب غلط اور مہمل ہے" کا دعوی کرنے والوں میں ایک آدھ کو چھوڑ کر کسی نے بھی کسی مذہب کا تحقیقی مطالعہ نہیں کیا ہے حتی کہ اپنے آبائی مذہب کا بھی نہیں، اور ان میں ایسے محققین کا وجود تو عنقا ہے جنھوں نے تمام مذاہب کے گہرے مطالعہ اور عمیق غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا ہو کہ تمام مذاہب غلط اور مہمل ہیں۔

مثال کے طور پر آپ اپنے ملک کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو لیجئے۔ مشرق و مغرب میں ان کا جو مقام ہے اسے کون نہیں جانتا۔ ان کی ذہانت، ان کی فکر، ان کی وسعتِ مطالعہ اور ان کی شخصی عظمت کے ان کے مخالفین بھی معترف ہیں وہ چوٹی کے سیاست دان اور عظیم مدبر ہی نہیں متعدد مقبول و معروف کتب کے مصنف بھی ہیں۔ گاندھی جی کے تربیت یافتہ ہونے کے باوجود وہ ملحد ہیں اور ان کا الحاد کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ وہ مذہب کو دقیانوسی اور مہمل سمجھتے ہیں سوال یہ ہے کہ وہ اس نتیجہ پر کیوں کر پہنچے؟ کیا انھوں نے عیسائیت کا تحقیقی مطالعہ کیا؟ ہرگز نہیں! کیا انھوں نے قرآن و حدیث سے اسلام کو سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کی؟ قطعاً نہیں!

کیا انھوں نے بدھ مت کو سمجھنے کے لیے ان کے قدیم مآخذ کی طرف رجوع کیا؟ بالکل نہیں! کیا انھوں نے اپنے آبائی مذہب، ہندو مت ہی کا گہرا اور تحقیقی مطالعہ کیا اور وید، اپنشد، منوسمرتی، گیتا اور پران کے تفصیلی مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ مذہب ایک مہمل بلکہ مہلک شئے ہے؟ ایسا بھی نہیں ہوا! پھر وہ اس قطعی نتیجہ پر کس طرح پہنچے؟ کیا یورپ کے ملحدین کے افکار سے متاثر ہو کر؟ مگر یہ تو تحقیق نہیں، کورانہ تقلید ہوئی۔

مذہب کے سلسلہ میں ملحدین کا عام رویہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں یا گرد و پیش کے عوام میں مذہب کے نام سے جن مزخرفات کو دیکھ سن یا پڑھ لیتے ہیں، بے سوچے سمجھے انھی کو مذہب خیال کر لیتے ہیں اور اس تحقیق انیق کی بنیاد پر مذہب کو مجموعۂ خرافات سمجھ کر بے تامل رد کر دیتے ہیں، لیکن کیا عوام کے جاہلانہ رسوم و خرافات کا نام مذہب ہے؟ کیا جہلاء کا قول و فعل مذہب کیا، کسی معاملہ میں بھی سند و حجت کا درجہ رکھتا ہے؟ کیا مختلف مذاہب کے مقدس صحیفے موجود نہیں ہیں کہ مذہبی تعلیمات جاننے کے لیے جاہل و بے خبر عوام کی طرف رجوع کیا جائے؟ پھر کیا اسی کا نام علم و تحقیق ہے کہ صحیح مطالعہ اور مناسب غور و فکر کے بغیر الل ٹپ کسی شئے کو رد کر دیا جائے؟ اور پھر علم و تحقیق کے بغیر ہی اس کے غلط اور قابلِ رد ہونے کا ڈھنڈورا بھی پیٹا جائے؟ اگر اسی کا نام علم و تحقیق ہے تو پھر جہلِ مرکب کسے کہتے ہیں۔

یہاں ایک خلش ذہن میں پیدا ہوتی ہے جسے دور کیے بغیر آگے بڑھنا صحیح نہ ہوگا اور وہ یہ ہے کہ ملحدین نے تحقیق کیے بغیر مذہب کے خلاف ایک متعصبانہ رائے قائم کر لی، یہ بات اگر واقعہ کی رو سے صحیح ہے جیسا کہ اوپر کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے تو خود اس عجیب و غریب واقعہ کی توجیہ کیا ہے؟ مشرق کے ملحدین کے بارے میں تو آپ یہ کہہ سکتے

ہیں کہ وہ مغربی ملحدین کے افکار سے مرعوب اور اُن کے مقلد ہیں۔ مگر خود مغربی ملحدین کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ وہ کس سے مرعوب اور کس کے مقلد ہیں؟ جن لوگوں کے آباؤ اجداد صدیوں سے مسیحیت کے معتقد چلے آرہے تھے، وہ اچانک مسیحیت ہی نہیں، مذہب و خدا اور ہر مذہب کی رشتے سے بیزار کیوں ہو گئے؟ ایک اور پہلو سے سوچئے، یورپ میں جب تک جہالت کا دور دورہ تھا وہ مذہب کو متاعِ عزیز سمجھ کر سینے سے چمٹائے ہوئے تھا۔ مگر جونہی یورپ قرونِ مظلمہ (Ages Dark) سے نکل کر علم و سائنس کی روشنی میں آیا مذہب سے اس کی عقیدت کم ہونی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہی یورپ جو ایک ہزار سال سے مسیحیت کا گہوارہ تھا، الحاد کی آماجگاہ بن گیا۔ اور اس نے پوری بے دردی سے مذہب و اخلاق کو پیروں تلے روند ڈالا۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اگر مذہب اور علم و سائنس میں بیر نہیں تو علم و سائنس کی روشنی پھیلتے ہی مذہب کا اثر کیوں زائل ہو گیا؟ اگر مذہب اور اس کے ماننے والوں میں شدید خامیاں نہ تھیں تو یورپ کے بے شمار افراد ـــ جن میں بڑے بڑے ذی علم اور اربابِ کمال شامل ہیں۔ مذہب اور اہلِ مذاہب میں ہزاروں عیب کیوں نکالنے لگے اور مذہب اور اربابِ مذہب کے مخالف کیوں ہو گئے؟ کیا یہ سب کے سب ہٹ دھرم اور متعصب تھے؟ کیا ان میں کچھ لوگ بھی حق پرست نہ تھے جو مذہب کی خوبیوں اور اس کی حقانیت کا اعتراف کرتے؟ کیا یہ ساری کشمکش بے وجہ اور بے بنیاد تھی؟

یہ سوال اس لیے بھی اہم ہے کہ مشرق کا الحاد مشرق کی پیدائش نہیں، مغربی الحاد کی صدائے بازگشت ہے اور مشرق میں وہی لوگ الحاد کے معتقد و داعی ہیں جو مغربی افکار سے مرعوب اور مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ یہ حضرات اس بات سے بہت زیادہ متاثر ہیں کہ یورپ میں مذہب اور سائنس

کے مابین سخت ٹکر ہوئی۔ اگرچہ مشرق میں مذہب و سائنس کے درمیان ایسی کوئی ٹکر نہیں ہوئی مگر یہ حضرات مشرق کی بجائے مغرب اور اہلِ مغرب کو پیشِ نظر رکھ کر سوچنے کے عادی ہیں اور ان کے ذہن پر اہلِ مذہب اور اربابِ سائنس کے تصادم کا اتنا گہرا اثر ہے کہ وہ اسے کسی طرح نظر انداز کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

عیسائیت کی تاریخ

یورپ میں مذہب اور سائنس کی ٹکر فی الواقع مسیحیت اور سائنس ہی بلکہ مسیحیت اور غلط کار پیشواؤں اور اربابِ سائنس کے درمیان تھی۔ اسی لیے اس سوال کا جواب پانے کے لیے عیسائیت کے آغاز اور یورپ میں اس کے ارتقاء پر غور کرنا ہوگا۔ یہ داستان ڈیڑھ ہزار سال کی طویل مدت پر پھیلی ہوئی ہے جسے ہم اختصار سے بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

عہد نامہ عتیق[1] (Old Testament) کے سرسری مطالعہ ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل کے لائے ہوئے دین کی اولین اساس توحید تھی یعنی یہ بات کہ پرستش کا مستحق صرف اللہ ہے، قانون اسی کا قانون ہے اور اطاعت اسی کے قانون کی ہونی چاہیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سمیت تمام انبیاء نے اسی بنیادی تعلیم پر زور دیا اور شرک کے ادنیٰ سے ادنیٰ شائبے سے انسانی زندگیوں کو پاک کرنے کی کوشش کی۔ تاریخ اور خود بائیبل (عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید) سے یہ بات ثابت

---

[1] انجیل کے علاوہ جسے "عہد نامہ جدید" (New Testament) کہتے ہیں انبیاء بنی اسرائیل کے تمام صحیفوں کا مجموعہ، یہ صحیفے یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کے نزدیک وحی الٰہی اور مقدس ہیں۔

ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفے تحریفات کی نذر ہو گئے۔ مگر ان کی تعلیمات کا پورا جز — توحید — محفوظ رہا۔ وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل میں انبیاء کی آمد کا سلسلہ برابر جاری رہا اور توحید کی اہمیت اور یہود کے بگاڑ کے پیشِ نظر یہ سب انبیاء توحید اور اس کے تقاضوں پر مسلسل زور دیتے رہے۔

انبیاء علیہم السلام کی پیہم کوششوں کے باوجود یہود ایمانی اور اخلاقی اعتبار سے پست سے پست تر ہوتے چلے گئے۔ ان کے عوام و خواص نہ صرف یہ کہ بد اخلاقی اور بدعملی کی ناپاک گہرائیوں میں ڈوب گئے بلکہ ان میں سے بہتوں نے بت پرستی تک کی نوبت پرستی سے بیج بو گئے وہ علماء پرستی، مشائخ پرستی اور روایات پرستی کا شکار ہو گئے۔ یہود کی اس حالت پر حضرت مسیح یسعیاہ نبی کے الفاظ دہراتے ہوئے اس طرح تنقید کرتے ہیں:

"اسی طرح تم اپنی روایات کے لیے خدا کے حکم کو باطل کرتے ہو۔ اے مکارو! یسعیاہ نبی نے تمہارے حق میں کیا خوب پیشین گوئی کی تھی۔ یہ لوگ اپنی زبان سے میری تحریف کرتے ہیں اور ہونٹوں سے میری تعظیم کرتے ہیں، لیکن اُن کے دل مجھ سے دور ہیں۔ وہ آدمی کے حکموں کو علم ضروری کی طرح سمجھ کے میری پرستش باطل کرتے ہیں۔" (متی، باب ۵، ۶ تا ۹)

اور قرآن مجید نے اسے نہایت مختصر مگر جامع لفظوں اس طرح بیان کیا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۝ "انھوں نے اپنے علماء اور اپنے مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا "رب" بنا لیا۔"

یہ لوگ خدا کی نافرمانیوں اور کھلی ہوئی بداخلاقیوں کا دانستہ ارتکاب کرتے اور ذرا شرمندہ نہ ہوتے، لیکن اگر کوئی شخص کسی چھوٹے سے

فقہی جزئیہ یا رائج الوقت کسی معمولی سے رواج یا روایت کے خلاف کوئی عمل کر بیٹھتا تو اس کی اس حرکت کو بے دینی قرار دے دیتے یہودی مشائخ کی روایت یہ تھی کہ نہائے یا ہاتھ منہ دھوئے بغیر کھانا نہ کھایا جائے۔ ایک بار حضرت مسیحؑ کے شاگردوں نے ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کھا لیا، اس پر یہودی علماء نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

"تب یروشلم کے کاہنوں اور فریسیوں نے یسوع کے پاس آکر کہا، تیرے مرید کس لیے روایتِ مشائخ کی نافرمانی کرتے ہیں کہ روٹی کھاتے وقت اپنے ہاتھ نہیں دھوتے۔ اس نے ان سے جواب میں کہا، تم کس لیے اپنی روایت کے لیے خدا کے حکم کی نافرمانی کرتے ہو کہ خدا نے یہ حکم کیا کہ اپنے ماں باپ کی تعظیم کر اور جو کوئی ماں باپ کو بری بات کہے جان سے مارا جائے، لیکن تم کہتے ہو اگر کوئی باپ یا ماں سے کہے کہ جو کچھ مجھ پر تجھے دینا تھا جب تھا سو راہِ خدا میں دے دیا گیا تو وہ اپنے ماں باپ کی تعظیم (خدمت) نہ کرے گا۔ اسی طرح تم اپنی روایت کے لیے خدا کے حکم کو باطل کرتے ہو۔ پھر اس نے جماعت کو بلا کر کہا، سنو اور سمجھو! جو کچھ منہ میں جاتا ہے، آدمی کو ناپاک نہیں کرتا بلکہ وہ جو منہ سے نکلتا ہے وہی آدمی کو ناپاک کرتا ہے کہ جو کچھ منہ میں جاتا پیٹ میں پڑتا اور پاخانہ میں پھینکا جاتا ہے، لیکن جو کچھ منہ سے نکلتا ہے دل سے باہر آتا ہے اور آدمی کو ناپاک کرتا ہے کہ برے خیال، خون، زنا، حرام کاریاں، چوریاں، جھوٹی گواہیاں اور کفر دل سے ہی نکلتے ہیں۔ پر بن دھوئے ہاتھوں سے کھانا کھانا آدمی کو ناپاک نہیں کرتا" (متی باب ۱۵، آیت ۱ تا ۶، ۱۰، ۱۱، ۱۷ تا ۲۰)

مرقس انجیل میں یہی بات ذرا تفصیل سے ہے، اس کے بعض اجزا یہ ہیں:

"تب فریسیوں اور کاہنوں نے اس سے پوچھا کہ تیرے مرید مشائخ کی روایت پر کیوں نہیں چلتے اور روٹی بن دھوئے ہاتھوں سے کھا لیتے ہیں۔ اس نے انھیں جواب میں کہا اے مکارو! یسعیاہ نے تمھاری ٹھیک خبر دی ہے کہ لکھا ہے یہ لوگ ہونٹوں سے میری تعظیم کرتے ہیں، پر ان کے دل مجھ سے دُور ہیں اور آدمی کے حکموں کو نصیحتِ الٰہی جان کر سکھلاکے میری عبادت بے فائدہ کرتے ہیں کہ تم خدا کے حکموں کو ترک کر کے آدمی کی روایت کو مانتے ہو اور تھالیوں اور پیالیوں کو ڈبونا وغیرہ ایسے بہتیرے کام کرتے ہو اور اس نے ان سے کہا، تم خدا کے حکم کو اچھی طرح سے باطل کرتے ہو تاکہ اپنے طریق کار کو بجا رکھو کیونکہ موسیٰ نے کہا اپنے ماں باپ کی تعظیم کر۔ پس تم خدا کی بات کو اپنی روایت سے جو تم نے جاری ہے باطل کرتے ہو اور ایسا بہت کچھ کرتے ہو۔" (مرقس باب ۷، آیت ۱ تا ۱۳)

افسوس کہ حضرت مسیحؑ کی اس حکیمانہ تعلیم و تنقید کا مطلب سینٹ پال اور ان کے متبعین نے یہ لیا کہ توریت کی شریعت منسوخ ہو چکی اور ہر چیز جو پہلے حرام تھی اب حلال ہے حالانکہ حضرت مسیحؑ کا پورا زور اس بات پر تھا کہ خود ساختہ روایات اور قوانین کے بجائے شریعتِ الٰہی کی پیروی ہونی چاہیے انھوں نے شریعتِ الٰہی کے قوانین کو ختم کر دینے اور ان کی جگہ خود ساختہ رسوم و قوانین جاری کرنے کی شدید مذمت کی اور جیسا کہ خود حضرت مسیحؑ نے صراحت کی، احکامِ خداوندی سے مراد حضرت موسیٰؑ کی لائی ہوئی شریعت ہی ہے۔

یہودی خدا کی نافرمانی اور اخلاق باختہ زندگی کے اس قدر عادی ہو گئے

تھے کہ جو کوئی انھیں ان حرکاتِ شنیعہ سے روکتا اس کے درپے آزار ہو جاتے اور بس چلتا تو اسے مار ڈالتے۔ حتیٰ کہ وہ نبیوں تک کو جھٹلانے اور قتل کرنے لگے تھے۔ عہد نامۂ عتیق اور قرآنِ مجید میں ان کی بدترین روش کا ذکر بار بار آیا ہے اور انجیل میں ہے:

"اے یروشلم! جو نبیوں کو قتل کرتی اور انھیں جو تیرے پاس بھیجے گئے سنگسار کرتی ہے۔" (متی باب ۲۳ آیت ۳۷)

یہ حالات تھے جن میں حضرت مسیح یہود کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوئے:

"میں اسرائیل کے گھرانے کی گمراہ بھیڑوں کے سوا کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔" (متی، ۵، ۲۴)

اس پسِ منظر میں یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت مسیح کی دعوت کیا تھی؟ اگر تمام انبیاء بنی اسرائیل کی دعوت توحید ہی کی دعوت تھی تو حضرت مسیح شرک کی دعوت کیونکر دے سکتے تھے جب کہ وہ انبیاء کے مشن ہی کو پورا کرنے آئے تھے؟ جب عہد نامۂ عتیق بھی خدا کی طرف سے ہے اور بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے ہے اور عہد نامہ جدید بھی بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے خدا ہی کی طرف سے آیا ہے تو دونوں کی — بنیادی تعلیم میں فرق کیسے ہو سکتا ہے؟ اس قدر عظیم فرق کہ ایک کی بنیادی تعلیم توحید ہو اور دوسرے کی بنیادی تعلیم تثلیث! عہد نامۂ عتیق کی رو سے ایک خدا کے سوا کسی اور خدا کو تسلیم کرنا شرک و کفر ہو اور عہد نامۂ جدید کی رو سے ایک سے زائد خداؤں کو تسلیم کرنا عین ایمان اور تسلیم نہ کرنا کفر و الحاد ہو! حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے تمام انبیاء ایک خدا کے سوا تمام خداؤں کی خدائی کو ختم کرنے ہی کے لیے مبعوث ہوں اور عہد نامۂ جدید کو اصرار ہو کہ خدا ایک نہیں، تین ہیں! عقلاً یہ بات

ناممکن ہے! یقیناً صحیح اور عقل میں آنے والی بات یہی ہے کہ "عہد نامۂ عتیق" اور "عہد نامۂ جدید" کا بنیادی پیغام ایک ہی ہو اور حضرت مسیح کی دعوت بنی اسرائیل کے دوسرے انبیاء کی دعوت سے مختلف نہ ہو۔

قرآن مجید بھی پورے زورِ استدلال اور زورِ بیان کے ساتھ اسی ٹھوس حقیقت کی شہادت دیتا ہے۔

موجودہ انجیلوں کے مترجمین اور ان کے شائع کرنے والے، سب کے سب تثلیث پرست ہیں، نیز یہ انجیلیں تحریفات کا پیہم تختۂ مشق بنتی رہی ہیں، اس کے باوجود ان میں حضرت مسیح کی زبان سے تثلیث کی تعلیم صراحتہً کہیں نہیں ملتی۔ اس کے برعکس توحید کی تعلیم پوری اہمیت و وضاحت سے ملتی ہے:

"تب کاہنوں میں سے ایک شخص نے آ کے اس سے پوچھا کہ سب حکموں میں بڑا حکم کون ہے؟ یسوع نے اس کے جواب میں کہا کہ سب حکموں میں بڑا حکم یہ ہے کہ اے اسرائیل! سن! وہ اللہ جو ہمارا خدا ہے، ایک ہی خدا ہے، تو اللہ کو، جو تیرا خدا ہے، اپنے سارے دل سے، اپنی ساری جان سے، اپنی ساری عقل سے اور اپنی ساری قوت سے پیار کر، بڑا حکم یہی ہے۔ تب اس کاہن نے اس سے کہا، کیا خوب! اے مرشد! تو نے سچ کہا! کیونکہ خدا ایک ہی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں، جب یسوع نے دیکھا کہ اس نے دانائی سے جواب دیا تو اس سے کہا، تو خدا کی بادشاہت سے دور نہیں"

(مرقس باب ۱۲۔ آیت ۲۸ تا ۳۰، ۳۲، ۳۴)

ذرا اجمال کے ساتھ توحید کی یہی تعلیم انجیل متی باب ۲۲۔ آیت ۳۷ تا ۳۸ میں بھی ہے۔ اس میں حضرت مسیح کے یہ الفاظ بھی ہیں "یہی دو حکم ساری

شریعت اور سب نبیوں کی تعلیم کا خلاصہ ہیں۔" نیز انجیل لوقا باب ۱۰ آیت ۲۵ تا ۲۷ میں بھی بالاجمال یہی بات کہی گئی ہے۔ البتہ اس میں اتنا اور ہے "یہی کیا کر تو ہمیشہ کی زندگی پائے گا" کتنی عجیب اور افسوس ناک بات ہے کہ جس مسیح نے توحید کی تعلیم اتنی وضاحت اور اہمیت سے دی تھی اسے عین خدا بنا دیا گیا!

توحید ہی کے ذیل میں حضرت مسیح نے اس بات پر بھی زور دیا کہ بُت پرستی کی طرح علما پرستی، مشائخ پرستی اور رسوم پرستی بھی غلط ہیں۔ پوری زندگی میں شریعتِ الٰہی کی پیروی ہونی چاہیے اور تمام خود ساختہ بندشوں کو توڑ کر پھینک دینا چاہیے۔ (عبارتیں اوپر گزر چکی)

توحید کی اس خالص و بے میل تعلیم کو سامنے رکھیے جو انبیاء بنی اسرائیل کی زبانی عہد نامۂ عتیق میں اور حضرت مسیح کی زبان سے عہد نامۂ جدید میں موجود ہے اور پھر "نیسیہ عقیدہ" (Nicen Creed) کا مطالعہ کیجیے، جو چوتھی صدی عیسوی سے مسیحی دُنیا کا مسلم عقیدہ شمار ہوتا ہے۔ "نیسیہ عقیدہ" کے ضروری اجزاء یہ ہیں:

"ہم ایک خدا پر ایمان لاتے ہیں جو باپ ہے اور قادرِ مطلق، تمام چیزوں کا خالق۔ تمام حاضر و غائب کا، اور ایک خداوند یسوع مسیح پر ایمان رکھتے ہیں۔ ابن اللہ، خدا کا (جنا ہوا) اکلوتا، باپ کے جوہر سے، خداوند خدا، نور النور، عین خدا سے عین خدا، جنا ہوا، بنایا ہوا نہیں، باپ ہی کے جوہر سے جس نے تمام چیزیں بنائیں، آسمان اور زمین میں، جو ہم آدمیوں کے لیے اور ہماری نجات کے لیے اترا، مجسم بشکل انسانی، اس نے دکھ اُٹھایا، پھر تیسرے دن جی اُٹھا اور آسمان پر چڑھ گیا، مُردوں اور زندوں کی عدالت کے لیے پھر آئے گا اور ہم روح القدس

پر ایمان لاتے ہیں"

کیا یہ عقیدہ سراسر شرک نہیں ؟ اور کیا یہ انبیائے بنی اسرائیل اور خود حضرت مسیح کی دعوتِ توحید کی عین ضد نہیں ؟

توحید اور عبادات کے بعد شریعتِ الٰہی میں اعلیٰ اخلاق کی بنیادی اہمیت ہے، لیکن یہود ـــ شریعتِ الٰہی کے حامل ـــ اخلاقی اعتبار سے انتہائی پستیوں میں گر چکے تھے، چنانچہ حضرت مسیح نے نہایت بلند آہنگی سے اخلاقی تعلیم کا صور پھونکا۔ حضرت مسیح کے اخلاقی اور حکیمانہ خطبوں کے کچھ ٹکڑے ـــ ترجموں اور تحریفات کی چھلنی سے چھنتے ہوئے ـــ ہم تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ ٹکڑے بے حد مؤثر ہیں اور انجیل کا اصل قیمتی سرمایہ یہی "حکمت پارے" ہیں۔

یہود نبیوں کو جھٹلانے اور انھیں قتل کر دینے میں بہت بیباک ہو گئے تھے۔ اس لیے اللہ نے حضرت مسیح کو غیر معمولی معجزانہ زندگی عطا فرمائی۔ ان معجزات کو دیکھ کر کچھ لوگ ایمان لے آئے اور کچھ دل کے اندھوں نے پھر بھی انکار کر دیا۔ مگر جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے یہ معجزات دیکھے تھے ان میں سے کسی نے بھی حضرت مسیح کو خدا نہ سمجھا۔ انبیائے بنی اسرائیل اور خود حضرت مسیح کی دعوتِ توحید کے ہوتے ہوئے اس طرح کی کسی غلط فہمی کی گنجائش نہ تھی۔ البتہ سینٹ پال اور ان کے متبعین کے لیے یہی لوگ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ حضرت مسیح کو سولی دے دی گئی اور انھوں نے انتہائی بے بسی کے عالم میں جان دے دی۔

یہ ہے حضرت مسیح کی دعوت اور ان کی زندگی کا صحیح تعارف، جو عہد نامہ عتیق، عہد نامہ جدید اور عقل کے مطابق ہے۔ اگر حضرت مسیح کو الوہیت کا حامل مان لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ یہ بات بداہتہً عقل کے خلاف ہے بلکہ خود عہد نامہ عتیق کی رو سے ـــ جس کے ایک ایک لفظ کو مسیحی دنیا وحیِ الٰہی

اور مقدس خیال کرتی ہے۔ صریح کفر و شرک ہے، اور تو اور حضرت مسیح کی مذکورہ بالا تصریحات کی بھی عین ضد ہے۔ اب یا تو یہ کہیے کہ عہد نامۂ عتیق اور عہد نامۂ جدید، سب قابلِ ردّ اور غلط ہیں، یا یہ مانیے کہ تثلیث کا وہ عقیدہ غلط ہے جو عقل عہد نامۂ عتیق اور خود حضرت مسیح کی صریح تعلیمات کے خلاف ہے اور ان سب کو باطل ٹھہرا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دوسری بات ہی صحیح ہے!

حضرت مسیح نے اپنے بعد اپنے بارہ تربیت یافتہ شاگردوں کو اپنی دعوت پھیلانے کے لیے اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ یوں تو ان کا ذکر تمام انجیلوں، متی، مرقس، لوقا اور یوحنا میں ہے، مگر یوحنا میں پورا ایک باب ان کے حق میں دعا کے لیے مخصوص ہے۔ اسی دعا میں ہے:

"جس طرح تو نے مجھے دنیا میں بھیجا میں نے بھی انھیں دنیا میں بھیجا ہے۔" (باب ۱۷- آیت ۱۸)

حضرت مسیح کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کے حواریین نے ان کے مشن کو جاری رکھا اور انتہائی نازک حالات میں مصائب و شدائد جھیل جھیل کر حق کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔ ملاحظہ ہو، عہد نامۂ جدید، "رسولوں کے اعمال"۔

حواریین والہانہ انداز میں دعوت حق کو پھیلانے میں مصروف تھے کہ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس کے باعث آگے چل کر مسیحی دعوت کا چہرہ دنیا کے لیے مسخ ہو کر رہ گیا۔ ہوا یہ کہ ساؤل یا ذول نامی ایک شخص نے جو دعوتِ مسیحی کا بدترین مخالف تھا اور حواریین اور ان کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کو ایذا پہنچانے، قید کرنے اور جان سے مار ڈالنے میں پیش پیش تھا، اچانک مسیحی دعوت قبول کر لی (یہی شخص بعد میں سینٹ پال، بلکہ پولوس رسول کے مقدس نام سے مسیحی دنیا میں مشہور ہوا) سینٹ پال خود اپنے بیان کے مطابق یہودی تھا اور یہودی شریعت کا بہت بڑا ماہر۔

میں یہودی ہوں جو کیلیکیہ کے تارسس شہر میں پیدا ہوا، پر اس شہر میں گملیل کے قدموں میں تربیت پائی اور باپ دادا کی شریعت کی باریکیوں کی تعلیم حاصل کی اور جیسے تم سب آج ہو ایسا ہی خدا کے لیے غیرت مند تھا اور میں (مسیحی) مردوں اور عورتوں کو باندھ کے قید میں ڈالتا تھا۔" (عہد نامہ جدید، اعمال باب ۲۲، آیت ۳ تا ۵)

یہ بیان سینٹ پال نے یروشلم میں یہودیوں کے مجمع کو خطاب کر کے دیا تھا جو مسیحی دعوت کو پھیلانے اور بیت المقدس میں غیر اسرائیلیوں کو لے آنے کے جرم میں انھیں قتل کرنے کے درپے ہو گئے تھے اور یہ دیکھ کے کہ ہنگامہ ہوا جاتا ہے، رومی فوج کے سپہ سالار نے پال کو گرفتار کر لیا تھا، اگرچہ اسی باب میں تھوڑے سے ہی دور آگے چل کر یہ ہے کہ سینٹ پال نے رومی سپہ سالار سے کہا کہ میں رومی ہوں:

سپہ سالار نے پاس آ کے اس سے کہا، مجھ سے کہہ کہ تو رومی ہے؟ وہ بولا، ہاں! تب سپہ سالار بولا کہ میں نے بہت سے روپیہ سے یہ مرتبہ حاصل کیا۔ پاؤل بولا، میں نے پیدائش سے حاصل کیا۔" (آیت ۲۷، ۲۸)

اسی طرح کے ایک اور موقع پر انھوں نے رومی حاکموں سے کہا کہ وہ رومی ہیں۔ (اعمال باب ۱۶، آیت ۳۷)

حقیقت یہ ہے کہ سینٹ پال اپنے آپ کو ہر طرح سے پیش کرنے اور حسب موقع بات کرنے کا بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے یہودیوں میں پھوٹ ڈال کر خود کو رہا کرنے کے لیے یہ ظاہر کیا کہ وہ یہودیوں کے فریسی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی جرم میں ماخوذ ہیں۔ (اعمال باب ۲۳، آیت ۶، ۷)

سینٹ پال نے اپنے مسیحی ہونے کی وجہ یہ ظاہر کی کہ حضرت مسیح خود ان کے سامنے نمودار ہوئے اور انھوں نے اپنا کام کرنے پر انھیں مامور کیا۔
(اعمال باب ۲۲، آیت ۶ تا ۱۱)

انھوں نے اعلان کیا کہ وہ غیر اسرائیلیوں میں مسیحی دعوت پھیلانے پر مامور کیے گئے ہیں:

"پر جب خدا اپنے بیٹے کو مجھ میں ظاہر کرنے پر راضی ہوا تاکہ میں اس کی انجیل کا وعظ غیر ملکیوں میں کروں، فی الفور میں نے آدمیوں سے مشورہ نہیں کیا اور نہ یروشلم میں، ان کے پاس جو مجھ سے پہلے رسول ہوئے تھے، گیا بلکہ عرب کو گیا اور وہاں سے دمشق کو پھرا" (خط مذکور، باب ۱۔ آیت ۱۵ تا ۱۷)

جیسا کہ مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے، انھوں نے اپنی دعوت کا کام حوارئین کی اطلاع و مشورہ کے بغیر شروع کر دیا اور غیر اسرائیلیوں کو منتخب کیا جو عہد نامۂ عتیق، حضرت مسیح اور ان کے حوارئین کی دعوت سے ناآشنائے محض تھے، ضرورت پڑنے پر انھوں نے حوارئین کے نام کو بھی استعمال کیا:-

"جب یعقوب اور کیفا (پیٹر) اور یوحنا (حوارئین) کے جو ستون سے معلوم ہوتے تھے، دیکھا کہ جیسا پیٹر مختونوں (اسرائیلیوں) کو ویسا ہی میں غیر مختونوں (غیر اسرائیلیوں) کو انجیل سنانے پر مامور کیا گیا تھا، تب مجھے اور برنباہ کو شرکت کے داہنے ہاتھ دیے کہ ہم غیر ملکیوں کے، اور میں مختونوں کے پاس جائیں" (خط مذکور باب ۲، آیت ۷ تا ۹)

برنباہ[1] کو حواریوں نے سینٹ پال کی تربیت و نگرانی کے لیے ساتھ کر دیا

---

[1] حوارئین کا خاص تربیت یافتہ جس کا ذکر عہد نامۂ جدید میں بار بار آتا ہے دیکھئے اعمال (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہو گا (بشرطیکہ یہ واقع صحیح ہو) مگر سینٹ پال کو حواریین کی تربیت و نگرانی گوارا نہ تھی۔ چنانچہ برنباہ اور سینٹ پال کا ساتھ زیادہ دنوں تک نہ نبھ سکا:

"اور ان میں ایسی تکرار ہوئی کہ وہ ایک دوسرے سے جُدا ہوگئے"

(اعمال باب ۱۵، آیت ۳۹)

نتیجہ یہ نکلا کہ سینٹ پال کو میدان خالی ملا، انھوں نے غیر اسرائیلیوں میں جس طرح پایا مسیحی دعوت کو پیش کیا۔ حواریین کو جونہی اس کی خبر ہوئی کہ سینٹ پال من مانے طریقے پر مسیحی دعوت کو پیش کر رہے ہیں، انھوں نے سینٹ پال کی دعوت (انجیل) کے مقابلہ میں مسیح کی دعوت (انجیل) پیش کی اور اس طرح حواریین کے درمیان کشمکش کا آغاز ہوا:

عہد نامۂ جدید، میں سینٹ پال کے خطوط بھی ہیں، ان میں سے بعض خط ان مریدین کے نام ہیں جو حواریین کی دعوت سے متاثر ہو کر اُن کی طرف مائل ہوگئے تھے۔ سینٹ پال کے ان خطوط سے، جو یک طرفہ ہیں، کشمکش اور وجہ کشمکش کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ کشمکش کی ایک وجہ یہ تھی کہ حواریین اور انکے پیرو سینٹ کو حضرت مسیح کا رسول نہیں مانتے تھے:

"اگر میں دوسروں کے نزدیک رسول نہیں ہوں، پر بیشک تمہارے نزدیک ہوں کہ تم خداوند ہو۔ میری رسالت کی مہر ہو" (کرنتھیوں کو پہلا خط باب ۹، آیت ۲)

کشمکش کی دوسری وجہ یہ تھی کہ حواریین "عہد نامۂ عتیق" کی پیروی کو ضروری قرار دیتے تھے اور سینٹ پال نے لوگوں کو اس "بندھن" سے

(گذشتہ سے پیوستہ) اور جس کی طرف "انجیل برنباہ یا برناباس" بھی منسوب ہے۔ حواریین کے ذریعے یہی انجیل توحیدِ خالص پر مشتمل ہے اور یہ فطری بات ہے کہ تثلیث پرست اس انجیل کا انکار کرتے ہیں۔

آزاد کر دیا تھا:

"جب پیٹر انطاکیہ میں آیا تو میں نے روبرو اس کا مقابلہ کیا کہ وہ ملامت کے لائق تھا کہ وہ اس سے پہلے کہ بعض آدمی یعقوب کی طرف سے آتے، غیر ملکیوں کے ساتھ کھایا کرتا، پر جب وہ آئے تب وہ مختونوں (یہودیوں) کے ڈر سے پیچھے ہٹا اور الگ ہو گیا اور باقی یہودی بھی اس کے ساتھ مکر کرنے لگے، یہاں تک کہ برنباہ بھی ان کے مکر میں آ گیا جب میں نے دیکھا کہ یہ انجیل کی حقیقت کے موافق راہ راست پر نہیں چلتے، میں نے سبھوں کے سامنے پیٹر سے کہا کہ جب کہ تو یہودی ہو کر یہودیوں کے طور پر نہیں، بلکہ غیر ملکیوں کے طور پر اوقات گزارتا تھا، پس تو کس واسطے غیر ملکیوں کو یہودیوں کے طریقہ پر چلنے کی تکلیف دیتا ہے"۔ (گلاتیوں کے نام پال کا خط، باب ۲، آیت ۱۱ تا ۱۴)

اس بات سے کئی باتیں معلوم ہوئیں، ایک تو یہ کہ اس کشمکش میں حواری (جو نسلاً یہودی تھے) ایک طرف تھے اور سینٹ پال دوسری طرف، دوسری بات یہ کہ سینٹ پال کے بقول حضرت مسیح کے حواری معاذ اللہ بے کردار اور مکار تھے۔ وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ یہودی شریعت کی پیروی کرو۔ مگر خود پیروی نہ کرتے اور مختلف مواقع پر مختلف رویہ اختیار کرتے، تیسرے یہ کہ وجہ نزاع یہ تھی کہ توریت کی پیروی کی جائے یا نہ کی جائے۔

یہ معلوم ہے کہ حضرت مسیح یہود ہی کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوئے تھے:

"میں اسرائیل کے گھرانے کی بھیڑوں کے سوا کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا"۔ (متی باب ۱۵۔ آیت ۲۴)

یہود کے پاس خدا کا قانون موجود تھا۔ مگر وہ اس پر عمل پیرا نہ تھے، بد اخلاقیوں

میں غرق اور خود ساختہ رسوم و قوانین میں جکڑے ہوئے تھے، حضرت مسیح نے شریعت کی پیروی کی تلقین کی، رسوم وروایات کی بندشوں کو توڑا اور اخلاقی اقدار کی اہمیت واضح کی، مگر انھوں نے تفصیلی قانون نہیں دیا۔ کیونکہ وہ توریت میں موجود ہی تھا۔ تمام اسرائیلی نبیوں کی طرح انھوں نے بھی شریعت کی پیروی پر زور دیا۔ انھوں نے صاف صاف کہا کہ وہ توریت، شریعت کو منسوخ کرنے نہیں، اس پر ٹھیک ٹھیک عمل کرانے آئے ہیں :-

"یہ گمان نہ کرو کہ میں توریت اور نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ میں منسوخ کرنے نہیں، پورا کرنے آیا ہوں۔ اس واسطے میں تم سے سچ کہتا ہوں، جب وقت تک کہ زمین و آسمان نیست نہ ہوں، ایک نقطہ یا شوشہ توریت سے ہرگز منسوخ نہ ہوگا جب تک سب پورا نہ ہو جائے پس جو کوئی ان حکموں میں سے چھوٹے سے چھوٹے حکم کو کمزور کرے اور ایسا ہی آدمیوں کو سکھلائے، آسمان کی بادشاہت میں چھوٹا کہلائے گا، پر جو کوئی عمل کرے اور سکھلائے آسمان کی بادشاہت میں وہی بڑا کہلائے گا۔" (متی۔ باب ۵، آیت ۱۷ تا ۱۹)

یہ حضرت مسیح کا فرمان ہے۔ مگر سینٹ پال کا ارشاد ہے کہ شریعت خدا کے غضب کی موجب ہے۔ شریعت کی پیروی غلامی و لعنت ہے۔ جس سے مسیح نے نجات دلائی اور شریعت کی پیروی مسیحیت کا انکار ہے:

"شریعت (خدا کے) غضب کا سبب ہے، کیوں کہ جہاں شریعت نہیں، نافرمانی بھی نہیں۔" (رومیوں)

"وہ سب جو شریعت پر عمل کرنے کا بھروسہ رکھتے ہیں لعنت میں گرفتار ہیں" (مسیح) نے ہمیں مول لے کے شریعت کی لعنت

سے چھڑایا۔" (گلاتیوں کے نام خط۔ باب ۳۔ آیت ۱۰ و ۱۳)

"جو آزادی مسیح نے تمہیں بخشی اس پر جمے رہو اور غلامی کے جوئے کے تلے دوبارہ نہ جتو۔ تم اگر شریعت سے نیک بننا چاہتے ہو تو مسیح سے جدا ہو کر فضل سے گر گئے ہو۔" (خط مذکورہ، باب ۵، آیت ۱ و ۴۔)

شریعت کو منسوخ ماننے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ دین مسیحی کا۔ جو بعینہٖ توریت کا دین تھا۔ بہت بڑا حصہ اس سے کاٹ کر پھینک دیا جائے اور جو بچ جائے سے بآسانی مسخ ہو سکے۔ شریعت سے تعلق توڑ لینے کے بعد انجیل میں صرف چند اخلاقی مواعظ رہ جاتے ہیں اور اخلاقی تعلیم ہر دین میں ہے۔ مذہب کا بنیادی جزء عبادت ہے۔ مگر انجیل اس میں بھی رہنمائی نہیں کرتی، رہیں اخلاقی تعلیمات تو انھیں کسی بھی دین میں فٹ کیا جا سکتا ہے اور یہی ہوا۔ یونان کی میتھالوجی سے تثلیث اور کفارہ کا عقیدہ اور انجیل کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ آمیز کر کے "دین مسیحی" بنا دیا گیا۔

توحید دین حق کی اساس ہے، اسی اہمیت کے پیش نظر حضرت مسیح نے بھی توحید پر زور دیا، مگر توحید کے متقضیات کو تفصیل سے بیان کرنے کے بجائے انھوں نے اشارات پر اکتفا کیا ـــ کہ توریت میں ان کا ذکر انتہائی وضاحت اور تکرار سے موجود تھا۔ توریت سے تعلق توڑ لینے کا یہ نتیجہ بالکل کھلا ہوا تھا کہ توحید کی مفصل تعلیم نظروں سے اوجھل ہو جائے اور اسی سے اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ کوئی غلط کار شخص حضرت مسیح کی معجزانہ زندگی اور ان کی تشبیہات تمثیلات کو غلط معنیٰ پہنا کر توحید میں سے شرک کی تعلیم برآمد نہ کر لے، اور یہی ہوا۔ حضرت مسیح کو رسول سے ابن اللہ اور عین اللہ بنا دیا گیا اور توحید تثلیث کے مترادف قرار پائی۔

حضرت مسیح نے اپنے بعد اپنی دعوت کے جاری رکھنے اور اسے اس

کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے بارہ مخلص حواریین کو تربیت دی تھی اور دنیا سے تشریف لے جانے سے قبل انھیں اپنی دعوت کا مستند ترجمان ٹھہرایا تھا — خدا سے ان کے لیے دعا کرتے ہوئے حضرت مسیح کہتے ہیں:

"جس طرح تُو نے مجھے دُنیا میں بھیجا ہے، میں نے بھی انھیں دنیا میں بھیجا ہے۔" (یوحنا، باب ۱۷، آیت ۱۸)

یعنی میں تیرا پیامبر ہوں اور یہ میرے پیامبر — عہد نامۂ جدید میں اسی لیے انھیں رسول کہا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو "رسولوں کے اعمال")

"جو تمھاری مہمانی کرے وہ میری مہمانی کرتا ہے اور جو میری کرتا ہے وہ میرے بھیجنے والے کی مہمانی کرتا ہے۔" (متی باب ۱۰۔ آیت ۴۰)

"اگر کوئی تمھاری مہمانی نہ کرے اور تمھاری باتیں نہ سنے تو جب اس گھر یا اس شہر سے نکلو، اپنے پیر کی گرد جھاڑ دو، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ حساب کے دن اس شہر کی سزا سے سدوم اور عمورہ (قوم لوطؑ کی بستیاں) کی سزا ہلکی ہوگی۔"

(متی، باب ۱۰، آیت ۱۴، ۱۵)

ان بارہ حواریین میں سے حضرت مسیح نے شمعون پیٹر کو قیادت کے لیے چنا:

"اے یونس کے بیٹے شمعون! کیا تو مجھے ان سے زیادہ پیار کرتا ہے؟ اس نے اس سے کہا۔ ہاں! اے خداوند تو جانتا ہے کہ میں تجھے پیار کرتا ہوں۔ یسوع نے اس سے کہا تو میری بھیڑوں کو چرا۔" (یوحنا، باب ۲۱، آیت ۲۱، آیت ۱۵، ۱۶)

یہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت کے کلمات تھے۔ اس سے قبل ایک

بارانھی پیٹر سے انھوں نے فرمایا:

"میں آسمان کی بادشاہت کی کنجیاں تجھے دوں گا، جو کچھ تو زمین پر باندھے گا وہی آسمان پر باندھا جائے گا اور جو تو زمین پر کھولے گا وہی آسمان پر کھولا جائے گا" (متی باب ۱۶، آیت ۱۹)

یعنی شمعون پیٹر کی دعوت خدا کی دعوت اور سرتاسر حق ہوگی اور جو ان سے اختلاف کرے گا وہ برسر باطل ہوگا۔ وہی دعوت کے حقیقی وارث ہونگے۔

سینٹ پال نے حضرت مسیح کے قائم کردہ ان بارہ ستونوں کو بھی ڈھانے کی کوشش کی۔ انھوں نے حوارین اور ان کے قائد شمعون پیٹر کو بے کردار اور مکار ظاہر کیا، ملعون ٹھہرایا اور ان کی دعوت کو مسیحی دعوت کی ضد قرار دیا:

"میں حیران ہوں کہ تم اتنی جلدی اس کو، جس نے تمھیں فضلِ مسیح میں بلایا، چھوڑ کر دوسری انجیل کے ہو گئے، سو وہ دوسری انجیل نہیں، پر بعضے تمھیں گھبرا دینا چاہتے ہیں اور مسیح کی انجیل کو الٹنا چاہتے ہیں، لیکن اگر ہم یا آسمان سے کوئی فرشتہ تمھارے پاس اُس انجیل کے سوا، جس کا وعظ ہم نے کیا دوسری انجیل کا وعظ کرے ملعون ہو" گلاطیوں کے نام خط۔ باب ۱۔ آیت ۶ تا ۸)

حوارین کو ساقط الاعتبار اور ان کی دعوت کو باطل ٹھہرانے کے ساتھ انھوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ خدا و مسیح نے انھیں "رسول" بنایا ہے اور وہ جو کچھ کر رہے ہیں الہام کی بنیاد پر کر رہے ہے:

"وہ انجیل جس کی خبر میں نے دی، آدمی کے طور پر نہیں ہے کہ میں اسے آدمی سے نہیں پایا۔ نہ آدمی سے سیکھا، پر یسوع کے الہام سے پایا" (خط مذکور، باب ۱، آیت ۱۱ و ۱۲)

"پاول نہ آدمیوں سے، نہ آدمیوں کے وسیلے سے، بلکہ یسوع مسیح اور اُس کے باپ خدا سے جس نے اُسے مُردوں سے

جلایا، رسول ہوا۔" (خط مذکور باب ۱ - آیت ۱)

گویا شریعت لعنت، مسیح کے حوارین غلط کار اور ان کی دعوت باطل اور سینٹ پال اور ان کی دعوت حق! اس طرح دینِ مسیحی کو مسخ کرنے کی مہم پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی!

سینٹ پال کی دعوت کو، حوارین کی دعوت سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ سینٹ پال ڈپلومیسی میں طاق، بحث و مناظرہ میں یکتا اور یونانی فلسفہ و تصوف میں ماہر تھے۔ عہد نامۂ جدید میں ان کے خطوط اس کے شاہد ہیں۔ جب کہ حوارین عامی، غیر تعلیم یافتہ اور سادہ لوگ تھے۔ (اعمال باب ۴، ۱۳) دوسری وجہ یہ تھی کہ مشرک رومی توحید کی حقیقت سے نامانوس، توریت و شریعتِ الٰہی سے بے خبر اور حوارین کے مقامِ بلند سے ناآشنا تھے اور تیسری وجہ یہ کہ حوارین کی دعوت قبول کرنے سے زندگی بہت سی پابندیوں میں جکڑ جاتی جب کہ سینٹ پال کی پیروی سے پوری چھوٹ ملتی تھی۔

اس طرح "دینِ مسیحی" کے نام سے دُنیا میں اور نصرانیت کے ساتھ تقدیس میں وہ دین رائج ہوا جس کا عہد نامۂ عتیق اور انجیل سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ جو دینِ مسیح کی عین ضد تھا۔ حضرت مسیح کے دین کی بنیاد توحید اور شریعتِ الٰہی کی پیروی پر تھی جبکہ یہ دین تثلیث اور شریعت سے آزادی کا داعی تھا۔

حوارین کی مخلصانہ کوششیں بھی رائیگاں نہ گئیں۔ ان کے زمانے میں اور ان کے بعد صدیوں تک لوگ ان کی دعوت قبول کرتے رہے۔ درحقیقت یہی لوگ مسیحی تھے اور چوتھی صدی عیسوی تک ذور دار فرقہ کی حیثیت سے موجود تھے۔ چوتھی صدی کے اوائل میں جب روم کا شہنشاہ قسطنطین مسیحیت کا حامی بن گیا تو اس نے عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے اختلاف کو دُور کرنے کے لیے جو روز بروز شدید تر ہوتے جا رہے تھے۔ ۳۲۵ء میں "نیسیہ" میں چرچ کی ایک جنرل کونسل منعقد کی۔ اس کونسل میں عیسائیوں کے تمام فرقوں

نے شرکت کی، جن تین فرقوں کا خصوصیت سے ذکر ملتا ہے۔ آریوسی، جو حضرت مسیح کو خدا نہیں، مخلوق مانتے تھے، گویا یہ سچے مسیحی اور حوارین کے پیرو تھے، سابیلی، جو حضرت مسیح کو خدا کا مظہر یا اوتار تصور کرتے تھے تثلیثی، جو باپ، بیٹا اور روح القدس، تین خداؤں کے قائل تھے اور اکثریت میں تھے، تثلیثی فرقہ نے کثرتِ تعداد کے بل پر کونسل سے تثلیث کا عقیدہ منوا لیا یہی عقیدہ "نیسیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کونسل کے بعد رومی شہنشاہیت تثلیث کی پشت پناہ بن گئی اور موحد عیسائیوں کے خلاف اس کی تلوار بے نیام ہو گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑے عرصے کے بعد یورپ میں اس فرقے نے دم توڑ دیا اور دین مسیح کے نام سے تثلیث یورپ میں جڑ پکڑ گئی۔ مشرق میں یہ فرقہ ــــ حقیقی میسحیت کا وارث ــــ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک موجود تھا۔ اس فرقہ کی عبادتگاہیں شام، عراق اور حبشہ وغیرہ میں تھیں اور حبشہ کا فرمانروا نجاشی، جو حضورؐ کا معاصر تھا، اسی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا۔

عہد نامۂ عتیق کو پسِ پشت ڈال کر تثلیث کا عقیدہ قبول کر لیا گیا، مگر دقت یہ تھی کہ خود عہد نامۂ جدید میں توحید کا عقیدہ صریح طور پر موجود تھا اس لیے تثلیث پرستوں کو توحید اور تثلیث دونوں کا قائل ہونا پڑا اور ان کا سارا سرمایۂ علم و فکر مسلسل اس میں صرف ہوتا رہا کہ اللہ مسیح اور روح القدس میں الوہیت کس طرح تقسیم کی جائے کہ خدا ایک بھی رہے اور تین بھی۔ اسی لاینحل مسئلہ کو حل کرنے کا نام "مسیحی علمِ کلام" ہے اور اسی بعید از عقل عقیدہ کو تسلیم کرنا ایمان اور تسلیم نہ کرنا کفر ٹھہرا

اسی طرح شریعت کو رد کر دینا تو آسان تھا مگر انسانوں کو زیادہ دنوں تک خلا میں نہیں رکھا جا سکتا تھا، انھیں خدا کی عبادت کرنی تھی اور اس کے لیے کسی متعین طریقے کی ضرورت تھی۔ انھیں زندگی کے مختلف پہلوؤں

سے متعلق قوانین درکار تھے جو شریعت کے رد کیے جانے کے باعث موجود نہ تھے۔ خدا کا قانون نہ مانا جائے تو انسان کو خود ہی قانون سازی کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ یہ سلسلہ خود سینٹ پال سے شروع ہوا اور عبادات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مسیحی پیشواؤں نے بہت سے قوانین — غیر متوازن اور وبالِ انسانیت قوانین — وضع کر ڈالے اور یہ سب کچھ اسی خدا کے نام پر کیا گیا جس کے قانون کو بے دردی سے پامال کیا گیا تھا اور اسی مسیح کے نام پر، جسے شریعت سے بخشنے والا ظاہر کیا گیا! اور رومی شہنشاہیت کے حامی دینِ مسیحی بننے کے بعد ان بے اصل اور ظالمانہ قوانین کے مجموعہ کا نام دینِ مسیحی قرار پایا اور علماء پرستی، شائخ پرستی اور انسانی قانون سازی کی وہ لعنت پوری قوت سے پھر عود کر آئی، جسے ختم کرنے کے لیے حضرت مسیح تشریف لائے تھے۔

مسیحی راہبوں نے حضرت مسیح کے نام پر رہبانیت کو فروغ دیا۔ حالانکہ حضرت مسیح نے رہبانیت کی تعلیم کبھی نہیں دی۔ انھوں نے روحانی ترقی کے لیے ترکِ تمدن، ترکِ علائق اور ترکِ دُنیا کو ضروری قرار دیا اور ایسی لرزہ خیز ریاضتیں رائج کیں جن کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مسیحی علما اور مشائخ نے عورت کو گناہ کی جڑ قرار دیا اسے انسانی حقوق سے محروم کیا اور اس سے تعلق کو معصیت سمجھا۔ بعض مسیحی بزرگوں نے ماں تک کی صورت دیکھنا گوارا نہ کی کہ کہیں ان کی ریاضت و عبادت خاک میں نہ مل جائے۔ اس رہبانہ تصور نے یورپ کو علمی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی ہر پہلو سے بہت پیچھے ڈھکیل دیا۔ جب وقت عالمِ اسلام، علم، تمدن اور سائنس ہر پہلو سے بامِ عروج پر تھا — مسیحی یورپ یونان و روم کے علم، تہذیب اور سیاست کا وارث — مسیحیت کے غلط تصورات اور تاریکیوں میں گم تھا۔ اس راہبانہ طرزِ عمل کا شدید ردِ عمل

بھی ہوا، اور مسیحی راہبوں کی خانقاہیں بدترین دنیا پرستی و عیاشی کا اڈہ بن گئیں۔
خود یورپ کے موجودہ مادی شغف اور جنسی بے راہ روی میں رہبانیت کے تمدن کش طرز عمل کا دخل ہے۔

مسیحیت اور رومی شہنشاہی کے گٹھ جوڑ نے مسیحی پیشواؤں کو وہ غیر معمولی اقتدار بخشا کہ اس کے سامنے بڑے بڑے فرمانرواؤں کے اقتدار ماند پڑ گئے۔ اس اقتدار سے مسیحی پیشواؤں نے حد درجہ غلط فائدہ اٹھایا۔ ساتھ ہی اس گٹھ جوڑ کا نتیجہ یہ نکلا کہ کلیسا رومی اقتدار کا آلۂ کار بن گیا اور یورپ کی مختلف قوموں میں یہ احساس شدت سے ابھرنے لگا کہ چرچ یورپ پر مسیحی اقتدار کا بہانہ ہے۔ درحقیقت مسیحی پیشواؤں اور مسیحی فرمانرواؤں کے دہرے اقتدار کے تحت یورپ کے عوام بری طرح پس رہے تھے مگر اف نہ کر سکتے تھے۔ حضرت مسیح نے خوش خبری دی تھی:

"میرا جُوا اپنے اوپر لے لو کہ میرا جُوا آسان اور میرا بوجھ ہلکا ہے"۔

(متی، باب ۱۱، آیت ۲۹، ۳۰)

اس خوشخبری کی عملی تعبیر کتنی بھیانک تھی!

مسیحی پیشواؤں نے اپنے بعید از عقل عقائد، مہمل مذہبی رسوم، ظالمانہ قوانین اور جابر و مستبد اقتدار کو بچانے کے لیے علم اور سائنس پر کڑا پہرہ بٹھا دیا۔ یہ وقت تھا کہ اسپین مسلمانوں کی فرمانروائی کی بدولت علم، سائنس اور تمدن کا مرکز تھا مگر مسیحی یورپ جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا اور اسے اپنے ہی ایک ملک ــــ اسپین ــــ سے استفادہ کی آزادی نہ تھی۔ مسیحی پیشواؤں کو اندیشہ تھا کہ اس طرح ان کا "خیالی طلسم" باقی نہ رہ سکے گا اور ہو سکتا ہے کہ یورپ کے لوگ اسلام کے پیغامِ توحید اور نظامِ عدل سے متاثر ہو جائیں۔ انھوں نے اس "خطرہ" کے سدباب اور اپنے جھوٹے مفادات کے تحفظ کے لیے اسلام کے خلاف صلیبی جنگوں کا مہیب سلسلہ شروع

کر دیا جو دو سو سال سے زائد مدت تک جاری رہا اور جس کے باعث یورپ کے لاکھوں فرزند خاک و خون میں نہا گئے۔

مسیحی پیشواؤں کی ان نامبارک کوششوں کے علی الرغم علم و تحقیق کا کارواں آگے بڑھتا ہی رہا۔ اہلِ یورپ نے مسلمان اہلِ علم سے طب، کیمیا، ریاضی، ہیئت، جغرافیہ، تاریخ اور دوسرے علوم سیکھے اور انھیں مزید ترقی دی۔ چرچ کی زیادتیوں سے لوگ پہلے ہی نالاں تھے، علمی بیداری نے اس بیزاری کو اور بڑھا دیا اور کلیسا کی خرافات اور اس کے استبداد کے خلاف اہلِ علم میں شدید جذبات پیدا ہونے لگے۔ فلسفہ نے مسیحی علم کلام کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں اور سائنس کی نئی نئی تحقیقات نے خرافات و اوہام کے لیے میدان تنگ کر دیا۔ مسیحی پیشواؤں نے اپنی غلطی کی اصلاح اور دلائل کے ذریعہ افہام و تفہیم کی راہ اختیار کرنے کے بجائے جبر و تشدد کی راہ اختیار کی۔ انھوں نے سائنسی تحقیقات کو کفر و بے دینی قرار دیا اور اربابِ سائنس کو ایسی شدید اور ہولناک سزائیں دیں کہ ان کے تصور ہی سے بدن میں کپکپی پیدا ہوتی ہے۔ اس جبر و تشدد سے علم و تحقیق کا کارواں تو نہ رکا البتہ اربابِ علم کلیسا سے اور کلیسا کے ساتھ مذہب اور خدا سے بھی متنفر ہو گئے بالآخر اس کشمکش نے چرچ کے اقتدار کے پرخچے اڑا دیے اور یورپ مسیح پرستی سے لادینی و الحاد کی آغوش میں چلا گیا۔ اگرچہ "بعد از خرابیٔ بسیار" چرچ کو ہوش آیا اور اس نے اپنی معاندانہ روش بدل دی۔ نیز معاملاتِ دنیا کو اہل دنیا کے حوالہ کر کے عقائد و عبادات کے خول میں سمٹ گیا۔ اسی طرح مغرب کے بہت سے اہلِ علم بھی بعد میں یہ محسوس کرنے لگے کہ مسیحی پیشواؤں اور اربابِ سائنس میں جو کشمکش ہوئی، اس کا حقیقی محرک مسیحیت و خدا پرستی نہیں، رہنماؤں کی جہالت و مفاد پرستی ہے۔ انھوں نے جب ٹھنڈے دل سے الحاد اور ملحدانہ نظام ہائے حیات، پر غور کیا اور ان کا تجزیہ کیا تو انھیں

یقین ہو گیا کہ الحاد و لادینیت میں نہیں، خدا پرستی میں انسان کی فلاح اور اس کے مسائل کا حل مضمر ہے۔ چنانچہ ملحد یورپ اب پھر مذہب کیطرف لوٹ رہا ہے!

یہ ہے یورپ میں عیسائیت کے ارتقاء کی تاریخ! اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ یورپ میں کشمکش سائنس اور مسیحیت کے مابین نہیں مفاد پرست پیشواؤں کی جہالت اور استبداد اور علم و حریت کے مابین تھی۔ اگر کسی وجہ میں اس کا تعلق مسیحیت سے تھا بھی تو وہ یہ نام نہاد مسیحیت تھی جس کا حضرت مسیح اور ان کے حواریین سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ یہ مسیحیت کی عین ضد تھی۔ یہ سینٹ پال اور اس کے متبعین کے خود ساختہ خیالات و اوہام تھے جو علم و تحقیق کے آگے نہ ٹھہر سکے اور اپنے آپ کو خطرہ میں محسوس کر کے انھوں نے جبر و تشدد کی راہ اختیار کر لی۔ بلاشبہ اس کشمکش میں خدا اور مسیح کا نام بہت بے دردی سے استعمال کیا گیا مگر اس سے خدا اور مسیح پر کیا ذمہ داری آتی ہے؟ مسیحیت تو "نیسیہ کونسل" کے کچھ ہی عرصہ کے بعد یورپ سے غائب ہو چکی تھی! کسی گروہ کے ذاتی خیالات و اعمال کی ذمہ داری کسی مذہب پر کیا صرف اسی لیے ڈال دی جائے گی کہ اس گروہ نے اس مذہب کے نام کو بے جا طور پر استعمال کیا تھا؟

یہ سینٹ پال ہی تھے جنھوں نے حضرت مسیح کا نام لے کر حضرت مسیح کے دین کو مسخ کیا اور ان کے سچے پیروؤں کی دعوت کو بہ لطائف الحیل باطل ٹھہرایا۔ پھر یہ ان کے متبعین ہی تھے جنھوں نے "نیسیہ کونسل" میں حضرت مسیح کے سچے پیروؤں کی تکفیر کی اور بزورِ شمشیر یورپ کو ان کے وجود سے پاک کیا اور پھر ان کے متبعین ہی تھے جنھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دو سو سال تک صلیبی جنگ کی آگ پورے یورپ بھڑکائے رکھی اور یورپ کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ پھر یہی لوگ تھے جنھوں

نے مسلمان اہلِ علم سے استفادہ پر کڑی پابندی لگادی۔ ان لوگوں نے اگر علم وسائنس کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کیا اور اربابِ علم وسائنس پر تشدد برتا تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی! البتہ یہ بات انتہائی عجیب تھی کہ مسیحیت کا خون کرنے والوں کے جرائم کی ذمہ داری خود مسیحیت کے سر ڈال دی جائے۔

لیکن اگر آپ کو اصرار ہو کہ نام نہاد مسیحی پیشواؤں نے جو کچھ کیا، اس کا محرک مفاد پرستی وجہالت نہیں، مذہب ہی تھا اور مذہب مسیحیت کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اگرچہ یہ بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ تب بھی اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسیحیت اور علم وسائنس میں بیر رہے مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کا ہر مذہب ایسا ہی ہوتا ہے؟ کیا مسیحیت اور دوسرے مذاہب یکساں ہیں؟ کیا مسیحیت کے عقائد و اعمال دوسرے مذاہب میں موجود ہیں کہ آپ دوسرے مذاہب کو مسیحیت پر قیاس کر رہے ہیں؟ جو کشمکش نام نہاد مسیحیت اور علم وسائنس کے مابین ہوئی، وہ کسی اور مذہب اور علم وسائنس کے درمیان بھی برپا ہوئی؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو دوسرے مذاہب کو مسیحیت پر قیاس کرنا علم و تحقیق یا دیانت وانصاف کی کون سی قسم ہے؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ کم از کم اس معاملہ میں تمام مذاہب کا حال یکساں نہیں ہے؟ بلاشبہ آپ نام نہاد مسیحیت سے بیزار ہو سکتے ہیں، لیکن تمام مذاہب سے بیزار و متنفر ہونے کی آخر کیا وجہ ہے؟

کیا خدا پرستی خرابیوں کی جڑ ہے؟

مذہب کے معاملہ میں ملحدین کے فکر کی کمزوری یہ ہے کہ وہ کسی ایک مذہب پر، جس کے بارے میں ان کی رائے بہت خراب ہوتی ہے، تمام مذاہب کو قیاس کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ یہ سب کچھ خدا پرستی کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ نہ تو سب مذاہب یکساں ہیں

اور نہ ہر مذہب خدا پرستی کے ہم معنی ہے۔

لادین نظام ہائے حیات اور ملحدانہ نظریات میں باہم جتنے اختلافات ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ اور شدید اختلافات مختلف مذاہب اور ان کے عقائد و اعمال میں ہیں۔ ان نظاموں میں کم از کم ایک بات تو مشترک ہے اور وہ یہ کہ خدا نہیں ہے یا کم از کم یہ کہ انسان کو خدا سے بے نیاز ہو کر سوچنا چاہیے۔ مذاہب تو خدا کے وجود کے معاملہ میں بھی متفق نہیں ہیں۔ اس لیے مذاہب کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا اس سے زیادہ غلط ہے جتنا کمیونسٹ ڈکٹیٹر شپ کو سرمایہ دارانہ جمہوریت پر قیاس کرنا۔

کچھ مذاہب تو وہ ہیں جو خدا کے منکر ہیں۔ یا نفیاً و اثباتاً خدا کے مسئلہ سے تعرض نہیں کرتے۔ جین مت اور بودھ دھرم کا شمار اسی قسم کے مذاہب میں ہے۔

کچھ مذاہب کائنات میں بہت سے خداؤں اور دیوی دیوتاؤں کے قائل ہیں۔ چین کا کنفیوشزم اور تاوی مذہب، جاپان کا شنٹوازم، ایران کی مجوسیت، عرب کا قبل از اسلام مشرکانہ مذہب، ہندوستان کا ہندو مت اور یورپ کی نام نہاد عیسائیت، جو باپ، بیٹا، روح القدس، تین خداؤں کی قائل ہے بلکہ جو حضرت مریم کو بھی مادرِ خدا قرار دے کر پرستش کا مستحق ٹھہراتی ہے۔ الغرض دنیا کے اکثر و بیشتر مذاہب اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ان سب مذاہب میں ایک سے زیادہ خداؤں کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

کچھ اور مذاہب ہیں جو توحید کے قائل ہیں، وہ خالقِ کائنات کے ماسوا نہ کسی کو خدا مانتے ہیں، نہ اس کے سوا کسی کو پرستش و بندگی کا مستحق سمجھتے ہیں۔ یہودیت اور اسلام صرف دو مذاہب[1] اس ذیل میں آتے ہیں۔

---

[1] ہندوؤں کے دو فرقے بھی توحید کے مدعی ہیں۔ ایک آریہ سماج، دوسرے سکھ۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

پہلی قسم کے مذاہب کے عقائد و اعمال کی ذمہ داری خدا پرستی پر ڈالنا، نری دھاندلی ہے۔ جو مذاہب خدا کے منکر ہوں یا کم از کم خدا سے بے نیاز ہو کر اپنی عمارت تعمیر کرتے ہوں، ان کی غلطیوں کی ذمہ داری خدا پرستی پر کس طرح ڈالی جا سکتی ہے؟ رہبانیت اور اسی کا نتیجہ ظالموں کے مقابلہ غلط صبر اختیار کرنا اور پست ہمتی پر قانع ہونا ہے۔ انہی مذاہب کا تحفہ ہے۔ رہبانیت دراصل بدھ مت کی تعلیم ہے، اسی سے ہندو مت میں گئی، اسی سے عیسائیت نے اسے اخذ کیا اور یہیں سے دوسرے مذاہب میں پہنچی۔ اس لیے یہ بات بالکل غلط ہے کہ خدا پرستی ترک دنیا کی تعلیم دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترک دنیا ان بزرگوں کا عطیہ ہے جو خدا کے منکر یا کم از کم خدا سے بے نیاز تھے۔

دوسری قسم کے مذاہب کے اعمال کی ذمہ داری بھی خدا پرستی پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ شرک کو آپ مخلوق پرستی، اوہام پرستی، رسوم پرستی، جو نام چاہے دے لیجئے، مگر اسے آپ خدا پرستی نہیں کہہ سکتے۔ بغیر کسی عقلی ثبوت یا خدائی تعلیم کے، اپنے وہم و خیال سے آپ جس مخلوق کو چاہیں، خدا قرار دے لیں، بغیر کسی دلیل کے، اس میں مافوق الفطرت اور خدائی طاقت تسلیم کریں اور پرستش و عبادت کا پورا نظام گھڑ کر رکھ دیں۔ یہ سب آپ کے اختیار میں ہے مگر اس ساری نامعقولیت کو آپ خدا پرستی نہیں کہہ سکتے خدا پرستی کے معنی تو یہ ہیں کہ آپ کائنات کے لیے ایک خالق، مالک اور منتظم تسلیم کر لیں۔

(گزشتہ سے پیوستہ) لیکن آریہ سماج ایک خدا کے بجائے تین تین موجود بالذات اور ازلی و ابدی ہستیوں ــــــ خدا، مادہ اور روح، کو مانتے ہیں۔ پھر یہ لوگ "وید" کو الہامی کتاب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس میں توحید کا ذکر شاذ و نادر ہی ہے۔ اس کے برعکس وہ لاتعداد دیوی دیوتاؤں اور ان کی پرستش کے ذکر سے پُر ہے۔ سکھ تو ان کے یہاں بھی تصورِ توحید واضح نہیں ہے۔ ان کی مقدس کتاب "گرو گرنتھ" صاحب میں توحید بھی ہے اور شرک بھی۔

اس اقرار و تسلیم کا فطری و منطقی تقاضا یہ ہے کہ آپ اسے غیر معمولی اور فوق الفطری قوت کا حامل یقین کریں اور تمام مخلوقات کو اس کا محتاج و دست نگر، اور اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آپ اس کے سوا نہ کسی کو خدا مانیں اور نہ کسی کو پرستش و عبادت کا مستحق سمجھیں۔ شرک خدا پرستی کا تقاضا نہیں، اس کی ضد ہے۔ کم از کم یہ بات تو آپ کو ماننی ہی پڑے گی کہ خدا پرستی کا یہ لازمی نتیجہ نہیں ہے کہ آپ کائنات میں بہت سے خداؤں کا وجود تسلیم کر لیں۔ پھر شرک کے نتائج کی ذمہ داری خدا پرستی پر ڈالنا کس طرح صحیح ہے؟

شرک کو خدا پرستی سے متعلق صرف اس صورت میں کیا جا سکتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ شرک خدا پرستی کا عقلی اور منطقی تقاضا ہے ــــ اور اوپر یہ واضح ہو چکا کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یا یہ ثابت ہو جائے کہ خدا نے اپنے ساتھ بہت سے خداؤں کے وجود کو تسلیم کیا اور کرایا ہے اور انسانوں کو شرک کی تعلیم دی ہے مگر یہ بات بھی ثابت نہیں ہے۔ مشرکانہ مذاہب اوہام و تخیلات اور افسانوی خرافات کے سوا اپنی پشت پر کوئی عقلی و علمی سند اور اپنے شرک کی کوئی معقول بنیاد نہیں رکھتے۔ عرب کے مشرکین کے پاس، جو اپنے دین کو دینِ ابراہیمی خیال کرتے تھے اس بات کا کوئی ثبوت نہ تھا کہ حضرت ابراہیم نے ــــ جو خدا کے نبی تھے ــــ سچ مچ شرک کی تعلیم دی ہے۔ یہی حال عیسائیت کا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے، تمام انبیائے بنی اسرائیل کی طرح، صاف و صریح الفاظ میں توحید کی تعلیم دی ہے۔ موجودہ انجیلیں حالانکہ حضرت مسیح یا ان کے حواریین کی مرتب کردہ نہیں۔ ایسے اشخاص کی لکھی ہوئی ہیں جن کے حالات پر جہالت کا پردہ پڑا ہوا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ وہ سچے ہیں یا جھوٹے، پھر ان انجیلوں کے بھی اصل نسخے موجود نہیں۔ تمام نسخے یونانی ترجمے کے ترجمے ہیں اور علاوہ دوسری تحریفات کے، خود ان ترجموں میں آئے دن ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے۔ پھر یہ انجیلیں حضرت مسیح کے سچے

پیروؤں کے ذریعے نہیں۔ تثلیث پرستوں اور سینٹ پال کے متبعین کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔ اس کے باوجود ان انجیلوں میں حضرت مسیح کی زبانی کہیں یہ موجود نہیں ہے کہ وہ خدا ہیں یا ان کی والدہ حضرت مریم مادرِ خدا ہیں، یا روح القدس خدائی کے مقام پر فائز ہیں۔ اس کے برعکس حضرت مسیح نے بار بار اپنے آپ کو "ابنِ آدم" کہا ہے۔

بلاشبہ موجودہ انجیلوں میں حضرت مسیح کی زبانی، خدا کے لیے "باپ" کا اور اپنے لیے "بیٹے" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ موجودہ انجیلوں کی تحریفات اور ان کے اصل متن کے موجود نہ ہونے کے باعث اور ان میں سے کسی بات کا انکار ممکن نہیں ــــ یہ بات یقینی نہیں ہے کہ حضرت مسیح نے واقعتہً یہ الفاظ استعمال کیے ہوں، لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ الفاظ فی الواقع انہی کے ہیں تو ان الفاظ کا وہی مطلب لینا صحیح ہوگا جو عہد نامۂ عتیق، انبیائے بنی اسرائیل کی تعلیمات اور خود حضرت مسیح کی دعوتِ توحید سے میل کھاتا ہو۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ موجودہ انجیلوں میں خدا کو حضرت مسیح ہی کا نہیں، تمام انسانوں کا باپ کہا گیا ہے اور بار بار کہا گیا ہے اور اسے "آسمانی باپ" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے تو کیا سب انسان خدا کے بیٹے اور سب انسان خدا ہیں؟ ظاہر ہے کہ باپ بیٹے کے الفاظ کا استعمال یہاں حقیقتاً نہیں مجازاً ہے اور اسے تثلیث پرست بھی ماننے پر مجبور ہیں۔ اس لیے یہی بات خود حضرت مسیح کے بارے میں صحیح ہے۔ بیٹے کا لفظ "پیارے" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور "باپ" کا مشفق اور مالک کے مفہوم میں۔ یہودی اسی معنی میں اپنے آپ کو خدا کا بیٹا اور چہیتا کہتے تھے نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ۔

حقیقت یہ ہے کہ عبرانی زبان میں "اب" کا لفظ باپ اور رب دونوں

کے لیے استعمال ہوتا ہے اور "ابن" کا لفظ بیٹے اور بندے دونوں کے لیے ــــــ حضرت مسیح نے جب "اب" اور "ابن" کے لفظ استعمال کیے ہوں گے تو ان کے اسرائیلی مخاطبین نے ان کا مطلب رب اور بندہ ہی سمجھا ہوگا۔ کیوں کہ "عہد نامہ عتیق" کی صریح تعلیمات اور انبیائے بنی اسرائیل کی متفقہ دعوتِ توحید کے پیشِ منظر اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں لیا جا سکتا تھا مگر جب حضرت مسیح کی دعوت غیر اسرائیلیوں میں پہنچی، جو توحید سے نا آشنائے محض تھے اور انجیل کا ترجمہ عبرانی سے یونانی زبان میں ہوا تو "اب" باپ کے ہم معنی ہو گیا اور "ابن" بیٹے کے، اور یونانیوں کے مشرکانہ ذہن نے باپ بیٹا اور روح القدس کی تثلیث قائم کر لی۔

یقیناً ویدوں میں شرک اور مظاہر پرستی کی تعلیم موجود ہے مگر اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ یہ تعلیم خدا نے دی ہے۔ اس بات سے قطعِ نظر کہ ویدوں میں تحریفات ہوئی ہیں جس کا اعتراف خود ہندو محققین کو بھی ہے اور اس بات سے بھی قطعِ نظر کہ اس کے مرتب یا مرتبین کا حال دنیا کو معلوم نہیں ہے، وید کو یہ حیثیت دینا صحیح نہیں ہے کہ خدا نے اپنے کسی بندے پر اس کی وحی نازل کی ہے اور اس لیے اس میں جو کچھ ہے خدا کی تعلیم ہے۔ وحی کا تصور ہندوؤں میں موجود ہی نہیں ہے۔ ویدوں کی صحیح حیثیت یہ ہے کہ بہت سے رشیوں اور منیوں نے اپنے خیال کے مطابق جن حقیقی یا خیالی ہستیوں کو معبود سمجھ لیا اور ان کی شان میں کچھ منتر کہے ہیں یا ان سے دعائیں مانگی ہیں یا ان کی پوجا پاٹ کی ہے اور ان کی پوجا پاٹ کے طریقے بتائے ہیں، انھی منتروں کے مجموعے کا نام وید ہے۔ کیا ایسی کتاب سے شرک کے خدائی تعلیم ہونے پر استدلال کیا جا سکتا ہے اور آریہ سماج تو اس کے مدعی ہیں کہ ویدوں میں شرک کی نہیں، توحید کی تعلیم ہے، اگر اس بات کو مان لیا جائے تو پھر استدلال کی ساری عمارت دھڑام سے زمین پر

آرہی ہے۔

بہر حال شرک نہ خدا پرستی کا عملی تقاضا ہے، نہ خود خدا نے اس کی تعلیم دی ہے۔ اس صورت میں شرک اور مشرکانہ مذاہب کی ذمہ داری کسی طرح بھی خدا پرستی پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ اور یہ شرک ہی ہے جو بعید از عقل ہے۔ اور یہ مشرکانہ مذاہب ہی ہیں جو اوہام و خرافات کی تعلیم انسان کو دیتے ہیں۔ خدا پرستی کا دامن ان چیزوں سے پاک ہے بانی ہے موّحد مذاہب تو ان کے سلسلہ میں ملحدین کے الزامات میں سے ایک الزام بھی صحیح نہیں ہے۔ یہودی مذہب اور اسلام میں سے ہم یہاں اسلام کو لیتے ہیں کہ اس کا تصور توحید بے لاگ ہے، پھر اس کے پاس مفصّل خدائی قانون موجود ہے، جو ہر تحریف سے پاک، آج بھی قرآن و سنّتِ رسول میں محفوظ ہے، پھر اہلِ ہند کو اس کے مطالعہ کی سہولتیں بھی حاصل ہیں۔

اسلام جہالت اور وہم پرستی کا دشمن ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ مانو علم و تحقیق کے بعد مانو۔ یہ اسلام ہی ہے جو انسان کو عجائب پرستی سے نکال کر عقل و فکر کی روشنی میں لایا۔ اور اسے صحیح طور سے سوچنا سکھایا۔ قرآن مجید کو آپ کہیں سے کھول لیجیے اس کا ہر صفحہ آپ کو تفکر، تدبر اور علم و تحقیق کی دعوت دے گا۔ قرآنِ مجید کے علاوہ کوئی کتاب روئے زمین پر موجود نہیں ہے جس نے علم و تحقیق اور غور و فکر پر اتنا زور دیا ہو۔ قرآن مجید ان لوگوں میں آیا تھا جو تمدّن کے اعتبار سے پسماندہ اور تعلیم کے لحاظ سے "اُمّی" تھے، لیکن یہ قرآن کی رہنمائی ہی کا نتیجہ تھا کہ یہی لوگ دیکھتے ہی دیکھتے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے امام بن گئے۔ یورپ کے محققین کو اعتراف ہے کہ یورپ کا موجودہ علمی، تمدّنی اور سائنسی ارتقا مسلمانوں کے علم و فن اور ان کے شاندار تمدّن کا مرہونِ منت ہے — انسان کے علم، انسان کے عقلی ارتقا، اور سائنس کے انکشافات نے انسان

کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور ہر ایک انسانی تحقیق غلط ثابت ہوئی مگر چودہ سو برس پہلے ایک "اُمّی" نے خدا کا جو دین پیش کیا تھا، اس کی کسی بات سے علمی حقائق کا تصادم نہ ہوا۔ نہ یہ دین علمی، عقلی اور سائنسی ارتقاء میں مزاحم ثابت ہوا۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اس دین کی بنیاد خالص اور کامل علم پر ہے اور صحیح خدا پرستی اور علم میں کوئی بیر نہیں ہے؟

اسلام عمل کا مذہب ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (انسان کو وہی ملے گا جس کی وہ جدوجہد کرے گا) وہ دنیا و آخرت کی کامرانی کے لیے ایمان کے ساتھ عمل صالح کو لازمی قرار دیتا ہے:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

اسلام کا سچا پیرو پست حالی پر کبھی قانع نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان عرب کے گمنام گوشوں سے اُٹھے اور متمدن دنیا کے بہت بڑے حصے پر چھا گئے۔

اسلام ترکِ دنیا کا مخالف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات انسان کے لیے ہے اور انسان خدا کے لیے۔ وہ صراحت کرتا ہے کہ رہبانیت لوگوں کا خود ساختہ طریقہ ہے جس کا خدا پرستی سے کوئی واسطہ نہیں:

وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ۔ ("اور رہبانیت کو انھوں نے خود گھڑ لیا، ہم نے اسے ان کے لیے مقرر نہیں کیا۔")

اسلام خدا کے اقتدار کے علاوہ ہر اقتدار کا مخالف ہے، خواہ یہ اقتدار بادشاہوں کا ہو، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا ہو یا نام نہاد عوامی نمائندوں کا۔ اسلام کی رو سے خدا حاکمِ اعلیٰ ہے اور ملک کا انتظام چلانے کے لیے موزوں تر افراد وہ ہیں جو عوام کے معتمد ہونے کے ساتھ خدا کے سچے

بندے ہوں اور اپنے اقتدار کے بجائے خدا کی مرضی اور اس کے قانون کو دنیا میں نافذ کرنا چاہتے ہوں۔

اسلام جنگ کو صرف اس حالت میں جائز قرار دیتا ہے جب مظلوموں کو ظلم کے چنگل سے نکالنے اور حق کے تحفظ و بقا کے لیے جنگ کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ ہو۔ اس کے باوجود اس کا حکم یہ ہے کہ:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ("اگر برسرپیکار لوگ صلح کے لیے آمادہ ہو جائیں تو تم بھی صلح پر آمادہ ہو جاؤ۔")

اسلام کے نزدیک بلا امتیاز رنگ و نسل و قوم و مذہب، ہر انسان کی جان، مال اور آبرو محترم ہے۔ اِلّا یہ کہ وہ فساد فی الارض اور حق کشی کا ارتکاب کر کے اپنی حرمت خود کھو دے۔

یہ ہے حقیقی خدا پرستی! حقیقت یہ ہے کہ اسلام ـــــ سچے خدا پرستانہ نظام کا مطالعہ آپ کو مطمئن کر دے گا کہ ملحدین کا ہر الزام غلط ہے!

ہندومت اور توحید

ہندومت کیا ہے؟

ہندومت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینا انتہائی مشکل ہے۔ کیونکہ ہندومت فی الواقع کسی متعین شئے کا نام نہیں ہے، نہ کوئی ایسی مقدس کتاب ہے جسے تمام ہندو فرقے اپنے مذہب کا منبع و ماخذ مانتے ہوں، نہ کوئی ایسا مذہبی پیشوا جسے سارے ہندو خدا اور اتھارٹی تسلیم کرتے ہوں۔ جان کلارک آرچر کے بقول:

"ہندومت کا کوئی بانی نہیں ہے جس نے کوئی بنیادی پیغام دیا ہو، نہ زرتشت، عیسیٰؑ اور محمدؐ کی طرح کا کوئی رہنما۔
ہندوؤں کے یہاں کنفیوشش کی طرح کا کوئی شخص بھی نہیں ہے جو طول طویل موروثی روایات کو پوری طرح مرتب کر دینے والا ہو۔ سیدھی اور سچی بات یہ ہے کہ ان کے یہاں ایسی شخصیتیں نہیں ہیں جیسے جینیوں کے یہاں مہاویر (سوامی) بدھوں کے یہاں گوتم ساکھیہ منی اور سکھوں کے یہاں (گرو) نانک۔ ایک مفہوم میں ہندومت کا بانی ایک انبوہ ہے جس کی شخصیتیں تاریکی میں ہیں۔"

(The Great Religions of the Modern World)

یہ ایک غیر ہندو کا تبصرہ نہ ہے جس پر ممکن ہے، تعصب کا شبہ کیا جائے اس لیے آئیے! ہم ہندوستان کے محبوب رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ پر غور کریں۔

"ہندومت ایک عقیدہ و مذہب کی حیثیت سے غیر مرتب مبہم اور بہت سے پہلو رکھنے والا ہے۔ وہ تمام انسانوں کے لیے سب طرح کی چیز ہے۔ اس کی تعریف بیان کرنا یا مذہب کے عام مفہوم کے اعتبار سے متعین طور پر کہنا کہ وہ مذہب ہے یا نہیں، مشکل ہی سے ممکن ہے۔ وہ اپنی موجودہ شکل میں اور ماضی میں بھی بہت سے معتقدات و اعمال پر مشتمل ہے۔ بلند ترین سے لے کر پست ترین تک لبا اوقات ایک دوسرے سے متصادم و متضاد" (The Discovery of India)

(تلاشِ ہند P. 37)

ہوسکتا ہے کہ پنڈت نہرو کے لامذہب ہونے کی بنا پر ـــــ اگرچہ اُن کی وفات کے بعد انھیں مذہبی اور کٹر ہندو ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جا رہا ہے ـــــ ہندو ہوتے ہوئے بھی ہندو دھرم کے بارے میں ان کی رائے کو اہمیت نہ دی جائے، اس لیے ہم جدید ہندوستان کے معمار گاندھی جی کو شہادت میں پیش کرتے ہیں جن کا مذہبی ہندو ہونا شبہ سے بالاتر ہے۔ گاندھی جی فرماتے ہیں:

"یہ ہندومت کی خوش قسمتی ہے یا بدقسمتی کہ اس کا کوئی سرکاری عقیدہ نہیں ہے ـــــ اگر مجھ سے ہندو عقیدہ کی تعریف پوچھی جائے تو میں سادہ لفظوں میں کہوں گا، غیر متشددانہ ذرائع سے حق کی تلاش۔ ایک شخص خدا پر اعتقاد نہ رکھتے ہوئے بھی اپنے آپ کو ہندو کہہ سکتا ہے۔ ہندومت حق کی پُر زور تلاش و جستجو کا نام

ہے ...... ہندو مت تمام مذاہب کے سلسلے میں انتہائی روادار ہے۔ اس کا عقیدہ سب کو اپنی آغوش میں لیتا ہے۔"

(Hindu Dharama) ہندو دھرم P. 4)

ایک اور موقع پر گاندھی جی نے فرمایا:

"میرے خیال میں ہندو مت کی خوب صورتی اس بات میں ہے کہ وہ ہر عقیدہ و خیال پہ حاوی ہے ـــــ کسی بھی مذہب میں جو جوہر ہے وہ ہندو مذہب میں موجود ہے اور جو کچھ ہندو مت میں نہیں ہے وہ یا تو غیر بنیادی ہے یا غیر ضروری ( )

ہندو دھرم P. 4)

یہ گاندھی جی کی رائے ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن صدر جمہوریہ ہند۔ جو ہندو مت کے بلند پایہ محقق تسلیم کیے جاتے ہیں، فرماتے ہیں:

"ہندو مت کی بنیاد کسی نسلی عامل پر نہیں ہے۔ یہ فکر اور جذبات کی ایک وراثت ہے جس میں ہر نسل و قوم نے اپنا خصوصی حصّہ ادا کیا ہے ـــــ موجودہ ہندو مت کے بہت سے چہرے (یا پہلو) انتہائی قدیم ذرائع سے ماخوذ ہیں، وہ غالباً اس دور سے بھی آگے کے ہیں، جب کہ موہن جو دارو اور ہڑپا کے لوگ (دراوڑ) اپنے بڑے بڑے شہر ـــــ اینٹوں کے شہر ـــــ بنانے میں مشغول تھے۔ (موہن جو دارو اور ہڑپا) کے آثارِ قدیمہ میں ہم شیو کی مورتی یا اس کا ابتدائی نمونہ پاتے ہیں (گویا شیو دراوڑ دیوتا ہے) مادہ دیویوں کی پرستش بہت ہی ابتدائی ہندوستانی تہذیب ہے، اور غالباً وادیٔ سندھ کے لوگوں کی آمد سے بہت پہلے ہندوستان میں موجود تھی۔ غالباً یہ بھی صحیح ہے کہ درختوں اور جانوروں کی پوجا انتہائی قدیم قوموں میں اور ہندوستان میں اور مختلف

دوسرے مقامات پر اتنے عرصے سے موجود ہے کہ اس کی ابتدا کا پتہ چلانا غیر ممکن ہے۔

جب ہم رگ وید اور یجروید کے دور سے گزرتے ہیں تو ہم نسبتاً زیادہ مضبوط بنیاد پر ہوتے ہیں۔ ہم اُن میں مختلف ادیان کے مابین تصادم، اور اُن کی آخری مصالحت کی صدائے بازگشت پاتے ہیں ۔۔۔۔ بہر حال ویدک دھرم نے قدیم مذاہب کے مراسم عبودیت اور طور طریق کو اپنے اندر جذب کر کے انھیں محفوظ کر لیا۔ اُن کو ختم کرنے کے بجائے اپنی ضرورت کے مطابق انھیں اختیار کر لیا۔ ویدک دھرم نے دراوڑوں اور ہندوستان کے دوسرے قدیم باشندوں کی سماجی زندگی سے اتنا زیادہ اخذ کیا ہے کہ اصل آرین عناصر کو دوسرے عناصر سے الگ کرنا سخت مشکل ہے۔ (مختلف خیالات و رسوم کا) یہ جذب و انجذاب اس درجہ پُر پیچ دقیق، پُراسرار اور مسلسل رہا ہے کہ اس کے نتیجے میں جو مخصوص ہندو تہذیب اُبھری وہ نہ آرین تہذیب ہے، نہ دراوڑ تہذیب اور نہ قدیم تہذیب"

(Eastern Religions and Western Thought)

مشرقی مذاہب اور مغربی فکر P. 306 . 307)

اپنی اسی تصنیف میں آگے چل کر وہ مزید فرماتے ہیں :

" اس روادارانہ رویہ کے نتیجے میں ہندومت مذہبی جذبات و اعمال کے تقریباً تمام انواع کا مُرقع بن گیا۔ اُس نے ہر انسان کی ضرورت کو پورا کرنے کا غیر محدود بندوبست کیا اور خدا سے متعلق کسی بھی پہلو کو جس کا انسان نے (کبھی) تصوّر کیا ہو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔" (صفحہ ۳۱۳)

ان اقتباسات کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ ہندومت کی تخلیق میں بے شمار افراد، قوموں، تہذیبوں اور مذاہب کا ہاتھ ہے۔ ہندومت نے پوری رواداری کے ساتھ مختلف مذاہب کے معتقدات و اعمال کو جذب کیا اور اس کے نتیجہ میں وہ دنیا جہان کے مختلف و متضاد مذہبی خیالات و اعمال کا معجونِ مرکب بن گیا۔

ایک اور ہندو فاضل و محقق سری آروبندگھوش (The Foundation of Indian Culture) (ہندوستانی تہذیب کی بنیادیں) میں تحریر فرماتے ہیں:

"پہلی مشکل جو چکرا دینے والی ہے اور جس میں اہلِ یورپ کا دماغ بُری طرح الجھا ہوا ہے، ہمارے سامنے آتی ہے۔ مغربی ذہن اس سوال کو حل کرنے میں خود کو قاصر پاتا ہے کہ "ہندومت کیا ہے؟" وہ سوال کرتا ہے کہ اس مذہب کی روح کیا ہے؟ اس کا ذہن اور متعین فکر کہاں ہیں؟ اس کے جسم کی (مخصوص) شکل کہاں ہے؟ کس طرح کوئی مذہب اس طرح کا ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی محکم عقیدہ نہ ہو جس پر دائمی عذاب کا خوف دلا کر ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا ہو، جس میں دینیاتی اصولِ موضوعہ نہ ہوں، نہ کوئی متعیّن دینیات ہو، نہ کوئی بنیادی عقیدہ ہو جو اسے دوسرے حریف یا مخالف مذاہب سے ممتاز کرتا ہو؟ کس طرح کوئی مذہب ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی پوپ (مسلّم مذہبی پیشوا) نہ ہو، انتظام کرنے والی کوئی کلیسائی جماعت نہ ہو، کوئی چرچ نہ ہو، کوئی مرکزی معبد نہ ہو، کوئی جماعتی نظم نہ ہو، کوئی لازم مذہبی شکل بھی نہ ہو جو اس کے تمام پیروؤں پر کسی پہلو سے بھی واجب ہو، کسی طرح کا نظم اور ڈسپلن نہ ہو۔ ہندومت کیوں کر ایک مذہب کہا جا سکتا ہے جب کہ وہ تمام ہی عقیدوں کو صحیح تسلیم کرتا ہے حتیٰ کہ ایک طرح کے اونچے الحاد اور لاادریت[1]

---

[1] یہ فلسفہ کہ نہیں معلوم کہ خدا ہے یا نہیں۔ گویا خدا کا اقرار ہے نہ انکار۔

کو بھی اور تمام ممکنہ روحانی تجربوں اور ہر قسم کے مذہبی اعمال کی اجازت دیتا ہے۔ واحد چیز جو (ہندو مت میں) متعین ہے، جامد، مثبت اور واضح ہے، سماجی قانون ہے اور وہ بھی مختلف جاتیوں، علاقوں اور گروہوں میں مختلف ہے، ذات پات کا نظام (ہندوؤں پر) حکومت کرتا ہے، نہ کہ کوئی کلیسا، لیکن ذات پات کا نظام بھی کسی شخص کو اس کے عقائد کی بنا پر سزا نہیں دے سکتا، نہ آزاد خیالی پر کوئی پابندی لگا سکتا ہے، نہ اپنے گروہ کو کسی نئے انقلاب انگیز عقیدہ یا کسی نئے روحانی رہنما کو اپنانے سے روک سکتا ہے اگر ذات پات کا نظام عیسائی یا مسلمان کو برادری باہر کر دیتا ہے تو یہ اس کے مذہبی عقیدہ یا عمل کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ صرف اس لیے کہ یہ لوگ سماجی ضوابط و نظام کو توڑ دیتے ہیں۔ غلط فہمی دراصل اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ مذہب کے بارے میں ہندوستان اور مغرب کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے مختلف ہے اور یہی چیز ہندوستانی ذہن اور یورپ کے عام ذہن کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔

ہندوستانی ذہن کے لیے مذہب کا سب سے کم اہم جزو اس کا عقیدہ ہے۔ مذہب کی روح اہم ہے نہ کہ دینیاتی عقیدہ۔ اس کے برعکس مغربی ذہن کے لیے کسی مذہب کا سب سے اہم جزو ایک مقررہ ذہنی عقیدہ ہے۔ یہ (مذہب کے) مفہوم کا دل ہے، یہی وہ چیز ہے جو ایک مذہب کو دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتی ہے۔ کیونکہ مذہب کے منضبط عقائد ہی وہ امور ہیں جو اسے سچا یا جھوٹا مذہب بناتے ہیں۔" (صفحہ ۱۳۹، ۱۴۰)

گویا شری آروبندو گھوش علی الاعلان یہ بات کہتے ہیں اور اسے ہندو مت

کی خوبی قرار دیتے ہیں کہ ہندومت کوئی متعینہ عقیدہ، مقررہ دینیات، طے شدہ اعمال اور متعین شکل نہیں رکھتا۔ وہ تمام عقیدوں اور تمام مذہبی اعمال کو جو ایک دوسرے سے مختلف و متضاد ہیں ــــ صحیح باور کرتا ہے۔

ہندومت کے ایک اور بلند پایہ محقق اور سرگرم عمل داعی و پیشوا سوامی وویکانند اپنے مقالے (Hinduism-A universal Religion) ¹ "ہندومت ــــ ایک عالمگیر مذہب" کے آغاز ہی میں فرماتے:

"ویدانت کی اونچی روحانی پروازوں سے لے کر ــــ کہ سائنس کی تازہ ترین تحقیقات تک اُن کی صدائے بازگشت محسوس ہوتی ہیں ــــ جہانت جہانت کی دیومالائیت کے ساتھ بت پرستی کے پست تصورات تک بدھوں کی لاادریت اور جینیوں کا الحاد ان میں سے ہر ایک اور سب ہندو مذہب میں ایک مقام رکھتے ہیں" (صفحہ ۱)

سوامی وویکانند کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہندومت میں ہر طرح کی چیز موجود ہے۔ ویدانت کی بلند پایہ روحانی اور سائنٹیفک تحقیقات بھی اور بت پرستی کے پست تصورات اور دیوی دیوتاؤں کے بعید از عقل قصے کہانیاں بھی۔ ایسے فرقے بھی جو ایک یا ایک سے زائد خداؤں کو مانتے ہیں اور ایسے فرقے بھی جو خدا کے منکر ہیں یا کم از کم اس کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔

یہی نہیں کہ از روئے واقعہ ہندومت میں ہر طرح کے مختلف و متضاد معتقدات و اعمال موجود ہیں بلکہ سوامی جی کے نزدیک حقیقی، فطری اور عالمگیر مذہب کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اسی مقالہ میں وہ فرماتے ہیں:

---

¹ یہ مقالہ شکاگو میں منعقد ہونے والی مذاہب کی پارلیمنٹ میں جو ۱۸۹۳ء میں منعقد ہوئی تھی، پڑھا گیا تھا۔

"اگر ایک آدمی اپنی خدائی فطرت کو ایک بت کے ذریعے پاسکتا ہے تو کیا بت پرستی کو گناہ کہنا صحیح ہو گا؟ اس وقت بھی جب وہ اس مرحلہ سے گزر جائے کیا وہ اسے غلطی قرار دے سکتا ہے؟ ہندو کے نزدیک انسان خطا سے صواب کی طرف سفر نہیں کر رہا بلکہ صداقت سے صداقت کی طرف، پست صداقت سے بلند صداقت کی طرف، اس کے نزدیک تمام مذاہب، اشیاء پرستی سے لے کر بلند ترین خدا پرستی تک، انسانی روح کی بے شمار مساعی ہیں جو اس نے لامحدود (خدا) کو پانے اور اخذ کرنے کے سلسلے میں کی ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کا تعین پیدائش اور سماج کے حالات سے ہوتا ہے ان میں سے ہر ایک ارتقاء کے ایک مرحلہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہر روح ایک نوجوان عقاب ہے جو اونچی اڑان اڑتا ہے اور بلند سے بلند تر اڑتا اور زیادہ سے زیادہ طاقت فراہم کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مہر تاباں (خدا) تک پہنچ جاتا ہے۔ کثرت میں وحدت فطرت کا منصوبہ ہے اور ہندو نے اسے قبول کر لیا ہے۔ دوسرے مذاہب میں سے ہر مذہب ایک مخصوص متعین عقیدہ مرتب کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ سماج اسے اپنانے پر مجبور ہو جائے۔ وہ سماج کے سامنے صرف ایک کوٹ رکھتا ہے جیسے جیک، جان اور ہنری سب پر یکساں فٹ ہونا چاہیے۔ اگر وہ جان یا ہنری پر فٹ نہیں ہوتا تو انھیں کوٹ کے بغیر جوان کے بدن کو ڈھانپے چلا جانا چاہیے۔ ہندوؤں نے اس حقیقت کو پا لیا ہے کہ وجود مطلق (Absolute) یعنی (خدا) کو اضافی طور پر ہی پایا، خیال کیا، یا بیان کیا جا سکتا ہے اور بت صلیب

اور ہلال[1] محض بہت سی علامات ہیں ـــــ بہت سی کھونٹیاں جن پر روحانی تصورات کو لٹکایا جا سکے۔

ہندوؤں کے نزدیک مذاہب کی تمام دنیا ایک سفر ہے۔ مختلف مردوں اور عورتوں کا مختلف حالات اور ماحول سے ایک ہی منزلِ مقصود کی طرف آنا ہے۔ تمام مذاہب کا منشا ایک ہی ہے اور وہ مادی انسان کو ترقی دے کر خدا[2] بنا دیتا ہے اور وہی ایک خدا ان سب انسانوں کا محرک بھی ہے۔ پھر اتنے بہت سے تناقضات و تضادات کیوں ہیں؟ "ہندو" کا کہنا یہ ہے کہ یہ تناقضات ظاہری ہیں۔ تناقضات و تضادات اس بات سے پیدا ہوتے ہیں کہ وہی ایک صداقت مختلف فطرتوں کے مختلف ماحولوں میں اپنے آپ کو مختلف انداز میں ڈھالتی ہے۔ وہی ایک روشنی ہے جو مختلف رنگوں کے شیشوں سے گزر کر آتی ہے، یہ تھوڑے سے تنوعات (مختلف ماحول کے سانچے میں) ڈھلنے کے لیے ضروری ہیں، لیکن ہر چیز کے دل میں وہی ایک صداقت حکمرانی کر رہی ہے۔ خداوند نے کرشن کا اوتار لے کر ہندو سے علی الاعلان کہا تھا:

"میں ہر مذہب میں موتیوں کی لڑی میں دھاگے[3] کی مانند ہوں۔ جہاں

---

[1] سوامی وویکانند کو شاید غلط فہمی ہوئی کہ ہلال اسلام کا کوئی مخصوص نشان ہے۔ ہلال دولت عثمانیہ کے پرچم کا نشان تھا۔ اس کا اسلام یا خدائے اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ اس کی کوئی دینی اہمیت ہے۔ [2] کم از کم یہودیت اور اسلام کا منشاء یہ نہیں ہے۔ اسلام کا منتہائے مقصود انسان کو خدا کا بندہ بنانا ہے نہ کہ خدا بنانا۔ ماسوی اللہ کی خدائی اسلام کی نظر میں سب سے بڑا جھوٹ، عظیم ترین گمراہی اور سارے فساد کی جڑ ہے اور اس ماسوی میں انسان بھی داخل ہے۔

[3] بھگوت گیتا میں کرشن جی کی تعلیم یہی ہے کہ تمام مذاہب حق ہیں اور کسی کی بھی پرستش

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہیں بھی تم غیر معمولی تقدس اور غیر معمولی طاقت پاؤ جو انسانیت کو ترقی
دیتی اور اس کا تزکیہ کر رہی ہو تو جان لو کہ میں وہیں ہوں"۔

(ہندو مت (Hinduism) صفحہ ۱۵، ۱۶)

سوامی وویکانند جی نے کتنی حسین توجیہ کی ہے! ــــ یہ الگ بات ہے کہ اس توجیہ کو مان لینے کے بعد دنیا میں کوئی چیز غلط اور ناحق نہیں رہتی۔ ہر عقیدہ، ہر خیال، ہر عمل اور ہر نظام حق ہے، صحیح ہے اور اختیار کیے جانے کے قابل ہے لیکن اس توجیہ سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ ہندو مت مختلف و متضاد عقائد و اعمال کو صحیح باور کرتا اور اپناتا ہے۔

کچھ لوگ ہندو مت کے ان اختلافات و تضادات سے گھبرا اٹھتے ہیں۔ اُن سے جب "ہندو مت" کی کوئی تعریف بن نہیں آتی تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ "ہندو مت" وہ مذہب ہے جسے ہندو مانیں۔ جان کلارک آرچر کہتے ہیں:

"ہندو مت کی اصطلاح وسیع بھی ہے اور مبہم بھی۔ کسی بہتر تعریف کے موجود نہ ہونے کے باعث ہم اس لفظ کا استعمال "ہندو کے مذہب" کے مفہوم میں کر سکتے ہیں"۔

(The Great Religions of the Modern World)

(گذشتہ سے پیوستہ) کہ وہ خدا ہی کی پرستش ہوتی ہے۔ یہی تعلیم اپنشدوں کی ہے۔ ویدوں کے ایک آدھ منتر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ہندو محققین عام طور سے یہی تصور پیش کرتے ہیں۔ مگر سوامی دیانند سرسوتی اس تصور سے متفق نہیں ہیں وہ فرماتے ہیں "دھرم سب کے لیے ایک ہے یا بہت سے؟ اگر یہ کہو کہ بہت ہیں تو بتاؤ کہ وہ ایک دوسرے کے مطابق ہوتے ہیں یا مخالف۔ اگر کہو کہ مخالف، تو ان میں سے ایک سچا ہو سکتا ہے دو نہیں۔ اگر کہو کہ مطابق تو الگ الگ ہونا فضول ہے"۔ (ستیارتھ پرکاش۔ باب ۱۱، صفحہ ۵۰۹)

لیکن اس تعریف سے ایک اور مشکل سوال اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ "ہندو" کی تعریف کیا ہے۔

"HNINDU LAW IN BRITISH INDIA"

(برطانوی ہند میں ہندو قانون) کا مصنف رقم طراز ہے:

"اب ایک اور سوال، جو بہت زیادہ علمی اہمیت کا ہے اور ساتھ ہی دشواری سے خالی نہیں، یہ ہے کہ ہندو کون ہے؟ "ہندو" کا نام اپنے مفہوم کے لحاظ سے کچھ زیادہ متعین نہیں ہے ..... ہندو کا لفظ سنسکرت کی قدیم کتابوں میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ یہ اپنی اصل کے اعتبار سے باہر کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ انڈس (INDUS) یا سندھو (سندھ) سے نکلا ہے اور مسلمان اس لفظ کو ان لوگوں کے لیے استعمال کرتے تھے جو دریائے سندھ کے مشرق میں رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ "ہندوستان کے باشندہ" کا مفہوم دینے لگا۔ اس لیے اشتقاق کی رو سے اس لفظ کے معنیٰ ہوئے "ہندوستان کا باشندہ" لیکن لفظ کے اشتقاق کی اس بحث سے ہمیں اپنے سوال کا جواب نہیں ملتا۔ کیونکہ اسے ماننے کا نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً ہندوستان کے مسلمان باشندوں پر بھی ہندو قانون کا اطلاق ہو" (صفحہ ۷)

یہی نہیں کہ ہندو کی کوئی ایسی تعریف نہیں کی جا سکتی جس کے نتیجہ میں ہندو سماج غیر ہندو سماج سے ممتاز ہو سکے بلکہ بعض ہندو فرقے ہندو کے لفظ ہی کو ناپسند کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ لفظ قطعاً قابلِ ترک ہے کیوں کہ اس کے معنیٰ فارسی اور دوسری زبانوں میں "رہزن" کے ہیں اور یہ ایک الزام و اتہام ہے جو آریوں پر لگایا گیا تھا۔

ہمیں اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ فارسی میں اگر "ہندو" کے معنیٰ ڈاکو

اور رہزن کے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہندوستان میں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں مستعمل ہوا اور فارسی ہی سے آیا ہو۔ مَن کے معنیٰ عربی میں جو یا کون کے ہیں، فارسی میں "میں" کے ہیں اور ہندی اور اردو میں "دل" کے۔ پھر ایک لفظ کے ابتدائی معنیٰ کچھ اور ہوتے ہیں اور بعد میں اس کے معنیٰ کچھ اور ہو جاتے ہیں اور ایسا تو بہت ہوتا ہے کہ ایک لفظ ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرتا ہے تو وہ اپنے معنیٰ بدل دیتا ہے۔ مثلاً عربی میں لفظ مکر کے اور معنیٰ ہیں اور اردو میں اور۔

یہ ایک جملہ معترضہ تھا ورنہ ہمیں لفظ "ہندو" کے لفظی و لغوی معنیٰ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہم صرف واضح کرنا چاہتے ہیں کہ "ہندومت" کی تعریف "ہندو" کے مذہب سے کرنا اور پھر لفظ "ہندو" کی لغوی تحقیق میں لگ جانا بے سود ہے۔ اس سے ہندومت کی تعریف اور اُس کے اصطلاحی مفہوم پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

مشترک بنیادیں

بحث جہاں سے شروع ہوئی تھی پلٹ کر پھر وہیں آ گئی۔ سوال یہ ہے کہ "ہندومت" کیا ہے؟ بلاشبہ ہندوؤں میں بے شمار فرقے ہیں اور ان کے عقائد ایک دوسرے کی ضد ہیں مگر ان کے مابین کوئی چیز بھی مشترک نہیں؟ اگر ان کے درمیان کچھ چیزیں مشترک ہیں تو وہ کیا ہیں؟ سوامی وویکانند نے اپنے ایک لیکچر (HINDUISM, ITS COMMON BASES) (ہندومت کی مشترک بنیادیں) میں، جو انھوں نے ۱۸۹۷ء میں بمقام لاہور دیا تھا بڑی محنت و کاوش سے ان بنیادوں کو تلاش کیا ہے جو ان کے خیال کے مطابق تمام ہندو فرقوں میں مشترک ہیں۔ آئیے! ہم ان بنیادوں پر غور کریں۔ سوامی جی فرماتے ہیں۔

"کچھ بڑے اصول ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب ـــ خواہ ہم وشنو ہوں یا شیو، شاکت ہوں یا گنپتی، قدیم ویدانتیوں سے ہمارا تعلق ہو یا جدید سے، قدیم جامد فرقوں سے متعلق ہوں یا جدید اصلاحی فرقوں سے ـــ ان اصولوں پر یقین رکھتے ہیں۔ غالباً ہم سب جو یہاں موجود ہیں اس پہلے نقطہ پر اتفاق کریں گے ہم سب ویدوں پر ایمان رکھتے ہیں اور انھیں مذہبی اسرار و رموز کی ازلی و ابدی تعلیمات باور کرتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اس مقدس لٹریچر کا نہ کوئی آغاز ہے نہ کوئی انجام یہ فطرت کا سم عصر ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا اور یہ کہ ہمارے تمام مذہبی اختلاف اور ساری مذہبی کشمکشیں ختم ہو جاتی چاہئیں جب ہم مقدس کتاب کے حضور کھڑے ہوں۔ ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ ہمارے تمام روحانی اختلافات کے لیے اپیل کی آخری عدالت یہی (مقدس کتاب) ہے۔

دوسرا نقطہ جس پر ہم سب ایمان رکھتے ہیں، خدا ہے ـــ پیدا کرنے والا، ساری کائنات کی حفاظت کرنے والی طاقت جس کی طرف وقتِ معیّن پر کائنات پلٹ کر جاتی ہے، پھر دوسرے ادوار میں کائنات اس سے باہر آتی ہے اور ان عجیب مظاہرِ فطرت کا مظاہرہ کرتی ہے جنھیں کائنات کہا جاتا ہے ـ ہمارا تصوّرِ خدا مختلف ہو سکتا ہے اس کے باوجود ہم سب خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص ایک مافوق الفطرت لامحدود طاقت پر ـــ جس سے ہر چیز نکلی ہے جس میں ہر چیز رہتی ہے اور جس کی طرف بالآخر ہر چیز پلٹے گی ـــ ایمان نہیں رکھتا اسے ہندو نہیں کہا جا سکتا۔

تیسرا تصور جو میں آپ کے سامنے پیش کروں گا یہ ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ہمارا اعتقاد یہ نہیں ہے کہ دنیا اتنے ہزار سال پہلے پیدا کی گئی ہے اور ایک خاص وقت آنے پر وہ ہمیشہ کے لیے فنا کر دی جائے گی۔ اس طرح ہم یہ بھی یقین نہیں رکھتے کہ انسانی روح کائنات کے ساتھ عدم سے وجود میں لائی گئی ہے۔ یہ ایک اور نقطہ ہے جس پر میرے خیال میں ہم سب اتفاق کرتے ہیں۔ فطرت کے بارے میں ہمارا یقین یہ ہے کہ اس کی کوئی ابتدا ہے نہ کوئی انتہا۔ صرف مناسب و متعین ادوار میں خارجی کائنات کی کثیف مادیت زیادہ بہتر حالت کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ ایک خاص مدت تک اسی حالت میں رہتی ہے۔ اس کے بعد ان تمام غیر محدود مظاہر کو منظرِ عام پر لانے کے لیے جنھیں ہم فطرت کہہ کر پکارتے ہیں دوبارہ خارج میں متشکل ہوتی ہے۔

پھر یہ کہ تمام ہندو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان محض کثیف مادی جسم نہیں ہے۔ صرف اتنی بات بھی نہیں کہ اس کے اندر ایک زیادہ عمدہ جسمانی شے ــــ ذہن ــــ ہے۔ ایک چیز ان سب سے بڑھ کر ہے ...... ان سب سے آگے، یعنی آتما ــــ میں آپ کے سامنے اس لفظ کا ترجمہ نہیں کر سکتا کیونکہ (اس کا) جو ترجمہ بھی ہوگا غلط ہوگا ...... اس کا نہ آغاز ہے، نہ انجام، وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ موت کیا شئے ہے اور اس کے بعد (آواگون کا) یہ نرالا تصور جو نوعِ انسان کی تمام قوموں کے تصورات سے مختلف ہے کہ یہ آتما ایک بدن کے بعد دوسرے بدن میں بود و باش کرتی ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا

ہے یہاں تک کہ اسے اس (سلسلہ) کے جاری رہنے میں دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ تب وہ آزاد ہو جاتی ہے اور پھر پیدا نہیں ہوتی۔"

(HINDUISM) ہندومت P. 44-47)

سوامی وویکانند کی مندرجہ بالا توضیحات سے معلوم ہوا کہ تین چیزوں پر سب ہندو فرقے متفق ہیں:

۱ : ویدوں پر ایمان رکھنا، انہیں ازلی وابدی، مقدس اور فائنل اتھارٹی تسلیم کرنا۔

۲ : خدا پر ایمان رکھنا۔

۳ : آواگون پر یقین رکھنا۔

یہ تین تصورات یقیناً بنیادی ہیں اور ان کا ہندومت میں وہی مقام ہونا چاہیے جو اسلام میں توحید، رسالت اور آخرت کا ہے، لیکن کیا یہ اساسات مختلف ہندو فرقوں کے مابین مشترک بھی ہیں۔

سب سے پہلے پہلے اصول کو لیجئے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ماضی میں بھی بہت سے فرقے ویدوں کے تقدس اور ان کے اتھارٹی ہونے کے منکر رہے ہیں اور آج بھی کئی ایسے فرقے موجود ہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن (RELIGION AND SOCIETY مذہب اور سماج) میں تحریر فرماتے ہیں:

"دھرم کے ماخذ ہیں (۱) سرتی یا وید۔ سرتی میں وید اور تنتر دونوں شامل ہیں کیوں کہ ہندومت کے کچھ فرقوں کے افراد کے نزدیک وید مذہبی سند کا ماخذ نہیں ہیں" (صفحہ ۱۲۵)

اس کے بعد انھوں نے متعدد فرقوں کے نام دیئے ہیں جو ویدوں کو نہیں مانتے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ سوامی وویکانند بدھ مت اور جین مت کو ہندومت ہی کا ایک جزو قرار دیتے ہیں اور یہی رائے ڈاکٹر رادھا کرشنن

کی بھی ہے۔ گاندھی جی فرماتے ہیں :

"میں جین مت اور بدھ مت کو ہندو مت سے علیحدہ نہیں سمجھتا۔" (HINDU DHARMA ہندو دھرم p.6)

اور یہ سب ہی جانتے ہیں کہ جینی نہ وید کو مقدس مذہبی کتاب تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہندوؤں کی کسی مذہبی کتاب کو۔ اُن کی کتابیں، اُن کے دیوتا، ان کے مذہبی پیشوا ان کی دیومالا، سب ہندوؤں سے الگ ہیں وہ ویدوں کے کھلے ہوئے منکر ہیں، یہی حال بدھوں کا ہے، وہ بھی ویدوں کو تسلیم نہیں کرتے، سوامی ویویکانند اپنے ایک لیکچر (HINDUISM OF THE WEDAS) (ویدوں کا ہندو مت) میں فرماتے ہیں :

"بدھ نے اس بات کی کوشش کی کہ ہر وہ قدیم شئے جو ہندوؤں کے نزدیک مقدس ہو، اسے خاک میں ملا دیا جائے۔"

(HINDUISM ہندو مت p.25)

یہی حال سکھوں کا ہے۔ ان کی مقدس مذہبی کتاب گرو گرنتھ صاحب ہے، نہ کہ وید، ڈاکٹر تارا چند ہندوستان کے معروف مورخ ہیں وہ اپنی مشہور تصنیف INFLUENCE OF ISLAM ON INDIAN CULTURE (اسلام کا اثر ہندوستانی تہذیب پر) میں ہندوؤں کے ایک فرقے سدھار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"وہ ویدوں، شاستروں اور بت پرستانہ اعمال کو بے مصرف خیال کرتے تھے۔" (صفحہ ۱۲۸)

بدھ مت کے مشہور محقق کوسمبی جی نے "بھگوان بدھ" میں کئی ایسے فرقوں کا ذکر کیا ہے۔ جو گوتم بدھ سے پہلے یا ان کے زمانے ویدوں کے منکر تھے۔

پھر جو لوگ ویدوں کو مانتے ہیں، ان کے ماننے کا حال کیا ہے؟ یہ

ایک حقیقت ہے کہ ہندوؤں کے مختلف فرقوں کا مذہبی و روحانی تعلق ویدوں سے ٹوٹ چکا ہے۔ آج مختلف ہندو فرقے تو موجود ہیں جن کا رشتہ اپنی مذہبی کتابوں اور پیشواؤں کے ارشادات سے ہے، لیکن ویدک دھرم کے ماننے والے موجود نہیں ہیں حتیٰ کہ آریہ سماج جو ویدک دھرم کے پرچارک ہونے کے مدعی ہیں ان کے نزدیک بھی بنیادی اہمیت سوامی دیانند سرسوتی اور ان کی تصنیف "ستیارتھ پرکاش" کی ہے۔

ویدوں کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ویدوں میں نہ مورتی پوجا ہے، نہ مندروں کا سسٹم ہے، نہ اوتار کا عقیدہ۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن فرماتے ہیں:

"ویدک آرین کے یہاں نہ مندر تھے اور نہ وہ بت بناتے تھے، دراوڑین تہذیب نے بت پرستی کو ترقی دی اور یگیہ کے بجائے پوجا پر زور دیا"

(RELIGION AND SOCIETY P.125)

لیکن آج مورتی پوجا، مندر اور اوتار کا عقیدہ، یہ تینوں چیزیں ہندومت کی جان ہیں اور جاہل عوام ہی نہیں۔ سوامی ویویکانند، سوامی رام تیرتھ، آربندو گھوش اور ڈاکٹر رادھا کرشنن جیسے ہندومت کے محقق و فلسفی اور گاندھی جی جیسے ہوش مند افراد ان چیزوں کی مدافعت و حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ بھی معلوم ہے کہ ویدک دھرم یگیہ اور جانوروں کی قربانی کا مذہب ہے مگر ہندوؤں نے یگیہ کے بجائے پوجا پاٹ اختیار کر لی اور جانوروں کی قربانی کے بجائے آہنسا ہندومت کی بنیاد قرار پائی۔ ہندوستان کے مشہور مؤرخ ڈاکٹر تارا چند ویدک دھرم میں قربانی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ویدک قربانیوں میں جانوروں کے چڑھاوے[1] کی طرح پھل، دودھ اور چاول کی روٹیاں شامل ہیں (بعد میں) جانوروں کی قربانی مذہبی اعمال سے غائب ہو گئی۔ سمرتیوں کے ماننے والے صرف غیر خونی قربانیاں پیش کرتے تھے۔"

(ہندوستانی تہذیب پر اسلام کا اثر صفحہ ۳)

یہی نہیں کہ پرستش و عبادت کے طریقے بدل گئے اور لوگوں نے ویدک طریقوں کو چھوڑ کر نئے نئے طریقے اختیار کر لیے۔ اس سے آگے بڑھ کر یہ ہوا کہ لوگ ویدک دیوتاؤں کو بھی بھول گئے یا انھوں نے زیادہ اہمیت رکھنے والے دیوتاؤں کو نظر انداز کر کے کم اہمیت رکھنے والے دیوتاؤں کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ سوامی وویکانند ویدک دیوتاؤں کا ذکر کرتے ہوئے (ویدوں کا ہندو مت WEDAS.) HINDUISM OF THE) میں فرماتے ہیں:

"ان میں سے ایک کا نام اندر ہے، دوسرے کا نام ورن ہے، ایک اور دیوتا کا نام مترہ ہے اور ایک اور نام پرجنیہ ہے اور اسی طرح اور" (HINDUISM، ہندو مت P.19)

ان دیوتاؤں کی پرستش آج نہیں ہوتی، بلکہ اندر کو چھوڑ کر اور کسی دیوتا کو لوگ جانتے بھی نہیں، ڈاکٹر تارا چند ویدک دیوتاؤں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جن دیوتاؤں کی شان میں (ویدوں) کے سب سے زیادہ

---

[1] سوامی وویکانند ویدک قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "وہ قربانی کی ایک چتا بناتے، کچھ جانوروں کو ذبح کرتے، ان کا گوشت سیخوں پر بھونتے اور یہ گوشت اندر پر چڑھا دیتے" (HINDUISM . P-19)

منتر ہیں۔ وہ اِندر، اگنی اور سوم ہیں۔ وُرن سب سے اونچا مانا گیا تھا۔ پرجاپتی تخلیق کا دیوتا شمار ہوتا تھا۔ وشنو اور رُدر شیو کو معمولی اہمیت دی گئی تھی۔ قدیم دیو مالائی نظم (وید) میں برہما خالق، مہربان کرنے والا اور سب کا جدِ امجد ہونے کی حیثیت سے سب دیوتاؤں کا صدر تھا۔ اور اگنی، یم، وُرن، کبیر اور اندر سے سب سے زیادہ دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ بعد کے زمانے میں شیو اور وشنو کو غالب پوزیشن حاصل ہو گئی اور انھوں نے برہما کے ساتھ مل کر عظیم تثلیث قائم کر لی۔

(INFLUENCE OF ISLAM ON INDIAN CULTURE.P.S)

سوامی ویویکا نند نے ویدوں پر ایمان لانے کی تشریح کرتے ہوئے کہا تھا:

"ہم سب ویدوں پر ایمان رکھتے اور انھیں مذہبی اسرار و رموز کی ازلی و ابدی تعلیمات باور کرتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اس مقدس لٹریچر کا نہ کوئی آغاز ہے، نہ کوئی انجام، یہ فطرت کا ہم عصر ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا"

لیکن کتنے ہندو ہیں جو ویدوں پر اس طرح ایمان رکھتے ہیں؟ گاندھی جی فرماتے ہیں:

" وید، اپنشد، سمرتی، پران اور اتہاس، ایک ہی وقت میں سامنے نہیں آئے۔ ان میں سے ہر ایک کا ارتقا مخصوص ادوار کی ضرورتوں کی بنیاد پر ہوا۔ اور اسی واسطے اُن میں باہم ٹکراؤ محسوس ہوتا ہے یہ کتابیں از سر نو ازلی و ابدی صداقتوں کا اظہار نہیں کرتیں بلکہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ان صداقتوں پر اُس دَور میں کس طرح عمل ہوتا تھا، جس دور کی یہ کتابیں تھیں کیونکہ جانوروں کی قربانی کا عمل ایک

زمانے میں عام تھا، کیا آج ہم اسے از سر نو زندہ کرنا چاہتے ہیں ؟ کیوں کہ ایک زمانے میں ہم گوشت کھاتے تھے، کیا آج بھی ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں ؟"

(HINDU DHARMA، ہندو دھرم P.19)

اسی طرح کے خیالات ڈاکٹر رادھا کرشنن نے بھی ظاہر کیے ہیں۔ صرف ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

" وید کے منتر بہرحال اس وقت مرتب کیے گئے تھے جب ہندوستانی ایرانیوں سے جدا ہو چکے تھے اور ان منتروں کی تخلیق کے وقت ان کا وطن سندھ کا علاقہ تھا۔"

(RELIGION AND SOCIETY. P.119)

اب دوسرے اصول کو لیجیے، سوامی وویکانند کے بقول خدا پر ایمان وہ دوسری اساس ہے جس پر تمام ہندو فرقے متفق ہیں، لیکن کیا اس بنیاد پر ہندو فرقے واقعی متفق ہیں؟

ہندو مت اور ہندوؤں کی تاریخ سے باخبر ہر شخص جانتا ہے کہ خدا پر ایمان رکھنے، نہ رکھنے کے سلسلے میں ہندوؤں میں قدیم ترین زمانے سے دو گروہ رہے ہیں۔ آستک (خدا پرست) اور ناستک (خدا کے منکر) اور جس طرح آستک گروہ میں متعدد فرقے ہوئے ہیں، اسی طرح ناستک گروہ میں بھی متعدد فرقے ہوئے ہیں۔ گاندھی جی یہ الفاظ اوپر گزر چکے ہیں:

" خدا پر ایمان نہ رکھتے ہوئے بھی ایک شخص خود کو ہندو کہہ سکتا ہے۔" (صفحہ ۴۔ ہندو دھرم۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن بھی یہی فرماتے ہیں:

"ہندو اپنی جماعت میں ملحدین کا بھی خیر مقدم کرتا ہے" (EASTERN

(RELIGION AND WESTERN THOUGHT. P.320)

بدھ مت کو سوامی ووِیکا نند سمیت اکثر و بیشتر ہندو محققین ہندو مت کا جزو خیال کرتے ہیں، لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ بدھ مت خدا پر ایمان رکھے بغیر زندگی کے دکھوں کو درمیان ہی سے حل کرنا چاہتا ہے۔[1] خود سوامی ووِیکا نند نے بدھ مت کو "لا ادریت" کا قائل قرار دیا ہے اور اس "لا ادریت" کے لیے "ہندو مت" میں جگہ رکھی ہے۔

جین مت خالقِ کائنات کا کُھلم کُھلا انکار کرتا ہے، نہیں، بلکہ اس تصور کا مذاق اڑاتا ہے۔ ڈاکٹر تارا چند فرماتے ہیں:

"جین مت نے ان مذہبی فلسفیانہ نظاموں میں، جو اس وقت ہندوستان میں عام طور پر رائج تھے، اہم مقام حاصل کرلیا ہے جینی کسی ماوراء سے ادراک (خدا) یا وجودِ مطلق پر ایمان نہیں رکھتے"

(INFLUENCE OF ISLAM ON INDIAN CULTURE, p.19

خود سوامی ووِیکا نند (HINDUISM OF THE WEDAS ویدوں کا ہندو مت) میں فرماتے ہیں:

"اس طرح گوتم بدھ، جہاں کہیں بھی گئے، انھوں نے کوشش کی کہ ہر اس چیز کو جو پرانی اور ہندوؤں کے یہاں مقدس تھی، خاک میں ملا دیں۔ یہی کچھ جینیوں نے کیا، وہ خدا کے تصور پر ہنستے تھے۔ وہ پوچھتے تھے خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ اوہام پرستی ہے اور بس۔"

(HINDUISM ہندو مت 24، 25)

یہ جانتے ہوئے بھی کہ جینی خدا کا انکار کرتے بلکہ مذاق اڑاتے ہیں سوامی ووِیکا نند انھیں ہندوؤں میں شامل سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں، وہ جینیوں

---

[1] ملاحظہ ہو "بدھ مت اور شرک"۔

کے الحاد کو ہندو مت میں ایک مقام دیتے ہیں۔ خدا پر ایمان ہندو مت کی بنیاد ہے اور جینیوں کے الحاد کا ہندو مت میں مقام بھی۔ خدا پر اعتقاد تمام ہندو فرقوں میں مشترک ہے اور خدا کے منکر جینی ہندوؤں میں شامل بھی یقیناً یہ ایک معمّہ ہے۔ لیکن دیکھئے اس معمہ کو سوامی وِویکانند کس خوبی سے حل کرتے ہیں :

"ایک اور چیز! کس طرح ہندو، جس کی پوری عمارت یا فکر کا مرکز خدا ہے، بدھ مت پر اعتقاد رکھ سکتا ہے۔ حالانکہ وہ لاادریت کا قائل ہے۔ یا جین مت کو مان سکتا ہے جب کہ وہ خدا کا منکر ہے؟ (جواب یہ ہے کہ) بُدھ یا جینی خدا پر انحصار نہیں رکھتے، لیکن ان کے مذہب کا پورا زور اسی چیز کی طرف ہے جو ہر ایک مذہب کی عظیم مرکزی سچائی ہے یعنی انسان کو ترقی دے کر خدا بنا دینا۔" (HINDUISM, P.17)

سوامی جی کی یہ توجیہ کتنی حسین ہے! لیکن اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خدا پر ایمان ہندو بننے کی لازمی شرط ہے اور نہ تمام ہندو فرقے اس بنیاد پر متفق!

کہا جا سکتا ہے کہ کیوں نہ بُدھوں، جینیوں اور اُن تمام لوگوں کو جو خدا پر یقین نہیں رکھتے، ہندو سماج سے خارج سمجھا جائے؟ خدا پرستی کا تقاضا تو یقیناً یہی ہے، مگر ہندو سماج اس کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ پنڈت جواہر لال نہرو جیسے افراد سے کس طرح ہاتھ دھو سکتا ہے؟ پھر ایک بار یہ دروازہ کھل جائے تو ایک دو نہیں، بہت سے فرقے ہندو سماج سے باہر آجائیں گے اور یہ چیز ہندو سماج کے شیرازہ کو درہم برہم کر دے گی۔

اب تیسری بنیاد کو لیجئے اور وہ ہے آواگون پر ایمان۔ یقیناً یہ ایک

ایسی بنیاد ہے، جو اکثر و بیشتر ہندو فرقوں میں بھی مشترک ہے۔ لیکن سب فرقوں میں نہیں۔ بدھ مت کے مشہور محقق کوسمبی جی نے "بھگوان بدھ" میں ایسے فرقوں کا ذکر کیا ہے جو گوتم بدھ سے قبل یا ان کے معاصر تھے اور آواگون کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ ڈاکٹر تاراچند نے بھی دو ایسے فرقوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک لنگائت، جس نے ڈاکٹر صاحب کی تصریح کے مطابق بارھویں صدی عیسوی سے زور پکڑا اور جو آج بھی کنٹری اور تلگو علاقوں میں پایا جاتا ہے اور آبادی کا ایک تہائی حصہ ہے یہ فرقہ:

"تناسخ یا رُوحوں کے آواگون پر یقین نہیں رکھتا۔"

(INFLUENCE OF ISLAM ON INDIAN CULTURE, P.119)

دوسرا فرقہ ہے سِدھار۔ اس فرقے کے بارے میں ڈاکٹر تاراچند صراحت کرتے ہیں کہ وہ ویدوں ہی کا نہیں، آواگون کا بھی منکر تھا۔ (کتاب مذکورہ بالا صفحہ ۱۲۴)

کبیر نہ صرف یہ کہ کبیر پنتھی فرقے کے بانی تھے بلکہ ہندو مصلحین میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے بعد میں آنے والے تمام ہندو مصلحین کو متاثر کیا اور ہندوستان میں ایک نئی طرح ڈالی، جس کی گونج صدیوں تک سنی جاتی رہی۔ ہندو مت کا یہ عظیم مصلح آواگون پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ ڈاکٹر تاراچند فرماتے ہیں:

"یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ آواگون کے نظریے سے کس درجہ وابستہ تھے بہت سی عبارتیں ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کی تردید کی ہے (مثلاً) رُوح ایک مہمان ہے جو دوبارہ نہیں آئے گی۔ آدمی کی حیثیت سے پیدائش حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ یہ دوبارہ واقع نہیں ہوگی۔ جب ایک پکا پھل گر جاتا ہے تو دوبارہ درخت پر نہیں لگ سکتا۔ نیز تمام لوگ اس

جانب سے اپنے بوجھ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور کوئی شخص اُس جانب سے لوٹ کر نہیں آتا جو وہاں کے حقائق کو کہہ سکے۔ وہ کرم کے نظریہ پر نہیں پہنچتے تھے، جو لازمی طور پر آواگون کے نظریہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اُن کی پوری توجہ اس دنیا اور موجودہ زمانہ ہی پر مرتکز ہے، بجائے مستقبل اور زندگی بعد موت کے۔"

(INFLUENCE OF ISLAM ON INDIAN CULTURE, P.163-164)

لیکن بات ان چند فرقوں ہی کی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آواگون کا نظریہ ویدوں میں موجود ہے اور نہ ویدک دور کے آریہ اس عقیدہ سے واقف تھے۔ ڈاکٹر رادھاکرشنن (INDIAN PHILOSOPHY) ہندوستانی فلسفہ میں فرماتے ہیں:

"موت کے بعد زندگی کے سلسلے میں آریہ کوئی مخصوص عقیدہ نہیں رکھتے تھے، اگرچہ جنت اور دوزخ کے متعلق کچھ مبہم تصورات سے سوچنے والے دماغ بچ نہ سکتے تھے۔ آواگون کا نظریہ ابھی دُور تھا۔" (VOL I. P. 113)

ویدک دور کے آریوں کے نقطۂ نظر کی تشریح کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:-

"جب ایک آدمی مرتا ہے تو اس کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ "یم" کے ملک میں پہنچ جاتا ہے۔ "یم" نے ہمارے لیے ایک ایسا گھر تیار کر رکھا ہے جو ہم سے واپس نہ لیا جائے گا۔ جب بدن روح سے چھوٹ جاتا ہے تو روح کو ایک چمکدار روحانی شکل مل جاتی ہے اور وہ دیوتاؤں کے ملک میں چلی جاتی ہے جہاں ہم اور آباؤ اجداد ابدی زندگی گزارتے ہوتے ہیں۔"
(جلد ا۔ صفحہ ۱۴۴)

یہ نظریہ آواگون کا نہیں، جنت، دوزخ کے اسلامی نظریہ سے قریب ہے۔ ویدک دور کے آریوں میں "تین جنموں" کا نظریہ بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن فرماتے ہیں :-

"یہ ویدک نظریہ کی طرف اشارہ ہے کہ ہر آدمی کے تین جنم ہوتے ہیں۔ پہلا جنم ایک بچہ کی حیثیت سے، دوسرا روحانی تعلیم کے ذریعے اور تیسرا جنم موت کے بعد" (جلد ا صفحہ ۱۱۶)

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ویدک عہد کے آریہ موت کے بعد ایک ہی جنم کے قائل تھے اور آواگون کا عقیدہ نہ رکھتے تھے یہی بات ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں :

"اس سب کا مطلب یہ ہے کہ ویدک دور کے آریہ آواگون کے تصور سے ناواقف تھے" (جلد ا۔ صفحہ ۱۱۶)

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ویدک دھرم کی بنیاد آواگون کے اعتقاد پر نہ تھی اور نہ ویدک دور کے آریہ آواگون کا عقیدہ رکھتے تھے بعض وجوہ سے جن کا ذکر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے مذکورہ بالا کتاب میں کیا ہے (ملاحظہ ہو جلد اوّل صفحہ ۱۳۵) یہ عقیدہ بعد میں پیدا ہوا اور اس نے قبولیت عام حاصل کر لی۔ اب یا تو یہ کہیے کہ ویدک دھرم کا ہندو مت سے کوئی علاقہ نہیں، ہندو مت کا ویدوں سے کوئی تعلق نہیں اور ویدک عہد کے آریہ ہندو نہیں، یا پھر آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ آواگون پر ایمان رکھنا ہندو مت کی بنیاد نہیں ہے اور یہ اصول تمام ہندو فرقوں میں متفق علیہ نہیں ہے۔

یہ ہے ان تین اصولوں کے مشترک ہونے کی حقیقت۔ جن کے ہندو فرقوں میں متفق علیہ ہونے کی خوشخبری سوامی وویکانند جی نے دی تھی، آپ نے دیکھ لیا کہ یہ بنیادیں فی الواقع مشترک نہیں ہیں۔

ہندومت کے مآخذ

گزشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ "ہندومت" کسی ایک مذہب کا نام نہیں ہے۔ نہ "ہندو" کسی ایک ملت کا، ہندوؤں میں مختلف فرقے ہیں اور ہر فرقے کا مذہب دوسرے سے مختلف ہے، ان مذاہب کے مآخذ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مآخذ کے لحاظ سے ہم ہندوؤں کو دو گروہوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ویدوں کو اپنے مذہب کا مآخذ نہیں مانتا، دوسرا وہ جو ویدوں پر ایمان رکھتا ہے۔ پہلے گروہ کے موجودہ معروف فرقے سکھ، بدھ اور جین ہیں۔

سکھوں کی مقدس مذہبی کتاب وید کے بجائے گورو گرنتھ صاحب ہے جس میں گورو نانک اور دوسرے سکھ گروؤں کے ارشادات جمع کر دیے گئے ہیں۔

بدھ بھی وید کے بجائے گوتم بدھ اور ان کے بعد بدھ پیشواؤں کی تعلیمات کو اپنے مذہب کا مآخذ مانتے ہیں۔

جین مت کی کتابوں کی فہرست خاصی طویل ہے اور ہمارے علم کی حد تک اُن میں کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں ہے جسے عام ہندو بھی تسلیم کرتے ہوں۔

اب دوسرے گروہ کو لیجئے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن فرماتے ہیں:

"دھرم کے مآخذ ہیں: ۱: شرتی یا وید

۲: ویدوں کا علم رکھنے والے اصحاب کی روایات و عمل۔

۳: نیکوکار لوگوں کا رویہ ۴: انفرادی ضمیر۔"

(RELIGION AND SOCIETY, P. 108)

پہلی دو چیزوں کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر رادھا کرشنن لکھتے ہیں:

"ویدوں میں دھرم کی منضبط تفصیلات نہیں ہیں، وہ آئیڈیل چیزوں کی طرف اشارہ کرتے اور کچھ اعمال کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ضوابط و استحکام سمرتیوں اور دھرم شاستروں میں — جو عملاً مترادف ہیں — پائے جاتے ہیں۔ سمرتیاں ان یادداشتوں کا لفظ بہ لفظ حوالہ دیتی ہیں جو وید کے ماہر علماء سے محفوظ کی گئی ہیں سمرتی کا وہ ضابطہ جس کا ماخذ وید میں مل سکتا ہو، اسے وید کی اتھارٹی حاصل ہو جاتی ہے۔ جب سمرتی و شرتی میں اختلاف ہو تو شرتی کو قبول کیا جائے گا۔" (صفحہ ۱۰۹)

گویا "ہندو مت" کے دو ماخذ ہیں۔ وید اور سمرتیاں اور وید سمرتیوں پر مقدم ہیں۔ ہم بھی پہلے وید کو لیں گے۔

وید:

ڈاکٹر رادھا کرشنن فرماتے ہیں:

"وید چار ہیں۔ رگ، یجر، سام اور اتھروید۔ پہلے تین نہ صرف شکل اور زبان میں متفق ہیں، بلکہ اپنے مضامین میں بھی، ان میں اہم ترین رگ وید ہے۔ سام وید خالص عبادات سے متعلق مجموعہ ہے۔ ان میں سے بہت کچھ رگ وید میں موجود ہے اور منتر سام وید ہی میں ہیں (اور رگ وید میں نہیں ہیں) ان میں کوئی خاص سبق نہیں ہے۔ یہ مجموعہ رسمی مذہب کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔"

Indian Philosophy P. 64

معلوم ہوا کہ اصل رگ وید ہی ہے، باقی مکررات ہیں۔ یہی بات سوامی شروانند اسسٹنٹ سیکرٹری رام کرشن مٹھ اینڈ مشن نے بھی فرمائی ہے۔

"اندرونی شہادت سے بھی ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ دوسرے

سمہتاؤں (ویدوں) میں رگ وید کے بعض حصوں کو کم وبیش کرکے اور بڑا کرکے بیان کر دیا گیا ہے۔ یجر وید اور سام وید معمولی اضافوں اور تبدیلیوں کے ساتھ رگ وید کے قابلِ لحاظ حصہ پر مشتمل ہیں .... اتھر وید جو سب سے آخری وید ہے اس میں بھی رگ وید کے بہت سے منتر ہیں۔ خود "تریائی" کا لفظ جو ویدک کتابوں کی نشاندہی کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس بات کو واضح کرتا ہے کہ وید اصل میں تعداد کے اعتبار سے صرف تین تھے اور یہ کہ اتھر وید بعد کا اضافہ ہے۔ ہندو سماج کا یہ واقعہ بھی بڑا معنی خیز ہے کہ برہمنوں کی بہت بڑی تعداد پہلے تین ویدوں سے متعلق رہی ہے رہا اتھر وید تو اس کے برہمن ہندوستان میں تھوڑے سے شاذ و نادر ہی ہیں۔ پانینی ہندوستان میں گرامر کا سب سے بڑا ماہر بھی اسی نقطہ کی تائید کرتا ہے کیونکہ وہ وید کی تعداد تین بتاتا ہے۔"

(Cultural Heritage of India) P. 4-5

ہندوستان کا تہذیبی ورثہ)

گویا ابتداً صرف ایک وید تھا "رگ وید" اس میں کمی بیشی کرکے تین وید بنے[1] اور پھر تین سے چار۔

وید کی تین قسمیں:

سوامی شردانند مزید فرماتے ہیں:

" ویدک نوشتے چار بڑی کتب رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھر وید پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی پھر تین خاص قسمیں

---

[1] گیتا میں بھی صرف تین ویدوں رگ وید، یجر وید اور سام وید کا ذکر ہے۔

ہیں۔ سمہتا (مقدس متون کے مجموعے) براہمن (شروح) اور آرنیک (دنیا چھوڑ کر جنگل میں رہنے والوں کے لیے ہدایت) ویدکے لغت نویس یاسک کے قول کے مطابق وید کے صرف دو حصے ہیں۔ سمہتا اور براہمن۔ سبب ہے آرنیک تو وہ براہمن ہی کا ایک حصہ ہیں۔ قدیم ہندوستان کے معروف ترین قانون ساز آپستمب کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے۔ مشہور و معروف اپنشد[1] آرنیک ہی کے مختلف ابواب ہیں بعض اہلِ علم ویدک لٹریچر میں سوتروں کے ایک مجموعہ کو جس کا نام کلپ سوتر ہے شامل کرتے ہیں۔ مقدس متون کے یہ مجموعے (سمہتا) منتر کہلاتے ہیں، یہ نثر میں بھی ہیں اور مختلف قسم کے اوزان کے اشعار میں بھی۔

براہمن عموماً نثر میں ہیں۔ ان میں قربانی کے منتروں اور انھیں ادا کرنے کے طریقوں کا تفصیلی ذکر ہے۔

آرنیک بالعموم مستقل اور آزاد تصنیف ہے۔ اگرچہ اس کو براہمن کا جزو تسلیم کیا جاتا ہے...... اپنشد جیساکہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے بالعموم انھی آرنیک کے ابواب ہیں۔ بہت سے آرنیک جو ویدوں سے متعلق تھے آج موجود نہیں۔ عام طور پر ان عجیب وغریب کتابوں کے صرف اپنشد کے ابواب زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہ سکے ہیں۔ آج اگرچہ ایک سو آٹھ سے زیادہ اپنشد موجود ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی وید سے ہے لیکن اپنشدوں کے قدیم ترین شارح شنکر اچاریہ نے ان میں سے صرف

---

[1] ہندو فلسفہ اور تصوف کی معروف ترین کتابیں جنھیں "ویدانت" (وید کا آخری حصہ) بھی کہا جاتا ہے۔

سولہ اپنشدوں کو اصلی اور مستند قرار دیا ہے۔

وشنو پران کے بیان کے مطابق اصل وید اننت اگرشیوپر الہام کیے گئے تھے۔ اُن میں ایک لاکھ اشلوک تھے اور چار حصے۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ یہ حصے گڈمڈ ہو گئے اور ویدوں کا بہت بڑا حصہ تاریکی میں غائب ہو گیا۔ دوا پریگ کے آغاز میں کرشن دوبے پائن نے ویدوں کے علم کو از سرِ نو زندہ کیا اور چار تقسیموں رِگ، یجس، سامن اور اتھروں کے مطابق ویدوں کو از سرِ نو مرتب کیا۔ اسی لیے وہ ویدویاس ویدوں کو مرتب کرنے والے کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ روایت ہندو علما میں بہت قوی شمار ہوتی ہے اور اسے اس حیثیت سے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ اس کی کچھ نہ کچھ تاریخی بنیاد موجود ہے۔"

(کتاب مذکور، جلد ا، صفحہ ۳، ۴)

اس اقتباس سے مزید چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱ : وید کے تین حصے ہیں سمہتا۔ براہمن، آرنیک۔ بعض اہلِ علم ابتدائی دو قسمیں ہی مانتے ہیں اور تیسری قسم کو دوسری قسم میں شامل سمجھتے ہیں۔

۲ : اپنشد بالعموم آرنیک ہی کے ابواب ہیں اور اس لیے وہ بھی ویدوں ہی کا حصہ ہیں۔ اسی لیے اپنشدوں کو واپدانت (وید کا آخری حصہ) کہا جاتا ہے۔

۳ : وید کے ایک لاکھ اشلوک تھے مگر امتدادِ زمانہ سے ان کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔[1]

---

[1] سوامی دیانند سرسوتی اس بات کو نہیں مانتے۔ وہ گم شدہ اجزاء کو وید ماننے کے بجائے وید کی شرح قرار دیتے ہیں۔ ستیارتھ پرکاش میں "وید کی گم شدہ شاخیں اور مورتی پوجا" کے

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

۴ : آرینک اکثر و بیشتر غائب ہو گئے۔ صرف وہ ابواب رہ گئے جنھیں اپنشد کہا جاتا ہے۔

۵ : اس وقت ایک سو آٹھ اُپنشد موجود ہیں مگر شنکر آچاریہ جیسے عظیم محقق شارح نے ان میں سے صرف سولہ کو تسلیم کیا ہے۔ گویا باقی جعلی یا محرّف ہیں۔

۶ : ویدوں کی موجودہ ترتیب کرشن دوبے پائن کی ہے جنھیں ویدؔ باس کہا جاتا ہے۔ ہندو روایات کی رُو سے یہی وید یاس مہابھارت، گیتا اور تمام پرانوں کے مصنف ہیں[۲]

۷ : بعض لوگ کلپ سوتر نامی سوتروں کے ایک مجموعہ کو ویدوں میں شامل سمجھتے ہیں، لیکن اکثر لوگ اسے وید کا جز نہیں مانتے۔

ویدوں کے بڑے حصہ کے گم ہونے کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ عرصۂ دراز تک صرف زبانی نقل ہوتے رہے۔ سوامی شردانند فرماتے ہیں :

"ویدوں کو "شُرتی" اس لیے کہا جاتا ہے کہ انھیں جاننے اور حفظ کرنے کی کارروائی کا طریقہ یہ تھا کہ انھیں اُستاد سے گاتے ہوئے

(گزشتہ سے پیوستہ) زیرِ عنوان ہے۔ "بت پرست سوال کرتے ہیں کہ وید لاانتہا ہیں۔ رگ وید کی ۲۱ - یجر وید کی ۱۰۱، سام وید کی ایک ہزار اور اتھر وید کی ۹ شاکھائیں (شاخیں) ہیں۔ ان میں سے چند شاکھائیں ملتی ہیں۔ باقی لوپ (گم) ہو گئیں۔ ان میں مورتی پوجا اور تیرتھوں کے پرمان (ثبوت) ہوں گے ..... جواب چار وید مکمل ملتے ہیں ...... یہ سب شاکھائیں وید نہیں ہیں (باب ۱۱ صفحہ ۴۵۸، ۴۶۰)

[۲] کے ایم منشی فرماتے ہیں : ہستناپور کی حالیہ کھدائی سے واضح ہوتا ہے کہ وید باس اس وقت پیدا ہوئے تھے جب ویدک عہد خاتمہ پر تھا یعنی تقریباً ۹۵۰ ق م"

(INDIAN INHERITANCE . P. 47)

سنا جائے۔" (کتاب مذکور، جلد ا صفحہ ۵)

مندرجہ بالا توضیحات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ براہمن اور اپنشد وید کے اجزا ہیں ــــ سناتن دھرم والوں کا عام عقیدہ یہی ہے ــــ لیکن آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی صرف پہلے جزو سمہتا (سنگھتا) کو وید قرار دیتے ہیں اور براہمن وغیرہ کو وید سے خارج سمجھتے ہیں۔ ستیارتھ پرکاش میں وہ فرماتے ہیں :

سوال : وید کن کن کتابوں کا نام ہے ؟

جواب : رگ وید، یجر، سام اور اتھروید، منتر سنگھتاؤں کا نام ہے دیگر کتب کا نہیں۔

دیکھو کتاب سنگھتا کے شروع میں اور ادھیائے (باب) کے اختتام پر لفظ وید ہمیشہ لکھا جاتا رہا ہے اور کتاب برہمن کے آغاز یا ادھیائے کے خاتمہ پر کہیں نہیں لکھا...... اس سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وید منتر بھاگ اور برہمن، دیا کھیا بھاگ (شرح) ہے۔ اس بارے میں جو خاص طور پر دیکھنا چاہے وہ میری تصنیف کردہ "رگ وید آدی بھاش بھومکا" میں دیکھ لیوے۔"

(باب ۷، صفحہ ۲۶۶ — ۲۲۸)

سمرتیاں :

اب سمرتیوں کو لیجئے۔ سمرتیوں کا ذکر کرتے ہوئے ایل۔ ایچ۔ چکرورتی (THE Elements of Hindu Law) ہندو قانون کے عناصر) میں" ہندو قانون کے ماخذ" کے زیر عنوان تحریر فرماتے ہیں :

۲ ؛ سمرتیاں : یہ دو طرح کی ہیں (الف) وہ جو نثر میں ہیں انھیں دھرم سوتر کہا جاتا ہے اور یہ منظوم سمرتیوں سے پہلے کی ہیں۔ ان کے خاص مصنف گوتم، بھاؤین، آپستمب، وششٹھ وغیرہ ہیں۔

(ب) جو نظم میں ہیں، انھیں دھرم شاستر کہا جاتا ہے اور یہ دھرم سوتر، کی منظوم ترتیب جدید ہیں۔ ان کے خاص مصنف منو، جگنا والکیہ، نارد، وشنو، برہسپتی، کاتیائن اور دیاس ہیں۔ سمرتیوں میں دنیوی معاملات سے متعلق خاصے قوانین ہیں۔ جیسے کہ اخلاق اور مذہب کے بارے میں ہیں۔ اگرچہ ان سمرتیوں کو شرتیوں کی طرح غلطی سے پاک تصور نہیں کیا جاتا۔ تاہم بلند ترین اختیارٹی ہونے کی حیثیت سے اُن کا احترام کیا جاتا ہے اور ان کے شروح کے ذریعے جن کا ذکر ذیل میں ہے، ان سمرتیوں کی جو تعبیرات کی گئی ہیں وہ موجودہ ہندو قانون کی بنیاد بنتی ہیں۔ سمرتیوں کے مصنفین میں منو یقیناً سب سے پہلے مصنف ہیں[1]۔ سند کے طور سے دوسرے مصنف جگنا والکیہ ہیں۔" (صفحہ ۴)

سمرتیوں کی جن شروح کا حوالہ جیکر ورتی صاحب نے دیا ہے، انھیں ہندو قانون کا تیسرا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ شروح (جن کا نام نبندھ ہے) دعویٰ تو یہ کرتی ہیں کہ وہ سمرتیوں کی تعبیر و تشریح ہیں مگر انھوں نے اپنے مصنفین کے نقطۂ نظر اور زمانے کے تغیرات کے مطابق قدیم قانون میں قابلِ لحاظ حد تک ترمیمات کی ہیں۔ نبندھ کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی یہ تاثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کے مصنفین سمرتیوں کی ٹھیک ٹھیک شرح کرنے کے بجائے اس بات کے

---

[1] منو سمرتی کی رو سے کائنات کے آغاز کے وقت برہما نے یہ سمرتی منو کو املا کی تھی۔ اسی منو سمرتی کی رو سے منو دس بڑے رشیوں کے خالق بھی ہیں اور یہ رشی بہت سے دیوتاؤں کے۔ (ملاحظہ ہو منو سمرتی، ادھیائے ۱، ۳۴، ۳۵، ۳۶)

زیادہ شائق ہیں کہ قدیم متون کو توڑ مروڑ کر انھیں اپنے نئے خیالات کے مطابق بنا لیں۔ موجودہ زمانے میں ان کی اتھارٹی ہر سنسکرت تصنیف سے زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ خود سمرتیوں کو ان کے لیے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ پریوی کونسل نے فیصلہ کیا ہے، عدالتوں کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ یہ تحقیق کریں کہ کسی مخصوص اسکول (مکتبِ فکر) کا نظریہ قدیم ترین مستند کتابوں سے صحیح طور پر اخذ کیا گیا ہے یا نہیں؟...

اہم اور بنیادی شرحیں یہ ہیں (یہاں دس شرحوں کا ذکر ہے) ان میں سے کچھ کو ایک علاقے میں مستند مآخذِ قانون مانا جاتا ہے جب کہ دوسرے علاقے میں اسے نظر انداز کیا جاتا ہے......

اس طرح ہندو قانون کے مختلف اسکول پیدا ہو گئے" (صفحہ ۵، ۶)

سمرتیوں کے مآخذِ قانون ہونے پر ویدک دھرم والوں کا اتفاق ہے۔ بدھوں، جینیوں اور سکھوں پر بھی سمرتیوں ہی کا قانون لاگو ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آریہ سماج فرقے کے بانی، سوامی دیانند سرسوتی صرف منوسمرتی کو مانتے ہیں باقی سمرتیوں کو نہیں مانتے۔ ستیارتھ پرکاش میں ہے:

"اب جو کتابیں ترک کرنے کے لائق ہیں۔ ان کا شمار مختصراً کیا جاتا ہے یعنی جو نیچے کتابیں لکھیں گے ان کو جال گرنتھ (جعلی کتابیں) سمجھنا چاہیئے۔ سمرتیوں میں منوسمرتی میں باہر سے ڈالے ہوئے اشلوک[1] اور دیگر سب سمرتیاں" (باب ۳۔ صفحہ ۶۵)

---

[1] معلوم نہیں، سوامی دیانند سرسوتی کن اشلوکوں کو الحاقی سمجھتے ہیں۔ سوامی دیانند موجودہ چھوت چھات کے قائل نہیں ہیں اور عورتوں کا مرتبہ بھی سماج میں بلند کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ ان اشلوکوں کو الحاقی سمجھتے ہوں جو شودروں (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ کیجئے)

گویا منوسمرتی کے علاوہ باقی سمرتیاں جعلی ہیں اور خود منوسمرتی میں بھی تحریف ہوئی ہے۔

پُران :

وید، اپنشد اور منوسمرتی کی خواہ کتنی ہی اہمیت ہو، عوام اور اہلِ علم کا ان سے کچھ زیادہ ربط نہیں ہے صرف خواص انھیں پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ ہندو عوام اور علما جن کتابوں سے خصوصی ربط رکھتے، جنھیں دن رات پڑھتے پڑھاتے اور جن کی روشنی میں اپنے فکر و ذہن اور عمل کو ڈھالتے ہیں وہ پُران بھگوت گیتا اور رامائن ہیں۔ سب سے پہلے ہم پران کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

ہندوستان کے مشہور روشن خیال ہندو لیڈر گاندھی جی فرماتے ہیں :

"میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیوں کہ ویدوں، اپنشدوں، پُرانوں اور ان تمام کتابوں پر ایمان رکھتا ہوں جنھیں ہندو مقدس کتب کہا جاتا ہے اور اس لیے اوتاروں اور آواگون پر بھی۔"

گاندھی جی نے سناتنی ہندو کی صحیح تعریف کی ہے۔ آریہ سماج کو چھوڑ کر ہندوؤں کی عظیم ترین اکثریت جو خود کو سناتن دھرم (ازلی مذہب) کا قائل کہتی ہے پُرانوں پر ایمان رکھتی ہے۔

دیوان بہادر، کے ایس رام سوامی شاستری

(The Purans and their Contribution to Hindu Thought)

(پُران اور ہندوستانی فکر میں ان کا حصّہ)

(گزشتہ سے پیوستہ) اور عورتوں سے متعلق ہیں اور جنھیں گاندھی جی نے بھی ظالمانہ قرار دیا ہے (ملاحظہ ہو ہندو دھرم، صفحہ ۳۲۹)

میں فرماتے ہیں :

"یہ واضح ہے کہ پُران ہندوؤں کی مقدس کتب کا نہایت اہم اور ناگزیر حصّہ ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ویدوں میں بیان کی ہوئی روحانی صداقتوں کی توسیعات اور ان کی تمثیلی تشریحات ہیں۔ باہر کے لوگ آج کل کے من گھڑت افسانوں کی طرح انھیں جھوٹے قصّے کہانیاں قرار دے سکتے ہیں۔ کچھ اندر کے لوگ (ہندوستان کے کچھ ہندو) بھی انھیں تمثیلی افسانے، علامتی و مجازی قصے یا یوگ کی صداقتوں سے متعلق قرار دے سکتے ہیں جن کا خارجی مادی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ہندوؤں کی عظیم اکثریت اور روایاتی عقیدہ کا مرکزی ڈھانچہ، پرانوں کو دہرے کردار، یعنی تمثیلی توضیحی قیمت[1] اور مؤثر واقعیت[2] کا حامل قرار دیتا ہے۔ پُرانوں نے ہزاروں سال سے ہماری سرزمین میں، عوامی زندگی، عقیدہ اور طرزِ زندگی کو ڈھالا ہے اور اگر ہم وید کی صداقتوں کو سمجھنے کے لیے تیار ہیں تو ہمیں ان سے پوری طرح استفادہ کرنا ہوگا۔ پرانوں کی مستقل اور عظیم ترین قدر و قیمت ہمارے لیے اسی چیز میں ہے۔" (کلچرل ہیریٹیج آف انڈیا صفحہ ۱۸۱ - ۱۸۳)

اے، ڈی پُسالکر (The Purans) (پُران) میں لکھتے ہیں :

"پُران ہندوؤں کے مذہبی و غیر مذہبی لٹریچر میں یکتا مقام رکھتے ہیں، اہمیت کے اعتبار سے ویدوں کے بعد ہی ان کا مقام سمجھا جاتا ہے، اور "مہا بھارت" کی طرح انھیں "پانچواں وید" عوام کا وید اور اتنا ہی قدیم اور مقدس خیال[1] کیا جاتا ہے جتنے

لہ "برہما تنتر پران میں ہے کہ پُران برہما کے منہ سے اس وقت سنے گئے جب کہ ابھی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خود وید ہیں" (The Indian Inheritance) P. 75)

بھگوت پران کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں :

"بھگوت[1] پران اٹھارہ خاص پرانوں میں سے ایک ہے، یہ سب سے زیادہ عوامی چیز ہے اور ہندو اس کو انتہائی احترام کا مستحق خیال کرتے ہیں۔ یہ اتنی مقدس خیال کی جاتی ہے کہ بہت سے راسخ العقیدہ ہندوؤں کے گھروں میں کتابِ مقدس کی حیثیت سے اس کی روزانہ تلاوت کی جاتی ہے" (صفحہ ۶۷)

پرانوں کے مصنف کون ہیں اور ان کا زمانۂ تصنیف کیا ہے؟ اے ڈی پُسالکر فرماتے ہیں :

"پرانوں کا زمانہ اور اُن کے مصنفین کا معاملہ اب تک بحث کا موضوع ہے۔ راسخ العقیدہ ہندوؤں کی روایات کے مطابق ان کو مرتب کرنے والے عظیم وید یاس (ویدوں کے مرتب ہیں جو مہابھارت کے مصنف ہیں، لیکن اس نقطۂ نظر کو ہمارے مؤرخین اور ریسرچ اسکالرس نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ سب پران اتنے قدیم زمانے یا ایک ہی وقت میں تصنیف ہوئے ہیں اور یہ کہ وہ ایک ہی مصنف اور اسی (مذکور) مصنف کی تخلیقات ہیں۔ ان تمام

(گزشتہ سے پیوستہ) ویدان کے چار منہ سے نکلے تھے (ہندوستان کا تہذیبی ورثہ جلد اول مضمون، پران اور ہندوستانی فکر میں ان کا حصہ صد ۱۰۰) [1] اس پران میں خدا کی بھگتی (عشق) سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے دسویں باب میں کرشن جی کی زندگی اور ان کی لیلاؤں کا تذکرہ ہے جس میں گوپیوں کے ساتھ کرشن جی کی محبت کی لیلائیں بھی ہیں (کتاب مذکور صفحہ ۱، ۔ ۶۲ ۔ ۶۳ ۔ ۶۴)

پرانوں میں "پنچ لکشنز" یا پانچ بنیادی صفات یا موضوعات پر بحث ہے۔ یہ موضوعات ہیں مسئلۂ تخلیق، دوسری پیدائش، دیوتاؤں اور اکابر کا شجرۂ نسب، مختلف منوؤں کے ممالک اور ادوارِ حکومت اور سورج اور چاند کے سلسلۂ نسب کی داستانیں، لیکن موضوعات کی یکسانی کے باوجود ان کے اسلوب بہت زیادہ مختلف ہیں۔ جن موضوعات سے بحث کی گئی ہے ان میں بہت زیادہ اختلافات ہیں اور بعض اوقات وہ باہم ٹکراتے بھی ہیں۔ ایک پران میں ایک دیوتا کی غالبانہ مدح وثنا ہے تو دوسرے پران میں دوسرے دیوتا کی اس حد تک تعریف ہے کہ پہلے دیوتا کو نقصان پہنچ جاتا ہے انہی وجوہ سے تاریخی تحقیق کے ماہرین یہ یقین کرنے کی طرف مائل ہیں کہ پران مختلف مصنفین کی تخلیقات ہیں اور غالباً آخری مصنفین نے ویاس جی کی طرف انھیں اس لیے منسوب کر دیا کہ کہ ان کی تخلیقات کو بھی وہی تقدس اور استناد کا وہی درجہ حاصل ہو جو عظیم ویدویاس کی تخلیقات کو حاصل ہے۔" (صفحہ ۸۷، ۸۸)

موجودہ ہندو مت اور ہندو فرقے براہِ راست پرانوں کی تخلیق ہیں۔ ہندو اہلِ علم ہی نہیں، خاص الخاص محققین بھی ان پرانوں پر ایمان رکھتے ہیں البتہ کچھ لوگ تو ان کے بیانات کو جوں کا توں مان لیتے ہیں اور کچھ ان کی تاویل و توجیہ کرتے ہیں۔ البتہ سوامی دیانند سرسوتی اور ان کے فرقہ آریہ سماج کے لوگ تمام پرانوں کو جال گر تخنفر قرار دیتے ہیں (ستیارتھ پرکاش باب ۳ صفحہ ۹۵) وہ "پورانک مت" کو ویدک دھرم سے الگ ایک مت قرار دیتے ہیں اور اس پر شدید تنقید کرتے ہیں۔ "ستیارتھ پرکاش" باب ۱۱ میں ان کی یہ تنقید پونے دو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ پرانوں کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر جاننے کے لیے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"شیووں نے شو پُران وغیرہ، شاکتوں نے دیوی بھاگوت وغیرہ وشنوؤں نے وشنو پران وغیرہ کتابیں تصنیف کیں اور انھیں دیاس وغیرہ رشی مینوں کے نام پر موسوم کیا۔ ان کتابوں پر انھوں نے اپنا نام نہیں دیا بدیں وجہ کہ ان کے نام سے قابلِ تسلیم نہ سمجھی جائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں ان کتابوں کا نام پُران (پرانی) کے بجائے نوین (نئی) رکھنا چاہیے تھا۔ آج کل جیسے ان لوگوں کے آپس کے جھگڑے ہیں ویسے ہی اُن کے پُرانوں میں بھی درج ہیں۔ دیکھو! "دیوی بھگوت پُران" میں لکھا ہے کہ "شری" نام والی ایک دیوی شری پور کی رانی ہے۔ اس نے ساری دنیا کو پیدا کیا ہے اور برہما، وشنو اور مہا دیو کو بھی اسی نے بنایا ہے، جب اس دیوی کی خواہش یہ ہوئی کہ میں دنیا کو پیدا کروں تو اس نے اپنا ہاتھ گھسا، اس کے ہاتھ میں ایک چھالا نمودار ہوا اس میں سے برہما پیدا ہوا۔ برہما سے دیوی نے کہا کہ تو مجھ سے بیاہ کر۔ برہما نے کہا تو میری ماں ہے میں تجھ سے بیاہ نہیں کرسکتا۔ یہ سن کر ماں کو غصہ آیا اور لڑکے کو اپنی قدرت سے جلا کر خاک کر ڈالا۔ اور پھر اسی طرح سے اپنے ہاتھ کو گھسا کر دوسرا لڑکا پیدا کیا اس کا نام وشنو رکھا۔ دیوی نے اس سے بھی اسی طرح کہا۔ وشنو نے نہ مانا تو اس کو بھی خاک کر ڈالا، پھر اسی طرح تیسرا لڑکا پیدا کیا، اس کا نام مہا دیو رکھا اور اس سے کہا کہ تو مجھ سے بیاہ کر، مہا دیو بولا کہ میں تجھ سے بیاہ نہیں کرسکتا اگر تو مجھ سے بیاہ کرنا چاہتی ہے تو کسی اور عورت کی شکل اختیار کر، دیوی نے ایسا ہی کیا۔ تب مہادیو نے پوچھا کہ دونوں جگہوں پر خاک کیسی پڑی ہے؟ دیوی نے کہا کہ یہ دونوں تیرے

بھائی ہیں۔ انھوں نے میرا حکم نہ مانا تھا۔ اس لیے خاک کر دیے گئے۔ مہادیو نے کہا کہ میں اکیلا کیا کروں گا؟ ان کو بھی زندہ کر اور دو عورتیں پیدا کر۔ کیوں کہ تینوں مردوں کا بیاہ تینوں عورتوں سے ہونا چاہیے۔ دیوی نے ایسا ہی کیا، پھر تینوں مردوں کا بیاہ تینوں عورتوں سے ہو گیا۔

واہ! ماں کے ساتھ بیاہ نہ کیا اور بہن کے ساتھ کیا۔ کیا اسے جائز سمجھنا چاہیے؟ ــــ بعدازاں اندر وغیرہ کو پیدا کیا۔ برہما، وشنو، رودر اور اندر۔ ان کو (اپنی) پالکی کے اٹھانے کے کہار بنایا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ایسے لمبے چوڑے من گھڑت گپوڑے لکھ مارے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اس دیوی کا جسم اور منی پور کا بنانے والا اور دیوی کے ماں باپ کون تھے؟ اگر کہیں کہ دیوی اناری (ازلی) ہے تو بھائی بہن کا بیاہ کون سی اچھی بات ہے؟ جس طرح اس "دیوی بھاگوت" میں مہادیو، وشنو اور برہما وغیرہ کا چھوٹاپن اور دیوی کی عظمت لکھی ہے اسی طرح شوپران میں دیوی وغیرہ کو بہت ہی ناچیز بتلایا گیا ہے۔ یعنی یہ سب مہادیو کے خادم اور مہادیو سب کا مالک ہے۔" (ستیارتھ پرکاش، باب ۱۱، صفحہ ۳۹۲ تا ۳۹۴)

ایک اور جگہ پرانوں کی عدم صداقت پر اس طرح بحث کرتے ہیں:

سوال: پرانوں میں لکھی سب باتیں جھوٹی ہیں یا کوئی سچی بھی ہے؟

جواب: بہت سی باتیں جھوٹی ہیں اور کوئی کوئی بات اتفاقیہ سچی لکھی گئی ہے، جو سچی ہے وہ وید وغیرہ ست (سچے) شاستروں کی ہے اور جو جھوٹی ہے وہ ان پوپوں کے اپنے گھر کے پرانوں کی ہے۔ مثلاً شوپران میں شیووں[1] نے شو کو ایشور مان

---

[1] شیو کو ماننے والے

کر وشنو، برہما، اندر، گنیش اور سورج وغیرہ کو ان کا غلام ٹھہرایا ہے۔ وشنوؤں[1] نے وشنو پران وغیرہ میں وشنو کو پرماتما مانا ہے۔ اور شو وغیرہ کو اس کا غلام لکھا ہے۔ گنیش کھنڈ میں گنیش کو ایشور اور باقی سب کو اس کا غلام بتاتا ہے۔ بھلا اگر یہ باتیں ان مختلف فرقوں کے پیرووں کی نہیں تو اور کن کی ہیں؟ ..... ان میں اگر ایک سچی بات مانیں تو دوسری جھوٹی اور اگر دوسری سچی مانیں تو تیسری جھوٹی اور اگر تیسری سچی تو اور سب جھوٹی ثابت ہوتی ہیں۔ شو پران والوں نے شو سے وشنو پران والوں نے وشنو سے دیوی پران والوں نے دیوی سے، گنیش کھنڈ والوں نے گنیش سے، سورج پران والوں نے سورج سے اور وایو پران والوں نے وایو سے، دنیا کی پیدائش و فنا کا حال لکھ کر پھر ایک ایک سے دوسرے سب مخالف خالقوں کی پیدائش لکھی ہے۔ اگر کوئی یہ پوچھے کہ دنیا کا پیدا، قائم اور فنا کرنے والا ہو سکتا ہے یا جو پیدا ہوا ہے وہ کبھی دنیا کی پیدائش کا سبب اولی ہو سکتا ہے؟ تو سوائے چپ رہنے کے کچھ بھی جواب نہ دیں گے اور اگر ان سب کے وجود کی پیدائش بھی اسی سے ہوئی ہو تو پھر وہ خود مخلوق اور محدود ہونے سے دنیا کے خالق کیونکر ہو سکتے ہیں؟ اور علاوہ بریں انھوں نے دنیا کی پیدائش بھی مختلف طور پر بانی ہے جو کہ بالکل ناممکن ہے۔ مثلاً شو پران میں لکھا ہے کہ جب شو نے خواہش کی کہ دنیا کو پیدا کروں تو ایک نارائن نامی تالاب پیدا کیا۔ اس کی ناف سے کنول اور کنول سے برہما پیدا

---

[1] وشنو کو خدا ماننے والے۔

ہوا جب اس نے دیکھا کہ ہر طرف تری ہی تری ہے تو اس نے پانی کو مٹھی میں بھر کر پانی میں پھینکا، اس میں سے بلبلہ اٹھا اور بلبلہ سے ایک پرش پیدا ہوا۔ اس نے برہما سے کہا کہ اے بیٹا! دنیا پیدا کر، برہما نے اس سے کہا کہ میں تیرا بیٹا نہیں بلکہ تو میرا بیٹا ہے۔ اس پر ان دونوں میں جھگڑا ہوا اور دونوں پانی پر (دیوتاؤں کے) ہزار برس تک لڑتے رہے۔ اب مہا دیو نے سوچا کہ جن کو میں نے خلقت پیدا کرنے کے لیے بھیجا تھا وہ تو دونوں آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ پھر ان دونوں کے بیچ میں ایک نورانی لنگ[1] پیدا ہوا جو جلد ہی آسمان تک چلا گیا۔ اس کو دیکھ کر دونوں حیران ہو گئے۔ سوچنے لگے کہ اس کی ابتدا و انتہا معلوم کرنی چاہیے جو ہم میں سے اس کی ابتدا و انتہا کا پتہ لے کر پہلے آوے وہ باپ اور جو بعد میں آئے یا تھاہ نہ معلوم کر سکے وہ بیٹا کہلائے گا[2]" (باب ۱۱ صفحہ ۳۶۸، ۳۶۹ ہندی ایڈیشن)

بھگوت گیتا:

یہ بات اوپر گزر چکی ہے کہ مہابھارت کو پانچواں وید خیال کیا جاتا ہے۔ اس "مہابھارت" کا سب سے اہم اور بنیادی جزو بھگوت گیتا ہے۔ یعنی کرشن جی

---

[1] عضوِ تناسل۔ یہ وہی شیو لنگ ہے جس کی پوجا کی جاتی ہے۔

[2] سلسلۂ بیان ابھی باقی ہے لیکن اسے ہم یہیں ختم کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ آگے کا خلاصہ یہ ہے کہ برہما نے جھوٹ بول دیا کہ میں نے تھاہ پالی اور گائے اور ایک درخت سے وشنو کے سامنے جھوٹی گواہی دلوادی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ برہما کی پوجا موقوف ہوئی اور گائے کے منھ کی بھی۔

وہ اپدیش جو انھوں نے ارجن کو مہا بھارت کی جنگ لڑنے پر ابھارنے کے لیے دیا اس اُپدیش میں بہت سے فلسفیانہ اور الہیاتی مسائل آگئے ہیں موجودہ دور کے ہندوؤں پر سب سے زیادہ گیتا ہی کا اثر ہے حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو اہنسا کے داعی ہیں مثلاً گاندھی جی اور ونوبا بھاوے وہ بھی گیتا ہی سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ گاندھی جی فرماتے ہیں:

"گیتا ایک ایسی اعلیٰ اور ماورائی کتاب ہے کہ ہر ایک عقیدہ، عمر اور ملک کے لوگ اسے احترام کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں اور اس کے اندر اپنے اپنے مذاہب کے اصول پا سکتے ہیں۔"

(ہندو دھرم صفحہ ۱۳۹)

اور شاید گیتا کی اسی خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ اُس کتاب سے جو جنگ اور تشدد کی پرزور تعلیم دیتی ہے اور جو ہندوستان کی عظیم ترین جنگ مہا بھارت کا باعث[1] بنی، اسی سے گاندھی جی کو آہنسا کا سبق ملتا ہے اور عدم تشدد کی تحریک کے دوران انھیں گیتا سے روحانی غذا ملتی ہے۔ اپنے سابرمتی آشرم کے لوگوں کو وہ "بڑودہ جیل" سے لکھتے ہیں:

"جب بھی میں اپنے آپ کو مشکلات میں گھرا ہوا پاتا ہوں تو میں اپنی ماں گیتا کے پاس دوڑ کر جاتا ہوں اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے مجھے آرام وسکون نہ پہنچایا ہو۔" (ہندو دھرم صفحہ ۱۴۲)

ڈاکٹر رادھا کرشنن فرماتے ہیں:

---

[1] سوامی دیانند سرسوتی فرماتے ہیں "افسوس، سب ملکوں کے سرتاج ملک کو مہا بھارت کی جنگ نے ایسا دھکا دیا کہ اب تک بھی یہ اپنی حالت پر نہیں آسکا، سچ ہے، جب بھائی بھائی کو مارنے لگے تو تباہی میں کیا شبہ! ..... جب بہت سے بڑے بڑے عالم، راجہ، مہاراجہ، رشی، مہارشی جنگ مہابھارت میں مارے گئے اور بہت سے مر گئے۔ تب علم اور ویدک دھرم کا پرچار دور ہونے لگا۔" (ستیارتھ پرکاش باب ۱۱ صفحہ ۳۶۱)

"گیتا سب سے زیادہ حسین، غالباً ایک ہی حقیقی فلسفیانہ نظم ہے جو معروف زبانوں میں سے کسی زبان میں کہی گئی ہے۔ یہ کتاب فلسفہ، مذہب اور اخلاق کے درس دیتی ہے۔ اس کو شرتی یا الہامی کتاب خیال نہیں کیا جاتا بلکہ سمرتی یا روایت قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن کسی تصنیف کی اہمیت کا پتہ اگر لوگوں کے ذہن و دماغ پر گرفت کے لحاظ سے لگ سکتا ہے تو ہندوستانی فکر پر سب سے زیادہ اثر گیتا کا ہے۔" (انڈین فلاسفی بحوالہ (The Indian Inheritance) ہندوستانی ورثہ، صفحہ ۱۴۵)

گیتا اور ویدوں کا تعلق بتاتے ہوئے ڈاکٹر رادھاکرشنن فرماتے ہیں:

"گیتا ویدوں کی استعارتی کو نظر انداز نہیں کرتی۔ وہ ویدوں کے احکامات کو ایک مخصوص تہذیبی حالت کے لوگوں کے لیے بالکل صحیح تصور کرتی ہے۔ لیکن ایک مخصوص اسٹیج کے بعد ویدک رسوم کی بجا آوری آخری تکمیل میں سدِ راہ بننے لگتی ہے۔ ویدک دیوتاؤں کی مبالغہ آمیز صفات بھی (گیتا میں) تسلیم نہیں کی گئی ہیں (گیتا کی رُو سے) ویدک رسوم اگرچہ ہمارے لیے دولت و طاقت کے حصول کا ذریعہ بنتی ہیں، لیکن وہ ہمیں مکتی تک براہِ راست نہیں لے جاتیں۔ نجات خودی کی دریافت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جب نجات کا راز ہمیں معلوم ہو جائے تو ویدک کرم (قربانی وغیرہ) کی ادائیگی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔"

(ہندوستان کا ورثہ صفحہ ۱۴۸)

"بھگوت گیتا" کے معنی ہیں بھگوان یا خدا کا گیت۔ کرشن جی کو وشنو کا اوتار مانا جاتا ہے۔ یعنی وشنو نے کرشن کے روپ میں جنم لیا تاکہ مہابھارت کی جنگ کرا کے ظالموں کا خاتمہ کرا دیں۔ اس لیے کرشن جی کا اپدیش وشنو

کا اپدیش ہے جو انھوں نے دنیا میں خود آ کر دیا۔ گیتا میں کرشن جی نے اپنے آپ کو اسی حیثیت سے پیش کیا ہے اور خدائے اعظم کی حیثیت سے اپنی پرستش اور بھگتی (عشق) کا مطالبہ کیا ہے۔ کرشن جی کے اوتار ہونے اور ان کی بھگتی اختیار کرنے کا عام چلن گیتا ہی کی دین ہے۔ گیتا کی تعلیم پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر رادھا کرشنن فرماتے ہیں:

"گیتا کے زمانے میں آخری حقیقت اور انسان کی تقدیر کے سلسلہ میں بہت سے مختلف نظریات پائے جاتے تھے۔ اپنشد کی روایات تھیں جن کی بنیاد روح کے وجدان کے مشاہدہ پر تھی سانکھیہ کا نظریہ یہ تھا کہ نجات اس طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ انسان فطرت سے اپنا تعلق توڑ لے۔ کرم میمانسا کا نظریہ تھا کہ ہم اپنے فرائض کو ادا کر کے کمال حاصل کر سکتے ہیں۔ عشقیہ جذبات و احساسات کا راستہ تھا جس کا تصور یہ تھا کہ دل کی رفعت و وجد سے مکتی کا آنند حاصل کیا جا سکتا ہے اور یوگ کا نظام تھا۔ آخری حقیقت (خدا) کو یا تو غیر شخصی وجود مطلق خیال کیا جاتا تھا۔ یا شخصی خداوند (خدا) گیتا مختلف المزاج عناصر کا امتزاج کر کے انھیں ایک وحدت میں ڈھال دینا چاہتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم اس میں مکتی کی غائت اور تربیت کے ذرائع کے بارے میں صریحاً متضاد و متصادم نظریات پاتے ہیں۔ ہم یہ بھی پاتے ہیں کہ گیتا کی تعلیم کا کوئی یکساں جز نہیں ہے، بلکہ مختلف مصنفین مختلف راستوں سے اس (کی تعلیم) کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گربے اور ہاپکنس یہ خیال کرتے ہیں کہ مختلف مصنفین نے مختلف صدیوں میں گیتا کی تخلیق کی ہے[1]

---

[1] اس کے بعد مصنف نے مختلف مغربی محققین کے اس ذیل کے قیاسات کا ذکر کیا ہے۔

یہ سوال کہ کیا گیتا فکر کے مختلف رجحانات کو ایک حقیقی وحدت میں سمونے میں کامیاب ہوگئی، ہمارے مطالعے کے درمیان جواب کے لیے باقی رہ جاتا ہے۔ ہندوستانی روایت نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ بے جوڑ عناصر گیتا میں اچھی طرح مل گئے ہیں جب کہ مغربی محققین کا اصرار ہے کہ شوخ اجزا مصنف کے مشاق ہاتھوں میں بھی یک جان ہونے سے انکار کرتے ہیں۔"

(The Indian Inheritance) ہندوستانی ورثہ p.152 -153)

گویا گیتا مختلف نظریات اور متضاد تعلیمات کو یک جان کرنے کی کوشش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گیتا تمام راستوں اور طریقوں کو حق بتاتی ہے۔

گیتا تاریخی حیثیت رکھتی ہے یا وہ ایک تخیلی اور تمثیلی کتاب ہے۔ ہندو اہلِ علم اس بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ گاندھی جی فرماتے ہیں:

"میں مہابھارت (کی نظم، گیتا جس کا ایک حصہ ہے) کو تاریخی تصنیف، ان معنوں میں جو اس کے مسلّم ہیں نہیں مانتا۔ آدی پروا میری اس رائے کی تائید کے لیے کافی شہادت رکھتا ہے۔ اپنے خاص ہیروؤں کو فوق الانسان یا تحت الانسان بیان کر کے عظیم ویاس نے بادشاہوں اور ان کی رعیت کی تاریخ کو خود ہی بہت کچھ ختم کر دیا ہے۔ اس میں جن افراد کا ذکر ہے وہ تاریخی ہو سکتے ہیں لیکن مہابھارت کے مصنف نے انھیں صرف اپنے موضوع کو ثابت و واضح کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔"

(ہندو دھرم۔ صفحہ ۱۴۰)

"جن گروہوں کے وجود کے بارے میں ہم قابلِ اعتماد (تاریخی) ریکارڈ رکھتے ہیں۔ میں ان کو تاریخی شخصیتیں خیال کرتا ہوں، لیکن میں بالکل نہیں جانتا کہ بھارت کے کرشن کبھی موجود تھے میرا کرشن

تاریخی شخصیت ہونے سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔"

(ہندو دھرم صفحہ ۱۸)

رامائن :

بھگوت گیتا سے بھی زیادہ جو چیز ہندو عوام اور اہلِ علم میں پڑھی پڑھائی اور مقدس خیال کی جاتی ہے وہ رام کی سوانح حیات رامائن ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندو عوام وخواص پر جتنا رامائن اور رام کی شخصیت وکردار کا اثر ہے، اتنا کسی کا بھی نہیں۔ رام کرشن اور بدھ تینوں ہی اوتار مانے جاتے ہیں۔ مگر جس طرح رام زمانے کے اعتبار سے کرشن اور بدھ دونوں سے مقدم ہیں اسی طرح ان کا مقام بھی ہندوؤں کے یہاں ان دونوں سے بلکہ ہر ایک سے زیادہ اونچا ہے۔ یہاں تک کہ رام خدا (کائنات کے خالق و مالک) کے ہم معنی ہو گیا ہے۔

رامائن دو ہیں۔ والمیکی رامائن۔ یہ سنسکرت میں ہے۔ اولین رامائن یہی ہے۔ یہ تصنیفی اعتبار سے "بھگوت گیتا" سے پہلے کی بتائی جاتی ہے اور تلسی داس کی رامائن سے تو یقیناً پہلے کی ہے۔ اس رامائن کے مصنف والمیکی نہ صرف یہ کہ رام کے ہم عصر بتائے جاتے ہیں بلکہ اس کہانی کے بعض اجزا میں ان کا اہم پارٹ ہے۔ سوامی ودیکانند والمیکی رامائن کی کہانی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"جب رام نے اپنا راج[1] دوبارہ حاصل کر لیا تو انھوں نے ضروری عہد وپیمان لیے...... راجہ اپنی رعیت کا غلام تھا۔ وہ عوامی رائے کے آگے جھک جاتا تھا...... رام نے سیتا کے ساتھ ہنسی خوشی

---

[1] والمیکی رامائن کی رو سے رام کے راج کی مدت گیارہ ہزار سال ہے (والمیکی رامائن بال کانڈ ۱)

چند سال گزارے کہ لوگوں نے پھر یہ چرچے شروع کر دیئے کہ سیتا کو ایک راکشش چرا کر لے گیا تھا اور انھیں سمندر پار کر کے لے جایا گیا تھا۔ وہ پہلی جانچ سے مطمئن نہ ہوئے تھے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ دوبارہ ان کا امتحان ہو ورنہ انھیں جلاوطن کر دیا جائے۔ عوام کو مطمئن کرنے کے لیے سیتا جلاوطن کر دی گئیں اور انھیں جنگل میں رہنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ وہیں شاعر والمیکی کا مٹھ تھا۔ رشی نے غریب سیتا کو روتے ہوئے اور بے یار و مددگار دیکھ کر اور ان کی المناک کہانی سُن کر اپنے آشرم میں جگہ دی۔ سیتا جلد ہی ماں بننے والی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے دو جڑواں بچے جنم دیئے۔ شاعر نے بچوں سے یہ کبھی نہیں کہا کہ وہ کون ہیں۔ والمیکی نے انھیں برہمچریہ جیون کے مطابق پروان چڑھایا۔ تب والمیکی نے رامائن نامی نظم ترتیب دی، اس کی دھن بنائی، اسے ڈرامہ کی شکل دی اور رام کے دونوں بیٹوں کو اس کے گانے کی تعلیم دی۔

ایک وقت آیا جب کہ رام نے ایک عظیم قربانی یا یگیہ کرنے کا فیصلہ کیا...... ہندوستان میں کوئی شادی شدہ آدمی کوئی مذہبی رسم اپنی بیوی کے بغیر ادا نہیں کر سکتا۔ رام کی بیوی ان کے ساتھ

ل سوامی وویکانند نے والمیکی رامائن کے حوالے سے اس کا قصہ بتایا ہے کہ سیتا کی عفت پاک بازی معلوم کرنے کے لیے ایک عظیم قربانی کی آگ تیار کی گئی جس میں سیتا کو دکھیں رام ان کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے مگر آگ کے دیوتا نے انھیں بچا لیا اور صحیح سلامت ایک تخت پر بیٹھی ہوئی برآمد ہوئیں اس امتحان سے ہر ایک شخص مطمئن ہو گیا تھا۔

(INDIAN INHERITANCE P-39)

نہ تھیں اس لیے لوگوں نے ان سے دوسری شادی کا مطالبہ کیا لیکن اس مطالبہ پر رام پہلی بار لوگوں کے بالمقابل کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے کہا، ایسا نہ ہوگا سیتا میری بیوی ہے اس لیے سیتا کی قائم مقامی کے لیے ان کا سونے کا اسٹیچو تیار کیا گیا تاکہ رسم پوری کی جاسکے۔ عظیم رشی شاعر والمیکی اپنے دونوں شاگردوں لو اور کشن کے ساتھ جو رام کے انجانے بیٹے تھے آئے۔ رام اور ان کے بھائی اپنے تمام سرداروں کے ساتھ اور عوام کے ساتھ شریک ہوئے۔ بہت بڑا مجمع ہوا۔ والمیکی کی ہدایت کے تحت لو اور کشن نے رام کی زندگی کے واقعات گائے۔ انھوں نے اپنی موہنی آواز اور صورت سے مجمع کا دل موہ لیا۔ غریب رام تقریباً پاگل ہو رہا تھا اور جب (ڈرامے میں) سیتا کے جلاوطن کیے جانے کا منظر آیا تو رام کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے، تب رشی نے اُن سے کہا غم نہ کرو! میں سیتا تمھیں دکھادوں گا۔ سیتا اسٹیج پر لائی گئیں اور رام اپنی بیوی کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ اچانک پرانی آوازیں پھر اٹھیں امتحان! امتحان! غریب سیتا اپنی عزت کے متعلق بار بار کی ظالمانہ توہین سے اس قدر دکھی ہوئیں کہ وہ اسے برداشت نہ کرسکیں۔ اس نے دیوتاؤں سے درخواست کی وہ اس کی عفت وپاکبازی کی گواہی دیں، زمین پھٹی اور سیتا چلائی، یہاں ہے امتحان! اور زمین میں سما گئیں اور رام غم میں ڈوب گئے[1]

---

[1] بے خطا اور پاک باز سیتا کے جلاوطن کیے جانے کے واقعہ کو جس کا انجام اس المیہ پر ہوا کچھ اہل علم جمہوریت کا مثالی نمونہ قرار دیتے ہیں لیکن کچھ دوسرے لوگ اس واقعہ کو صنف نازک پر ظلم سے تعبیر کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ہندو دھرم)

سیتا کے غائب ہونے کے چند ہی روز بعد دیوتاؤں کی طرف سے ایک پیامبر آیا جس نے بتایا کہ زمین پر اُن کا مشن ختم ہو چکا ہے اور انھیں اب آسمان پر واپس آنا ہے وہ سرجو ندی میں جیان کی راجدھانی کو چھوتی ہوئی بہتی تھی کود گئے اور دوسری دنیا میں سیتا سے جا ملے۔

(The Indian Inheritance) p. 39, 40, 41 (ج ۱)

گویا والمیکی نہ صرف یہ کہ اس قصہ کا ایک جزء ہیں، بلکہ انھوں نے یہ قصہ رام اور اُن کے بھائیوں کو سنا کر اُن سے خاموش تصدیق بھی کرا لی۔

والمیکی راماین کی دوسری اہمیت اُس کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ والمیکی نے یہ پورا قصہ نارد مُنی سے جو تینوں لوکوں (دنیاؤں) کا علم رکھتے ہیں، سنا ہے پھر دنیا کو پیدا کرنے والے برہما نے خود آ کر ان کے یہاں آ کر انھیں راماین لکھنے کا حکم دیا اور ان سے وعدہ کیا اُن سے قصہ کا کوئی پہلو چھپا نہ رہے گا نہ اُن کے منہ سے جھوٹ نکلے گا۔

(والمیکی راماین۔ بال کانڈ)

اس اہمیت و فضیلت کے باوجود والمیکی راماین ہندو عوام میں زیادہ مقبول نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سنسکرت میں ہے اور سنسکرت کبھی بول چال کی زبان نہیں رہی ہے۔ اس کے برعکس تلسی داس کی راماین جو بعد میں لکھی گئی بھاشا میں ہونے کے باعث بہت زیادہ مقبول ہوئی اور اب عام طور پر اُسی کا پاٹھ ہوتا ہے۔ گاندھی جی جیسے لوگ بھی اس کی عظمت و افادیت کے بے پناہ معتقد ہیں لیکن سوامی دیانند سرسوتی اسے جال گرنتھ اور قابلِ ترک کتب میں شمار کرتے ہیں۔

(ستیارتھ پرکاش باب ۳ صفحہ ۹۱)

تلسی داس کی راماین پر دوسرے ہندوؤں کو بھی اعتراض ہے۔ گاندھی جی ان اعتراضات کا خلاصہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"کیا آپ یہ نہیں دیکھتے کہ کس طرح تلسی داس نے عورتوں کی صنف کی تحقیر کی ہے۔ والی کے خلاف رام کے خلاف مردانگی حملے کی مدافعت کی ہے۔ وبھیشن کی، اپنے ملک سے غداری کی تعریف کی ہے اور رام کو اوتار بتایا ہے۔ حالانکہ انھوں نے سیتا کے ساتھ کھلی ناانصافی کی ہے۔"

(ہندو دھرم صفحہ ۳۳)

گاندھی جی نے آخری تین اعتراضات کا جواب دیا لیکن پہلے اعتراض کا انھوں نے صفائی سے اعتراف کر لیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ تلسی داس نے غیر ارادی طور پر جیسا کہ میرا خیال ہے، عورتوں کی صنف کے ساتھ زیادتی[۱] کی ہے۔ اس معاملہ میں، متعدد دوسرے معاملات کی طرح وہ اپنے دور میں پائے جانے والے نظریات سے اوپر اٹھنے میں ناکام رہے ہے۔" (ہندو دھرم ص۳۴)

ہزاروں اور کچھ دوسرے ہندو انھیں امور کے باعث تلسی داس کی رامائن کو پسند نہیں کرتے اور وہ اس پر والمیکی رامائن کو ترجیح دیتے ہیں لیکن ہمیں اس پہلو سے دونوں رامائنوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ والی، وبھیشن اور سیتا کے واقعات دونوں میں موجود ہیں۔ اس لیے اگر ان پر کسی کو اعتراض ہے تو یہ اعتراض دونوں رامائنوں پر ہوتا ہے۔ رہا شودر اور عورت کو پیٹے جانے والا دوہا تو بلاشبہ یہ والمیکی رامائن میں نہیں ہے لیکن اس کے نہ ہونے

---

[۱] اشارہ ہے اس دوہے کی طرف جس میں کہ ڈھول، شودر، احمق اور عورت کو پیٹے جانے کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ گاندھی جی نے ایک موقع پر صراحت سے اس کا ذکر کیا ہے۔ (ہندو دھرم ص۱۳۶)

سے عورتوں کی صنف کو جو فائدہ بھی پہنچ جائے، شودروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا کیوں کہ شودروں کا مقام والمیکی رامائن میں بھی اونچا نہیں ہے۔ والمیکی رامائن میں یہ قصہ موجود ہے کہ ایک عابد وزاہد شودر کو رام نے صرف شودر ہونے کی بنا پر قتل کر دیا کہ شودر کے عابد وزاہد ہونے سے دنیا میں تباہی آجائے گی۔
(اتر کانڈ)

مندرجہ بالا اعتراضات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہمارے نزدیک سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ان رامائنوں میں رام کو کیا مقام دیا گیا ہے۔ تلسی داس کی رامائن میں تو صاف وصریح الفاظ میں انھیں خدا کا اوتار بتایا گیا ہے یعنی خدا رام کے روپ میں خود دنیا میں آیا۔ والمیکی رامائن کے بارے میں بعض حلقوں میں یہ مشہور ہے کہ اس میں رام کے اوتار ہونے کا ذکر نہیں ہے لیکن کیا اس پہلو سے دونوں رامائنوں میں کوئی خاص فرق ہے؟ چندر شیکھر آزر فرماتے ہیں:

"اس امر میں مشکل ہی سے کسی شبہ کی گنجائش ہے کہ والمیکی کا مقصد یہی ہے کہ وہ رام کو اوتار کی حیثیت سے پیش کریں۔ کتاب کے آغاز ہی میں ہم اس واقعہ کا ذکر پاتے ہیں کہ دیوتاؤں نے مجتمع ہو کر شری مہا وشنو سے درخواست کی کہ وہ راکشش راون کو ہلاک کرنے کے لیے دسرتھ کے بیٹے یا بیٹوں کے روپ میں زمین پر اوتار لینے کا فیصلہ کریں۔ اس باب کو یہ کہہ کر رد کر دینا آسان نہیں ہے کہ یہ بعد کا اضافہ ہے۔ کیوں کہ یہ قصہ راجہ دسرتھ کی جانب سے کیے گئے اشومیدھ یگیہ کا لاینفک جزء[1] ہے راون کے مارے جانے اور جنگ سے جیتے جانے کے بعد تمام

---

[1] یہاں اوتار ہونے کے کئی اور ثبوت ہیں۔ طوالت کے خوف سے ہم انھیں حذف کرتے ہیں۔

دیوتا برہما کی قیامت میں برسرِ موقع آ موجود ہوتے ہیں تاکہ اس فتح پر دھن باد دے سکیں وہ صاف و صریح الفاظ میں کہتے ہیں کہ رام نارائن جو خبیث راون سے دنیا کو نجات دلانے کے لیے دنیا میں نازل ہوئے۔"

(The Indian Inheritance) . p. 29 - 30)

ہمارے سامنے اس وقت والمیکی رامائن کا اصل سنسکرت نسخہ نہیں البتہ اس کا ہندی ترجمہ موجود ہے اور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم چندر شیکھر آئر کی تائید و تصدیق پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔

رہی رامائن کی تاریخی حیثیت تو گیتا کی طرح اس میں بھی ہندو اہل علم کی دو رائیں ہیں۔ گاندھی جی فرماتے ہیں:

"ہمارے لیے مہابھارت اور رامائن دونوں تاریخی کتاب ہونے کے بجائے مذہبی کتاب ہیں یا اگر انہیں ہم تاریخی کہیں تو وہ روح کی تواریخ ہے۔ ہزاروں سال پہلے جو کچھ ہوا ہے وہ اس کا بیان نہیں ہے بلکہ مہابھارت اور رامائن دونوں میں اس چیز کی تصدیر ہے جو ہر انسانی سینہ میں آج جاری ہے۔ اس جنگ کا بیان ہے جو روزانہ دیوتاؤں اور راکھشسوں، رام اور راون کے درمیان ہوتی ہے" (ہندو دھرم۔ صفحہ ۱۴۸)

شرک کے رجحانات اور اُس کا فلسفہ

یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ ہندو مت کے ماخذ کیا کیا ہیں۔ اب ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ وید، اپنشد، منوسمرتی، پران، گیتا اور رامائن میں جو ہندو مت کے ماخذ ہیں شرک کے رجحانات ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو اس کا فلسفہ اور اس کی توجیہ کیا ہے۔ اگلے باب میں ہم توحید کے

رجحانات اور ان کے حامل فرقوں کا تذکرہ کریں گے۔

سب سے پہلے وید اور ویدک عہد کو لیجئے۔ ڈاکٹر تارا چند ویدک دور کے معتقدات دیوتاؤں، مذہب اور مذہبی رسوم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ویدک نظریہ کا تاریخی مواد کچھ بھی ہو، وہ اپنی پختہ شکل میں ایک عمدہ فلسفیانہ سسٹم ہے، اس سسٹم میں ایک بالاتر ہستی، آخری حقیقت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ وہ ایک دائیم شخصیت (پرش) خالق (وشو کرمنٹر) پرجاپتی، واجب الوجود برہما نٹر ماورا ادراک، محیطِ کل، عالمِ کل، اخلاقی قانون کی بنیاد اور عالمی نظم کو قائم کرنے والا ہے۔ وہ باپ ہے، کائنات کا قوام ہے۔ دستگیر ہے اور خواہشات کا پورا کرنے والا ہے۔"[1]

(Influence of Islam on Indian culture), p. 2)

معلوم ہوا کہ ویدک دور میں ایک خدائے بالاتر و برتر کا تصور موجود تھا جو ساری کائنات کا خالق و مالک مانا جاتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اللہ کا تخیل موجود تھا۔

کائنات کی تخلیق کے متعلق ویدک نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر تارا چند فرماتے ہیں:

"خدا دنیا کو کیسے پیدا کرتا ہے؟ اس سلسلہ میں ویدک لٹریچر میں متعدد بیانات ہیں۔ کبھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کائنات مشینی تخلیق کا نتیجہ ہے۔ کبھی وہ قربانی کا پھل ہوتا ہے۔ پُرش بہ نفسِ نفیس

---

[1] ڈاکٹر صاحب نے ان صفات کے لیے رگ وید کے حوالے دیے ہیں جو طوالت کے خوف سے ہم نے حذف کر دیے ہیں۔

قربان ہوتا ہے اور اس کے اعضاء سے کائنات کے اجزا بنتے ہیں۔ زیادہ فلسفیانہ انداز میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ تخلیق ایک سلسلہ ہے۔ معدوم (است) سے موجود (ست) کا ارتقاء ہے ابتداء میں وجود و عدم وجود دونوں معدوم تھے۔ ایک تاریک خلا تھا خدائے واحد اس خلا میں خاموشی کے ساتھ سانس لیتا تھا تب اس کے اندر خواہش پیدا ہوئی۔ یہ وجود اور عدم وجود کی سرحد تھی اور ساری تخلیق کا سبب بنی ہے لیکن وہ بیان جو عوام میں زیادہ مقبول ہوا یہ تھا کہ قدیم موجود ہستی نے پانی پیدا کیا جس کے اندر طلائی انڈا تیرتا تھا۔ وہ اس کے اندر داخل ہو گیا اور اس سے پہلی مخلوق برہما کی شکل میں پیدا ہوئی۔ تب برہما نے دیوتاؤں، جنت، زمین، آسمان، سورج، چاند، کائنات اور انسان کو پیدا کیا۔"

(صفحہ ۲، ۳)

ویدک دور میں قربانی کی بڑی اہمیت تھی۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قربانی کائنات کے اس نظم کی علامت ہے وہ پرجاپتی کی طاقت کا ذریعہ بھی ہے کیونکہ جب پرجاپتی تخلیق کرنے میں قوت کھو دیتا ہے تو دیوتا اس کی قدیم طاقت کو قربانی کے ذریعے از سر نو واپس لے آتے ہیں۔ قربانی کے ذریعے دیوتا بارش، طوفان اور سورج کے طلوع کے سلسلہ میں اپنی سرگرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس طرح قربانی وہ ہتھیار ہے جس کے ذریعہ خدا کا ارادہ تکمیل پاتا ہے۔"

(صفحہ ۔ ۳)

ویدک دور کے دیوتاؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں:

"ویدوں میں دیوتا تخلیق کی اولین پیداوار ہیں۔ یہ فطرت کی نیم مجسم

طاقتیں ہیں، ان کے اعمال میں بہت کم فرق کیا جاتا ہے اور اس لیے یہ آسانی سے دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ لیکن بعد کے زمانے میں ان کی شخصیتیں زیادہ متعین ہو گئیں، ویدک دیومالا میں ایسے دیوتا شامل ہیں جو آسمان میں رہتے ہیں یا فضاء میں یا زمین پر، ان کا شمار ۳۳ ہے، لیکن جن دیوتاؤں کی شان میں ویدوں کے زیادہ منتر ہیں ان میں اندر، اگنی، سوم زیادہ بڑے شمار ہوتے ہیں ورن سب سے اونچا مانا جاتا ہے۔ پرجاپتی تخلیق کا دیوتا شمار ہوتا ہے۔ وشنو اور رودر شیو کو معمولی اہمیت دی گئی تھی۔ قدیم تر دیومالائی نظم میں برہما خالق مہربانی کرنے والا اور سب کا جدِ امجد ہونے کی حیثیت سے سب دیوتاؤں کا صدر تھا اور اگنی، یم، ورن، کبیر اور اندر سے سب سے زیادہ دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ بعد کے زمانے میں شیو اور وشنو کو غالب پوزیشن حاصل ہو گئی اور انھوں نے برہما کے ساتھ مل کر عظیم تثلیث قائم کر لی۔" (صفحہ ۵)

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوئی کہ وید ایک سے زائد (۳۳) دیوتاؤں کا قائل ہے۔ جن میں برہما خالق ہے اور باقی دیوتا مختلف امور سے متعلق ہیں اور برہما سمیت سب دیوتا مخلوق ہیں۔ سوامی شرد انند ذرا تفصیل میں جاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"دوسری بات یہ ہے کہ رگ وید کے رشی کائنات کے بارے میں یہ نقطۂ نظر رکھتے تھے کہ اس میں وجود کی تین کی مختلف دنیائیں ہیں۔ سب سے بلند دیولوک یا سماوی و ملکوتی دنیا ہے۔ دوسرا انتر کشا لوک ہے جو درمیانی خلا کی دنیا ہے اور تیسرا بھور لوک یا عالمِ سفلی ہے۔ ان تینوں دنیاؤں میں تین سردار دیوتا ہیں۔

ساوتری یا سوریہ (سورج) ملکوتی دنیا کا خدا ہے۔ اندر یا وایو (ہوا) درمیانی خلا کا خدا ہے اور اگنی (آگ) عالمِ سفلی کا خدا ہے۔ یہ تین خدا پھر ضرب پا کر تینتیس ۳۳ خدا بن جاتے ہیں۔ ہر دنیا میں گیارہ خدا[1]۔ رگ وید اور دوسرے ویدوں میں بے شمار عبادتیں ہیں جو تینتیس ۳۳ دیوتاؤں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ست پاتھ براہمن کے مطابق ان میں آٹھ واسو ہیں۔ گیارہ رودر ہیں۔ بارہ آدتیہ ہیں اور دیو (آسمان) ہے اور پرتھوی (زمین)[2] ہے۔

آٹھ واسو یہ ہیں :

دھاو، دھرو، سوم، آپ، آگل، انل، پرتیوش، پربھاس۔

بارہ آدتیہ یہ ہیں :

دھاتری، متر، آریامن، رودر، ورن، سوریہ، بھاگ، ودسوت، پوشنتر، ساوتری، توشتری اور وشنو۔

گیارہ رودروں کے نام واضح طور پر ویدوں میں بیان نہیں کیے گئے ہیں لیکن یجر وید اور تیتریا آرنیک میں مختلف مواقع پر ان کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ہم ان گیارہ رودروں کے نام مہابھارت سے[3] لیتے ہیں۔ یعنی :

ہرگ ویاد، سرپ، نیرتی، اجے کپاد، اہر بودھن، پناکن، دھن، ایشور[4]، کپالن، استھالا اور بھاگ۔

یہ تینتیس ۳۳ دیوتا پھر بڑھ کر تین ہزار تین سو انتالیس (۳۳۳۹) دیوتا بن جاتے ہیں جیسا کہ ہم رگ وید[5] میں پڑھتے ہیں۔

اس کے بعد یہ تعداد بڑھ کر تینتیس کروڑ تک پہنچ جاتی ہے جس

---

[1] رگ وید ۱، ۱۳۹، ۱۲ [2] ست براہمن ۴، ۵، ۷، ۲ [3] مہابھارت ۲۰۱
[4] معلوم ہوا کہ ایشور خالقِ کائنات کے ہم معنی نہیں بلکہ ایک دیوتا کا نام ہے۔ [5] رگ وید ۳، ۹، ۹

سے کے معنی یہ ہیں کہ دیوتاؤں کی بے شمار تعداد زندگی اور فطرت دونوں پر حکومت کر رہی ہے، لیکن یہ بنیادی تصور کہ ایک خدا ارتقا کر کے تین بن گئے۔ پھر تینتیس اور پھر روحانی قوت کے لاتعداد پہلوؤں میں تبدیل ہو گئے، نظر سے کبھی اوجھل نہیں ہوا۔"

(The Cultural Heritage of India) ، ۹-۸-۹)

ایک سے تین، تین سے تینتیس، تینتیس سے تین ہزار تین سو انتالیس اور تین ہزار تین سو انتالیس سے تینتیس کروڑ دیوتاؤں کے وجود میں آنے کا یہ نظریہ کثرت میں وحدت پا لینے کا نظریہ ہے چنانچہ سوامی شروا نند اس کے فوراً بعد فرماتے ہیں:

"ہندوستانی رشیوں نے قدیم ترین زمانے ہی سے بہتوں میں ایک کے وجود کو تسلیم کرنے کی یکتا حقیقت پائی تھی۔" (صفحہ ۹)

بعض مشہور ترین ویدک دیوتاؤں کا ذکر کرتے ہوئے سوامی شروا نند فرماتے ہیں:

"رگ وید کے سب سے اعلیٰ منتر، مترا اور وُرن کی شان میں ہیں۔ مترا روشنی کی علامت ہے اور وُرن کا دیوتا شمار ہوتا ہے اور وُرن گہرے نیلے آسمان کا۔ ان دو دیوتاؤں کو خطاب کر کے جو حسین منتر (ویدوں میں) کہے گئے ہیں۔ اُن میں سے چند نمونے یہ ہیں:

"اے مترا اور وُرن تم قادر ہو اور (پرستاروں کی) طاقت بڑھاؤ۔ تم تین ملکوتی دنیاؤں کے مالک ہو۔ تین چمکنے والی دنیاؤں کے مالک ہو اور تین سفلی دنیاؤں کے، اے مترا اور وُرن! تمہارے ہی حکم سے گائے دودھ دیتی ہے۔ دریا شیریں پانی دیتے ہیں اور تین چمکتے ہوئے دیوتا (اگنی، وایو اور آدتیہ) بارش کو لاتے

اور برسانتے ہوئے باقی رہتے ہیں" (صفحہ ۱۰)

"آدیتہ دیوتاؤں میں اہمیت کے اعتبار سے دوسرا خدا ساوِتری یا سورج ہے۔ سورج کو بسا اوقات زریں ہاتھ رکھنے والا بتایا جاتا ہے۔ جس کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ ایک چلتی ہوئی گاڑی پر بیٹھا ہے جس کا ایک پہیہ ہے اور اس میں سات گھوڑے جُتے ہوئے ہیں۔ اس دیوتا کو زندگی، دولت اور قوت کا عظیم داتا خیال کیا جاتا ہے، لیکن ورن، مترا اور دوسرے دیوتاؤں کی طرح سوریہ یا ساوِتری کا تصور بھی تکمیل پا کر ایک ماورائی اصول کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جیسا کہ درجِ ذیل گائتری[1] منتر سے واضح ہوتا ہے۔" ہم اُس ساوِتری (سورج) کے عظیم و تاباں نور کا مراقبہ کرتے ہیں ہمارے ذہن کو وہ اپنی طرف متوجہ کرلے[2]" اس منتر میں رشی اس بات کو واضح کرتا ہے کہ وہ بنیادی ہستی ایک ہی ہے جو آسمان میں نور بن کر چمکتی ہے۔ اور ذہن و فکر بن کر انسان میں۔ یہ منتر سفید یجر وید (۳، ۳۵) اور سام وید (۲، ۸، ۱۲) میں بھی پایا جاتا ہے اور اُوپر کی تین جاتیوں (برہمن، چھتری اور ویش) میں مراقبہ کے لیے مقدس ترین منتر مانا جاتا ہے[3]"

(صفحہ ۱۱)

"گائتری منتر" کے اندر خود ساوِتری کا لفظ موجود ہے۔ اس لیے یہ بالکل ظاہر ہے کہ اس منتر میں سورج دیوتا ہی سے خطاب ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن فرماتے ہیں:

---

[1] رگ وید، ۵، ۶۹، ۱، ۲۔ [2] گائتری منتر وید کا سب سے مقدس اور سب سے اہم منتر مانا جاتا ہے اس کا ورد ویدک دھرم کا سب سے اہم ذکر ہے۔ [3] رگ وید، ۳، ۶۲، ۱۰

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"گائتری منتر" ایک دعا ہے، جس کا خطاب ساوتری" یعنی سورج سے ہے جو کائنات کا ذریعہ اور اس کا محرک خیال کیا گیا ہے۔ تمام صداقت علامتی ہے، سورج، جو روشنی اور زندگی کا بلا واسطہ ذریعہ ہے۔ وہ الوہیت کی فطرت کو کسی خیالی علامت سے زیادہ واضح کرتا ہے وہ خدائی طاقت کا سب سے زیادہ محسوس مظاہرہ ہے۔"

(ریلیجین اینڈ سوسائٹی صفحہ ۱۳۵)

لیکن سوامی دیانند سرسوتی اس منتر کو پرمیشور (خدا) سے متعلق کرتے ہیں اور اس کی تشریح بہت لمبی چوڑی کرتے ہیں (ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش، باب ۳ صفحہ ۵۰ تا ۵۲)

دیوتاؤں اور ان سے متعلق منتروں کا ذکر کرنے کے بعد سوامی شروانند لکھتے ہیں:

"رگ وید اور دوسرے سمہتاؤں سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیوتاؤں اور دیویوں کا تصور، جو متعین روحانی شخصیتیں تھیں، جن کی صورتیں اور شکلیں تھیں اور جو فطرت کی تنظیم میں مختلف اعمال انجام دیتی تھیں ایسے دیویوں اور دیوتاؤں کا تصور لوگوں میں لازماً موجود تھا، کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو یہ کہتے تھے کہ انھوں نے واقعتاً دیوتاؤں کی شکلیں دیکھی ہیں، لیکن کچھ دوسرے لوگ تھے جو ان کی مادی شکلوں پر یقین نہ رکھتے تھے، نہیں، کچھ ایسے بھی تھے جنھیں دیوتاؤں کے وجود ہی میں شک تھا۔ پھر دیوتاؤں اور دیویوں کو کامل شکل میں دیکھنے کا تصور بھی موجود تھا۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل بہت سے

۴؎ اگرچہ شتسے جو سنسکرت شودروں کے لیے اس کا ورد منع جاتا ہے لیکن ڈاکٹر رادھا کرشنن اسے عام کرنے کا مشورہ دیتے ہیں (RELIGION AND SOCIETY. P.136)

رشیوں کے ذہن میں یہ تصور پا چکے ہیں۔ ان میں کچھ اس بلندی تک پہنچ گئے جو سر چکرا دینے والی ہے یعنی ایک ماوراء ہستی تک اور وہ کل کائنات کے پیچھے خدائی طاقت یا روحانی ہستی کی وحدت کو پا گئے۔ کچھ رشی یہ خیال کرتے تھے کہ کل کائنات ایک جسمانی وحدت ہے اور تخلیق کے مختلف پہلوؤں کو وہ عالمی وحدت کے اجزا خیال کرتے تھے، کچھ اور ٹائپ کے لوگ بھی تھے جو پورے انسانی سماج کو ایک ہستی میں ڈھال دیتے جسے وہ پرش کہتے تھے۔" (صفحہ ۱۴)

سی، چھنن راجہ[1] اپنے مقالے (The Vedic Culture) میں فرماتے ہیں:

"ویدک آریوں کا مذہب بنیادی طور سے کثرت پرستی و شرک کا تھا۔ جیسا کہ وہ ہندو مذہب کے آخری مراحل میں تھا۔ ویدک آریہ بہت سے دیوتاؤں کو پوجتے تھے۔ اس شرک کے ساتھ ساتھ ہم توحید کا انتہائی تصور بھی پاتے ہیں۔ رگ وید کی یہ عبارت "اکم سد وپرا، بہدا ودنتی (رگ وید، ۱، ۱۶۴، ۴۶)

صداقت ایک ہے، رشی اسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں" ہندوستانی فلسفہ کی پوری تاریخ میں ہندوستانی توحید کی بنیاد رہی ہے۔"

(The Culture Heritage of India) P.24-25)

سوامی دیانند سرسوتی جو بت پرستی کے سخت مخالف اور شرک کے بالمقابل توحید کے علمبردار ہیں۔ مختلف دیوتاؤں اور ان کے ناموں کو خدائے واحد کی

---

[1] ریڈر اینڈ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ آف سنسکرت مدراس یونیورسٹی۔

صفات قرار دیتے ہیں۔ ستیارتھ پرکاش باب اول میں انھوں نے خدا کے سو نام[1] لکھے ہیں۔ اس بحث کے ابتدائی حصہ میں وہ لکھتے ہیں :

"اس قسم کے حوالوں سے صحیح معنی معلوم ہو جائیں گے اور آپ جان لیں گے کہ ان ناموں سے پرمیشور ہی مراد ہے۔ کیونکہ اوم اور اگنی وغیرہ ناموں کے خاص معنی پرمیشور ہی ہیں۔ لیکن اوم تو صرف پرمیشور ہی کا نام ہے اور اگنی وغیرہ ناموں سے پرمیشور کے معنی لینے میں موقع اور صفت دونوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جہاں حمد و ثنا، دعا، پرستش، ہمہ دانی ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا، پاکیزگی، ابدیت اور خالقیت وغیرہ اوصاف لکھے ہیں وہاں ان ناموں سے پرمیشور مراد ہے اور جہاں ایسا موقع ہے جیسا کہ اُن منتروں میں وہاں وارٹ پرش، دیو آکاش، وایو، اگنی، جل، بھومی وغیرہ اشیائے مادی کے نام ہیں۔ کیوں کہ جہاں پیدائش، قیام، فنا، الپگیا، بے جان دکھائی دینے والے اوصاف لکھے ہیں وہاں پرمیشور سے مراد ہرگز نہیں۔ کیوں کہ وہ پیدا ہونے والے کرم (فعل) سے بری ہے" (صفحہ ۱۷، ۱۸)

لیکن ویدوں میں متعدد دیوتاؤں کا وجود ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کسی تاویل و توجیہ سے انکار ممکن نہیں۔ چنانچہ سوامی دیانند ستیارتھ پرکاش کے ساتویں باب "ایشور اور وید کا بیان" کے آغاز ہی میں لکھتے ہیں :

سوال : ویدوں میں جو بہت سے دیوتا لکھے ہیں، ان کا مطلب کیا ہے ؟

جواب : دیوتا اوصاف الٰہی سے متصف ہونے کی وجہ سے دیوتا کہلاتے

---

[1] مترجم کی صراحت کے مطابق ان میں ایک نام شِو مکرّر ہے اس طرح ننانوے نام ٹھہرے۔

ہیں مثلاً زمین، لیکن اس کو کہیں ایشور کے مانند معبود نہیں مانا۔ اسی منتر میں لکھا ہے کہ وہ ایشور جاننے اور عبادت کیے جانے کے لائق ہے کہ جس میں سب دیوتا قائم ہیں جو لوگ لفظ دیوتا کے معنی ایشور سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ پرمیشور دیوتاؤں کا دیوتا ہونے سے مہادیو اسی لیے کہلاتا ہے کہ وہی سارے جہان کی پیدائش قیام اور فنا کا موجب، مصنف اور مالک ہے جو ۳۳ دیوتاؤں کا ثبوت ویدوں میں ہے، اس کی تشریح شت پتھ برہمن میں کی ہے۔ یہ ۳۳ وجود مذکورہ بالا اوصاف سے متصف ہونے کی وجہ سے دیوتا کہلاتے ہیں۔ ان کا مالک سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے پرماتما چونتیسواں دیوتا پرستش کے قابل، شت پتھ کے چودھویں کانڈ (باب) میں صاف لکھا ہے، اسی طرح اور جگہ بھی لکھا ہے اگر لوگ ان شاستروں کو دیکھتے تو ویدیں بہت سے ——— ایشور ہونے کے مغالطے میں پڑھ کر کیوں غلطی کھاتے۔" (صفحہ ۲۲۹، ۲۳۰)

جہاں تک ہمیں معلوم ہے، وید میں بہت سے ایشور (خدائے اعظم) ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں۔ سوال یہ ہے کہ پرمیشور کے ساتھ اور چھوٹے بڑے دیوتا ہیں یا نہیں؟ ویدوں سے تینتیس ۳۳ دیوتا ثابت ہیں اور ان کا اعتراف سوامی دیانند نے بھی کیا ہے۔

سوامی ودیکانند (Hinduism of Vedas) (ویدوں کا ہندومت) میں فرماتے ہیں:

"(ویدوں کے) بالکل آغاز ہی میں ہم بہت ہی نرالا تصور پاتے ہیں۔ یہ منتر بہت سے دیوتاؤں کی تعریف میں گائے گئے ہیں۔ دیوتا جنھیں دیو، درخشاں ہستی کہا جاتا ہے۔ ان کی کافی تعداد

ہے، ایک کا نام اندر ہے، دوسرے کا ورُن، ایک اور متراہے
پرجنیہ ہے اور اسی طرح اور مختلف ومتعدد دیو مالائی اور مجازی عنصر ہیں
ایک دوسرے کے بعد، ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثال کے
طور پہ اندر ــــ رعد ــــ ناگ پر حملہ کرتے ہوئے جس نے بارش
کو نوعِ انسانی سے روک رکھا تھا تب وہ اپنی بجلی گراتا ہے ،
سانپ مارا جاتا ہے اور بارش پھوار کی شکل میں نیچے آنے لگتی
ہے۔ لوگ خوش ہوجاتے ہیں اور وہ چڑھاوے چڑھا کر اندر
کی پرستش کرتے ہیں۔ وہ ایک قربانی کی چتا بناتے ہیں، کچھ
جانوروں کو ذبح کرتے ہیں۔ ان کا گوشت سیخ پر بھونتے ہیں۔
اور یہ گوشت اندر کو نذر کر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک مقدس
درخت تھا جس کا نام سوم تھا۔ یہ درخت کون سا تھا آج کوئی
نہیں جانتا، وہ اب بالکل غائب ہو گیا ہے، لیکن کتابوں سے
جو کچھ معلومات ہمیں حاصل ہوئی ہیں وہ یہ ہیں کہ جب وہ کچلا جاتا
تھا تو ایک قسم کا دودھیا رس اس کے اندر سے نکلتا
جو جوش مارتا ہوتا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سوم رس نشہ آور ہوتا
ہے۔ اس رس کو آریہ اندر اور دوسرے دیوتاؤں پہ چڑھاتے
اور یہ دیوتا خود بھی اس رس کو پیتے تھے۔ بعض اوقات آریہ اسے
کچھ زیادہ پی جاتے تھے اور اسی طرح ان کے دیوتا بھی، اندر بھی
بعض اوقات نشہ میں پایا گیا۔ ایسی عبادتیں بھی ہیں جن سے معلوم
ہوتا ہے کہ اندر نے ایک دفعہ سوم اتنا زیادہ پی لیا کہ وہ بہکی بہکی
باتیں کرنے لگا۔ ایسا ہی معاملہ ورُن کا ہے، وہ دوسرا دیوتا ہے
بہت طاقت ور، اسی طرح اپنے پرستاروں کی حفاظت کرنے
والا، آریہ اس دیوتا کی تعریف کرتے ہیں اور اس پر سوم رس چڑھاتے!

اسی طرح جنگ کا دیوتا ہے اور اس طرح اور دوسرے دیوتا ہیں لیکن وہ مقبولِ عام اور جاذب توجہ تصور، جو ویدی سمتا ؤں کی دیو مالائیت کو دوسری دیو مالا ئیتوں سے بالکل مختلف کر دیتا ہے، وہ ایک لامحدودیت کا تصور ہے ـــــ مثال کے طور پر اندر کو لیجئے بعض کتابوں میں آپ پائیں گے کہ اندر کے جسم ہے وہ بہت قوی ہے۔ بعض اوقات زرین زرہ بکتر پہنے ہوتا ہے۔ اتر کر نیچے آتا ہے، اپنے پرستاروں کے ساتھ کھاتا پیتا ہے ۔ راکششوں کے ساتھ جنگ کرتا، سانپوں سے لڑتا اور اسی طرح کے دوسرے کام کرتا ہے۔ پھر ہم ایک اور منتر میں یہ پاتے ہیں کہ اندر کو بہت اونچا مقام دے دیا گیا ہے۔ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، قادرِ مطلق ہے، ہر ہستی کے دل پر اس کی نظر ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ ورُن کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم دوسرے دیوتاؤں کی بہت سی مثالیں دے سکتے ہیں، یہ سب یکے بعد دیگرے آتے ہیں، ایک ہی قسمت میں شرکت کے لیے۔ یہ شروع شروع میں صرف دیوتا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد "وجود" کے تصور تک انھیں اونچا اٹھا دیا جاتا ہے، وہ وجود جس کے اندر پوری کائنات موجود ہے۔ جو ہر ایک کے دل کو دیکھتا اور کائنات کا حاکم ہے، ورُن کے معاملہ میں ایک اور تصور بھی موجود ہے۔ جو ایک ایسے تصور کے برابر ہم پر آیا لیکن آرین ذہن نے اسے فوراً ہی دبا دیا۔ یعنی خوف کا تصور۔ دوسری جگہ ہم پڑھتے ہیں کہ وہ خائف ہیں کہ انھوں نے گناہ کیا ہے اور ورُن سے معافی کے خواستگار ہیں۔ ان تصورات کو ان اسباب کے تحت جنھیں آپ بعد میں سمجھیں گے ہندوستانی سرزمین پر پنپنے کی کبھی اجازت

نہیں دی گئی ۔ یہ تصور جیسا کہ آپ جانتے ہیں، توحید کا تصور[1] ہے، یہ تصور توحید، ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں بالکل ابتدائی دور میں آیا۔ وید سمہتاؤں کے اوّلین اور قدیم ترین حصّہ میں یہ موحدانہ نقطۂ نظر پایا جاتا ہے، لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ تصور آریوں کے لیے تشفی بخش ثابت نہ ہوا۔ انھوں نے اسے ابتدائی تصور سمجھ کر، جیسا کہ وہ فی الواقع ہے، ایک طرف پھینک دیا اور آگے بڑھ گئے ۔ یہ تصور آریوں کے نزدیک غیر مفید اور فلسفیوں اور مفکروں کے ناقابل قرار پایا اور انھوں نے اس بات کے لیے سخت جدوجہد کی کہ زیادہ فلسفیانہ اور کامل و ماورائی تصور پاسکیں ۔ ایک خدا کی تعریف کی جاتی ہے اور ایک زمانے تک کہا جاتا ہے کہ دوسرے تمام دیوتا اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں اور وہی دیوتا جسے ورُن کی بدولت رفعت نصیب ہوئی تھی دوسری کتاب میں بلند ترین مقام تک بلند ہو جاتا ہے۔ باری باری تمام دیوتا شخصی خدا (پرسنل گارڈ) کا مقام اختیار کرتے ہیں (اس کی توجیہ کیا ہے ؟) اس کی توجیہ خود کتاب (وید) میں موجود ہے۔ یہ ایک عظیم توجیہ و تشریح ہے جو بعد کے تمام ہندوستانی افکار و نظریات کی اصل ہے اور جو تمام دنیائے مذاہب کی اصل بھی بنے گی۔ یعنی اکم سدو پرابہدا ودنتی۔ موجود ایک ہی ہے۔ رشی اسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔"

(HINDUISM , PP. 19 TO 24)

---

[1] یعنی یہ تصور کہ ایک ہی خدا مالکِ کائنات ہے اس سے خوف کھانا چاہیے اور اس سے گناہوں کی معافی طلب کرنا چاہیے۔

مندرجہ بالا طویل اقتباس سے حسب ذیل اہم نتائج سامنے آتے ہیں :

۱ : وید میں ابتداءً توحید کا تصور تھا، لیکن اسے ناقص اور غیر مفید سمجھ کر ترک کر دیا گیا۔

۲ : وید میں بہت سے دیوتاؤں کا ذکر ہے۔ ان میں سے ہر دیوتا ایک موقع پر محدود، مادی جسم رکھنے والا اور محدود اختیارات کا حامل ہوتا ہے لیکن دوسرے موقع پر وہ لامحدود، حاضر وناظر، قادرِ مطلق اور علیم وخبیر ہوتا ہے اور دوسرے دیوتا اس کی اطاعت کرتے ہیں۔

۳ : اس کی توجیہ وحدت الوجود کے نظریہ سے ہوتی ہے، موجود صرف ایک ہے، لوگ اسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ وحدت الوجود کے اس تصور نے توحید کی جگہ لے لی اور یہی نظریہ بعد کے تمام ہندوستانی نظریات وافکار کی اساس وبنیاد بنا۔

سوامی وویکانند نے ٹھیک ہی فرمایا۔ بے شمار دیوتاؤں کو ماننے اور پوجنے کے ساتھ توحیدِ خالص کا تصور کس طرح پنپ سکتا تھا، توحید اور شرک ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ایک کا غلبہ دوسرے کے خاتمے کے مترادف ہے۔ چنانچہ یہی ہوا، شرک کے غلبہ نے توحید کو ختم کر دیا اور اس کی جگہ وحدت الوجود کے پُرپیچ فلسفیانہ نظریہ نے جنم لیا، جو شرک سے نہ صرف یہ کہ مصالحت کر سکتا تھا بلکہ اس کے لیے اساس وبنیاد بننے کی اہلیت بھی رکھتا تھا۔ ہر چیز خدا ہے اس لیے کسی بھی چیز کی پرستش کی جا سکتی ہے۔ ہر چیز خدا ہے اس لیے ہر چیز کی پرستش عین خدا کی پرستش ہے۔ یہ تھا اپنشد۔ ویدانت کا وہ شاندار اور عظیم فلسفہ جس نے ہندوستان میں شرک کی جڑیں مضبوط کر دیں۔

ڈاکٹر رادھاکرشنن فرماتے ہیں :

" ایک بنیادی فرق ہے اس عبادت میں جو بہت سے مستقل بالذات یا ایک دوسرے کی مخالف ہستیوں کی کی جائے اور ایسی

عبادت میں جو اُن ہستیوں کی کی جائے جو واحد پر ماتما کے مختلف پہلو شمار کیے جاتے ہوں۔ جس خدا کی بھی ہم پرستش کرتے ہیں وہ خدائے بالا و برتر کے ساتھ متحد ہے۔ ہندو مذہب کا خصوصی مفصدیت پرستی کی، مذہبی اسپرٹ کی ارتقاء کے ذریعے کے طور پر اجازت دیتا ہے۔ اس خدائے عظیم کی معرفت کے لیے جس کا اندر تمام موجودات میں موجود ہے۔"

(Religion and Society)   ، P.P. 122 - 23)

وحدت الوجود کا یہ تصور کیوں کر پیدا ہوا؟ ڈاکٹر رادھا کرشنن فرماتے ہیں:

"ویدک دھرم نے دراوڑوں اور ہندوستان کے دوسرے دیسی اور قدیم باشندوں سے اتنا زیادہ اخذ کیا ہے کہ اصل آرین عناصر کو دوسرے عناصر سے الگ کرنا سخت مشکل ہے۔ دوسرے مذاہب و مسالک کو اختیار کرنے کے اس رجحان کی رگ وید میں یہ نظری توجیہ پیش کی گئی ہے کہ حق ایک ہی ہے، اہلِ علم اسے مختلف ناموں اگنی، یم، ماترشون سے پکارتے ہیں۔ اپنشد بھی یہی راہ اختیار کرتے ہیں۔"

(Religion and Society) ، PP. 306 - 307)

ڈاکٹر تارا چند بھی اسی سے ملتے جلتے انداز میں توجیہ کرتے ہیں

(اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر صفحہ ۱۰)

اپنشد، جیسا کہ سوامی ویویکانند نے کہا، مختلف زمانوں میں لکھے گئے ہیں۔ بسا اوقات ان میں سے ایک ہی اپنشد میں پچاس مختلف قسم کی باتیں ہیں۔ خیالات جیسے آئے، جمع کر دیے گئے۔ لیکن اُن کی خاص تحقیق تمام اشیا کی وحدت (وحدت الوجود) ہے۔ (ہندو دھرم صفحہ ۳۴، ۳۵) بعد کے ادوار میں، ہندو مذہب کے عظیم مجدد شنکراچاریہ اس نظریہ کے بہت بڑے

داعی تھے۔ لیکن سوامی دیانند سرسوتی وحدت الوجود کے اس نظریہ کے مخالف ہیں اور اس کی انھوں نے تفصیل سے تردید کی ہے۔

(ستیارتھ پرکاش۔ باب ۱۱ صفحہ ۳۸۰ تا ۴۰۱)

منوسمرتی :

منوسمرتی میں جو تمام سمرتیوں سے اہم تر ہے، پیدائشِ عالم کا تذکرہ اس طرح ہے:

"یہ سب جگت (کائنات) پہلے کرتی (فطرت) میں لین (ضم) تھا، اس کا کچھ نشان نہ تھا، نہ دلیل سے اسے معلوم کیا جا سکتا تھا۔ خواب کی سی حالت میں تھا۔ اس کے بعد پوشیدہ و لازوال قوت رکھنے والا اور اندھکار (تاریکی) کا ناش کرنے والا پرمیشور، پرماتما عناصر وغیرہ کو ظاہر کرتا ہوا ظاہر ہوا۔ اور اُس کے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ اپنے بدن سے ایک قسم کی خلقت پیدا کرنا چاہیے، تو اس نے پہلے پانی کو پیدا کیا۔ پھر اس پانی میں بیج ڈالا، تب وہ بیج مثل طلا و آفتاب کے بصورتِ بیضہ بن گیا، پھر اس بیضہ سے برہما جو تمام مخلوقات کے پیدا کرنے والے ہیں، آپ سے آپ پیدا ہوئے۔ برہما نے اس انڈے میں ایک برس رہ کر اور پرماتما کا دھیان کرکے اُس انڈے کے دو ٹکڑے کیے۔ ان دو ٹکڑوں سے برہما نے سورگ (بہشت) اور پرتھوی (زمین) کو بنایا۔ پھر ان دونوں کے بیچ آکاش، آٹھوں سمت اور ساکن سمندر بنایا۔ پھر پرماتما نے سب جیووں کا نام اور کرم علیحدہ علیحدہ جس کا، جیسا پیدائش سے پہلے تھا، ویسا ہی وید شبد سے جان کر بنایا۔ پھر پربھو یعنی برہما نے دیوتاؤں کو اور جڑ پدارتھوں (جمادات) اور سوکشم ستیہ (لطیف برحق)، یگیہ کو پیدا کیا، پھر یگیہ سدھ (تکمیل)

ہونے کے لیے اگنی سے رگ وید، وایو سے یجر وید اور سورج سے سام وید نکالا۔ دُنیا کی ترقی کے لیے منہ سے براہمن کو، بانہہ سے چھتری کو، ران سے ویش کو اور پاؤں سے شودر کو پیدا کیا۔ پھر برہماجی نے اپنے قالب کے دو حصے کیے۔ نصف سے صورتِ مرد اور نصف سے صورتِ عورت پیدا ہوئی۔ ان دونوں کو ملانے سے براٹ شخص پیدا کیا۔ منوجی کہتے ہیں کہ اس شخص براٹ نے عبادت کر کے جس شخص کو بنایا وہ میں ہی ہوں اور میں سب کا پیدا کرنے والا ہوں۔ پھر میں نے دنیا کو پیدا کرنے کی خواہش میں سخت عبادت کر کے دس رشیوں کو جو پرجاپتی ہیں پیدا کیا۔ ان رشیوں نے سات بڑے پُرجلال منوؤں اور دیوتاؤں کو اور دیوتاؤں کے مقامات یعنی سورج اور مہاپرتاپی (بڑے جلال والے) بڑے بڑے رشیوں کو بنایا۔ جب تک برہماجی جاگتے رہتے ہیں تب تک یہ جگت دکھائی پڑتا ہے اور جب وہ شانت پرش (متین) یعنی برہماجی سو جاتے ہیں تب پرلے (قیامت) ہو جاتی ہے۔ اسی طرح برہماجی جاگنے اور سونے سے تمام ساکن و متحرک جانداروں کو بار بار جلاتے اور مارتے ہیں۔ جگ (Period) کے مطابق آدمیوں کا دھرم سب جگوں میں علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ ست جگ میں صرف عبادت اور ترتیا جگ میں معرفت اور دواپر جگ میں یگیہ اور کل جگ میں دان مقدم رکھا گیا ہے۔ اس سمپورن جگ (کل کائنات) کی رکشا کے لیے اس سب سے بڑے صاحبِ جلال و کمال برہما نے منہ، بانہہ، جانگھ اور چرن سے پیدا ہوئے چاروں ورنوں کے کرم الگ الگ مقرر کیے۔ وید پڑھنا، وید پڑھانا، یگیہ کرنا، یگیہ کرانا، دان دینا، دان لینا، یہ چھ کرم براہمن کے لیے بنائے۔ رعایا کی حفاظت کرنا،

دان دینا، یگیہ کرنا، وید پڑھنا، دنیا کی نعمتوں میں دل نہ لگانا، یہ پانچ کرم چھتری کے مقرر کیے۔ چوپایوں کی حفاظت کرنا، دان دینا، یگیہ کرنا، وید پڑھنا، تجارت کرنا، سود (بیاج) لینا، کھیتی کرنا، یہ سات کرم ویشوں کے مقرر کیے۔ شودر کے لیے ایک ہی کرم پربھو (خدا) نے ٹھہرایا۔ یعنی صدق دل سے ان دونوں کی خدمت کرنا[1] ساکن و متحرک جانداروں میں کیڑا افضل ہے۔ اس سے آدمی اور اس سے براہمن افضل ہے۔

پرمیشور نے دھرم کے خزانے کی حفاظت کے واسطے براہمن کی صورت میں نزول فرمایا۔ جو کچھ دنیا میں ہے وہ سب گویا براہمنوں کی ملکیت ہے کیوں کہ وہ برہما کے منہ سے پیدا اور سب سے افضل ہے۔"

(ادھیائے ۱۔ ۵تا ۱۰۰)

منوسمرتی کے اس اقتباس سے موجودات کی تخلیق اور موجودات کے مراتب وغیرہ بہت سے امور پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اشیاء کا پیدا کرنے والا ایک نہیں، بہت سے ہیں، یہ بھی کہ دیوتا بہت سے ہیں، یہ بھی کہ ہر یگ کا دھرم الگ ہے، یہ بھی کہ چار ورن ہیں اور ہر ورن کے فرائض و اعمال جدا جدا ہیں۔ یہ بھی کہ ہر برہمن انسان کے روپ میں خدا ہے اور یہ بھی کہ شودر سب کا خادم ہے۔

رامائن:

والمیکی رامائن اپنے تقدم اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے تلسی داس کی رامائن سے بڑھ کر ہے ہم اس سے وشنو کے اوتار لینے کے واقعہ کا ایک

---

[1] سوامی دیانند سرسوتی بھی چار ورنوں اور ان کے مذکورہ بالا فرائض کے قائل ہیں۔ البتہ وہ ورن کو نسل سے نہیں، اعمال سے مانتے ہیں (ستیارتھ پرکاش باب ۴ صفحہ ۱۱۲ تا ۱۲۰)

اقتباس پیش کرتے ہیں:

"اسی وقت (راجہ دسرتھ کے اولاد کے لیے یگیہ کرتے وقت) برہما کی سبھا میں دیوتا لوگ اکٹھے ہو کر اُن سے بولے۔ بھگوان! راون[1] کا نام راکشش آپ کا کرپا پرساد پاکر ہم سب لوگوں کو بہت کشٹ دے رہا ہے، ہم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اپنی کوشش سے اُسے دبا سکیں۔ آپ نے خوش ہو کر اسے قول دے دیا ہے اور اُس کے مارے تینوں دنیاؤں کے جانداروں کا ناک میں دم ہو گیا ہے۔ دیوتاؤں کے ایسا کہنے پر برہما جی کچھ سوچ کر بولے: دیوتاؤ! چنتا نہ کرو، اس بری آتما کو ختم کرنے کی تدبیر میری سمجھ میں آگئی ہے۔ اس نے ور مانگتے وقت کہا تھا کہ میں گندھرو، یکش دیوتاؤں اور راکھشسوں کے ہاتھ سے نہ مارا جاؤں۔ آدمیوں کو تو وہ ذلیل سمجھتا تھا، اس لیے ان کے ہاتھ سے مارے جانے کا قول اس نے نہ لیا، اب اس کا خاتمہ آدمی ہی کے ہاتھ سے ہو گا۔ اس وقت مہان تیجسوی، جگت پتی، بھگوان وشنو بھی گرڑ پر سوار وہاں آن پہنچے۔ ان کے بدن پر پتیامبر اور ہاتھوں میں سنکھ چکر اور گدا وغیرہ چیزیں بھلی لگ رہی تھیں۔ تمام دیوتاؤں نے انھیں پرنام کیا اور وہ برہما جی کے ساتھ مل کر اطمینان کے ساتھ سبھا میں براجمان ہو گئے۔ تب دیوتاؤں نے عاجزی کے ساتھ ان سے درخواست کرتے ہوئے کہا پربھو! اجودھیا کے راجہ دسرتھ

---

[1] لنکا کا فرمانروا، جو اپنے زمانے کا بہت بڑا عالم اور عابد مرتاض تھا۔ جنوبی ہند کے لوگوں کے دلوں میں آج بھی اس کی عقیدت و محبت ہے، یہ لوگ رام اور راون کی اس جنگ کو بالکل دوسرا رنگ دیتے ہیں۔

مہرشیوں کی طرح تپسوی ہیں۔ ان کی تین رانیاں جوہری، متری اور کیرتی ان تین دیویوں کی طرح ہیں۔ آپ اپنے چار روپ[1] بنا کر ان تینوں رانیوں کے حمل کی شکل میں اوتار لیجیے۔" (بال کانڈ)

اس اقتباس سے بہت سے دیوتاؤں کے وجود، ان کی سبھا، ان کی سواریوں اور ہتھیاروں نیز اُن کے اوتار لینے کے مفہوم پر ہلکی سی روشنی پڑتی ہے۔

بھگوت گیتا:

شرک اوتار واد اور وحدت الوجود سے متعلق چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"دیوتاؤں کو اس قربانی سے پرورش کرو اور دیوتاؤں کو موقع دو کہ وہ تمھاری پرورش کریں، اس طرح کسی غرض کے بغیر ایک دوسرے کو پرورش کرتے ہوئے تم بلندترین نیکی تک پہنچ سکو گے قربانی سے پروان چڑھ کر دیوتا یقیناً تمھیں وہ تمام مطلوبہ چیزیں بخش دیں گے جو تم ان سے مانگو گے بھی نہیں"

(باب ۳ - ۱۱ - ۱۲)

"حالانکہ میں (کرشن) غیر پیدا شدہ اور لافانی ہوں اور تمام موجودات کا خداوند و مالک ہوں اس کے باوجود میں اپنی یوگ مایا کے ذریعہ اپنی پرکرتی کو قابو کر کے اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہوں۔ ارجن! جب بھی نیکی زوال پذیر ہوگی اور بدی کو عروج ہوگا میں اپنے آپ کو جسم کا روپ دے کر سامنے آؤں گا۔ نیکوں کے تحفظ، بدوں کی ہلاکت اور دھرم کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے میں نے مختلف ادوار میں جنم لیا ہے۔" (باب ۴ - ۶ - ۷ - ۸)

---

[1] گویا راجہ دسرتھ کے چاروں بیٹے رام، لکشمن، شترو گھن اور بھرت۔ سب کے سب وشنو کے اوتار تھے۔

"ارجن! اس بات کو جان لو کہ تمام موجودات اس دو گونہ پرکرتی سے ارتقا کر کے بنی ہے۔ میں ہی تخلیق کا سرچشمہ ہوں۔ پھر میرے ہی اندر تمام خلقت غائب ہو جائے گی۔ ارجن! میرے سوا کوئی کوئی چیز بھی موجود نہیں ہے ارجن! میں پانی میں اس کی شیرینی ہوں، میں چاند کا نور ہوں۔ میں تمام ویدوں میں مقدس لفظ اوم ہوں، خلا میں آواز ہوں اور انسانوں میں انسانیت ہوں۔ میں زمین پر پاکیزہ خوشبو ہوں، آگ کی پاکیزہ درخشانی ہوں، میں تمام موجودات میں زندگی ہوں اور متقشف راہبوں کا تقشف ہوں۔" (باب ۷-۴ تا ۹)

"ارجن! میں تمام موجودات کو جانتا ہوں، گزشتہ اور موجود، دونوں نیز انھیں بھی، جو بعد میں پیدا ہوں گی، لیکن مجھے کوئی نہیں جانتا۔"

(باب ۷-۲۶)

"وہ پرستار، جو میرے سوا کسی کو نہیں جانتے اور استقامت کے ساتھ میرے دھیان میں لگے رہتے ہیں جو بے غرضانہ میری پرستش کرتے ہیں اور جو فکر میں میرے ساتھ متحد ہیں، میں ان کے لیے پورے تحفظ کا انتظام کرتا ہوں۔ ارجن! وہ پرستار بھی جو عقیدت کے ساتھ دوسرے دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں، وہ بھی میری ہی پرستش کرتے ہیں۔ اگرچہ ضوابط و احکام کے مطابق نہیں۔"!

(باب ۹-۲۲-۲۳)

"آدتیہ کے بارہ بیٹوں (دیوتاؤں) میں میں وشنو ہوں۔ مارتوں (ہوا کے ۴۹ دیوتاؤں) کا جلال وشکوہ ہوں۔ ویدوں میں سام وید ہوں۔ گیارہ رُدروں (تباہی کے دیوتاؤں) میں شنکر ہوں۔ آٹھ واسوؤں (خاص طرح کے دیوتاؤں) میں اگنی ہوں۔"

(باب ۱۰-۲۰-۲۳)

"ان فریبوں میں جو عمل میں لائے جاتے ہیں میں جوا ہوں، میں پُرشکوہ افراد کا شکوہ ہوں اور نیک طبع لوگوں کی نیکی۔"

(باب ۱۰-۳۶)

"ارجن نے (کرشن سے) کہا اے تمام موجودات کے خالق! اے مخلوقات کے فرمانروا! دیوتاؤں کے خدا! آپ ہی اپنے آپ کو اپنی ذات کے ذریعے جانتے ہیں۔" (باب ۱۰، ۱۵)

گیتا کے اگلے باب (گیارہویں) کے آغاز ہی میں ارجن کرشن جی سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنی خدائی شکل اگر وہ دیکھ سکتا ہو تو اسے دکھا دیں۔

(باب ۱۱-۳-۴)

کرشن جی، اس کے جواب میں کہتے ہیں:

"ارجن! تم تھوڑی دیر میں، میری سینکڑوں، ہزاروں گوناگوں خدائی صورتیں متنوع رنگوں اور شکلوں کی دیکھ لو۔! ارجن! تم میرے اندر بارہ آدتیہ کے فرزندوں (دیوتاؤں) دو اشونانی کمار (توام دیوتا) اور انچاس ۴۹ ماروتوں (ہوا کے دیوتاؤں) اور بہت سی مزید حیرت انگیز شکلیں دیکھو جو تم نے کبھی نہیں دیکھیں۔ ارجن! میرے اس جسم میں تم ساری خلقت جاندار اور بے جان اور جو کچھ تم اس کے سوا دیکھنا چاہو، سب میرے ایک ہاتھ میں دیکھو! لیکن تم اپنی ان کثیف آنکھوں سے مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ اس لیے میں تمھیں خدائی آنکھیں عطا کرتا ہوں ان کے ذریعے میری یوگ کی خدائی طاقت کو دیکھو"! (باب ۱۱-۵ تا ۸)

اس کے بعد ارجن نے کیا دیکھا اس کے لیے گیتا کے گیارہویں باب کی طرف رجوع کیجیے۔

پُران :

گزشتہ صفحات میں ان کا ہلکا سا نمونہ گزر چکا ہے۔ مزید ملاحظہ ہو :

"بھاگوت پُران میں ہے کہ وشنو کی ناف سے کنول، کنول سے برہما، برہما کے داہنے پیر کے انگوٹھے سے سوامیبھو، بائیں انگوٹھے سے ست روپا رانی، چہرے سے ردّر مریچ وغیرہ دس لڑکے پیدا ہوئے۔ ان سے دس پرجاپتی، ان کی تیرہ لڑکیوں کا بیاہ کشیپ سے، اُن میں سے دلی سے دیو، دِنو سے راکھشش، آدیتہ سے آدیتہ، دِنا سے پرند، کودر سے سانپ، سرما سے کتے، گیدڑ وغیرہ اور دوسری بیویوں سے ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، گدھے بھینسے، گھاس پھوس ببول وغیرہ درخت کانٹوں سمیت پیدا ہو گئے۔"

(ستیارتھ پرکاش۔ باب ۱۱ صفحہ ۲۱۱ ہندی ایڈیشن)

بھاگوت پران کو وشنومت کے لوگ مانتے ہیں۔ سوامی دیانند اس کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں :

"پھر ہرنیاکش اور ہرنیہ کشیپ پیدا ہوئے۔ ہرنیاکش کی داستان یوں لکھی ہے کہ وہ زمین کو چٹائی کی طرح لپیٹ کر سرہانے رکھ کر سو گیا۔ وشنو نے سؤر[1] کی شکل میں آکر اس کے سر کے نیچے سے زمین نکال کر منہ میں پکڑ لی۔ اس پر وہ اٹھا اور دونوں میں لڑائی ہوئی جس میں سؤر نے ہرنیاکش کو مار ڈالا۔ اب رہا ہرنیہ کشیپ اس کا لڑکا جو پرہلاد تھا اور جو بھگت ہو گزرا ہے۔ اس کو جب پڑھنے کے لیے مدرسہ بھیجا تو وہ استادوں سے کہنے لگا کہ میری تختی پر

---

[1] وشنو نے انسانوں کی طرح جانوروں کی شکل میں بھی اوتار لیا ہے جیسے سؤر اور شیر کا ذکر آرہا ہے۔

رام رام لکھ دو اور جب اس کے باپ نے سنا تو اس سے پوچھا کہ تو ہمارے دشمنوں کا بھجن کیوں کرتا ہے؟ لڑکے نے نہ مانا تب اس کے باپ نے باندھ کر پہاڑ سے گرایا، کنوئیں میں ڈالا لیکن اس کو کچھ نہ ہوا۔ تب اس نے ایک لوہے کا ستون آگ میں گرم کر کے اس سے کہا کہ تیرا معبود رام سچا ہے تو تو اس کو پکڑنے سے نہ جلے گا۔ پرہلاد پکڑنے لگا، دل میں شک پیدا ہوا کہ آیا جل جاؤں گا یا بچ رہوں گا؟ نارائن (خدا) نے اس ستون پر چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی قطار چلائی جن کو دیکھ کر یقین ہو گیا۔ جھٹ ستون کو جا پکڑا وہ پھٹ گیا۔ اس میں سے نرسنگھ[1] (شیر) نکلا اور اس نے اس کے باپ کو پکڑ کر اس کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ بعد ازاں پرہلاد کو چاٹنے لگا اور پرہلاد سے کہا کہ بر مانگ، اس نے یہ التماس کی کہ میرے باپ کی سدگتی (نجات) ہو۔ نرسنگھ نے بر دیا کہ تیرے بزرگ اکیس پشت[2] تک نجات پائیں گے۔"

(ستیارتھ پرکاش۔ باب ۱۱ صفحہ ۳۴۰ - ۲۱۲۰۴)

ہندو سماج میں توحید کے رجحانات

وید :

شرک کے رجحانات کے سلسلے میں گزشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا اس کا تعلق ہندو سماج کی اکثریت سے تھا، لیکن ہندو سماج میں ایک

---

[1] اسے نرسنگھ اوتار کہتے ہیں یعنی خدا شیر کی شکل میں آیا۔

[2] سوامی دیانند فرماتے ہیں کہ بھاگوت پران کی رو سے برہما سے پرہلاد تک کل چار پشتیں گزری تھیں۔

ایک مختصر سا گروہ شاید ہمیشہ رہا ہے جو شرک و بت پرستی سے غیر مطمئن اور کسی نہ کسی درجہ میں توحید کا رجحان رکھتا تھا۔ ذیل میں ہم اس گروہ کے بارے میں کچھ تفصیل دیں گے۔

جیسا کہ سوامی وویکانند نے کہا، ہمیں ویدوں کے اولین اور قدیم ترین اجزا میں توحید کا ایک گونہ تصور ملتا ہے۔ سوامی شروانند اس ذیل میں فرماتے ہیں:

"ذیل میں رگ وید کے ان منتروں میں سے جن کا حوالہ بار بار دیا جاتا ہے کچھ منتر ہیں جو وحدتِ الٰہ پر دلالت کرتے ہیں:

وہ جو ایک ہے، رشی اسے بہت سے نام دیتے ہیں، وہ اسے اگنی، یم اور ماترشون کہہ کر پکارتے ہیں (رگ وید، ۱، ۱۶۴، ۴۶)

وہ روشنی بن کر چمکتے ہوئے آسمان میں واسو (ہوا) بن کر درمیانی خلا میں، ہوتری (آگ) بن کر قربانی کے آتشکدہ پر، مہمان بن کر وہ گھر میں زندگی بن کر انسان میں اور حق کی حیثیت سے وہ ہر جگہ رہتا ہے۔" (رگ وید، ۴، ۴۰، ۵)

ویدانت کا فلسفہ:

لیکن یہ منتر توحید سے زیادہ وحدت الوجود کے نظریے کے حامل ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظریے نے آگے چل کر اپنشد میں زیادہ مفصل اور فلسفیانہ شکل اختیار کرلی۔ سوامی وویکانند اپنشد کے فلسفہ کی تشریح کرتے ہوئے "ہندومت کے فلسفہ" میں فرماتے ہیں:

"ہندوستانی مذاہب عجیب وغریب ابتدا اختیار کرتے ہیں۔ اولین مرحلہ میں تخلیق کا نظریہ سامنے آتا ہے جو بڑا ہی عجیب وغریب ہے۔ تخلیق کا نظریہ یہ ہے کہ پوری کائنات خدا کی مرضی سے عدمِ محض سے پیدا کی گئی ہے۔ اگلے مرحلہ میں اس نظریہ پر اعتراض ہو جاتا ہے کہ عدم سے وجود کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؛ فطری

طور پر یہ نظریہ کہ کائنات عدم محض سے پیدا کی گئی بے معنی قرار دیا گیا اور کچھ مواد جس سے کائنات بنی ہو، تلاش کیا جانے لگا۔ ایک حل یہ سامنے آیا کہ فطرت، خدا اور روح تینوں ازلی و ابدی۔ ویدانت کے فلسفہ کی رو سے جیو دائمی ہے، جیسے کہ خدا دائمی ہے، فطرت بھی دائمی ہے، مگر وہ بدلتی رہتی ہے۔ ساری فطرت جو کروڑ ہا کروڑ روحوں پر مشتمل ہے۔ خدا کی مرضی کے تحت ہے، خدا ہر چیز میں سرایت کئے ہوئے ہے، عالم کل ہے، شکل کے بغیر ہے، ہر جگہ ہے اور وہ فطرت کے ذریعہ دن رات کام کرتا ہے۔ وہ ازلی و ابدی فرمانروا ہے۔ کائنات کا ایک ہی فرمانروا ہے اور وہ خدا ہے، کوئی شخص خدا نہیں بن سکتا۔ ثنویت کے قائل اس بات کے معتقد ہیں کہ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تم خدا ہو تو یہ کلمۂ کفر ہے۔ اس کے بعد اس سے اونچا ویدانتی فلسفہ آتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر تم کہتے ہو کہ خدا ہے جو لامحدود ہستی ہے، روح ہے اور وہ بھی لامحدود ہے اور فطرت بھی لامحدود ہے تو تم لامحدودیتوں کو بغیر کسی تحدید کے بڑھاتے چلے جاؤ گے۔ اور یہ صراحتاً مہمل ہے، تم اس طرح ساری منطق کو ختم کر دو گے۔ خدا کائنات کی علت مادی بھی ہے اور علت فاعلی بھی۔ خدا اس کائنات کو خود اپنے وجود سے ظاہر کرتا ہے۔ پوری کائنات جو تمام فطرت اور ارواح کی غیر محدود باڈی پر مشتمل ہے۔ وہ خدا کی غیر محدود باڈی ہے، وہ پوری کائنات میں جاری و ساری ہے، وہ تنہا غیر متغیر ہے، لیکن فطرت متغیر ہوتی ہے اور روح بھی متغیر ہوتی ہے.... پہلے نظریہ کو ثنویت کے نام سے پکارتے ہیں، دوسرا نظریہ کہتا ہے کہ خدا، فطرت اور روح تینوں ہیں، لیکن روح الفطرت

خدا کی باڈی کی تشکیل کرتے۔ اس طرح یہ مینول ایک وحدت کی تعمیر کرتے ہیں۔ یہ نظریہ مذہبی ارتقاء کی نسبت زیادہ بلند منزل کی رہنمائی کرتا ہے اور اسے "محدود وحدت الوجود" (Qualified Manoism) کہتے ہیں۔ سب سے آخر میں وحدت الوجودی آتے ہیں۔ اب بہت عمدہ سوال ابھرتا ہے اگر خدا کائنات بن جاتا ہے تو آپ اور یہ تمام چیزیں خدا ہیں۔ کیا خدا کروڑوں روحوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ اگر وہ کائنات بن گیا تو وہ تغیر پذیر ہے اور اگر تغیر پذیر ہے تو فطرت کا جز ہے اور جو کوئی فطرت ہے اور تغیر پذیر ہے، وہ پیدا ہوتا اور مرتا ہے۔ تو وحدت الوجودی (ادویت وادی، (Non Dualist) کہتے ہیں، کائنات سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ یہ سب فریب ہے، یہ دیو، دیوتا فرشتے تمام وہ چیزیں جو پیدا ہوتی اور مرتی ہیں، روحوں کی یہ لا محدود تعداد جو آتی اور جاتی ہے، یہ سب خواب ہے۔ کوئی جیو (روح) موجود نہیں ہے۔ صرف ایک لامحدود ہستی موجود ہے جس طرح پانی کے مختلف قطعات میں ایک ہی سورج منعکس ہو کر بہت سورجوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور کروڑوں پانی کے قطرات میں کروڑوں سورج نظر آتے ہیں اور ہر قطرہ میں سورج کی مکمل تصویر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود سورج ایک ہی ہے، اسی طرح یہ جیو مختلف دماغوں کے انعکاسات ہیں۔ خدا ان مختلف جیووں میں منعکس ہے (یہ ساری دنیا خواب ہے) لیکن خواب بغیر کچھ نہ کچھ حقیقت کے نہیں ہو سکتا اور حقیقت وہی ایک لامحدود ہستی ہے۔ تم ایک جسم، ایک ذہن یا ایک روح کے اعتبار سے خواب ہو، لیکن تم حقیقتاً وجود ہو، گیان ہو، آنند

ہو، تم کائنات کے خدا ہو، تم پوری کائنات کو پیدا کر رہے ہو۔
یہ تمام پیدائش اور آواگون، یہ آنا جانا، یہ سب "مایا" کا فریب ہے
یہ ہے "ادویت ویدانتی فلسفہ" Hinduism pp. 61—74

یہ ہے اپنشد یا ویدانت کا فلسفہ! اس سے معلوم ہوا کہ اپنشد میں تین مکاتبِ فکر ہیں۔ ثنویت، محدود وحدت الوجود۔ وحدت الوجود یا لاثنویت، پہلے نظریہ کی رو سے خدا، روح اور فطرت (مادّہ) یہ تین ازلی وابدی اور مستقل وجود ہیں۔ خدا صانع ہے خالق نہیں، یعنی وہ عدم سے وجود نہیں پیدا کرتا، بلکہ روح اور فطرت میں امتزاج پیدا کرتا ہے اور یہ امتزاج روح کے سابق اعمال کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ خدا، فطرت اور روح یہ تین ازلی اور ابدی اور لامحدود وجود ضروری ہیں، مگر یہ تین فی الواقع ایک ہیں فطرت اور روح خدا ہی کا ظہور ہیں۔ فطرت اور روح خدا کا جسم ہیں۔ اس طرح کائنات کی ہر چیز خدا ہے اور تیسرا نظریہ یہ ہے کہ کائنات محض خواب ہے، موجود صرف ایک ہی ذات ہے اور وہ لامحدود ہستی ــــ خدا ہے۔ مادہ اور روح اسی ایک ذات کے مختلف انعکاسات ہیں۔ بظاہر یہ سب فریب اور خواب ہے اور حقیقت کے اعتبار سے ہر شئے خدا ہے۔ ان تینوں نظریات میں خدا کی خالقیت کو رد کر دیا گیا ہے۔

ہم نے ویدانت کے تینوں مکاتبِ فکر کا یہاں اس لیے ذکر کر دیا کہ بعد کے تقریباً تمام ہندو مصلحین پر یہ نظریات چھائے رہے ہیں بالخصوص آخری دو نظریے جو وحدت الوجود کی دو تعبیریں ہیں۔ ہندو مصلحین کا رجحان خواہ شرک کی طرف رہا ہو یا توحید کی طرف، وہ اس فلسفہ سے اپنا دامن نہ چھڑا سکے ہیں۔ یہ بات اوپر گزر چکی ہے کہ اس فلسفہ کا توحیدِ خالص سے کوئی جوڑ نہیں ہے۔ حالانکہ ہندو فلسفی و صوفی ہی نہیں، بہت سے مسلمان

صوفی بھی وحدت الوجود ہی کو حقیقی توحید قرار دیتے رہے ہیں[1]۔ ہندوستان کی مذہبی فکری تاریخ گواہ ہے کہ وحدت الوجود کے اس فلسفہ نے شرک کے لیے جو بے بنیاد تھا، بنیاد فراہم کی ہے اور اس کی جڑوں کو اس قدر مستحکم کر دیا ہے کہ توحید خالص یہاں کبھی پنپ نہ سکی۔

جنوبی ہند کے ہندو مصلحین:

ہندوستان کے مشہور مورّخ ڈاکٹر تاراچند فرماتے ہیں:

"ہندو مذہب کی تاریخ جس کا خاکہ گزشتہ باب میں کھینچا گیا ہے۔ اولین ادوار سے آٹھویں صدی عیسوی تک ارتقا کے تسلسل کو واضح کرتی ہے یہ ارتقا اصلاً شمالی ہند میں ہوا جہاں تمام (مذہبی) تحریکات نے جنم لیا اور یہیں سے وہ جنوب میں پھیلیں۔ اس پورے دور میں شمال تہذیبی رہنما بنا رہا۔ کیوں کہ تمام مذہبی نوشتے یہیں لکھے گئے۔ قدیم دھرم کے خلاف تمام اعتقادات جیسے بدھ مت اور جین مت اور فلسفیانہ مکاتبِ فکر اور فرقے یہیں ابھرے لیکن آٹھویں صدی کے بعد تبدیلی رونما ہوئی۔ شمال نے رہنمائی کا مقام کھو دیا اور اصلاحی تحریکات کا سرا جنوب کے ہاتھ میں آ گیا۔ وہیں سے وشنو مت اور شیو مت کے رشیوں نے بھکتی (عشق)، کے مکتبِ فکر کا آغاز کیا اور شنکر آچاریہ، راما نج، یمبادیتہ، باسو، ولبھ آچاریہ اور مادھو نے اپنے اپنے فلسفیانہ نظاموں کی تشریح کی۔ سرگرمیوں کے مرکز کا شمال سے جنوب

---

[1] وحدت الوجود کا نظریہ خالص ویدانتی نظریہ ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، اس مسئلہ پر ہم انشاءاللہ الگ بحث کریں گے۔

کی طرف اچانک منتقل ہو جانا اسی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا نتیجہ تھا جو اس وقت ہندوستان میں رونما ہوئیں"

(اسلام ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۸۴)

اسلام کا اثر :

اس صورت حال کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر تاراچند اس کے خاص اور بنیادی سبب پر انگلی رکھ دیتے ہیں :

"نویں صدی سے چودھویں صدی تک جنوبی ہند میں نئے نظریات کا ظہور اور کچھ پرانے نظریات پر زور عجیب و غریب ہے۔ یہ سب کچھ شمال میں ظاہر نہیں ہوا کیوں کہ قرون وسطیٰ کے تمام اولین مصلحین جنوب ہی سے متعلق ہیں اگر اسباب میں سے ایک سبب یہ نہیں ہے کہ اسلام کا اثر باضابطہ طور پر اور روز افزوں طریقہ سے اس دور میں اور اس علاقے میں قوت پکڑ رہا تھا تو اس کی توجیہ مشکل ہے۔ اس کے علاوہ مزید قابل غور بات یہ ہے کہ اصلاح کی قینچیاں مذہب کے صرف انہی حصوں پر چلائی گئیں جو اسلام کے ذریعے مردود قرار پائے تھے اور جو نئی چیزیں ابھر کر ظاہر ہوئیں وہ وہی چیزیں تھیں جو اس مذہب کی سب سے نمایاں خصوصیات تھیں" (صفحہ ۱۱۵ - ۱۱۶)

"نویں صدی عیسوی کے بعد کے جنوبی ہند کے فکر کی بہت سی دوسری خصوصیات اسلامی اثرات کی شدت سے نشاندہی کرتی ہیں۔ یہ ہیں توحید پر پڑتا ہوا زور، جذباتی عبادت، گرو کے آگے خود سپردگی (گرو بھگتی) اور اس کے ساتھ ذات پات کے نظام کی سختیوں میں نرمی اور رسمی مذہبیات سے بے اعتنائی"

(صفحہ ۱۱۴)

"قرونِ وسطیٰ میں توحید ہندوستان کا غالب و مروّج مذہب بن گیا۔
ایک خدا کو مختلف ناموں سے، شیو، وشنو اور دوسرے ناموں
سے پکارا جا سکتا ہے۔ اس کے وجود، اس کی تخلیق اور انسان کے
ساتھ اس کے تعلق کے بارے میں مختلف نظریات ہو سکتے ہیں
لیکن وہ ایک ہی ہے سب سے برتر اور شخصی خدا ہے۔"

شنکر آچاریہ:

بدھ مت کے غلبہ کے بعد ہندو مت کو جن لوگوں کی کوششوں سے دوبارہ عروج حاصل ہوا اور جنھوں نے مختلف ہندو فرقوں اور مسلکوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ ان میں شنکر آچاریہ کا مقام بہت بلند ہے۔ موجودہ ہندو مت پر ان کی بہت گہری چھاپ ہے۔ ڈاکٹر تارا چند ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شنکر آچاریہ نہ صرف یہ کہ اپنے زمانے کی پیداوار تھے بلکہ نئے عہد کے نقیب بھی موحدانہ پرستش ان کے پیش رووں کی کوششوں سے طاقت پکڑ چکی تھی، لیکن ابھی اس بات کی ضرورت باقی تھی کہ اسے فلسفہ کی مضبوط بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ اس موحدانہ رجحان میں اسلام جیسے غیر مصالحانہ دینِ توحید کے ظہور سے طاقتور قوتِ محرکہ حاصل ہوئی۔ شنکر آچاریہ ایسے وقت پیدا ہوئے جب کہ مسلمان ہندوستان میں اپنی سرگرمیاں شروع کر رہے تھے اور اگر روایات صحیح ہیں تو انھوں نے ملک (مالا بار) کے بادشاہ کو مسلمان بنا کر اپنے عقیدے کے پھیلانے میں خاصی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ شنکر آچاریہ ایسے مقام پر پلے بڑھے جہاں عرب اور خلیج فارس سے بہت سے جہاز آتے رہتے تھے۔" (صفحہ ۱۱۱)

غلط فہمی نہ ہو شنکر آچاریہ موحد سے زیادہ وحدت الوجودی تھے۔ وہ وحدت الوجود کے عظیم فلسفی وداعی تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ صوفیائے

کرام جن کی کوششوں سے ہندوستان میں اسلام پھیلا، وہ بھی عموماً وحدت الوجود ہی کے قائل تھے۔

لنگایت :

ڈاکٹر تارا چند جنوب کے مصلحین اور ان کے اصلاحی فرقوں کا تفصیل سے تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں فرماتے ہیں :

"جنوب کو چھوڑنے سے دو اور فرقے توجہ کے طالب ہیں جن پر اسلام کا اثر پچھلے فرقوں سے زیادہ واضح ہے۔ یہ ہیں لنگایت اور سدھار۔ اس بات کو مسلمہ طور پر مانا جا سکتا ہے کہ غیر مصالحانہ لنگایت مت بارہویں صدی عیسوی میں ابھرا، اس تحریک کے رہنما کون تھے ؟ باسو اور چنّا باسو کا بھتیجا۔ عام طور پر لنگایت مت والوں کی جانب سے رہنما تسلیم کیے گئے ہیں۔" (صفحہ ۱۱۶)

"باسو کا نظام اپنی شکل میں ایک انقلاب اور راسخ الدتنت مذہبی فکر کی سخت سرزنش تھا۔ لنگایت ایک خدا (پرشو) کے پرستار ہیں جو لامحدود ہے، خود مختار ہے، ناقابلِ ادراک وجود ہے، بلند ترین نور ہے، بلند ترین مسرت ہے، سب سے عظیم جوہر ہے، تمام تغیرات سے بالاتر بیان کیا گیا اور تمام مادیات سے خالی ہے، وہ ارواح اور فطرت کا خالق ہے۔" (صفحہ ۱۱۷)

"لنگایت کے یہاں قربانیاں نہیں ہیں، نہ برت ہیں، نہ تیوہار ہیں، نہ تیرتھ یاترا، نہ کوئی (مقدس) دریا، نہ ذات پات۔ شادی رضاکارانہ ہوتی ہے، شادی سے پہلے دلہن کی رضامندی ضروری ہے بچوں کی شادی غلط تصور کی جاتی ہے، طلاق کی اجازت ہے، بیواؤں کے ساتھ عزت و احترام کا سلوک کیا جاتا ہے اور انہیں دوبارہ شادی کی اجازت ہے، مُردوں کو جلایا نہیں جاتا دفن کیا جاتا ہے۔

مُردہ کو غسل دیا جاتا ہے۔ کوئی شردھا (مرنے کے بعد میت کو ثواب پہنچانے کی ہندوانہ رسوم) نہیں، تناسخ یا روحوں کے آواگون پر اعتقاد نہیں، لنگایت کنڑی اور تلگو علاقوں میں پائے جاتے ہیں اور آبادی کا تہائی حصہ ہیں۔" (صفحہ ۱۱۸، ۱۱۹)

ڈاکٹر صاحب لنگایت فرقے کی خصوصیات گِنا کر فرماتے ہیں :

"بے خطا طور پر اُس ذریعے کی نشاندہی کرتی ہیں جہاں سے یہ سب القا ہوا ہے اور وہ اسلام ہے۔" (صفحہ ۱۲۰)

اس کے بعد ڈاکٹر تاراچند ان کی مذہبی کتاب "وچن" سے جو باسو کی طرف منسوب ہے کچھ اقتباسات دیتے ہیں۔ ان میں توحید کا نسبتاً نکھرا ہوا تصور پایا جاتا ہے۔ ایک اقتباس آپ بھی ملاحظہ فرمائیں :

"تو ہی واحد خداوند ہے، تو ازلی و ابدی ہے۔ قادرِ مطلق خدا سے بڑھ کر کوئی لفظ نہیں۔ قادرِ مطلق خدا لنگ ستھی، کل کائنات میں صرف ایک ہی خدا ہے۔ تمام سماوی عالم میں، تمام فانی دنیا میں اور پاتال میں ایک ہی خدا ہے۔ مجھے یہ فرضی خدا پسند نہیں آتے۔ میں کیسے یہ کہہ سکتا ہوں کہ دیوتا جو لاکھ سے بنائے جائیں، جنھیں پگھلایا جائے یا وہ دیوتا جنھیں آگ پہ تپا کر بنایا جائے وہ اس خدا کے برابر ہو سکتے ہیں؟ میں کیسے یہ کہہ سکتا ہوں کہ دیوتا جو وقت آنے پر بیچے جاتے ہیں، وہ اُس خدا کے برابر ہیں؟ دیکھو! دوسرے خداؤں کا ساتھ نہ تلاش کرو۔ دوسرے خداؤں کا ذکر کرنا زناکاری ہے۔"

(صفحہ ۱۲۱)

سدھار

ڈاکٹر تاراچند جنوبی ہند کے ایک اور فرقہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سدھار فلسفیانہ شاعروں کا، جو یوگی بھی تھے اور طبیب اور کیمیاگر

بھی ، ایک مکتبِ فکر تھا۔" (صفحہ ۱۲۴)

اس فرقے کے عقائد اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہیں :

" خدا ایک ہے ، ویدک ایک ہے ، بے لوث اور سچا گروپ ایک ہے اور جب وہ حاصل ہو جائے تو اس کی جنت ایک ہے زمین پر لوگوں کا جنم بس ایک ہی ہے اور ایک ہی راستہ ہے تمام انسانوں کے چلنے کے لیے ۔ لیکن جو چار ویدوں اور چھ شاستروں کے قائل ہیں اور دیوتاؤں کی کثرت کے معتقد ہیں وہ جہنم کی آگ میں گریں گے ۔" (صفحہ ۱۲۵ ، ۱۲۶)

شمالی ہند کے مصلحین :

ڈاکٹر تارا چند فرماتے ہیں :

" یہ تحریک جو جنوب میں شروع ہوئی تھی ، شمال میں اس کا ارتقاء جاری رہا ۔ مہاراشٹر ، گجرات ، ہندوستان (یوپی) اور بنگال میں چودھویں صدی سے آئندہ کی صدیوں تک مذہبی رہنماؤں نے پرانے عقائد کے متعدد عناصر کو عمداً رد کر دیا اور کچھ دوسری چیزوں پر زیادہ زور دیا اور اسی طرح اس بات کی کوشش کی کہ ہندو اور مسلم عقائد میں زیادہ قربت پیدا کی جائے ۔" (صفحہ ۱۳۰)

کبیر :

اس سلسلہ کی سب سے اہم کڑی کبیر تھے ۔ انھوں نے ہندو اور مسلم عقائد اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں یک جہتی پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ اسلام اور مسلمان صوفیاء اور تصوف کی کتابوں سے ان کا تاثر اور اکتساب فیض یقینی ہے ان کی پیدا کی ہوئی تحریک کو نہ صرف ان کے زمانے میں ، بلکہ بعد کی صدیوں میں بھی قبولیت حاصل ہوئی اور آج تک اس کے اثرات موجود ہیں ۔ ڈاکٹر تارا چند فرماتے ہیں :

"کبیر کا تصور خدا انتہائی دقیق و لطیف ہے۔ ان کے عقیدہ کے مطابق خدا ماورائے ادراک اور محیطِ کل ہے، غیر شخصی اور شخصی ہے، لامحدود اور محدود ہے، صفات کے بغیر ہے اور صفات سے متصف ہے، معدوم ہے اور موجود ہے۔ صاحبِ شعور ہے اور بے شعور ہے۔ ظاہر ہے اور نہ پوشیدہ ہے، نہ ایک ہے نہ دو۔ ہر چیز میں ہے اور ہر چیز سے بے نیاز ہے اور اس کے باوجود اضداد سے بالاتر اور ماوراء ہے۔" (صفحہ ۱۵۴)

کبیر اوتار کے عقیدہ کے خلاف تھے۔ ڈاکٹر تارا چند فرماتے ہیں:

"وہ کھلم کھلا اوتار کے عقیدہ کی تردید کرتے تھے۔ (انھوں نے کہا) خالق نے سیتا سے شادی نہیں کی اور نہ انھوں نے سمندر پر پتھروں سے پل بنایا، وہ (ہندو) کہتے ہیں کہ کائنات کا مالک خدا کمزور اور طاقت ور کی عدم مساوات کو محسوس کر کے رام بن کر آیا، لیکن کبیر کہتا ہے کہ ایسی شخصیت جو پیدا ہوتی اور مرتی ہو میں اس کے آگے سر نہیں جھکا سکتا۔ دس اوتار جن کا لوگ تذکرہ کرتے ہیں، مجھ سے ان کا کوئی تعلق نہیں، وہ اپنے اعمال کی فصل کاٹنے والے ہیں، خالقِ کائنات ان کے ماسوا ہے۔" (صفحہ ۱۶۳)

لیکن کبیر گرو کو خدا کا مقام دیتے تھے، وہ فرماتے ہیں:

"گرو کو گوبند (خدا) کی طرح سمجھو۔"

(ہندوستانی تہذیب پر اسلام کا اثر، صفحہ ۱۵۸)

گرونانک:

سکھ مت کے بانی گرونانک دوسری عظیم شخصیت ہیں، جنھوں نے شرک و بت پرستی کی مخالفت کی اور توحید پر زور دیا۔ سکھ بت پرستی سے بچتے ہیں البتہ

"گرو گرنتھ صاحب" کی پرستش کرتے ہیں۔ سکھ مت کے بارے میں ہم تفصیل سے الگ گفتگو کریں گے[1] انشا اللہ!

سوامی دیانند سرسوتی :

اس سلسلہ کی سب سے آخری کڑی آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی ہیں۔ انھوں نے بہت کھل کر بت پرستی کی مذمت کی، اوتار واد کے عقیدہ کو غلط ٹھہرایا، نیز تیرتھ یاترا اور مندروں کی تردید کی، پرانوں کا انکار کیا اور موجود الوقت تمام ہندو فرقوں کا رد کیا۔ یہ رد ستیارتھ پرکاش کے پورے دو سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ایک آدھ اقتباس ملاحظہ ہو۔ اوتار کے عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

سوال : یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ پرمیشور نراکار (غیر مجسم) ہے لیکن اس نے شیو، وشنو، گنیش، سورج اور دیوی وغیرہ کے قالب اختیار کر کے رام اور کرشن اوتار لیے ہیں، اس لیے اس کی مورتی بنتی ہے، کیا یہ بھی جھوٹ ہے؟

جواب : ہاں، ہاں جھوٹ ہے۔ کیوں کہ آج ایک پات اکائم وغیرہ صفات کے لحاظ سے ویدوں میں پرمیشور کو پیدا ہونے، مرنے اور جسم اختیار کرنے سے پاک بتایا گیا ہے اور دلائل سے بھی پرمیشور کا اوتار لینا ثابت نہیں ہو سکتا۔" (باب ۱۱۔ صفحہ ۴۰۳)

مورتی پوجا کے خلاف انھوں نے تفصیل سے دلائل دیے ہیں (ملاحظہ ہو باب ۱۱)

شیو مت والوں پر انھوں نے بت پرستی کے علاوہ شیو لنگ اور جلادھاری کی پرستش کے سلسلے میں سخت تنقید کی ہے۔ فرماتے ہیں :

---

[1] ملاحظہ ہو سکھ مت اور توحید۔

"اس کے بعد وام مارگیوں اور شیو مت والوں نے متفق الرائے ہو کر بھگ لِنگ (زنانہ و مردانہ اعضائے تناسل) کو قائم کیا جس کو جلا دھاری اور لِنگ کہتے ہیں اور اس کی پوجا کرنے لگے۔ ان بے شرموں کو ذرا شرم نہ آئی کہ یہ کمینہ پن کا کام ہم کیوں کرتے ہیں[1]"

(باب ۱۱ صفحہ ۳۳۱ ہندی اڈیشن)

سوامی دیانند تین ازلی و ابدی وجود، خدا، روح اور پرکرتی (مادہ) کے قائل ہیں اور صرف اپنے مت کو ویدک دھرم اور حق قرار دیتے ہیں۔ اُن کے مت کو بہت کم ہندوؤں نے قبول کیا۔ ان کے مت کو جاننے کے لیے ستیارتھ پرکاش کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

---

[1] گاندھی جی اس میں کوئی بے حیائی نہیں پاتے (ہندو دھرم ص۲۵)

باب ہفتم

بُدّھ مت اور شرک

بُدھ مت کی اہمیت

بدھ مت دنیا کا ایک قدیم مذہب ہے اسے وجود میں آئے تقریباً ڈھائی ہزار سال[1] ہوئے۔ پیروؤں کی تعداد کے لحاظ سے مسیحیت دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے، لیکن بدھ مت اس سے پانچ چھ سو سال پہلے کا ہے۔ اسلام دنیا کا دوسرا بڑا مذہب ہے اور بدھ مت اس سے ایک ہزار سال[2] پرانا ہے۔ ہندو مت، جین مت اور یہودیت اگرچہ بدھ مت سے قدیم ہیں، مگر بدھ مت کو اُن پر اس پہلو سے فوقیت حاصل ہے کہ وہ عالمگیر مذہب ہے اور یہ نسلی و ملکی۔ اس معاملہ میں بدھ مت کا مقابلہ اسلام اور مسیحیت ہی کیا جا سکتا ہے جو عالمگیر اور بین الاقوامی مذاہب ہیں۔ بلاشبہ اسلام اس پہلو میں بھی بدھ مت سے بہتر ہے۔ کیوں کہ وہ زیادہ واضح اور صریح الفاظ میں اپنے پیغام کو

---

[1] بدھ مت کے ڈھائی ہزار سال (2500 years of Budhism) شائع کردہ شعبہ نشر و اشاعت گورنمنٹ آف انڈیا (۱۹۵۶ء) صفحہ ا۔

[2] یہ بات اسلام کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لحاظ سے کہی گئی ہے ورنہ اسلام اتنا ہی پرانا ہے جتنی نوع انسانی۔

بین الاقوامی اور عالمگیر بتاتا ہے لیکن بدھ مت کو مسیحیت پر فوقیت حاصل ہے موجودہ انجیلوں میں بہ صراحت یہ بات موجود ہے کہ حضرت مسیحؑ صرف یہودیوں کی اصلاح کے کے مبعوث ہوئے تھے (متّی، ۱۵، ۲۴) اور انھوں نے اپنے شاگردوں کو غیر قوموں میں دعوت و تبلیغ کے لیے جانے سے روکا تھا۔ (متی ۱۰، ۶-۷) موجودہ انجیلوں کی رو سے یہ حضرت مسیح نہیں، بلکہ سینٹ پولس ہیں جنھوں نے مسیحیت کو عالمگیر بنایا، لیکن گوتم بدھ نے حضرت مسیح کی طرح اپنے پیغام کو محدود نہیں کیا تھا۔

بدھ مت کی یہی خصوصیت تھی جس کے باعث وہ ایشیا کے بہت سے ملکوں، ہندوستان، نیپال، تبت، لنکا، برما، افغانستان، ترکستان، چین جاپان، منگولیا، سیام وغیرہ میں پھیل گیا، ہندوستان میں اگرچہ ہندومت نے اسے بعد میں شکست دے دی اور اسے خود اپنی جنم بھومی سے دیس نکالا ملا اور افغانستان اور ترکستان جیسے ممالک میں اس کی جگہ ——— اسلام نے لے لی، لیکن آج بھی وہ ایشیا کے متعدد ممالک کا زندہ اور مروّج مذہب ہے اور دنیا میں اس کے پیرو تخمیناً بیس کروڑ ہیں۔ پیرووں کی تعداد کے لحاظ سے بدھ مت ایشیا کا چوتھا بڑا مذہب ہے اور دنیا کا پانچواں یا چھٹا۔

بدھ مت کی اہمیت ایک اور پہلو سے بھی ہے اور وہ یہ کہ اس نے اپنے سے قدیم اور اپنے بعد میں آنے والے مذاہب پر بہت گہرے اثرات چھوڑے ہیں، ہندومت، بدھ مت سے قدیم ہے، لیکن اس پر بدھ مت کے گہرے اثرات پڑے ہیں، ویدوں کے مطالعہ سے آج بھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ویدک دھرم ہنسا، جانوروں کی قربانی اور یگیہ کا مذہب تھا اور یگیوں میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں جانور ذبح کیے جاتے تھے جن میں گایوں اور بیلوں کی کثیر تعداد بھی ہوتی تھی، بودھوں کے ایک مذہبی نوشتے، کوسل سینیت میں ہے:

"بھگوان مہاتما بدھ شراوستی میں رہتے تھے۔ اس وقت پسیندی کوسل راجہ

کا مہایگیہ شروع ہوا، اور اس میں پانچ سو بیل، پانچ سو بچھڑے، پانچسو بچھڑیاں، پانچ سو بکرے اور پانچ سو مینڈھے کھمبوں سے بندھے ہوئے تھے۔ یہ سب دیکھ کر بھکشوؤں (بدھ فقیروں) نے بھگوان (بدھ) کو اس سے آگاہ کیا، اس پر بھگوان بولے۔ ان (یگیوں) سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، بکرے، گئوویں اور مینڈھے جیسے مختلف جاندار جس میں مارے جاتے ہیں، اس یگیہ میں مہارشی شریک نہیں ہوتے"

(بھگوان بدھ[1] صفحہ ۳۱۳، ۳۱۴)

گوتم بدھ اور جین مذہب کے آخری پیشوا مہاویر سوامی نے جانوروں کی اس اندھا دھند قربانی کے خلاف آواز اٹھائی اور ہنسا کے بجائے آہنسا کا پرچار کیا، یہ اسی پرچار کی صدائے بازگشت ہے کہ آہنسا کو ہندو مت کا لازمی جزو تصور کیا جاتا ہے[2]۔ آہنسا سے زیادہ گہرا اثر بت پرستی کا ہے، کہا جاتا ہے کہ بدھ اور جین مت

---

[1] یہ کتاب گاندھی جی کے ایک خاص چیلے اور بدھ دھرم کے مشہور محقق و مبلغ دھرمانند کوسمبی نے بدھ مت کی بنیادی کتابوں کے براہ راست اور عمیق مطالعہ کے بعد مرہٹی زبان میں لکھی تھی اور دھرمانند سمارک ٹرسٹ سے شائع ہوئی تھی، کتاب کا گجراتی ترجمہ گاندھی جی کی گجرات ودیا پیٹھ نے شائع کیا تھا اور اردو ترجمہ ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی نے، ہمارے سامنے اردو ترجمہ ہے جو پرکاش پنڈت نے کیا ہے، اپنی تصنیف کے سلسلے میں ہمیں اس کتاب سے خاصی مدد ملی ہے۔

[2] آہنسا کے بہت بڑے مبلغ ہونے کے باوجود گوتم بدھ گوشت خوری کے خلاف نہ تھے۔ ان کے زمانے میں گوشت خوری بلکہ گاؤ خوری کا عام رواج تھا" (بھگوان بدھ" ص ۳۲۰) مگر انھوں نے اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی، وہ گوشت خود بھی کھا لیتے تھے۔ انتقال سے قبل انھوں نے سور کا گوشت کھایا تھا اور اسی سے ان کی موت ہوئی تھی جسے انھوں نے نجات قرار دیا اور اس گوشت خوری کو ذریعۂ نجات (بھگوان بدھ" صفحہ ۳۸۱) آج کل کے بدھ بھکشو بھی کم و بیش مقدار میں گوشت کھاتے ہیں (ص ۳۸۲) گوتم بدھ یگیوں میں جانوروں کی اندھا دھند قربانی کے خلاف تھے کیونکہ وہ کاریگروں اور غریبوں سے زبردستی چھینے جاتے تھے (ص ۳۲۰، ۳۲۱)

سے پہلے ہندوستان میں مظاہر پرستی تو تھی لیکن بت پرستی نہ تھی۔ موجودہ بت پرستی جو ہندومت کی رگ وپے میں سرایت کر گئی ہے، بدھ اور جین دھرم کی دین ہے[1] بدھ مت سے تاثر ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ہندوؤں نے بالآخر گوتم بدھ کو وشنو کا اوتار مان لیا۔ چنانچہ وشنو پران میں یہ کتھا آئی ہے کہ وشنو نے بدھ کے روپ میں ظاہر ہو کر راکششوں کو مرعوب کیا اور دیوتاؤں کے ذریعے انھیں تلف کرایا۔ اس کتھا کا خلاصہ "بھگوت گیتا" کے ایک اشلوک میں بھی ہے (بھگوان بدھ ص ۳۰) مذہب کے دائرے سے ہٹ کر ہندوستانی ثقافت اور آرٹ پر بدھ مت کی اور بھی نمایاں اور گہری چھاپ ہے۔

بدھ مت اور ہندومت کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا تو فطری تھا کیونکہ اصلاً وہ دونوں ایک ہی ملک کے مذہب ہیں اور بہت سی چیزیں ان میں مشترک ہیں۔ حتیٰ کہ بہت سے محققین، جن میں سوامی ودیکانند اور ڈاکٹر رادھا کرشنن جیسے ہندومت کے اسکالر بھی شامل ہیں، بدھ مت کو ہندومت کا جزو قرار دیتے ہیں[2]۔

بہرحال ہندومت اور بدھ مت کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا عجیب نہیں ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ عیسائیت بھی بدھ مت سے کچھ کم متاثر نہیں ہوئی۔ مسیحیت کی بعض تعلیمات حتیٰ کہ بعض واقعات وکرامات تک بدھ مذہب کی تعلیمات و

---

[1] یہ سوامی دیانند سرسوتی کی تحقیق ہے مگر بعض ہندو محقق اسے تسلیم نہیں کرتے۔ وہ بت پرستی کو بدھ مت یا جین مت کی دین نہیں، ہندومت کا جزو تصور کرتے ہیں

[2] ملاحظہ ہو (Hinduism) ص ۱ اور بدھ مت کے ڈھائی ہزار سال" کا دیباچہ از ڈاکٹر رادھا کرشنن ص ۹، ۱۳۔ اس کے برعکس دھرمانند کوسمبی جیسے بدھ مت کے محقق ومبلغ کا اصرار ہے کہ بدھ مت کا ویدک دھرم سے کوئی تعلق نہیں اس کا تعلق دراصل سادھو سنیاسیوں کے مذہب سے ہے جو آریوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں موجود تھا۔

(بھگوان بدھ صفحہ ۱۲۳، ۱۲۴)

واقعات کا چربہ معلوم ہوتے ہیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ مشابہت محض اتفاقی ہے اور باہم کچھ لین دین نہیں ہوا ہے۔

مسیحیت تو مسیحیت، مسلمانوں نے بھی اپنے دورِ زوال میں بدھ مت کا بہت کچھ اثر قبول کیا ہے۔ افغانستان اور ترکستان وغیرہ ممالک میں بدھ مت کا عام رواج تھا۔ یہی نہیں بدھ بھکشو بدھ مت کے پرچار کے لیے ہر جگہ گھومتے پھرتے تھے۔ یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ مسلمان صوفیا کی اُن سے ملاقات ہوئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بدھ مت سے اسلام کی طرف آنے والے افراد اپنے ساتھ گزشتہ مذہب سے کچھ تخیلات اور اعمال لائے ہوں، اسباب کچھ بھی ہوں، یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ تصوف پر بدھ مت کے گہرے اور نمایاں اثرات ہیں اور اسلامی عنصر کو خارج کر کے تصوف میں جتنا کچھ غیر اسلامی عنصر رہ جاتا ہے اس میں خاصا بڑا حصہ بدھ مت کا ہے۔[1]

اپنی گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے بدھ مت آج بھی بہت سے لوگوں کے لیے پرکشش ہے، بدھ مت میں دقیق فلسفہ، اعلیٰ روحانیت، بلند اخلاقیات اور دیہاتی رسوم وروایات کا امتزاج ہے۔ الفاظ کے عام مذہبی مفہوم کے لحاظ سے، نہ کہ اسلامی مفہوم کے لحاظ سے۔ بغرض وہ سب کچھ ہے جو اہلِ مغرب کو اپیل کرتا ہے، بدھ مت دکھوں سے بھری دنیا کو دکھوں سے نجات کا راستہ دکھاتا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ راستہ صحیح ہے یا غلط۔ تشدد کی ماری ہوئی انسانیت کو عدمِ تشدد (اہنسا) کا پیغام دیتا ہے اور اونچ نیچ اور چھوت چھات پر تنقید کرتا ہے اس لیے پسماندہ اور کچلے ہوئے طبقات اگر اس کے اندر کشش محسوس کرتے ہیں اور ہندوستان کے ہریجن بدھ مت قبول کر رہے ہیں تو اس

---

[1] ڈاکٹر اقبالؒ کا بھی یہی خیال تھا کہ بدھ مت نے مسلمانوں پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بدھ مت اور تصوف کے تقابلی مطالعہ کے بعد اس حقیقت میں شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

میں حیرت کی بات نہیں ہے۔

گوتم بدھ اور اُن کا پیغام

گوتم بدھ کون تھے، وہ کس خاندان میں، کس مقام پر اور کس زمانے میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد حکمران تھے، یا عام شہری، کن اسباب و محرکات کے تحت اور کس حال میں انھوں نے گھر بار چھوڑا، گیان حاصل ہونے سے پہلے وہ کن کن مراحل سے گزرے، ان کی حقیقی تعلیم کیا ہے، انھوں نے اپنے آپ کو کس حیثیت میں پیش کیا اور اپنے مذہب کو پھیلانے کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے، ان کی اپنی زندگی کیا تھی اور بے شمار بدھ فرقوں میں کون سا اصل فرقہ اصل بدھ مت سے قریب تر ہے؟ ان سب سوالات کا صحیح جواب دینا آج بہت مشکل ہے۔ ان میں سے ہر سوال کے ایک سے زائد بعض اوقات کئی کئی جواب ہیں اور تہہ بہ تہہ مذہبی افسانوں، متضاد اور بعید از عقل افسانوں کا ایسا گہرا کہرا چھایا ہوا ہے کہ اصل صورتِ حال کو دیکھنے کی کوئی شکل باقی نہیں رہی ہے۔ ڈاکٹر ہیرولڈ اسمتھ (The Budhist way of Life) (بدھ طریقِ زندگی) میں لکھتے ہیں:

> "جن روایات کا ہم نے خاکہ دیا ہے کیا وہ ہمیں تاریخی گوتم کی حقیقی تصویر دیتی ہیں؟ اس سوال کا جواب دینا کسی طرح بھی آسان نہیں ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مقدس لٹریچر (بدھ مت کے) ارتقا کے ایک طویل عرصے تک ہمیں لے جاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ تحریری ریکارڈ سے پہلے روایات کو زبانی یاد رکھنے کا رواج تھا۔"
>
> (صفحہ ۶۹)

(Budhism-its Essence and Development)

لہ بدھ مت پر ایک جدید مختصر مگر انتہائی جامع کتاب۔

(بدھ مت، اس کا جوہر اور اس کا ارتقاء) کے مصنف ڈاکٹر ایڈورڈ کانزے اس مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں:

"مؤرخ، جو یہ طے کرنا چاہتا ہے کہ بدھ کی حقیقی تعلیمات کیا تھیں، ہزاروں تصنیفی تخلیقات سے دوچار ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ اسے بدھ کی سند (استحقاق) حاصل ہے۔ حالانکہ ان کی تعلیمات ایک دوسرے سے انتہائی مختلف بلکہ متصادم ہیں، بعض با اثر مصنفین نے جو غیر تقلیدی رجحانات کے حامل ہیں، حال ہی اس بات پر زور دیا ہے کہ انسان کو حقیقی بدھ نظریات لازماً اُن تعلیمات میں تلاش کرنا چاہئیں جو گوتم بدھ نے واقعتاً ۵۰۰ قبل مسیح میں دی تھیں، اس نظریے نے کچھ خشونت پیدا کر دی ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ موجود الوقت نوشتوں میں سے قدیم ترین تحریروں تک رسائی بھی غیر یقینی استنتاج اور ظن و گمان ہی سے ہوئی ہے، ان تمام کوششوں کا واحد مقصد صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ایک 'اصلی بدھ مت' کی تعبیر نو کی جائے، یہ سارے مصنفین اس بات پر متفق ہیں کہ بدھ کی حقیقی تعلیم وہ نہیں ہے جو بدھ مت کے ماننے والے سمجھتے ہیں[1]۔ میں نے یہ طے کیا ہے کہ اس کتاب میں اُن بدھ روایات کو بیان کروں جو صدہا سال کے دوران میں جاری و ساری رہی ہیں۔ میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ مجھے

---

[1] اس کے بعد مصنف نے بدھ مت کے مغربی محققین کی کوششوں کا ماحصل بیان کیا ہے کہ کس طرح ہر ایک نے بدھ مت کے کچھ اجزا کو چھوڑ کر اپنے تخیل کے مطابق "اصلی بدھ مت" کی تخلیق کی جو دوسرے محققین کے "اصلی بدھ مت" سے بالکل مختلف ہے۔

یہ نہیں معلوم کہ بدھ مت کا حقیقی پیغام کیا تھا۔" (صفحہ ۲۷)

"ایک اور اہم تقسیم وہ ہے جو سوترا اور شاستر کے درمیان ہے سوتر وہ متن ہے جس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ خود گوتم بدھ کا کہا ہوا ہے۔ بہت سے سوتر بدھ کی وفات کے صدیوں بعد تیار کیے گئے ہیں جن سوتروں کو تاریخی بدھ نے خود نہیں کہا ہے ان کے حقیقی مصنف، قطعاً غیر معلوم ہیں، بعد میں مرتب کیے جانے والے ان سوتروں کی قدر وقیمت کے بارے میں خود بدھ مت کے ماننے والوں میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا اور وہ دو فرقوں میں بٹ گئے، ایک فرقہ کا نام ہنایان ہوا یعنی چھوٹی سواری، اس فرقہ کا نظریہ یہ تھا کہ جو سوتر ۴۸۰ قبل مسیح کے خاصے زمانے کے بعد مرتب کیے گئے ہیں اور اس پہلی کونسل میں، جو بدھ کی موت کے فوراً بعد منعقد ہوئی تھی، پڑھ کر نہیں سنائے گئے تھے۔ وہ مستند نہیں ہو سکتے، وہ بدھ کے اپنے الفاظ نہیں ہو سکتے، شاعری یا جھوٹے افسانوں سے زیادہ اُن کی کوئی حیثیت نہیں ہے، دوسرے فرقے نے، جو مہایان یعنی "بڑی سواری" کے نام سے معروف ہے، تمام تاریخی مشکلات کے علی الرغم یہ دعویٰ کیا کہ بعد کے یہ سوتر بھی بدھ ہی کے منھ سے نکلے ہیں۔" (صفحہ ۲۸، ۲۹)

"شاستر وہ رسالہ ہے جو کسی مصنف کا لکھا ہوا ہو اور جسے نام سے عموماً جانا جاتا ہو، یہ سوتروں کے مقابلہ میں زیادہ سلیقہ و ترتیب کے اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ سوتروں کا حوالہ سند کے طور پر دیتے ہیں۔

بدھوں کی جملہ تصنیفی پیداوار بہت زیادہ تھی، ہم تک اس کے

چند بچے کھچے اجزا ہی پہنچے ہیں، اس لیے بدھ مت سے متعلق ہماری تاریخ ہمیشہ ناقص اور آزمائشی رہے گی۔ تقریباً چار سو سال تک روایات کو صرف زبانی منتقل کیا جاتا رہا۔ زبانی طریق روایات کو ترجیح دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ قدیم ترین دستاویزوں میں سے بہت کچھ تلف ہو چکی ہیں، نوشتوں کے دھرے کے بارے میں بھی ہم کسی حد تک تاریکی میں ہیں، بدھ مت روایات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں صرف چند نام نمایاں ہیں اور ناموں سے بھی کم کچھ تاریخیں ٹھیک طور سے معلوم ہیں۔ لینگلوٹس اور سینیبوز اپنی ٹیکسٹ بک میں جو تاریخی طریق (Historical Method) پر ہے، بیان کرتے ہیں کہ جس دستاویز کا مصنف، تاریخ اور ماخذ معلوم نہ ہو وہ ردّ کر دی گئی ہے، افسوس! جن دستاویزوں پر ہم بُدھ مت کی تاریخ تعمیر کرتے ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر دستاویزوں کا حال یہی ہے، ہندوؤں نے تاریخ سے متعلق تاریخوں سے ہمیشہ تقریباً مکمل بے اعتنائی برتی ہے۔ ہندوستانی بُدھسٹ اس رویہ میں ان کے شریک ہیں، اُن تاریخوں کے سلسلے میں بھی جو بنیادی ہیں، جیسے بدھ کا زمانہ، اُن کے تخمینے بڑی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مغربی محققین بدھ کی وفات کی تاریخ عموماً ۴۸۳ ق م بتلاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں بدھ روایات بہت سی دوسری تاریخیں ہمارے سامنے رکھتی ہیں مثلاً ۸۵۲ ق م یا ۶۵۲ یا ۵۵۲ یا ۳۵۳ حتیٰ کہ ۲۵۲ ق م بھی، تاریخوں کے ایک مضبوط فریم کے بغیر ہم بدھ کی تاریخ میں واقعات کی زمانی تسلسل کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں، اس کی حیثیت خوشنما قیاس آرائی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ دھرم (وہ نوشتے جن میں

بدھ تعلیمات بیان کی گئی ہیں) کی بجائے خود کوئی تاریخ نہیں ہے بدھوں نے (نوشتوں کے سلسلے میں) صرف چند نام محفوظ رکھ چھوڑے ہیں، کیوں کہ بہتر ادوار میں ایک راہب کے لیے یہ ایک بُرا طرزِ عمل تھا کہ وہ تصنیفی تحقیق کے سلسلے میں نام پیدا کرے ان کے لیے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ کوئی چیز کس نے کہی ہے، شرط صرف یہ ہے کہ وہ صداقت پر مبنی ہو، مفید ہو اور روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ہو۔ تخلیق و ایجاد کی ہمت افزائی نہیں کی جاتی تھی اور کسی نوشتہ کے مصنف کے نامعلوم ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اس نوشتہ کو تقدس کا مقام حاصل ہے۔

مزید برآں، ان نوشتوں میں جہاں نام کی نشاندہی کی گئی ہے ان ناموں کو ہمیشہ ان کی شخصیتوں کے ذاتی ناموں کی حیثیت سے نہیں لیا جا سکتا۔ اشوگھوسا، ناگرجونا اور وسو بندھو جیسے افراد کے بڑے ناموں کے ساتھ بسا اوقات اتنا بہت سا تصنیفی کام متعلق کر دیا گیا ہے کہ بعد کی مذہبی روایات بعض اوقات ان کے مصنفین کی عمر بہت سی صدیوں تک دراز کر دیتی ہیں۔ چنانچہ جدید تاریخی تنقید کو ایک نام کے پیچھے مختلف شخصیتوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے میں عظیم دشواریاں پیش آئی ہیں۔" (صلا)

"لیکن اس (تمام چھان بین) کے باوجود ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اہم ترین نوشتوں کی تصنیف و تالیف بھی ایک طویل مدت تک پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے، مہاوستو اور للت وستر جیسی اہم تصانیف بھی ایسے مواد پر مشتمل ہیں جو دو سو قبل مسیح سے چھ سو بعد مسیح کے آٹھ سو سال کے عرصے سے متعلق ہو سکتا ہے۔

عمدہ قانون کا کنول (Lotus of The Good Law) یا تکمیل حکمت

(Perfection of Wisdom) جو آٹھ ہزار سطروں پر
پھیلی ہوئی ہے، جیسی کتاب کے آخری ابواب پہلے باب سے
صدیوں کے بعد کے لکھے ہوئے ہیں۔" (صفحہ ۳۱)

یہ ایک مغربی محقق کی رائے ہے، دوسرے مغربی محققین کی آراء بھی اس سے مختلف نہیں ہیں، ہوسکتا ہے کہ آپ ان آراء میں کچھ تعصب کی بو محسوس کریں، اس لیے بہتر ہے کہ آپ دھرمانند کوسمبی[1] کی طرف رجوع کریں، جو ہندوستانی بھی ہیں اور بدھ مت کے محقق و شیدائی بھی۔

کوسمبی جی کی معرکۃ الآراء کتاب "بھگوان بدھ" اس بات کا برملا اعتراف ہے کہ بدھ مت کی حقیقت نیز گوتم بدھ کی شخصیت من گھڑت افسانوں میں گم ہوگئی ہے وہ بدھ مت کے مذہبی نوشتوں کی روایات کو نقل کرکے بے دھڑک انھیں من گھڑت کہہ دیتے ہیں، لیکن بسا اوقات انھیں من گھڑت افسانوں میں سے صداقت کا کھوج لگانے پر مجبور ہوتے ہیں۔

بدھ کی جسمانی علامتوں کو دیکھ کر پیشین گوئی کرنے کے مفصل تذکرے متعدد بدھ گرنتھوں میں موجود ہیں، کوسمبی جی اس کا ذکر کرکے لکھتے ہیں:

"اس میں کوئی صداقت ڈھونڈنے کی کوشش اس لیے لاحاصل ہے کہ بھگت لوگ بدھ کی عظمت جتانے کے لیے ہمیشہ اس طرح کی باتیں کرتے رہے ہیں۔" (ص ۱۵۴)

---

[1] دھرمانند کوسمبی نے بدھ مت کی صحیح معرفت حاصل کرنے کے لیے سنسکرت اور پالی دونوں زبانوں پر عبور حاصل کیا (بدھ مت کا سرمایہ اکثر و بیشتر پالی زبان میں ہے) انھوں نے اس مقصد سے نیپال، لنکا اور برما کے دور دراز کے سفر کیے اور بدھ گرنتھوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ پھر انھوں نے بدھ مت کے پرچار کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ بدھ مت کی بعض دقیق کتابوں کو ایڈٹ کرنے کے لیے وہ کئی بار امریکہ گئے وہ ایک بار روس بھی گئے تھے۔

بُدھ کے گھر چھوڑنے سے پہلے کے ایک واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

"ندان کتھا ، للت وستر اور بدھ چرت میں اس سلسلے میں بہت خوب صورت تذکرے درج ہیں اور بدھ فنِ مصوری پر ان کا بہت گہرا اثر ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کہانی میں قطعی اصلیت نہیں ہے۔" (صفحہ ۱۷۳)

گیان حاصل ہونے کے بعد گوتم بدھ گوشہ نشین ہونا چاہتے تھے کہ برہما نے آکر درخواست کی کہ وہ دھرم کے پرچار کے لیے اٹھ کھڑے ہوں ، کوسمبی جی اس کے بارے میں لکھتے ہیں :

"یہ کہانی بڑی تفصیل کے ساتھ مہا وگ ، اور مجھم نکائے کے اریہ پریہ سن سُتّ میں درج ہے ، لیکن یہ کہانی گوتم بدھ کے بارے میں نہیں ہو سکتی ، یہ کہانی وِپسّی بدھ کے بارے میں کسی مصنف نے گھڑی ہو گی اور پھر اسے جوں کا توں گوتم بدھ کے سوانح سے منسلک کر دیا گیا ہو گا۔" (بھگوان بدھ صفحہ ۲۰۲)

گیان حاصل ہونے سے پہلے گوتم بدھ نے کس کس طرح کی تپسیائیں کیں ، بدھ گرنتھوں میں خود بدھ کی زبانی اس کی تفصیل آئی ہے۔ کوسمبی جی چند صفحات میں اس کا خلاصہ بیان کرنے کے بعد اپنی رائے ظاہر فرماتے ہیں :

ـــه بدھ مت میں گوتم بدھ سے پہلے چھ بدھ اور مانے گئے ہیں سِکھی ، وِپسّی ، وِسبھو ، ککوسندھ ، کوناگن اور کسپ (یہ شخصیتیں تاریخی نہیں ہیں) "مہاپدان سُت" میں ان سب کے حالاتِ زندگی مجملاً بیان کیے گئے ہیں اور وِپسّی بدھ کی محیر العقول داستانِ حیات بہت تفصیل سے گوتم بدھ کی زبانی ہے۔ ان کی عمر اسی ہزار سال بیان کی گئی ہے۔
(بھگوان بدھ صفحہ ۲۰۸ ، ۲۰۹)

"کہنے کی ضرورت نہیں کہ بدھ کے زمانے میں مروجہ تمام مختلف تپسیاؤں کی لغویات پیش کرنے کے لیے سُت کے مصنف نے متذکرہ باتیں بھگوان کی زبان سے کہلوائی ہیں" (صفحہ ۱۱۶)

بدھ کے چیلوں کی انتہائی مبالغہ آمیز تعداد پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

"بدھ دھرم کی زوال کی اہم وجہ یہی تھی کہ اپنے دھرم اور اپنی جماعت کی اہمیت بڑھانے کے لیے بودھ بھکشوؤں نے بے سر پیر کی داستانیں گھڑنا شروع کر دیں اور برہمنوں نے اُن سے بھی زیادہ عجیب وغریب داستانیں گھڑ کر بھکشوؤں کو شکستِ فاش دے دی" (صفحہ ۲۲۵)

یہ گوتم بدھ کے شیدائی اور بدھ مت کے ایک محقق اور مبلغ کے ریمارک ہیں۔

"بھگوان بدھ" اوّل سے آخر تک اس طرح کے ریمارکس سے بھری ہوئی ہے۔ یہی نہیں، کوسمبی جی نے ثابت کیا ہے کہ گوتم بدھ کی زندگی کے تمام مشہور واقعات افسانوی اور مشکوک ہیں اور پھر ان من گھڑت افسانوں کے تہہ بہ تہہ پردوں ہی سے حقیقت کا نیا چہرہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔

یہ ہے من گھڑت افسانوں میں گوتم بدھ کی شخصیت اور ان کے پیغام کے گم ہو جانے کی دردناک داستان! — مذاہبِ عالم میں یہ فضیلت صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس کی تعلیمات من وعن محفوظ ہیں اور اس کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آن کے پاک باز ساتھیوں کی زندگیاں تاریخ کی پوری روشنی میں ہیں۔

چار مقدس صداقتیں

گوتم بدھ کی حقیقی تعلیمات کیا تھیں، بظاہر اب اس بات کے جاننے کی

کوئی سبیل نہیں ہے، اس لیے بدھ مت جیسا کچھ اس وقت ہے، ہمیں اسی کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔

بدھ مت کے پیرو آج ہی نہیں، زمانے سے بہت سے فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا بدھ مت دوسرے سے مختلف ہے تاہم کچھ بنیادی باتیں مشترک بھی ہیں ان مشترک باتوں میں اہم ترین اور مشہور ترین چیز چار مقدس صداقتیں (Four Holy Truths) جو بدھ مت کی بنیاد تسلیم کی جاتی ہیں، ڈاکٹر ایڈورڈ کانز سے لکھتے ہیں:

"بدھ کی تعلیم کا جوہر جو (بدھ مت کے) تمام مکاتبِ فکر کے نزدیک مسلم ہے، چار مقدس صداقتوں کی شکل میں ترتیب دیا گیا ہے، یہ وہ صداقتیں ہیں جن کی تبلیغ بدھ نے گیان حاصل ہونے کے فوراً بعد بنارس میں دی تھی۔ ہم پہلے اس بنیادی تعلیم کا فارمولا دیں گے، پھر اس کی تشریح کریں گے۔

۱ : غم کے بارے میں مقدس صداقت کیا ہے؟ پیدائش غم ہے: بڑھاپا غم ہے، بیماری غم ہے، موت غم ہے، جسے کوئی شخص پسند نہ کرتا ہو اس کا ساتھ ہونا غم ہے، جسے کوئی شخص پسند کرتا ہو اس سے جدائی غم ہے، مطلوبہ شئے کو نہ پانا غم ہے۔

۲ : غم کی پیدائش کے بارے میں مقدس صداقت کیا ہے؟ غم کا سبب وہ خواہش ہے جو دوبارہ جنم کا موجب بنتی ہے، خواہش جس کے ساتھ مسرت اور ہوا و ہوس لگے ہوئے ہیں، جو مسرت اور خوشی کو یہاں اور وہاں ڈھونڈتی پھرتی ہے، مثلاً حواس کے ذریعے محسوس کرنے اور لطف اندوز ہونے کی خواہش، اپنے آپ کو زندہ و جاوید بنانے کی خواہش، فنا کی خواہش۔

۳ : تمام غموں کو ختم کرنے کے سلسلے میں مقدس صداقت کیا ہے؟

خواہش کو مکمل طور پر ختم کر دینا، خواہش سے دست بردار ہو جانا۔ خواہش کو ترک دینا، خواہش کو پسِ پشت ڈال دینا۔ خواہش سے نجات حاصل کرنا اور اس سے تعلق منقطع کر لینا۔

۴ : اقدامات جو تمام غموں کے خاتمے کا موجب بنیں، ان کے بارے میں مقدس صداقت کیا ہے؟ حسبِ ذیل امور پر مشتمل ہشت پہلو مقدس راستہ ہے:

۱ : صحیح اعتقاد	۲ : صحیح نیت
۳ : صحیح قول	۴ : صحیح رویہ
۵ : صحیح ذریعۂ معاش	۶ : صحیح جدوجہد
۷ : صحیح لحاظ	۸ : صحیح مراقبہ

(بدھ ازم، صفحہ ۴۳)

یہ ہیں "چار مقدس صداقتیں" دھرمانند کوسمبی اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"کوئی بھی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا میں غم ہے، لیکن ہر شخص یہی سوچتا رہتا ہے کہ اس کا غم کیوں کر دور ہو گا، نتیجہ کے طور پر ہر کوئی دوسرے کو تباہ کر کے خود سکھی ہونا چاہتا ہے۔ ہر شخص کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ اس کا اور دوسروں کا غم مشترک ہے، یہی وجہ تھی کہ بھگوان بدھ نے پہلی بنیادی صداقت کی بنیاد٭ عمومی غم پر رکھی۔

بھگوان بدھ نے سب سے پہلے اس صداقت کا انکشاف کیا کہ غم کا حقیقی سبب روح یا فطرت نہیں، بلکہ انسانی تشنگی یا خواہشات

٭ بدھ مت کی رو سے دیوتا بھی غم سے محفوظ نہیں ہیں، ساری موجودات غم کی لپیٹ میں ہے۔

ہیں، پچھلے جنم یا اس جنم کی خواہشات کی وجہ سے ہی غم پیدا ہوتا ہے۔ جب تک خواہشات ہیں تب تک غم پیدا ہوتا رہے گا۔ تیسری بنیادی صداقت یہ ہے کہ خواہشات کا خاتمہ کرنے سے ہی انسان غم سے نجات حاصل کرسکتا ہے اور خواہشات کے خاتمے کا ذریعہ ہے۔ دو انتہاؤں[1] کے بیچ میں سے گزرنے والا اعلیٰ واشرف ہشت پہلو درمیانی راستہ ــ یہ چوتھی بنیادی صداقت ہے۔" (بھگوان بدھ، صفحہ ۲۰۶ تا ۲۰۸)

ہشت پہلو راستہ کے بعض پہلوؤں کی مختصر تشریح ڈاکٹر کانز سے اس طرح کرتے ہیں:

"ہشت پہلو راستہ جن اعمال پر مشتمل ہے اُن پر آئندہ ابواب میں تفصیل سے بحث ہوگی، یہاں اتنا نوٹ کرنا کافی ہوگا کہ صحیح اعتقاد کا مطلب ہے چار بنیادی صداقتیں، صحیح نیت کا مطلب ہے اپنی خودی کی نفی اور دوسروں کی فلاح وبہبود کی خواہش جس کی تشریح بدھ گھوسا نے تین اصطلاحوں میں کی ہے:

۱: ترکِ دنیا، ۲: عدمِ عداوت اور ۳: عدمِ تشدد۔

صحیح جدوجہد کا مطلب ہے کہ تمام مضر اور غلط باتوں کو چھوڑ کر ایسے احوال کو نشوونما دینا جو مفید اور صحیح ہوں۔"

(بدھ ازم صفحہ ۴۸)

ہشت پہلو راستہ کے بعض دوسرے پہلوؤں کی تشریح کوسمبی جی کی

---

[1] ایک انتہا ہے عیش وعشرت کی زندگی میں راحت ماننا۔ دوسری انتہا (تپسیا کرکے) جسم کو ایذا پہنچانے کی ہے۔ ہشت پہلو راستے کے تمام پہلو ان دو انتہاؤں کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ (بھگوان بدھ صفحہ ۲۱۰)

زبانی سے نیچے:

"دروغ گوئی چغلی، گالی، فضول گوئی وغیرہ بدکلامی کے باعث سماج کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ لہٰذا ہمیشہ صحیح اور شیریں کلامی سے کام لینا چاہیے۔ اس کو نیک قول (صحیح قول) کہتے ہیں۔ قتل، چوری، زنا وغیرہ افعال سے دور رہ کر ایسے جسمانی اعمال کرنا چاہئیں جن سے لوگوں کی فلاح ہو، اسی کو نیک فعل (صحیح رویہ) کہتے ہیں نیک ذریعۂ معاش کا مطلب ہے۔ ایسے ذرائع زندگی اختیار کرنا جن سے سماج کو نقصان نہ پہنچے۔ جو برے خیالات دل میں پیدا نہ ہوئے ہوں، انھیں پیدا ہونے کا موقع نہ دینا۔ جو برے خیالات دل میں پیدا ہو چکے ہوں انھیں نکال باہر کرنا، جو نیک خیالات دل میں پیدا نہ ہوئے ہوں انھیں پیدا کرنے اور جو نیک خیالات دل میں پیدا ہو چکے ہوں انھیں بڑھاوا دینے کی کوشش کرنا۔ ان چار ذہنی کوششوں کو نیک ورزش یا نیک کوشش (صحیح جدوجہد) کہتے ہیں۔ جسم ناپاک اجزاء سے بنا ہے، اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا۔ جسمانی دکھوں اور سکھوں کا بار بار جائزہ لینا، ذہنی میلانات کا جائزہ لینا اور حواس خمسہ پر کڑی نگاہ رکھنا۔ یہ نیک خیال (صحیح لحاظ) ہے اپنے جسم پر، مردہ جسم پر، ذہنی میلانات پر اور مٹی، پانی، آگ، ہوا۔ وغیرہ عناصر ترکیبی پر ذہن مرکوز کر کے چار مراقبے کرنا ہی نیک مراقبہ ہے۔" (صفحہ ۲۰۸، ۲۱۰)

بدھ مت کی بنیادی تعلیم کی یہ بہت ہی مختصر اور حد درجہ سادہ تشریح ہے۔ اس کی مفصل تشریح کے لیے بلا مبالغہ ہزارہا صفحات درکار ہیں۔ تفصیل میں جاتے ہی نہ صرف یہ کہ بے شمار اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں

بلکہ یہی سادہ اور مختصر سی بات انتہائی طویل وعریض اور دقیق و پر پیچ بن جاتی ہے، اس قدر دقیق وپُر پیچ کہ انسانی عقل اس کی بھول بھلیوں میں پھرتے پھرتے تھک جاتی ہے۔ یہی نہیں، یہ تعلیم جو مختصر ہونے کی صورت میں بظاہر مربوط نظر آتی ہے، تفصیلات میں جانے کے بعد تضادات کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ تضاد کو ایک مسلمہ حقیقت بلکہ مطلوبہ شے کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ دقیق فلسفیانہ مباحث کے ساتھ روحانیت کے پیچ در پیچ اور غامض مسائل بھی یکے بعد دیگرے آ کھڑے ہوتے ہیں اور کشف و اشراق، مشاہدہ و مراقبہ، حقیقت و معرفت، نفیٔ ذات، نفیٔ شعور وحدت الوجود اور انا الحق اور ارادتِ شیخ و باطنیت جیسے امور پر مشتمل ایک عظیم روحانی نظام وجود میں آجاتا ہے۔

فلسفیہ اور روحانیت کی بلند پروازیوں کے ساتھ مذہبی توہمات، مشرکانہ دیومالائیت (Mythology) اور گوتم بدھ اور دوسرے حقیقی و فرضی موجودات کی پرستش کا لامتناہی چکر چل پڑتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ جنتر، منتر، ٹوٹنے ٹوٹکے اور جادو کا ایک پورا طلسماتی سسٹم اپنی مادی و روحانی الوہیت و اہمیت کے ساتھ بدھ مت میں شامل ہو جاتا ہے اور آج ان تمام رطب و یابس کے مجموعہ کا نام بدھ مت[1] ہے۔ اس بدھ مت کی ہلکی سی جھلکی آپ کو آئندہ صفحات میں نظر آئے گی۔

بدھ مت اور انکارِ خدا

"چار بنیادی صداقتوں" میں خدا کو تسلیم کیے بغیر اور اس کی پرستش و بندگی اور اس کے قانون کے اتباع کے بغیر انسانی دکھوں کا علاج تجویز کیا گیا ہے،

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے (Budhism its Essence and Development)

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ بدھ مت کی بنیاد انکارِ خدا پر ہے اور گوتم بدھ ملحد تھے؟ یہ ایک اہم سوال ہے اور آگے بڑھنے سے پہلے اس سوال کو حل کر لینا ضروری ہے۔

ایڈورڈ کانزے اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"بسا اوقات یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ بدھ مت ایک ملحدانہ طریق فکر ہے، اس مفروضہ نے بہت سے مباحث کھڑے کر دیے ہیں، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ چونکہ بدھ مت خدا کو نہیں جانتا اس لیے وہ مذہب نہیں ہو سکتا، کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ بدھ مت صریحاً ایک مذہب ہے جو خدا کو نہیں جانتا، اس لیے خدا پر یقین مذہب کا لازمی جزو نہیں ہے، ان مباحث میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ "خدا" ایک غیر مبہم اصطلاح ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس سیاق و سباق میں ہم اس اصطلاح کے کم از کم تین معنی بتا سکتے ہیں۔ اولاً ایک شخصی خدا ـــــ (Personal Gods) جس نے کائنات کو پیدا کیا۔ دوسرے گاڈہیڈ[1] (God heads) جسے غیر شخصی یا فوق شخصی تصور کیا جاتا ہے تیسرے دیوتاؤں (Gods) کی تعداد یا فرشتوں کی جو دیوتاؤں سے واضح طور پر ممتاز نہیں ہیں

۱: جہاں تک پہلے مفہوم کا تعلق ہے، بدھ مت کی روایات خالق کے وجود کا صاف انکار نہیں کرتیں البتہ وہ اس معاملہ میں دلچسپی

---

[1] افسوس کہ ہم اردو میں اس لفظ کا مترادف نہیں پا رہے ہیں، اس لفظ کے معنی خدا کے بھی ہیں اور الوہیت کے بھی۔ مگر یہاں اس سے مراد ایسا خدا ہے جو شخصیت ہونے کے بجائے صفت ہے۔

بھی نہیں رکھتیں کہ کائنات کو کس نے پیدا کیا ہے۔ بدھ مت کے نظریہ کا مقصد یہ ہے کہ موجودات کو غم سے نجات ملے اور کائنات کی پیدائش سے متعلق قیاسات سے وقت ہی برباد نہیں ہوتا بلکہ یہ لوگوں کے درمیان عداوت و نزاع کا موجب بن سکتے ہیں اور اس طرح غم سے نجات کے مقصد کو پسِ پشت ڈالنے کا باعث بن سکتے ہیں گویا بدھ مت کے ماننے والے شخصی خالق کے مسئلہ میں لا ادریت (Agnosticism) کا رویہ اختیار کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ برہما پر ـــ خدا[1] جس نے برہمنوں کی مذہبی روایات کی رو سے کائنات کی تخلیق کی ـــ بدھ کی فوقیت جتانے سے ذرا بھی نہیں ہچکچاتے[2] تھے۔ وہ خدا برہما کی اس طرح تصویر کشی کرتے ہیں کہ وہ غرور کا شکار ہو گیا تھا کیوں کہ اس نے اپنے بارے میں یہ خیال کیا:

"میں برہما ہوں! میں مہا برہما ہوں! دیوتاؤں کا بادشاہ! میں غیر مخلوق ہوں! میں نے دنیا کو پیدا کیا ہے! میں دنیا کا مقتدرِ اعلیٰ

---

[1] واضح رہے کہ برہما پرمیشور یا خدائے اعظم کے ہم معنی نہیں ہے۔ ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق برہما وہ دیوتا ہے جسے کائنات کی تخلیق سے قبل پرمیشور نے پیدا کیا اور اس نے کائنات کو۔ منوسمرتی میں ہے "جو پرماتما سب کا باعث ولپوشیدہ ہمیشہ قائم اور فاعلِ مطلق ہے اس نے جس شخص کو دنیا میں پہلے پیدا کیا اسی کو سب لوگ برہما کہتے ہیں" (ادھیائے ۱-۱۱)

[2] بدھ مت کے پیرو بدھ کو خدائے اعظم کا مقام دیتے ہیں اس لیے اس طرح کی باتوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کا انکار کرتے ہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے خدائے اعظم کو ہندوؤں کے برہما سے برتر خیال کرتے ہیں۔

ہوں! میں تخلیق کر سکتا ہوں! میں اُلٹ پلٹ کر سکتا ہوں میں جنم دے سکتا ہوں! میں تمام چیزوں کا باپ ہوں!

بدھوں کی مذہبی کتابیں اس بات کی نشاندہی میں پیچھے نہیں ہیں کہ "ما تا گاٹا"[1] اس طرح کے بچکانہ تصورات سے مبّرا ہے[2]۔ اگر کائنات کے شخصی خالق سے بے اعتنائی الحاد ہے تو بدھ مت یقیناً ملحدانہ ہے۔

۲: ہم آج کل الڈوئیس ہکسلے کی تحریروں کے ذریعہ خدا اور گاڈ ہیڈ کے درمیان جو پرنیسپل فلاسفی کی بنیادی شے ہے، فرق سے مانوس ہیں۔ مسیحی فکر کی زیادہ متصوفانہ اور باطنی (Mystical) روایات ہیں، گاڈ ہیڈ کی جو صفات تصور کی گئی ہیں جب ہم ان کا مقابلہ نروان (نجات، بدھ مت کے تصور کے مطابق) کی صفات سے کرتے ہیں تو ہم ان دونوں میں کوئی فرق نہیں پاتے[3]۔ یقیناً یہ بات صحیح ہے کہ نروان کا کائنات میں کوئی کام نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ (بدھ مت کی رو سے) یہ دنیا خدا کی دنیا نہیں ہے یہ ہماری اپنی ہوا و ہوس اور حماقت کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ لیکن دوسری طرف ہم سے کہا گیا ہے کہ نروان دائمی ہے، محکم ہے، غیر فانی ہے اور امر ہے، غیر متغیر ہے، اس

---

[1] بدھ [2] ان الفاظ سے بھی خالقِ کائنات کا انکار نہیں نکلتا۔ یہ صرف برہمنوں کے تصورِ خدا پر چوٹ ہے۔ بدھ مت کی رو سے کمال نام ہے خودی کی نفی کا اور برہما کے مذکورہ بالا خیالات میں خودی کا مظاہرہ ہے۔ تنقید اسی مظاہرۂ خودی پر کی گئی ہے نہ کہ نفسِ خالقیت پر! [3] نروان حاصل ہونے کے معنی بدھ مت میں حقیقتاً یہ ہیں کہ انسان میں خدائی صفات پیدا ہو جائیں۔ اسی لحاظ سے مصنف نے نروان اور گاڈ ہیڈ کو ہم معنی قرار دیا ہے۔

پر وقت کا اثر نہیں ہوتا، اس پر موت طاری نہیں ہوتی، وہ کبھی پیدا نہیں ہوا (ازلی ہے) اس پر حالات طاری نہیں ہوتے، وہ قوت ہے، سعادت اور مسرت (آنند) ہے، محفوظ جائے پناہ ہے، ملجا و ماویٰ ہے۔ ایسی حفاظت کی جگہ ہے جسے خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا کیوں کہ وہ حقیقی صداقت اور اعلےٰ ترین حقیقت ہے، کیوں کہ وہ خیر ہے، وہ اعلےٰ ترین منزل مقصود اور مطمحِ نظر ہے (Goal) وہ ایک ہے، ہماری زندگی کی واحد غایت ہے، دائمی و ابدی ہے، مخفی ہے اور ناقابلِ فہم سکون و طمانیت ہے۔

علیٰ ہٰذا القیاس بدھ، جو کہ نروان کا جسمانی ظہور ہے، ان تمام جذبات کا موضوع بن جاتا ہے جنھیں ہم مذہبی کہنے کے عادی ہیں۔

۳: اب ہم شرک کے پرُخار موضوع پر آتے ہیں:

جن آبادیوں نے بدھ مت کو قبول کیا، ان میں تقریباً تمام سرگرمیاں اپنے پیچھے بخت و اتفاق کا بہت بڑا عنصر رکھتی تھیں اور اسی لیے دیوتاؤں کی بہت بڑی تعداد سے تحفظ و امداد طلب کی جاتی تھی۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو۔ بدھوں کو بہت سے دیوتاؤں کی پرستش پر کوئی اعتراض نہیں ہے، ایک غیور[1] خدا کا تصور ان کے لیے بالکل نامانوس ہے۔ پھر ان کی رگ و پے میں یہ عقیدہ بھی سرایت کر گیا ہے کہ ہر شخص کی ذہنی بصیرت محدود ہے، اس لیے ہمارے لیے یہ جاننا بہت مشکل ہے کہ ہم کب حق

---

[1] جس کی غیرت دوسروں کی خدائی کو برداشت نہ کرے۔

پر ہیں اور یہ بات تو عملاً ناممکن ہے کہ ہمیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ دوسرا آدمی باطل پر ہے۔ کیتھولک کی طرح بدھ مت کے ماننے والے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ عقیدہ کو اسی وقت زندہ رکھا جا سکتا ہے، جب کہ اسے متوسط انسان کی ذہنی عادات کے مطابق اختیار کیا جائے، نتیجہ یہ ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بدھ نوشتوں میں برہمن مت کے دیوتاؤں کو مسلمہ کے طور پر مان لیا گیا ہے اور بعد کے ادوار میں بدھوں نے ہر اس ضلع کے مقامی دیوتاؤں کو اپنایا جہاں وہ پہنچے۔

اگر الحاد کسی خدا کے وجود سے انکار کا نام ہے تو یہ بات بہت زیادہ غلط فہمی پیدا کرنے کی موجب ہو گی کہ بدھ مت کو ملحدانہ بیان کیا جائے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بدھ ذہن کو توحید نے کبھی اپیل نہیں کیا۔ (بدھوں میں) کائنات کی اصل وعلت کے سلسلے میں کبھی کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی ہوا ایک استثناء کے۔ تقریباً ۱۰۰۰ء میں ہندوستان کے شمال مغربی حصہ میں بدھوں کا سابقہ اسلام کی فاتحانہ قوتوں سے ہوا۔ اس خواہش میں کہ وہ سب لوگوں کے لیے سب کچھ بن سکیں، اس علاقے میں کچھ بدھوں نے اپنے مذہبی تصورات کو ایک "آدی بدھ" کے تصور سے ٹھیک ٹھاک کیا۔ "آدی بدھ" ایک قسم کا قادر مطلق اور عارف کل قدیم بدھ ہے۔ جس نے اپنے مراقبہ سے کائنات کا آغاز کیا۔ یہ نظریہ نیپال اور تبت کے کچھ فرقوں نے اپنایا"۔ (صفحہ ۴۱ تا ۴۳)

دھرمانند کوسمبی جی نے بھی اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے، اس کے بعض اجزاء ملاحظہ ہوں۔

"بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بھگوان بدھ خدا کو نہیں مانتے تھے۔ اس لیے وہ دہریہ تھے، لیکن بدھ ادب یا قدیم اپنشدوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خیال بے بنیاد ہے۔ خاص ایشور (خدا) کے لفظ کا ذکر انگتر نکائے کے تِک نپات (ست ۱۴۱) میں اور مجھم نکائے کے دیودھن (ست ۱۰۱) میں آیا ہے۔

بدھ کے زمانے میں سب سے بڑا دیوتا برہما مانا جاتا تھا لیکن وہ ایک الگ نوعیت کا خالق ہے۔ تخلیقِ کائنات سے قبل اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ کائنات کے وجود میں آنے پر سب سے پہلے وہ ظہور پذیر ہوا اور پھر دوسرے جاندار پیدا ہوئے اس جملہ میں مختصر طور پر برہم دیو (برہما) سے متعلق متذکرہ بالا تصور آجاتا ہے اور اس سے برہم دیو کو خالقِ کائنات بنانے کی برہمنوں کی کوشش واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔"

(بھگوان بدھ صفحہ ۲۷۹ تا ۲۸۱)

"برہمن لوگ اُن پر الزام دھرتے تھے کہ چوں کہ وہ ویدوں کی مذمت کرتے تھے، اس لیے دہریہ[1] (ناستک) تھے، لیکن بُدھ نے کبھی ویدوں کی مذمت کی ہو، ایسا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ بدھ اس لیے مطعون قرار دیے گئے کہ انھوں نے برہمنوں کے نسلی امتیاز پر کاری ضرب لگائی تھی، ویدوہی نسلی امتیاز ہے اور نسلی امتیاز ہی وید۔" (بھگوان بدھ، ۲۸۳)

---

[1] بہت سے ہندو محققین کے نزدیک، ناستک کے معنی ہیں۔ وید کا منکر اور آستک کے معنی وید کا ماننے والا۔

ان اقتباسات سے، نیز بدھ مت سے متعلق دوسری چیزوں کو سامنے رکھنے سے حسبِ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱: گوتم بدھ برہمنوں کے نسلی امتیاز کے خلاف تھے۔ اس سے برہمنوں نے دہریہ اور وید کا مخالف مشہور کر دیا حالانکہ انھوں نے کبھی وید کی مذمت نہیں کی تھی، ہاں انھوں نے ویدک دھرم کی بعض تعلیمات پر تنقید ضرور کی تھی۔ مثلاً نسلی امتیاز، یگیہ اور یگیوں میں جانوروں کی اندھا دھند قربانی۔

۲: برہمن اپنے سب سے بڑے دیوتا، برہما، کو خالقِ کائنات کے مقام پر فائز کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور "بدھ مت" "برہما" کے مقام کو کچھ گراتا نظر آتا ہے۔ اس سے بھی لوگوں کو غلط فہمی ہوئی۔ حالانکہ بدھ مت نے برہمنوں کے دیوتا برہما پر[۱] ضرور تنقید کی ہے مگر خالقِ کائنات کا انکار کبھی نہیں کیا۔

۳: چار مقدس صداقتوں کو اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ اس میں خدا کی ضرورت کہیں پیش نہیں آتی۔ اس سے گوتم بدھ کا ذہن یہ سامنے آتا ہے کہ وہ الٰہیاتی اور مابعد الطبیعاتی مسائل و مباحث سے دامن بچا کر نکل جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے دنیا کے فانی و غیر فانی ہونے اور جسم و روح کے مسائل پر بحث کرنے سے بھی اسی لیے گریز کیا گیا ہے۔

(بھگوان بدھ صفحہ ۲۷۶ تا ۲۷۸)

مگر خدا ہے یا نہیں اور ہے تو ایک یا کئی، اور انسان سے اس خدا یا خداؤں کا کیا تعلق ہے۔ یہ انسانی زندگی کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے اور اس سے گریز ممکن نہیں، گوتم بدھ فی الواقع ملحد تھے یا موحّد یا مشرک، اس کا صحیح علم تو اللہ کو ہے مگر تحقیق سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ

---

[۱] یوں بدھ گرنتھوں میں برہما کا ذکر دیوتا کی حیثیت سے آتا ہے تفصیل آگے آتی ہے۔

گوتم بدھ نے نہ تو خدا کا انکار کیا اور نہ شرک کی مذمت کی۔ اگر بدھ روایات کو جوں کا توں تسلیم کر لیا جائے تو انھوں نے خود شرک کی تعلیم دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مذہب، جو مابعد الطبیعاتی مسائل اور الٰہیاتی مباحث سے دامن بچا کر گزر جانا چاہتا تھا وہ سر تا پا شرک میں غرق ہو گیا۔ ہندو میتھالوجی کو اپنانے کے علاوہ اس نے ہر علاقے کے مقامی دیوتاؤں کو اپنایا، خود گوتم بدھ کو خدائی کا بلکہ آگے بڑھ کر خدائے اعظم کا مقام دے دیا گیا۔ پھر بدھ اور بدھی ستو کے نام سے بہت سی شخصیتیں فرض کی گئیں اور ان سب میں خدائی صفات مان لی گئیں۔ حتیٰ کہ بدھ مت کی اپنی مشرکانہ میتھالوجی اور مشرکانہ نظام پرستش تیار ہو گیا جو کسی بھی دینِ شرک سے کم شاندار نہیں ہے اور یہ سب کچھ گوتم بدھ کی زبانی کیا گیا اور ان کے نامۂ اعمال (بدھ گرنتھوں) میں لکھ دیا گیا۔

ہندو دیوی دیوتا

بدھ مت میں بنیادی طور پر ایک خدا کو تسلیم کیا گیا ہے یا ایک سے زائد خداؤں کو؟ "ایڈورڈ کانزے" کے مندرجہ ذیل الفاظ سے اس پر روشنی پڑتی ہے:

> "آج کل ہم زندگی کی تین قسموں کو پہچانتے ہیں، انسان، جانور، پودے، بدھ روایات چھ قسمیں بتاتی ہیں، دیوتا (Gods) اسور کو (آسمانی شیاطین)، آدمی، بھوت، جانور، پاتال، کچھ مصنفین اسور کو حذف کر کے پانچ دنیائیں بتلاتے ہیں، تفصیلات میں بہت کچھ اختلاف ہے، لیکن تمام مکاتبِ فکر کے نزدیک یہ عمومی تقسیم مسلم ہے۔" (صفحہ ۵۰)

اس سے معلوم ہوا کہ دیوتاؤں کا وجود بدھ مت میں بنیادی طور پر مسلم ہے۔ یہ دیوتا عموماً ہندو مت سے لیے گئے ہیں۔ "بدھ کے ڈھائی ہزار سال"

کے دیباچے میں ڈاکٹر رادھا کرشنن فرماتے ہیں :

"بدھ نے مابعد الطبیعات اور اخلاقیات کے بنیادی اصولوں میں کچھ اپنے اس (ہندو) عقیدے سے اتفاق کیا جو انھوں نے ورثہ میں پایا تھا، البتہ انھوں نے بعض رسوم و اعمال کے خلاف احتجاج کیا جو اُس دور میں عام طور پر رائج تھے۔" (iii x P)

ایڈورڈ کانز سے اپنی تصنیف "بدھ ازم" میں فرماتے ہیں :

"چار مقدس صداقتیں بدھ مت کے مخصوص مذہبی تصور کا جوہر بیان کرتی ہیں، رہی کائنات تو اس کی تخلیق اور ارتقاء سے متعلق اپنے نظریات میں بدھ لوگ اپنے معاصر ہندو مت کی روایات کو مستعار لینے پر قانع ہیں۔" (صفحہ ۴۸، ۴۹)

بدھ گرنتھوں میں ہندو دیوی دیوتاؤں کے چند تذکرے ملاحظہ کیجئے :

"گوتم بدھ کی پیدائش کے بارے میں "سُت پٹاٹ" کے "نالک ست" کے دیباچے میں ہے :

"خوب صورت لباس پہن کر اور اندر (ہندو دیوتا) تعاظم مدارات کر کے دیوتا اپنا لباس اُچھال اچھال کر جشن منا رہے تھے۔"

(بھگوان بدھ صفحہ ۱۵۵)

کام دیو (شہوانی خواہشات کا دیوتا) اور گوتم بدھ کی جنگ کے مفصل تذکرے بدھ چرت، (بدھ کی سوانح) اور دوسرے بدھ گرنتھوں میں ملتے ہیں اور مصوروں نے بودھ مصوری میں ان مناظر کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ (بھگوان بدھ، صفحہ ۱۹۳ تا ۱۹۹)

پہلی جنگ کا ایک منظر ملاحظہ ہو :

"چاروں طرف کام دیو کی فوج نظر آ رہی ہے، اس سے جنگ کرنے کے لیے میں آگے بڑھتا ہوں تاکہ وہ مجھے

گمراہ نہ کر سکے (رہزانہ سکے) دیوتا اور انسان تمھاری فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے، لیکن میں اپنے علم کی مدد سے اُسے یوں ہرا سکتا ہوں جیسے مٹی کا برتن توڑ دیا جاتا ہے۔"

(بھگوان بدھ، صفحہ ۱۹۶، بحوالہ ست پنات کا پدھان ست)

دوسری جنگ کا بھی ایک منظر پیش نظر ہے:

"جاتک کی ندان کتھا میں بڑی تفصیل سے اس کا ذکر ملتا ہے کہ اس موقع پر کام دیو کی فوج نے کس طرح چاروں طرف سے بدھ پر دھاوا بول دیا، کام دیو کی فوج کو دیکھ کر برہما وغیرہ دیوتا بھاگ جاتے ہیں اور تنہا بدھی ستوا ہونے والے بدھ) وہاں رہ جاتے ہیں۔ پھر کام دیو بدھ سے کہتا ہے، یہ میری جگہ ہے، تم یہاں سے چلے جاؤ اور اپنا حق ثابت کرنے کے لیے کام دیو اپنی فوج کی شہادت دلواتا ہے۔ تمام دیوتا چونکہ بھاگ گئے تھے، اس لیے بدھ کی طرف سے شہادت دینے والا وہاں کوئی نہ تھا، یہ دیکھ کر بھگوان بدھ اپنا دایاں ہاتھ نیچے کی طرف کر کے کہتے ہیں، یہ پرتھوی (زمین) میری گواہ ہے اور پرتھوی دیوی اپنا بھیانک روپ دھار کے کام دیو کی فوج کو ہرا دیتی ہے۔" (بھگوان بدھ، صفحہ ۱۹۸)

گیان حاصل ہونے کے بعد گوتم بدھ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ یہ فلسفہ زندگی میں نے بہت تکالیف برداشت کر کے حاصل کیا ہے لہٰذا لوگوں کو درس دینے میں مزید تکالیف برداشت کرنا مناسب نہیں ہے، برہم دیو (برہما) نے یہ خیال جان لیا اور بدھ سے اپنی تعلیمات کا درس دینے کی درخواست کی۔ یہ کہانی بڑی تفصیل کے ساتھ "مہاوگ" اور مجھم نکائے کے اریہ پریہ سن ست، میں درج ہے۔ (بھگوان بدھ، صفحہ ۲۰۲)

دھرمانند کوسمبی نے کسی دلیل کا ذکر کیے بغیر اس کہانی کی صحت سے انکار کیا ہے، لیکن اُن سمیت کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ یہ کہانی مستند بدھ گرنتھوں میں موجود ہے اور اس قدر معروف ہے کہ بدھ مذہب پر لکھنے والے بیشتر مصنفین نے اس کا ذکر کیا ہے۔

اسی طرح کی ایک کہانی مہاپدان ست میں ولپتی بدھ کے بارے میں خود گوتم بدھ کی زبانی نقل کی گئی ہے۔ اس کا ایک منظر ملاحظہ ہو:

"اے بھکشوؤ! اس خیال سے ولپتی بھگوان کا دل دھرم کا اپدیش دینے کے بجائے گوشہ نشینی کی طرف مائل ہو گیا۔ لہٰذا اے بھکشوؤ! جتنی دیر میں کوئی طاقت ور شخص پھیلے ہوئے ہاتھ کو سکیڑ لیتا ہے اور سکڑے ہوئے ہاتھ کو پھیلا لیتا ہے اتنی دیر میں ہی مہا برہما برہم لوک سے اتر کر ولپتی بھگوان کے روبرو ظاہر ہو گیا۔ اور اپنا داہنا گھٹنا ٹیک کر اور ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے بولا، بھگوان! دھرم کا اپدیش کرو۔"

(بھگوان بدھ، صفحہ ۴۲۴)

ارہت[1] کی تعریف کرتے ہوئے "اودان سنک" میں بتایا گیا ہے:

"وہ اس دنیا کے فائدوں اور تعظیم و تکریم سے بیزار ہو جاتا ہے وہ اس کا مستحق ہو جاتا ہے کہ دیوتا — جن میں اندر، وشنو اور کرشن شامل ہیں، اس کی عزت کریں، اسے سلامی دیں اور اس کی تعظیم و تکریم کریں۔"

(بدھ ازم، صفحہ ۹۴)

---

[1] بدھ سے کچھ کم مرتبہ کی شخصیت۔ "بدھ کے علاوہ کوئی شخص ارہت کے برابر کامل نہیں ہو سکتا۔" (بدھ ازم، صفحہ ۹۴)

بدھ لوگ ہندو دیوتاؤں کی پرستش بھی کرتے تھے۔

(بدھ ازم صفحہ ۸۵)

بُدھ اور بُدھی ستو

بدھ کا لفظ بظاہر ایک شخص کا نام معلوم ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقت وہ عَلَم نہیں صفت ہے۔ گوتم بدھ میں گوتم نام ہے اور بدھ اس کی صفت۔ بدھ اور بدھی ستو، بدھ مت کی دو بنیادی اصطلاحیں ہیں جن کے گرد پورا بدھ مت گھومتا ہے، ایڈورڈ کانزے، ان پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"بدھ وہ ہے جسے گیان حاصل ہو گیا ہو[1] اور بدھی ستو کے لفظی معنی ہیں ہونے والا بُدھ، بالقوۃ بدھ وہ شخص جو بدھ ہونا چاہتا ہے۔ تمام بدھوں کے نزدیک ہر بدھ اپنے گیان سے پہلے ایک طویل عرصہ تک بدھی ستو رہا ہے[2]" (بدھ ازم صفحہ ۱۲۵)

لیکن اس مجمل اور لفظی تعریف سے اصل حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی۔ بدھ اور بدھی ستو کے بارے میں بدھ مت میں جو صفات اور معتقدات ہیں اُن پر ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری ہے:

(۱) بدھی ستو کی پیدائش عام انسانوں سے مختلف طرح پر ہوتی ہے۔ مہاپدان سُت (عظیم شخصیتوں کی نیک زندگیاں) میں بدھی ستو کی پیدائش کے سولہ فطری اصول بیان ہوئے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ:

---

[1] "بدھ وہ ہے جو ہر وقت بیدار رہے۔ سنسکرت میں "بدھ" کے مادہ کے دونوں معنی ہیں جاگنا اور جاننا" (بدھ ازم صفحہ ۱۳۹)

[2] گویا گیان (کامل معرفت) کے حصول سے پہلے بدھی ستو ہوتا ہے اور گیان کے بعد بدھ

۱ : وہ ہوش اور شعور کے عالم میں ماں کی کوکھ میں داخل ہوتا ہے۔
۲ : دس ہزار دنیاؤں میں چاروں طرف نور ہی نور بکھر جاتا ہے۔
۳ : اس کی حفاظت کے لیے چار دیوتا چاروں طرف موجود رہتے ہیں۔
۴ : ماں تمام بداخلاقیوں سے بچی رہتی ہے۔
۵ : ماں کی کوکھ میں اس کے داخل ہونے کے بعد ماں کے دل میں کسی مرد کے لیے شہوانی جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور نہ کوئی مرد اس جذبہ سے اسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔
۶ : ماں کو پانچ سکھ حاصل ہوتے ہیں۔
۷ : ماں خوش رہتی ہے، بیمار نہیں پڑتی اور وہ اپنی کوکھ کے بدھی ستو کو صاف طور پر دیکھتی ہے۔
۸ : پیدائش کے ساتویں روز ماں چل بستی ہے۔
۹ : بدھی ستو دس مہینے مکمل ہونے کے بعد جنم لیتا ہے۔
۱۱ : پیدا ہونے پر سب سے پہلے دیوتا اسے اٹھاتے ہیں۔
۱۲ : دیوتا ماں سے کہتے ہیں" دیوی خوش ہو کہ تیرے یہاں عظیم المرتبت بیٹے نے جنم لیا ہے۔"
۱۳ : بدھی ستو گندگی سے لت پت نہیں ہوتا بلکہ وہ بالکل پاک وصاف حالت میں باہر آتا ہے۔
۱۴ : پیدائش کے بعد آسمان سے پانی کی دو دھارائیں آتی ہیں، ایک سرد اور گرم اور اس کی ماں کو دھو ڈالتی ہیں۔
۱۵ : بدھی ستو پیدا ہوتے ہی اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر شمال کی طرف سات قدم چلتا ہے، اس وقت اس پر چھتر تانا جاتا ہے، چاروں طرف نگاہ ڈال کر وہ گرجتا ہے:

"میں دنیا کا پیشوا ہوں، افضل ہوں، یہ میرا آخری جنم ہے۔"

۱۶ : اس کے پیدا ہوتے ہی تمام دنیاؤں کے چاروں طرف نور ہی نور بکھر جاتا ہے[1] (بھگوان بدھ، صفحہ ۹۰۴ تا ۴۱۲)

(۲) : جس ہستی کی پیدائش اس قدر عجیب وغریب طریقے سے ہو، وہ خود کیا کچھ ہوگا۔ بدھ گرنتھوں میں یہ بات بیان کی گئی ہے اور بدھوں کے نزدیک مسلّم ومعروف ہے کہ بدھی ستو (ہونے والے بدھ) کی ۳۲ جسمانی علامتیں ہوتی ہیں جنھیں دیکھ کر وہ پہچان لیا جاتا ہے۔

(بھگوان بدھ صفحہ ۱۴ تا ۱۶ نیز بدھ ازم ص۱۶۲)

(۳) : بدھ کو ہر چیز کا علم ہوتا ہے۔ یہ گزر چکا ہے کہ "بدھ" وہ شخص ہے جسے گیان (معرفت) حاصل ہو چکا ہو، گیان کا کیا مطلب ہے؟ ایڈورڈ کانزے فرماتے ہیں:

"مثبت پہلو سے "نجات" کی ایک ہی تعریف ہے اور وہ ہے کامل معرفت۔

مہایان[2] فرقے کے لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ بدھ اصطلاح کے سب سے زیادہ ٹھوس مفہوم میں عارفِ کامل تھے۔ وہ اپنی غیر محدود معرفت کے ذریعے وجود کے تمام پہلوؤں کو ان کی تمام تفصیلات کے ساتھ ٹھیک ٹھیک جانتے ہیں۔ تمام بدھوں کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کامل معرفت کو اس کے پورے مفہوم میں بدھ کے لیے ضروری سمجھتے ہوں۔ پالی نوشتوں کے

---

[1] بدھ کے گزشتہ جنموں کی کہانیاں جٹک (میلادناموں) یا اودان کی صورت میں موجود ہیں، بہت سے مندروں میں سنگ تراشی کے ذریعہ ان کہانیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ (بدھ ازم ص۳۰۰)

[2] بدھوں کا سب سے بڑا فرقہ۔

بعض جملوں میں خود بدھ نے واضح الفاظ میں اس بات کی تردید کی ہے کہ انھیں (دھرم کے علاوہ) کسی اور قسم کی معرفت حاصل ہے۔ مہایان اس کے برعکس صراحت کرتے ہیں کہ بدھ کی معرفت ابتدا جنت اور نجات کے ذرائع کی واقفیت سے متعلق ہے لیکن اس کے ساتھ وہ بلا استثناء تمام چیزوں کو جانتا ہے حتیٰ کہ اس طرح کی غیر ضروری معلومات کو بھی کہ جیسے یہ بات کہ دنیا میں کتنے کیڑے ہیں۔" (بدھ ازم صفحہ ۱۳۷، ۱۳۸)

۲ : بدھی ستو اور بدھ حاجت روا اور مشکل کشا ہوتے ہیں، وہ زندۂ جاوید ہیں۔ ایڈورڈ کانزے لکھتے ہیں:

"مہایان ملکوں میں بدھی ستو کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ معتقدین کی ارضی قسمتیں بھی انھی سے وابستہ ہیں۔ وہ آگ اور پانی سے بچا سکتے ہیں، جہازوں اور مویشیوں کا تحفظ کر سکتے ہیں یا اولاد بخش سکتے ہیں۔" (بدھ ازم صفحہ ۸۳)

بھکتی کے بدھ مت کی رو سے بدھوں اور بدھی ستوؤں کے چار کام ہیں:

۱ : "وہ معتقد کی خوبیوں کو نشوونما دیتے ہیں، حرص، بغض اور دغا کے ازالے میں مدد دیتے ہیں اور بھوتوں اور آدمیوں سے بچاتے ہیں جو کینہ کے باعث روحانی اعمال میں مداخلت کرتے ہیں۔

۲ : وہ مادی منافع پہنچاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اولکتشورا قافلوں کو رہزنوں سے بچاتا ہے، ملاحوں کو جہازوں کی تباہی سے اور مجرموں کو پھانسی سے۔ اس کی مدد سے عورتیں حسب خواہش بچے پاتی ہیں، اس کا خیال کرتے ہی آگ بجھ جاتی ہے

تلواروں کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں، دشمن رحم دل ہو جاتے ہیں بندھن ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، جادو جہاں سے چلتا ہے وہیں لوٹ جاتا ہے، وحشی جانور بھاگ جاتے ہیں اور سانپ کا زہر ختم ہو جاتا ہے۔

۳: ان سے محبت، خواہش اور بھگتی کی جا سکتی ہے۔ مہایان نے اس تصور (بدھ کے دنیا میں زندہ ہونے) کو بہت زیادہ ترقی دی اور پوری کائنات کو خلا کی آخری حدوں تک بدھوں اور بدھی ستوؤں سے بھر دیا۔ جو زندہ ہیں، اس لیے ان سے محبت و عقیدت کی جا سکتی ہے اور ان کو یاد کیا جا سکتا ہے۔

۴: آخری کام یہ کہ بدھ اور بدھی ستو مستقبل کی زندگی میں گیان حاصل ہونے کے لیے مناسب حالات پیدا کرتے ہیں۔"

(بدھ ازم ۱۵۳/۱۵۴)

(۴): بدھ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ تانترک بدھ مت[1] میں بدھ کا مقام کیا تھا ایڈورڈ کانزے کی زبانی سنیے:

"بدھ اب اعلیٰ روحانی حقیقت نہیں رہتا، بدھ فطرت کا ہر جگہ حضور اس حقیقت کا نتیجہ ہے کہ بدھ کو ایک کائناتی جسم، تصور کیا گیا۔ چھ عناصر، جو ہر چیز کا مادہ ہیں یعنی زمین، پانی، آگ، ہوا، خلا اور شعور، یہ اسی کائناتی جسم کا خلاصہ ہے۔ دنیا اس کے

---

[1] بدھ مت کا یہ مکتب فکر جادو ٹونے ٹوٹکے پر بہت زور دیتا ہے اور اسے مادی فوائد ہی نہیں، روحانی ارتقا اور انجات کا ذریعہ بتاتا ہے، بدھ مت پر اس فکر کا گہرا اثر ہے۔ "بدھ مت کے ڈھائی ہزار سال" میں بھی اس پر تفصیلی بحث موجود ہے۔

(صفحہ ۳۵۷ تا ۳۷۴)

سوا کچھ نہیں کہ وہ بدھ کے نور کا انعکاس ہے جو ایک جگہ زیادہ مرتکز ہے اور دوسری جگہ زیادہ منتشر۔ جیسی صورت بھی ہو، بدھ تمام چیزوں کی خفیہ حقیقت ہے، وہ ہر ایک کا دل، ہر ایک کی زندگی اور ہر ایک کے اندر کی مرکزی صداقت ہے، ہم خود بھی بدھ سے خارج اجنبی عناصر نہیں ہیں۔ ہمیں اس حقیقت کو پالینا چاہیے کہ ہم خود بدھ اور کائنات ہیں۔ منطقی دلائل و مباحث اس معاملہ میں بے سود ہیں۔ باطنی اور متصوفانہ حرکات و اعمال ہی سے ہم اپنی حقیقت، عالمی وحدت اور بدھ سے اپنے اتصال کو پا سکتے ہیں۔" (بدھ ازم، صفحہ ۱۸۸)

(۵) : بدھ اور بدھی ستو فوق الطبعی قوتوں کے حامل ہیں، خدا ہیں، کائنات کے مقتدر اعلیٰ ہیں۔ "بھکتی کے بدھ مت" کا ذکر کرتے ہوئے ایڈورڈ کانز نے تحریر فرماتے ہیں :

"ایک بدھی ستو، حقیقی فرماں روا کی طرح دنیا کے اقتدار اعلیٰ کا لطف اٹھاتا ہے۔ وہ معجزانہ طریقہ پر اپنی خواہش سے جہاں چاہے دوبارہ پیدا ہو سکتا ہے اور جو شکل چاہے اختیار کر سکتا ہے۔"

(بدھ ازم، صفحہ ۱۵۰)

بدھوں کی طرح بدھی ستو بھی بہت زیادہ تعداد میں ہیں، ہم اُن میں سے صرف چند کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ بھکتی کے بدھ مت کے مابعد الطبعی تخیل کی تخلیقات ہیں اولکستورا سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ تحریروں اور مجسموں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں یہ بدھی ستو تین مراحل سے گزرا ہے۔ پہلے مرحلے میں وہ تین میں سے ایک ہے۔ دوسرے مرحلے میں وہ دنیا کو اپنے ہاتھوں میں رکھتا ہے، وہ بے پایاں حد تک بڑا ہے۔ وہ دنیا کا

مالک ومقتدرِ اعلیٰ ہے۔ اس کی آنکھوں سے سورج اور چاند نکلتے ہیں۔ اس کے منہ سے ہوائیں اور اس کے قدموں سے زمین نکلتی ہے۔ ان تمام معاملات میں وہ ہندو خدا برہما کے مشابہ ہے۔ تیسرے اور آخری مرحلہ میں جب کہ بدھ مت میں ساحرانہ عناصر زیادہ ہو گئے وہ سب سے بڑا ساحر نظر آتا ہے جو اپنی طاقت، اپنے منتروں میں منتقل کر دیتا ہے۔ اس مرحلہ میں وہ شیو کی بہت سی خصوصیات اختیار کر لیتا ہے۔"

(بدھ ازم، صفحہ ۱۴۷)

(۶) : بدھ خدا، بلکہ نوعِ انسانی کا خدائے اعظم ہے۔ ایڈورڈ کانزے کہتے ہیں:

"بدھ ایک قسم کا خدا بن گیا۔ تمام لوگوں کا سب سے بڑا خدا، بدھ کو انسانی شکل میں پیش کر کے زیادہ مقدس شکل میں اس کی پرستش بجا لائی گئی۔" (بدھ ازم، صفحہ ۸۷)

(۷) بدھ کے تین جسم ماننے لگئے، دھرم باڈی جو مطلق وجود ہے اور حقیقی وجود ہے، جسم مستفاد (Enjoyment Body) جو مختلف بدھی ستوں کی شکل میں مختلف بدھ وائروں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے، اس جسم کی ۳۲ علامتیں ہیں۔ اس سے معجزانہ کرشمے صادر ہوتے ہیں۔ یہ ذہن کی تخلیق ہے اور ولادت کے عام طریقہ کے بغیر وجود میں آتا ہے۔ تیسرا خیالی جسم (Body Apparitional) ہے، یہ انسانی جسم ہے، جو انسانوں کی طرح پیدا ہوتا، مرتا، مصیبتیں جھیلتا، گیان حاصل کرتا اور اپدیش دیتا ہے۔ یہ وہی خیالی جسم ہے۔ اس طرح بدھ کی خدائی حقیقی ٹھہری اور اس کی انسانیت فرضی اور خیالی۔

(بدھ ازم، صفحہ ۱۷۲)

کسی انسان کو خدا ماننے کے بعد ایسی ہی قلابازیاں کھانا پڑتی ہیں۔

بُدھ پرستی اور بُت پرستی

اب ایک نظر یہ بھی دیکھ لیجیے کہ بدھ مت میں پرستش کن کن چیزوں کی ہوتی ہے۔ پناہ کس سے مانگی جاتی ہے اور جپ کس کے نام کا کیا جاتا ہے ایڈورڈ کانز سے لکھتے ہیں:

"بدھوں کی عادت ہے کہ وہ ان تبرکات اور نقوشِ قدم کو پوجتے ہیں جو روئے زمین پر بدھ کے وجود کے محسوس نشانات ہیں۔ وہ ان چیزوں کو بھی پوجتے ہیں جنھیں اصطلاحاً چیتیہ کہا جاتا ہے۔ چیتیہ بدھ کی ذات سے متعلق جگہ کا نام ہے خواہ یہ تعلق بہت ہی بالواسطہ ہو۔ چیتیہ میں بدھ کے جسم کا کوئی طبعی حصہ ہو سکتا ہے جیسے دانت، ہڈی۔ اس میں کوئی ایسی چیز ہو سکتی ہے جسے بدھ نے پہنا ہو یا استعمال کیا ہو، مثلاً عبا جو ہڈہ میں ہے اور کاسۂ گدائی جو پشاور میں دکھایا گیا ہے یا اس میں بدھ دھرم باڈی کے کچھ اجزا ہو سکتے ہیں۔ یعنی مذہبی نوشتے۔ بعض صورتوں میں چیتیہ بدھ کی زندگی کے کسی واقعہ کی یاد دلاتا ہے، مثلاً بدھ دنیا کی مقدس ترین جگہ ہے، ایک درخت کے ارد گرد ہے جس کے نیچے بدھ کو گیان ہوا تھا۔ پرستش میں یہ ہوتا ہے کہ انسان کھلنے کا، پھولوں کے ہاروں کا، چھتریوں کا (جو وفاداریوں کی علامت ہیں) اور بعض اوقات رقم کا چڑھاوا چڑھاتا ہے اس وقت طواف کا تعظیمی رویہ بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی انسان بت یا مندر کے گرد چکر لگاتا ہے، ہمیشہ اسے اپنی داہنی طرف رکھتے ہوئے۔" (بدھ ازم صفحہ ۷۹، ۸۰)

یہ ہوئی آثار و تبرکات بدھ کی پرستش! اب بت پرستی کو لیجیے:

کانزے بدھوں کی بت پرستی کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

"بت مراقبہ کا محل بننے کے لیے اہم چیز ہے اور کردار پیدا کرنے کے لیے نفع بخش ذریعہ، مقدس بتوں کو بنانا اور ان کی تعداد بڑھانا بہت زیادہ بلند کرداری کا کام خیال کیا جاتا تھا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ کسی قوم کی خوش حالی کا دارومدار ان بتوں کی تعظیم و تکریم ہے۔ یہ بت ایک طرف روحانی قوتوں کا علامتی مجسمہ تھے، دوسری طرف وہ جادو کے پاور اسٹیشن خیال کیے جاتے تھے۔ جادو کی طاقت جو ان کے اندر جبلی اور لاینفک تھی۔ معتقدوں پر ان معجزانہ کرشموں سے ظاہر ہوتی تھی جو چیتیہ اسٹوپ یا بتوں کے تعلق سے عموماً واقع ہوتے تھے"

(بدھ ازم صفحہ ۸۰، ۸۱)

بعض محققین کا خیال ہے کہ بت بدھ کی بگڑی ہوئی شکل ہے، بدھ کے مجسموں کی اتنی زیادہ پرستش کی گئی اور بدھ کے اتنے زیادہ بت بنائے گئے کہ بدھ بت کے ہم معنی ہو گیا۔

بدھ کا ذکر، بدھ سے استعاذہ

دنیا دار[1] آدمی کے لیے بدھ مت کی رو سے کم سے کم فرائض کی فہرست دو چیزوں پر مشتمل ہے۔ ایک وہ جسے روایات کی رو سے "سہ جواہر" کہا جاتا ہے اور دوسرے پانچ اشیا کی بجا آوری "سہ جواہر" کا طریقہ جسے

---

[1] واضح رہے کہ بدھ مت کا حقیقی پیرو وہ ہے جو دنیا ترک کر دے جن کے پاس گھر در کچھ نہ ہو، بھیک پر گزارہ کرے چیتھڑوں کے کپڑے پہنے اور جن کے پاس نقدی اور سامان بھی نہ ہو سوائے عبا، کاسہ گدائی، سوئی، استرے، چھلنی اور مالا کے"۔ (بدھ ازم صفحہ ۵۴)

ڈھائی ہزار سال سے جپ کیا جاتا ہے، یہ ہے:

بدھ کی طرف پناہ کے لیے میں جاتا ہوں

دھرم کی طرف پناہ کے لیے میں جاتا ہوں

سنگھ (بدھ راہبوں کی تنظیم) کی طرف پناہ کے لیے میں جاتا ہوں۔ دوبارہ بدھ کی طرف .... دوبارہ دھرم کی طرف دوبارہ سنگھ کی طرف ..... سہ بارہ بدھ ..... سہ بارہ دھرم .... سہ بارہ سنگھ ......

اور پانچ احکامات یہ ہیں:

۱ : قتل نہ کرنا۔

۲ : جو چیز نہ دی گئی ہو اُسے لینے سے رک جانا۔

۳ : مادّی مسرتوں کے لیے غلط کاموں سے بچنا۔

۴ : غلط گوئی سے پرہیز۔

۵ : منشیات سے اجتناب۔" (بدھ ازم، ۸۶)

منزلِ مقصود پر پہنچنے کے ذرائع کیا ہیں؟ ایڈورڈ کانز سے کہتے ہیں:

۱ : پاک باز زندگی گزارنے سے اور بدھ کی طرح ہونے کی خواہش پروان چڑھانے۔

۲ : جس قدر مہایان فرقے کو ترقی ہوئی، زیادہ سے زیادہ اس بات پر زور دیا گیا کہ اہلیت و کردار کے حصول کے لیے بدھوں کی زیادہ سے زیادہ پرستش کی جائے، پرستش کا مطلب ہے بدھ کی حمد و ثنا، اس کے حسن و جمال کو خراجِ عقیدت پیش کرنا اس کے تصور سے محظوظ ہونا، اس بات کی دعا کرنا کہ ایک دن کامل بدھ کی حیثیت سے دوبارہ جنم ہو اور بدھ پر نذر و نیاز چڑھانا۔

۳ : بدھ کا نام جپنے کے ساتھ اس کا تصور بھی کیا جائے چوں کہ

بدھوں اور بدھی ستوپوں کی طاقت ان کے نام میں ہے اس
لیے نام جپنا سب سے اعلیٰ نیکی ہے، جپ کے بیشمار
طریقے وضع کیے گئے، جن میں مشہور ترین طریقہ، جو سب کے
لیے ہے، یہ ہے: "تعظیم بُدھ امیتابھ کے لیے"

(بدھ ازم صفحہ ۱۵۰، ۱۵۸)

پرستش کی یہ لے بدھوں اور بدھی ستوپوں تک محدود نہ رہی، مشائخ
پرستی دھرم کی بنیاد بن گئی، تانترک بدھ مت کا ذکر کرتے ہوئے ایڈورڈ
کانزے فرماتے ہیں:

"تنتر، اس کے برعکس یہ یقین رکھتے تھے کہ نجات کے
حقیقی مجرب طریقے اور ان کا موزوں استعمال کتابوں سے
حاصل نہیں کیا جا سکتا، تو یہ صرف ایک روحانی رہنما گرو
سے شخصی تعلق قائم کر کے ہی سیکھا جا سکتا ہے۔ صرف ایک
گرو کامل اطاعت کے ساتھ ہم اپنے آپ کو جس
کے حوالے کریں اور جو ہمارے لیے بدھ کا قائم مقام ہو،
وہی عقیدہ کے حقیقی اسرار و رموز سے ہمیں آگاہ کر سکتا ہے"

(بدھ ازم، صفحہ ۱۸۰)

یہی نہیں، تانترک بدھ مت میں گرو کے ذریعے، دیوتاؤں کا مراقبہ
مشاہدہ کرتے کرتے انسان خود خدا بن جاتا ہے۔ کانزے کے
الفاظ ہیں:

"چوتھے قدم پر ہم خود دیوتا بن جاتے ہیں، موضوع معروض
سے مل جاتا ہے اور معتقد اعتقاد سے، پرستش، پرستار
اور معبود الگ الگ نہیں رہتے۔"

(بدھ ازم، صفحہ ۱۸۷)

اتنا ہی نہیں، اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی ہوا کہ جس فرمانروا نے بدھ مت کی تھوڑی یا بہت حمایت کر دی، اسے بدھی ستو یا اس کا اوتار مان لیا گیا حتیٰ کہ چنگیز خاں اور قبلائی خاں جیسے خونخوار فاتحوں کو بھی!

(بدھ ازم صفحہ ۷۴، ۷۵)

یہ ہے بدھ مت اور اس کا شرک سے تعلق! گویا بدھ مت میں خالقِ کائنات کا اقرار ہے اور نہ اس کی پرستش و بندگی کا کوئی تصور، ہاں خدا کے ماسوا ہر شے کی پرستش موجود ہے۔ شرک کی کتنی بھیانک شکل ہے یہ!

باب ہشتم

جین مت اور خدا پرستی

جَین مت کی قدامت

جَین مت اگرچہ صرف ہندوستان میں پایا جاتا ہے اور ہندوستان میں بھی اس کے ماننے والوں کی تعداد ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے صرف ۱۶۱۸۴۰۵ تھی۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۲ لفظ جین (Jains)) لیکن جَین مت ہندوستان کے قدیم مذاہب میں سے ایک اہم مذہب ہے اور اس نے ہندو مت اور بودھ مت دونوں پر اپنے اثرات ڈالے ہیں' انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۲ میں لفظ جین کے تحت ہے:

"جین، ہندو مت کا مخالف ایک اہم فرقہ، جو اپنی تعداد سے زیادہ اپنی دولت مندی کے باعث با اثر ہے۔ جین مت کم از کم اتنا ہی قدیم ہے جتنا بودھ مت، بودھ مت کی کتابوں میں اس کا ذکر ایک حریف فرقے کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ ان کے آخری پیشوا اور دھمان مہا بیر کو مضبوط بنیادوں پر بودھ مت کے پٹک[1] میں مذکور نگینتھو نت پت خیال کیا جاتا ہے"

---

[1] بودھ مت کی ایک مقدس کتاب

جو گوتم بدھ کے معاصر تھے، لیکن جین مت کی روایات بہت زیادہ قدامت کی مدعی ہیں۔ وہ قطعیت[1] کے ساتھ یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ مہاویر سے پہلے تیئیس ۲۳ تیرتھنکر[2] اور گزرے ہیں جنھوں نے نروان (نجات) حاصل کی ہے۔ انھیں جن بھی کہا جاتا ہے جس کے معنیٰ فاتح یا مکتبِ فکر کے رہنما کے ہیں اور اسی سے لفظ جین نکلا ہے۔ لیکن یہ کہاں تک تاریخی شخصیتیں ہیں اس میں بہت زیادہ شک و شبہ کی گنجائش موجود ہے" (ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

لالہ دیوان چند سیکرٹری جین سمتی متر منڈل راولپنڈی نے اپنی تصنیف "جین دھرم ازلی ہے" میں پنڈت بال گنگا دھر تلک کے اخبار "ہندی کیسری" ۱۹۰۴ء نمبر ۱۳ کے حوالے سے ان کی طرف حسب ذیل الفاظ منسوب کیے ہیں:

"یہ تو سدھ ہی[3] ہے کہ جین دھرم ۵۷۶ برس قبل مسیح شروع ہوا، مہاویر سوامی جین دھرم کو دوبارہ پرکاش[4] میں لائے۔ اس بات کو آج چوبیس سو برس گزر گئے ہیں۔ بودھ دھرم کی ستھاپنا[5] سے پہلے جین دھرم چل رہا تھا، یہ بات وشواش کرنے یوگیہ[6] ہے۔ چوبیس ۲۴ تیرتھنکروں میں مہاویر سوامی آخری تیرتھنکر تھے۔ اس سے بھی جین دھرم کی پراچینتا[7] مانی جاتی ہے، بودھ دھرم پیچھے ہوا، یہ نشچت[8] ہے" (صفحہ ۲۳)

(Fundamentals of Jainism)

(جین مت کے بنیادی اصول) کے مصنف پرتھوی راج ایم، اے شاستری نے ڈاکٹر رادھا کرشنن، ہندو مت کے عظیم محقق اور بھارت کے

---

[1] جین مت کے پیشوا [2] ثابت [3] روشنی [4] قیام [5] یقین [6] لائق [7] قدامت [8] طے شدہ۔

سابق راشٹرپتی کی طرف حسب ذیل الفاظ منسوب کیے ہیں:

"جین مت وردھمان (مہاویر) یا پارشؔ ناتھ[1] سے بھی پہلے موجود تھا۔ یجروید[2] (جینیوں کے) تین تیرتھنکروں رشبھ[3]، اجیت ناتھ[4] اور ارشٹ نیمی[5] کے ناموں کی نشاندہی کرتا ہے۔"

(کتاب مذکور صفحہ ۲)

چمپت رائے جین بیرسٹر ایٹ لا، جین مت پر گراں بہا کتابوں کے مصنف ہیں، وہ اپنی کتاب (The Practical Path) (عملی راہ) میں تیرتھنکروں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حالیہ تحقیقات نے حقیقت کو پوری طرح نمایاں کر دیا ہے کہ جین مت بودھ مت سے کم از کم تین سو سال پہلے موجود تھا۔ جدید مستشرقین اس بات پر متفق ہیں کہ بھگوان پارش ناتھ سوامی تیئسویں تیرتھنکر ایک خیالی اور دیومالائی شخصیت نہیں حقیقی تاریخی وجود ہیں۔" (صفحہ ۱۷۵)

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے متعدد شہادتیں پیش کی ہیں جن میں سے ایک شہادت انسائیکلوپیڈیا ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد، ص۶۵ کی ہے جس کے ضروری اجزا ذیل میں درج ہیں:

"جین مت اور بودھ مت فلسفیانہ نظریات میں بنیادی فرق رکھنے کے باوجود چونکہ اصلاً رہبانہ نظام ہیں اور برہمنوں کے مت سے باہر کے ہیں، اس لیے ظاہری سطح پر ایک دوسرے سے

---

[1] جینیوں کے تیئسویں تیرتھنکر [2] چار ویدوں میں سے ایک وید [3] موجودہ کال میں جین مت کے پہلے تیرتھنکر [4] دوسرے تیرتھنکر [5] بائیسویں تیرتھنکر۔

(انڈین فلاسفی جلد ا صفحہ ۲۸۷ و صفحہ ۲)

کچھ مشابہ نظر آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی مصنفین بھی بعض دفعہ انھیں گڈ مڈ کر دیتے ہیں، اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ یورپ کے کچھ محققین، جو جین لٹریچر کے ناقص نمونوں کے ذریعے جین مت سے آگاہ ہوئے، آسانی سے اس خیال کی طرف مائل ہو گئے کہ جین مت بدھ مت کی ایک شاخ ہے لیکن اب یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہو کر ثابت ہو چکی ہے کہ اُن کا یہ نظریہ غلط تھا اور یہ کہ جین مت کم از کم اتنا ہی پرانا ہے جتنا بودھ مت، بودھ مت کے برعکس مہاویر غالباً اپنے فرقے کے جو رسول ہونے کی حیثیت سے ان کی عزت کرتا ہے، بانی نہ تھے اور نہ اپنے مذہب کے مصنف۔ ان کے پیش رو پارش ناتھ، آخری سے پہلے تیرتھنکر، کے بارے میں غالباً زیادہ بہتر طور پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ جین مت کے بانی تھے، لیکن تاریخی دستاویزات کی عدم موجودگی میں ہم قیاس کے آگے جانے کی ہمت نہیں کر سکتے۔"

(پریکٹیکل پاتھ صفحہ ۱۷۶)

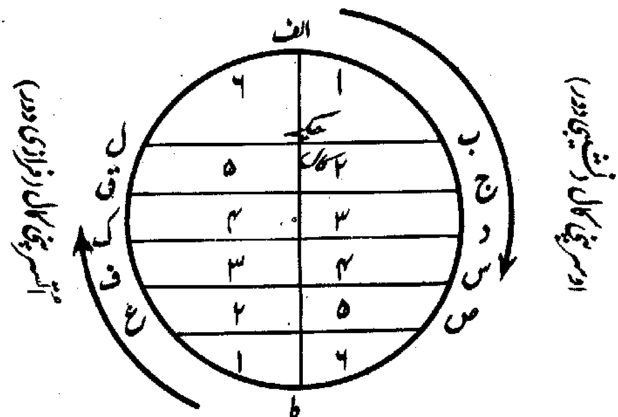
یہ ہے جین مت کی قدامت کا وہ پہلو جو ہندو مت کی کتابوں یا تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، اب آئیے، دیکھیں، خود جین مت کی روایات سے کیا واضح ہوتا ہے۔

کیا جین دھرم ازلی ہے؟

جین روایات کی رو سے جین دھرم ازلی ہے، یہ بات ہر جینی مصنف نے کہی ہے۔ ہم صرف "جین دھرم ازلی ہے" سے وہ حصہ نقل کرتے ہیں جو جین دھرم کے متعلق "جین گرنتھ" کے عنوان کے تحت درج ہے، یہ جز ذرا

طویل ہے اور طویل ہونے سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ لیکن اسے نقل کیے بغیر جین مت کے ازلی ہونے کا مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا، نہ زمانے کے متعلق جین تصور اور جین ریاضی سامنے آتی ہے:

"جین دھرم اس بات کو مانتا ہے کہ یہ دنیا ازلی وابدی ہے یعنی نہ اس کی ابتدا ہوئی ہے اور نہ ہی اس کا خاتمہ ہوگا البتہ وقت کے لحاظ سے اس کی حالت بدلتی رہتی ہے، جین دھرم میں وقت کو بھی ازلی مانا گیا ہے اور اس کو چکر خیال کیا گیا ہے اس چکر کو دو برابر کے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔



شری جمبو دیپ پنتی کے "کال" ادھیکار میں مذکورہ بالا شکل کی تشریح حسب ذیل طور پر ہے۔ الف ج ط حصہ کو اوسرپنی کال (نشیبی دور) کہا گیا ہے اور اس کے چھ حصے کیے گئے ہیں۔ الف ب کا نام سکھما[1] سکھم آرہ ہے جو چار کروڑ در اکروڑ یعنی چار × کروڑ × کروڑ ساگراوپم سال کا ہے۔ ب ج کا نام

۱؎ وہ دور جس میں سکھ ہی سکھ ہو۔

سکھم آرہ ہے جو تین کروڑا کروڑ یعنی ۳ × کروڑ × ساگراوپم سال کا ہے۔ ج۔ د کا نام سکھما دکھم آرہ ہے جو دو کروڑا کروڑ یعنی ۲ × کروڑ × ساگراوپم سال کا ہے۔ د۔ س کا نام دکھم سکھم آرہ ہے جو اکروڑ اکروڑ یعنی ۱ × کروڑ × کروڑ ساگراوپم سال میں سے بیالیس ہزار برس کم کا ہے۔ س۔ ص کا نام دکھم آرہ ہے اکیس ہزار سال کا ص، ط کا نام دکھما دکھم آرہ ہے۔ اکیس ہزار سال کا اس طرح سے ادسرپنی کال کے چھ آرے کل دس کروڑا کروڑ ساگراوپم سال کے ہیں۔ اس کال کے حصہ کو گھٹتی کا پہرا بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ سکھ درجہ بدرجہ کم ہوتا جاتا ہے اور دکھ بڑھتا جاتا ہے۔ برعکس اس کے اُتسرپنی کال کے چھ آرے بڑھتی کے پہرے کہے جاتے ہیں کیوں کہ ان میں ہر ایک چیز ترقی پر ہوتی ہے۔ ان آروں میں سے ادسرپنی کے آروں کی نسبت یہ فرق ہے کہ یہ اُلٹے چلتے ہیں۔ یعنے اُتسرپنی کا پہلا آرہ اکیس ہزار سال کا، دوسرا اکیس ہزار سال کا، تیسرا ایک کروڑ ایک کروڑ ایک سال اوپم میں سے بیالیس ہزار کم کا اور چوتھا دو کروڑ ایک کروڑ ساگراوپم سال کا، پانچواں تین کروڑ اکروڑ سال اوپم سال کا اور چھٹا چار کروڑ اکروڑ ساگراوپم سال کا اسطرح اتسرپنی کال کا زمانہ بھی دس کروڑ اکروڑ ساگراوپم کا ہوتا ہے۔ یہ کال چکر ہمیشہ چلتا رہتا ہے ختم نہیں ہوتا ہر ادسرپنی کال میں اور ہر اتسرپنی کال میں چوبیس چوبیس تیرتھنکر بھرت کھیتر میں ہوتے ہیں۔ آج کل ادسرپنی کال کا پانچواں دکھم آرہ

---

۱ وہ دور جس میں سکھ ہو مگر پہلے سے کم ۲ وہ دور جس میں سکھ کے ساتھ کچھ دکھ ہو۔

۳ وہ دور جس میں دکھ کے ساتھ کچھ سکھ ہو۔

۴ وہ دور جس میں صرف دکھ ہو۔ ۵ وہ دور جس میں بہت دکھ ہو۔

گزر رہا ہے جس میں سے اڑھائی ہزار سال کے قریب گزر گئے ہیں اور ابھی ساڑھے اٹھارہ ہزار سال باقی ہیں۔"

(کتاب مذکورہ صفحہ ۷۶، ۷۷)

ساگراوپم سال کا ذکر اوپر بار بار آیا ہے اور آئندہ بھی بار بار آئے گا، یہ ایک طویل حساب ہے بلکہ حساب سے ماوراء ایک چیز یوں سمجھیے کہ لاانتہا سالوں کو ساگراوپم سال کہتے ہیں[۱]۔ اب "جین دھرم ازلی ہے" کے مصنف کی زبانی جین دھرم کی قدامت اور تیرتھنکروں کے زمانے کا حال سنیئے:

"اس اوسرپنی کال سے پہلے جو اُتسرپنی کال گزر چکا ہے، اس کے چوتھے آرہ میں جو چوبیس جین تھنکر ہوئے تھے، ان کے نام حسب ذیل ہیں[۲]:

(۱) شری کیول گیانی (۲) شری نروانی جی

(۳) شری ساگر جی (۴) شری مہاشر جی

(۵) شری و مل پربھو جی (۶) شری سروانو بھوتی جی

(۷) شری شری دھر جی (۸) شری شری دت جی

(۹) شری دامودر جی (۱۰) شری سوتیج جی

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو شری جیو دیپ کا "کال" ادھیکار نیز ستیارتھ پرکاش باب ۱۲۔

[۲] اوپر گزر چکا ہے کہ ہر ایک کال (دور) میں چوبیس تیرتھنکر ہوتے ہیں۔ موجودہ دور اوسرپنی کال کا ہے جس کے چوبیس تیرتھنکر آگے بیان ہوں گے اس سے پہلے جو اتسرپنی کال کا گزرا ہے۔ اس کے چوبیس تیرتھنکر یہاں بیان کئے جا رہے ہیں۔ زمانہ جینی اعتقاد کی رو سے ازلی و ابدی ہے اس لیے بے انتہا تیرتھنکر آئے ہوں گے اور آئیں گے مصنف نے صرف ۲۷ کا ذکر کیا ہے، لیکن عام طور پر صرف چوبیس تیرتھنکر مشہور ہیں۔

(۱۱)	شری سوامی ناتھ جی	(۱۲)	شری منی سرت جی
(۱۳)	شری سمتی چن جی	(۱۴)	شری سوگنی جی
(۱۵)	شری استانگ جی	(۱۶)	شری نیمشور جی
(۱۷)	شری انل ناتھ جی	(۱۸)	شری یشودھر جی
(۱۹)	شری کرتارتھ جی	(۲۰)	شری جلیشور جی
(۲۱)	شری شدھ منی جی	(۲۲)	شری شونکرنگ جی
(۲۳)	شری سیانندن ناتھ جی	(۲۴)	شری سمپرات جی

شری سمپرات جی، چوبیسویں تیرتھنکر کے اٹھارہ کروڑ ایک کروڑ ساگراوپم کے بعد یعنی موجودہ اوسرپنی کال[1] کے تیسرے آرہ کے خاتمے پر نابھی کلکر کی پتنی[2] مرو دیوی سے ورتمان چوبیسی کے پہلے تیرتھنکر شری رشبھ دیو جی کا جنم ہوا

پہلے تیرتھنکر رشبھ دیو جی کے ۵۰ لاکھ کروڑ ساگراوپم سال کے بعد دوسرے تیرتھنکر اجیت ناتھ جی ہوئے۔

دوسرے تیرتھنکر اجیت ناتھ جی کے ۳۰ لاکھ کروڑ ساگراوپم سال کے بعد تیسرے تیرتھنکر سمبھو ناتھ ہوئے۔

تیسرے تیرتھنکر سمبھو ناتھ کے دس لاکھ کروڑ ساگراوپم سال کے بعد چوتھے تیرتھنکر ابھے نندن جی ہوئے۔

چوتھے تیرتھنکر ابھے نندن کے ۹ لاکھ کروڑ ساگراوپم سال کے بعد پانچویں تیرتھنکر سمتی ناتھ جی ہوئے۔

پانچویں تیرتھنکر سمتی ناتھ کے ۹۰ ہزار کروڑ ساگراوپم سال کے بعد چھٹے تیرتھنکر پدم پربھو جی ہوئے۔

---

[1] بیوی [2] موجودہ جین مت کے جو چوبیس تیرتھنکر مشہور ہیں وہ صرف موجودہ دور کے ہیں۔

چھٹے تیرتھنکر پدم پربھو کے نو ہزار کروڑ ساگر اوپم سال کے بعد ساتویں
تیرتھنکر سپارش ناتھ جی ہوئے۔

ساتویں تیرتھنکر سپارش ناتھ کے ۹ صد کروڑ ساگر اوپم سال کے بعد
آٹھویں تیرتھنکر چندر پربھ جی ہوئے۔

آٹھویں تیرتھنکر چندر پربھو جی کے نوے کروڑ ساگر اوپم سال کے بعد
نویں تیرتھنکر سدھی ناتھ جی ہوئے۔

نویں تیرتھنکر سدھی ناتھ کے نو کروڑ ساگر اوپم سال کے بعد
دسویں تیرتھنکر شیتل ناتھ جی ہوئے۔

دسویں تیرتھنکر شیتل ناتھ کے ایک کروڑ ساگر اوپم سال کے بعد
گیارھویں تیرتھنکر شریانس ناتھ جی ہوئے۔

گیارھویں تیرتھنکر شریانس ناتھ کے ۵۴ ساگر اوپم سال کے بعد
بارھویں تیرتھنکر شری باسو پوج جی ہوئے۔

بارھویں تیرتھنکر شری باسو پوج کے تیس ساگر سال کے بعد
تیرھویں تیرتھنکر شری بمل ناتھ جی ہوئے۔

تیرھویں تیرتھنکر شری بمل ناتھ کے ۹ ساگر اوپم سال کے بعد
چودھویں تیرتھنکر شری اننت ناتھ جی ہوئے۔

چودھویں تیرتھنکر شری اننت ناتھ جی کے ۴ ساگر اوپم سال کے بعد
پندرھویں تیرتھنکر شری دھرم ناتھ جی ہوئے۔

پندرھویں تیرتھنکر شری دھرم ناتھ جی کے ۳ ساگر اوپم سال کے بعد
سولھویں تیرتھنکر شانتی ناتھ جی ہوئے۔

سولھویں تیرتھنکر شانتی ناتھ جی کے نصف پل اوپم سال کے بعد
سترھویں تیرتھنکر کنتھ ناتھ جی ہوئے۔

سترھویں تیرتھنکر کنتھ ناتھ جی کے چہارم پل اوپم سال کے بعد

اٹھارہویں تیرتھنکر ارہ ناتھ جی ہوئے۔

اٹھارہویں تیرتھنکر ارہ ناتھ جی کے ایک کروڑ ایک ہزار سال کے بعد انیسویں تیرتھنکر ملی ناتھ جی ہوئے۔

انیسویں تیرتھنکر ملی ناتھ جی کے ۵۴ لاکھ سال کے بعد بیسویں تیرتھنکر منی سبرت سوامی ہوئے۔

بیسویں تیرتھنکر منی سبرت سوامی کے ۶ لاکھ برس کے بعد اکیسویں تیرتھنکر نمی ناتھ جی ہوئے۔

اکیسویں تیرتھنکر نمی ناتھ جی کے ۵ لاکھ سال کے بعد بائیسویں تیرتھنکر نیم ناتھ جی ہوئے۔

بائیسویں تیرتھنکر نیم ناتھ جی کے ۸۴ ہزار برس کے بعد تئیسویں تیرتھنکر پارشنا ناتھ جی ہوئے۔

تئیسویں تیرتھنکر پارشنا ناتھ جی کے اڑھائی صد سال کے بعد چوبیسویں تیرتھنکر شری مہابیر جی ہوئے (جین تتو پرکاش صفحہ ۲۰ سے ۴۴ تک)

بھرت کھیتر میں اوسرپنی کال کے پانچویں اور چھٹے آرہ میں اور اتسرپنی کے پہلے اور دوسرے آرہ میں کوئی تیرتھنکر نہیں ہوتے مگر جین دھرم بالکل معدوم نہیں ہوتا۔

(جین دھرم ازلی ہے صفحہ ۴۸ تا ۵۰)

یہ تو ماضی کا ذکر تھا مستقبل میں کیا ہوگا، یعنی دکھم آرہ کے باقی ساڑھے اٹھارہ ہزار سال اور دکھما دکھم آرہ کے اکیس ہزار سال کل ساڑھے انتالیس ہزار سال گزر جانے[1] کے بعد جو اتسرپنی کال شروع ہوگا اس میں کون کون سے

---

[1] اوسرپنی کال کے آخر کے دکھ کے بیالیس ہزار سالوں اور اتسرپنی کال کے شروع کے دکھ بیالیس ہزار سالوں کل ۸۴ ہزار خالص دکھ کے سالوں میں تیرتھنکر نہیں آتے۔

تیرتھنکر آئیں گے، اس کی تفصیل "جین دھرم ازلی ہے" کے مصنف کی زبانی سنیئے :

"جین گرنتھوں میں تو آئندہ انسرپنی کال میں ہونے والے چوبیس تیرتھنکروں کے نام بھی حسب ذیل بتلا دیئے گئے ہیں :

(۱) شری پدم ناتھ جی (۲) شری سُر دیو جی
(۳) شری سپارشو جی (۴) شری سویمگ پربھو جی
(۵) شری سروانو بھوتی جی (۶) شری دیو شرتی جی
(۷) شری اُدے ناتھ جی (۸) شری پیڈال جی
(۹) شری پوٹل جی (۱۰) شری ستک جی
(۱۱) شری منی برت جی (۱۲) شری امم جی
(۱۳) شری نکھشلیسے جی (۱۴) شری نش پولاک جی
(۱۵) شری نرمم جی (۱۶) شری چترگپت جی
(۱۷) شری سمادھی ناتھ جی (۱۸) شری سنور ناتھ جی
(۱۹) شری یشودھر جی (۲۰) شری وجے جی
(۲۱) شری ملیہ دیو جی (۲۲) شری دیو چندر جی
(۲۳) شری انت ویریہ جی (۲۴) شری بھدرکر جی"

(جین دھرم ازلی ہے صفحہ ۵۱)

اس کے آگے مصنف جین دھرم کے ازلی و ابدی ہونے کا ذکر کرتے ہیں :

"غرضیکہ ہر اُتسرپنی اور اوسرپنی کال میں چوبیس تیرتھنکر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ ہمیشہ سے چلا آیا ہے اور اسی طرح چلا جائے گا۔ کبھی اس کا نہ شروع ہوا اور نہ کبھی خاتمہ ہوگا۔ گویا جین دھرم لاابتدا زمانے سے چلا آیا ہے اور آئندہ لاانتہا

زمانے تک رہے گا، البتہ کسی وقت اس کی اشاعت کا زور زیادہ ہوگا اور کسی وقت کم ہو جائے گا یعنی اس کو کبھی کمال اور کبھی زوال ہوتا رہے گا مگر بالکل معدوم نہ کبھی ہوا، نہ کبھی ہوگا۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جین دھرم دنیا کو "انادی اننت" مانتا ہے یعنی نہ دنیا کا آغاز ہوا ہے اور نہ کبھی خاتمہ ہوگا۔ اسی طرح جین دھرم کو بھی انادی اننت ہی سمجھنا چاہیے امید ہے کہ اب دنیا کے مورخین و علماء کو یہ پتہ لگ جائے گا کہ جین دھرم اب تک قطعی غلط سمجھا جاتا رہا ہے اور اب ان کو ماننا ہوگا کہ جین دھرم محض قدیمی ہی نہیں بلکہ ازلی مذہب ہے"

(جین دھرم ازلی ہے صفحہ ۵۱، ۵۲)

مستقبل کے پردے میں کیا ہے؟ اسے تو مستقبل ہی بتلا سکے گا، البتہ ماضی کا حال تاریخ سے معلوم ہوتا ہے لیکن تاریخ تین چار ہزار برس سے آگے نہیں جاتی اور ہندوستانی تاریخ تو مسلمانوں کے دور، زیادہ سے زیادہ ایک ہزار برس سے شروع ہوتی ہے، اس سے پہلے کی تاریخ افسانوں اور دیومالائی قصے کہانیوں میں گم ہے۔ مگر جین دھرم کا ماضی اور اس کے تیر تھنکروں کا زمانہ اتنا قدیم بتایا جاتا ہے کہ تاریخ تو تاریخ، ریاضی کی گرفت میں بھی نہیں آتا۔ ازلی چیز نہ تاریخ کے دائرے کی چیز ہے نہ ریاضی کی ـــــ عقل بھی اس سلسلے میں ہماری دستگیری نہیں کرتی، لے دے کے جین گرنتھ رہ جاتے ہیں جن میں یہ سارے قصے ہیں، آیئے ان کا حال دیکھیں کہ انھیں کن لوگوں نے لکھا ہے ـــــ کب لکھا ہے اور وہ محفوظ ہیں یا نہیں اور ان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے، لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ تیر تھنکروں کی عمروں اور

ان کے قدوقامت وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ تفصیل ناظرین کے سامنے رکھ دیں۔

تیرتھنکر کا نام	لمبائی کمانوں میں[1]	عمر پورب سالوں میں[2]
۱ : رشبھ دیوجی	۵۰۰	۸۴۰۰۰۰۰
۲ : اجیت ناتھ جی	۴۵۰	۷۲۰۰۰۰۰
۳ : سمبھو ناتھ جی	۴۰۰	۶۰۰۰۰۰۰
۴ : ابھی نندن جی	۳۵۰	۵۰۰۰۰۰۰
۵ : سمتی ناتھ جی	۳۰۰	۴۰۰۰۰۰۰
۶ : پدم پربھو جی	۲۴۰	۳۰۰۰۰۰۰
۷ : پارشں ناتھ جی	۲۰۰	۲۰۰۰۰۰۰
۸ : چندر پربھو جی	۱۵۰	۱۰۰۰۰۰۰
۹ : سبدھی ناتھ جی	۱۰۰	۲۰۰۰۰۰
۱۰ : شیتل ناتھ جی	۹۰	۱۰۰۰۰۰
۱۱ : شری یانس ناتھ جی	۸۰	۸۴۰۰۰۰۰
۱۲ : باسوپوج سوامی جی	۷۰	۷۲۰۰۰۰۰
۱۳ : بمل ناتھ جی	۶۰	۶۰۰۰۰۰۰
۱۴ : اننت ناتھ جی	۵۰	۳۰۰۰۰۰۰
۱۵ : دھرم ناتھ جی	۴۵	۱۰۰۰۰۰۰
۱۶ : شانتی ناتھ جی	۴۰	۱۰۰۰۰۰

[1] کمان ساڑھے تین ہاتھ کی ہوتی ہے۔ [2] پورب سال ساگراوپم سال سے کم تعداد کے سال کو کہتے ہیں، مگر کتنے سال کو؟ ریاضی کے اعداد و شمار میں اسے بیان نہیں کیا جا سکتا بس یوں سمجھیے کہ بے انتہا سال۔

۱۷	: کنتھ ناتھ جی	۳۵	۹۵۰۰۰
۱۸	: ارہ ناتھ جی	۳۰	۸۴۰۰۰
۱۹	: ملی ناتھ جی	۲۵	۵۵۰۰۰
۲۰	: منی سبرت جی	۲۰	۳۰۰۰۰
۲۱	: نمی ناتھ جی	۱۴	۱۰۰۰۰
۲۲	: نیم ناتھ جی	۱۰	۱۰۰۰
۲۳	: پارس ناتھ جی	۹ ہاتھ	۱۰۰
۲۴	: مہابیر سوامی	۷ "	۷۲

(رتن سار حصہ اوّل صفحہ ۱۹۶، ۱۹۷، ستیارتھ پرکاش باب ۱۲ صفحہ ۶۱۰، ۶۱۱)

جین گرنتھ

"جین مت سار" اُردو میں جین مت پر ایک مستند اور جامع[1] کتاب ہے اس میں صفحہ ۳ ۵ سے ۸ ۸ تک ۳۶ صفحات میں جینی فرقوں اور ان کی مذہبی کتابوں کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے صفحہ ۷۳، ۷۴ پر مصنف اس کو مختصر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ ہے جین مذہب کی مختصر تواریخ جس کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ جین مت کی دو بڑی شاخیں دگمبر اور سوتیامبر ہیں اور پھر ایک ایک شاخ کے بڑے بڑے دو فرقے، ایک مورتی پوجک، دوسرا مورتی نہ پوجنے والا۔ سوتیامبریوں میں مورتی نہ پوجنے والا فرقہ ڈھونڈیا ماستھانک واس کہلاتا ہے اور دگمبریوں

---

[1] دگمبر فرقے کے عظیم رہنما شری ۱۰۸ بھوشن جی نے جین مت کے سمجھنے کے لیے منجملہ اور کتابوں کے یہ کتاب بھی عنایت فرمائی کتاب ۹۲۰ صفحات کی ہے، مصنف کا نام کا نام لالہ شمیر چند جینی ہے۔

ہیں تارن پنتھی اور سوامی آچاریہ کا تصنیف کیا ہوا تتوارتھ سوتر جس کو جین مذہب کا وید سمجھنا چاہیے، دونوں فرقوں میں مانا جاتا ہے اور وجہ یہ ہے کہ یہ اس وقت کا بنا ہوا سوتر ہے جس وقت جین مت کی دو شاخیں نہیں ہوئی تھیں۔ بعد ازاں ہر دو فرقوں کے آچاریوں نے ہزارہا شاستر تصنیف کیے جو اپنے فرقے میں مانے اور پڑھے جاتے ہیں۔ یہ سب شاستر چار قسموں میں منقسم کیے جاتے ہیں۔

۱۔ پرتھمانو یوگ یا دھرم کتھا انو یوگ۔ اس میں دھرماتماؤں کے چرتر، راجہ مہاراجوں کی تاریخ، سوانح عمریاں ہیں جیسے دگمبر فرقے کے رام چرتر، پدم پران، پانڈو پران ہری بنس پران، پارشں پران، مہابیر پران، یشودھر چرتر وغیرہ اور سوتیامبر فرقے کے اترادھین گیاتا دھرم کتھاد وغیرہ۔ یہ کتابیں منتبدیوں کے پڑھنے کی ہیں اور ان میں کہیں کہیں واقعات میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے مثلاً کسی شاستر میں یہ لکھا ہے کہ نیم ناتھ جی کا جنم شوری پور میں ہوا، کسی نے لکھا ہے کہ دوار کا میں ہوا۔ دگمبر شاستر کہتے ہیں کہ مہابیر سوامی کا بیاہ نہیں ہوا، سوتیامبر کہتے ہیں کہ ہوا مگر یہ قصہ کہانیوں کے اختلافات کچھ قابلِ وقعت اختلاف نہیں ہیں۔" (صفحہ ۴۳، ۴۴)

سلسلہ بیان ابھی جاری ہے، مگر ہم چاہتے ہیں کہ یہاں تھوڑا سا رک کر غور کر لیا جائے۔ یہی وہ کتابیں ہیں جن سے جین مت کی قدامت اور تیرتھنکروں کے سوانح حیات معلوم ہوتے ہیں، لیکن انھی کو مصنف منتبدیوں کے پڑھنے کی کتابیں بتاتا ہے۔ ان میں اختلافات کا ذکر ہوتا ہے مگر ان اختلافات کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتا ہے کہ یہ قصہ کہانیوں کے اختلافات ہیں۔ مصنف یہ بھی واضح کرتا ہے کہ یہ کتابیں بہت بعد میں لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں کے بارے

میں اگرچہ مصنف نے ایک جگہ لکھا ہے:

"اب ہم جین مت کی مختصر سی تاریخ اُس کی قدامت اور اس کے جملہ دیگر مذاہب سے پیشتر ہونے کا حال بموجب جین شاستروں شری پدم پُران جی، ہر بنس پُران جی، آد پُران جی، دھرم پریکشا جی اور جین تتو آدرش وغیرہ بیان کرتے ہیں۔ یہ معلوم رہے کہ جین مت کے پُران ہندوؤں کے پُرانوں جیسے نہیں ہیں کہ جن میں جیسے کہ آریہ سماج کہتی ہے، بعید از عقل باتیں لکھی ہوں۔" (صفحہ ۱۵)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعید از عقل اور انتہائی مبالغہ آمیز دیو مالائی قصے بیان کرنے میں جین مت اور ہندو مت کے پُران ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں بعض وقت تو ایک جینی دوست کا خیال صحیح محسوس ہونے

تو کسی بزرگ کی بڑائی جتلانے کے واسطے اور بعض الکار (استعارہ) روپ سے لکھی ہوئی معلوم پڑتی ہیں۔ مثلاً مہابیر سوامی، بودھ دیو وغیرہ کی پیدائش وغیرہ کے وقت اندر اور دیوتاؤں کا آنا، دیوانگناؤں کا ناٹک کرنا اور بہت سے عجیب و غریب بعید از عقل تماشے دکھلانا۔[1] لیکن ایسی ایسی باتیں کیا ہندو کیا مسلمان، کیا عیسائی، کیا پارسی وغیرہ وغیرہ سب کتابوں میں لکھی ہیں، نہ معلوم کیا بھید[2] ہے۔

ہم کو ان داستانوں سے اخلاقی سبق سیکھنے چاہئیں اور ان کے امر واقعہ ہونے یا نہ ہونے پر کچھ دھیان نہ دینا چاہیے۔ ہم کو ان پرانوں کے مصنفوں کا اُپکار[3] ماننا چاہیے جنھوں نے اس زمانے میں جب وقت کہ کاغذ تک نہ تھا، بزرگوں کی، جن کو ہم دیوتاؤں اور پرمیشر کے آتاروں تک کا رتبہ دیتے ہیں۔ سوانح عمریاں اور نصیحت آموز داستانیں تاڑپتروں پر لکھ کر ہمارے تک پہنچائے ہیں۔ ان کے لکھنے والے کوئی سروگیہ[4] تو تھے ہی نہیں، پھر اگر انھوں نے کچھ سنی سنائی روایتوں کو بھی درجِ کتاب کر دیا ہو کیا تعجب ہے مثلاً جب ہری بنس پران میں لکھا ملتا ہے کہ چھپّن[5] کروڑ جادو بنسی دوارکا میں بستے تھے یا جب ہم ان میں پڑھتے ہیں کہ بھرت راجہ کے ۹۶ ہزار رانیاں تھیں تو حجت کر لے بیٹھ جاتے ہیں کہ ۵۶ کروڑ تو آبادی ہندوستان کی بھی نہیں ہے، پھر ایک دوارکا شہر میں اتنی آبادی کہاں سے آ سکتی ہے؟ اور ۹۶ ہزار رانیاں ایک راجہ

---

[1] جین عقیدے کی رو سے ہر تیرتھنکر کے پیدا ہونے، اس کے سنیاس لینے، اسے گیان ہوتے اور اس کے نروان (نجات وفات) کے وقت اندر اور بہت سے دیوتا آسمان سے آتے اور جشن مناتے ہیں۔ [2] مسلمانوں کے یہاں پران قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ [3] احسان [4] ہر چیز کا علم رکھنے والا۔

کی کیسے ہو سکتی ہیں۔ ان میں سمجھ ہی کا قصور ہے، وجہ یہ ہے کہ ہم ان کو دھرم پستکیں مان کر ان کو لفظ بہ لفظ درست سمجھتے ہیں۔ اگر لفظوں کو چھوڑ کر چھپن کروڑ اور ۹۶ ہزار سے مراد صرف تعداد کثیر سے لیویں تو پھر کچھ اعتراض نہیں رہتا۔ دیگر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہم ان تحریروں کے ترجمہ کرنے میں غلطی کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ۵۶ کروڑ اور ۹۶ ہزار کے بجائے شاید اصل تعداد ایک کروڑ چھپن اور ایک ہزار چھیانوے ہو۔ اعداد و شمار میں اس قسم کی غلطیاں پرانوں میں بہت جگہ معلوم پڑتی ہیں۔ پرانوں میں ان کی تصنیف کے بعد ہی لوگوں نے سب کچھ تغیر و تبدل کر دیا ہے، ان ہی میں نہیں بلکہ بڑی بڑی دھرم پستکوں میں تغیر و تبدل ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ تمام کتابیں پہلے سینہ بہ سینہ زبانی یاد کی جاتی تھی کتابی شکل میں یہ سب بہت عرصہ بعد لکھی گئی ہیں، وید جو بہت عرصہ پہلے کے تصنیف شدہ ہیں، مہابھارت کے بعد ویاس نے مرتب کیے، جینیوں کے شاستر چندر گپت کے بعد لکھے گئے ہیں، بودھ مذہب کی کتابیں اشوک کے زمانے میں تحریر ہوئیں قرآن شریف ابوبکرؓ کے زمانے میں تحریر ہوا،[1] بائبل بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوتے ہوئے موجودہ شکل میں ہم تک پہنچی، یہی

---

[1] یہ بات صحیح نہیں ہے تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی کتابت کے لیے کاتب مقرر کر رکھے تھے جو قرآن کے اجزا کو نازل ہوتے ہی لکھ لیتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ کیا کہ ان لکھے ہوئے اور حفظ شدہ اجزا کو ایک جلد میں جمع کر دیا اور وہ بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک ڈیڑھ سال کے بعد ہی کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی مدت صرف سوا دو سال تھی۔

وجہ ہے کہ ان کتابوں میں بہت سی باتیں مشتبہ ہیں۔"

(صفحہ ۳۵۱ تا ۳۵۳)

اب ہم اصل سلسلۂ بیان کی طرف لوٹتے ہیں۔ مصنف نے جین شاستروں کی چار قسمیں کی تھیں۔ پہلی قسم کا ذکر ہو چکا ہے اب دوسری قسم کو لیجیے:

(۲) کرنانوگ یا گنتانویوگ۔ اس میں جیوگرافی، علم ہئیت، جوتش وغیرہ ہے۔ ترلوک سار، جوتش سار، بجے گنت، چندر گنتی، سورج پرگنیتی وغیرہ گرنتھ اس قسم میں آتے ہیں۔" (صفحہ ۴۸)

ان کتابوں میں بھی عجیب وغریب اور بعید از عقل باتیں ہیں خصوصاً جغرافیہ اور ریاضی کی کتابوں میں تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

اب تیسری قسم کی کتابوں کو لیجیے:

(۳) چرنانویوگ میں منیوں اور گرہستیوں کے فرائض کا ذکر ہوتا ہے اچار سار مولاچار، شراد کاچار وغیرہ دگمبریوں کے، اور آچارانگ، اپاسکادھین، نسیت، چھید سوتر وغیرہ سوتیامبریوں میں شامل ہیں۔"

(صفحہ ۴۸)

دگمبر، سوتیامبر اور ستھانک واسی فرقوں میں اصل اختلاف فرائض و اعمال ہی میں ہے، اس لیے ہر فرقہ کی کتابوں میں دوسرے فرقے سے مختلف فرائض بیان کئے گئے ہیں، اب چوتھی قسم کی کتابوں کو لیجیے:

(۴) دربیانویوگ میں روح و مادہ وغیرہ دربیوں کا ذکر ہے اور یہی جین فلسفہ ہے، گومٹ سار، پرویچن سار، راج وارتک، اسٹا سہسری، پرمے کمل مارتنڈ، دگمبر آچاریوں کے اور سیادوباد منجری وغیرہ سوتیامبر آچاریوں کے گرنتھ اس قسم میں شامل ہیں دراصل جین مت یہی ہے اور اس میں دگمبر، سوتیامبر، ستھانک واسی کسی کا بھی کچھ اختلاف نہیں ہے۔" (صفحہ ۴۸)

ان کتابوں میں جین فلسفہ ہے۔ یہ فلسفہ نہایت طویل وعریض اور پیچیدہ ہے، ہم کتاب کے مختصر ہونے کے باعث جین فلسفہ سے تعرض نہیں کر سکے ہیں۔

جین گرنتھ آخری تیرتھنکر مہاویر سوامی کے کتنے عرصے کے بعد لکھے گئے ہیں اور ان میں کتنی بھول اور کیا گڑ بڑ ہوئی "جین مت سار" میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے ضروری اجزا درج ذیل ہیں:

مہابیر سوامی سمبت بکرم سے ۴۷۰ سال یعنی عیسوی سے ۵۲۷ سال پیشتر مکت گئے (وفات پا گئے) دگمبر فرقے کے شاستروں کے بموجب، مہابیر سوامی کے موکش جانے (وفات پانے) کے بعد گوتم سوامی سدھرم آچاریہ اور جمبھو سوامی تین کیولی (گیانی، عالم دین) ۶۲ سال کے عرصے میں ہوئے اور بعد ازاں وشنو نندی متر، اپراجت، گوبردھن اور بھدر باہو پانچ سرت کیولی (تمام شاستروں کے عالم) ایک سو سال کے عرصے میں ہوئے۔ یہ سب دوادشانگ[1] بانی کو اپنی یادداشت میں رکھتے رہے اور دوسروں کو زبانی اپدیش دیتے رہے۔

بھدر باہو سوامی کا جو آخری شرت کیولی (تمام شاستروں[2] کے عالم) تھے، سورگباش ہو چکا تھا لہٰذا اب دگمبر فرقے کا گرو لبشاد کھ چاریہ ہوا اور اردھ پالک (فرقے) کا ستھول بھدر لبشاد کھ چاریہ کے بعد دگمبر فرقے میں پروشٹلا چاریہ، چھتریہ، جے سین، ناگ سین، سدھارتھ، دھرت کھین نجے، بدھمان، گنگ دیو، دھرم سین،

---

[1] مہابیر سوامی کی الہامی تعلیمات [2] گویا یہ آخری آدمی تھے جنھیں تمام جینی شاستر زبانی یاد تھے ان کے بعد جو جینی علما ہوئے ہیں انھیں تمام شاستر نہیں، ان کے کچھ اجزا یاد تھے جیسا کہ آگے

گیارہ منی گیارہ انگ اور دس پورب کے جاننے والے ماہر ۱۸۳ برس کے اندر ہوئے، پھر نچھتر، جے پال، پانڈیہ، دہر سینن کنس آچاریہ پانچ آچاریہ صرف گیارہ انگ (حصہ) کے ماہر ۲۲۰ سال کے عرصے میں ہوئے۔ بعد ازاں سوبھدر، یشو بھدر، بھدرباہو ثانی، مہاپیشن اور لوہا آچاریہ یہ پانچ آچاریہ پہلے انگ کے عالم ۸۴ سال کے اندر ہوئے اس طرح مہابیر سوامی سے ۶۸۳ برس بعد تک جین مت کا اپدیش سینہ بہ سینہ چلا آیا اور کوئی شاستر نہیں لکھا گیا۔" (صفحہ ۵۳ تا ۵۷)

گویا جین شاستر مہابیر سوامی کے تقریباً سات سو سال بعد لکھے گئے، اس سے پہلے وہ زبانی یادداشت کے ذریعے منتقل ہوتے رہے اور زبانی یادداشت کا بھی یہ حال ہے کہ مہابیر سوامی کے تقریباً پونے دو سو سال کے بعد کوئی ایسا جینی عالم نہ رہا جسے سب شاستر زبانی یاد ہوں۔ زبانی یاد ہونے کی مقدار مسلسل کم ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ:

"لوہا آچاریہ کے بعد کوئی منی ایسا نہیں ہوا جس کو دوادشانگ بانی کا ایک ایک انگ بھی پورا یاد ہو، اس زمانے کے منیوں نے ذہانت اور حافظہ میں روز بروز کمی ہوتے دیکھ کر یہ مناسب سمجھا کہ جو کچھ اب یاد ہے اس کو قلمبند کیا جائے چنانچہ شری کند کند سوامی نے پربچن سار، سمے سار، کریا سار، جوتی سار، تتو سار، بھاؤ سار، نیم سار، اشٹ پاہڑ، آچار نا پاہڑ وغیرہ چوراسی پاہڑ اور پنچ استی کائے اور دوادشانو پریکشیا تصنیف کیے۔ شری کند کند سوامی دگمبر آمنائے (فرقے) کے پہلے منی ہیں جنھوں نے شاستر تصنیف کیے۔ اوما سوامی نے تتوارتھ سوتر تصنیف کیا جو جین مت کے ہر دو فرقوں دگمبر اور سوتیامبر میں مانا جاتا ہے

اور جین مت کا وید قرآن ہے۔ اوما سوگند سوامی کے شاگرد تھے۔"

(صفحہ ۵۶، ۵۷)

گویا جین مت کا متفقہ وید مہابیر سوامی کے سات سو سال کے بعد یادداشت کے انتہائی کمزور ہو جانے کے بعد لکھا گیا۔ اس کے بعد مصنف نے مختلف جینی آچاریوں کا ذکر کیا ہے جو مختلف زمانوں میں شاستر لکھتے رہے۔ اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:

"اس طرح تیسری صدی بکرمی میں (مہاویر سوامی کے سات سو سال بعد) دگمبر اور سوتیامبر بالکل علیحدہ ہو گئے اور دونوں نے اپنے شاستروں کی تصنیف شروع کی۔" (صفحہ ۶۱)

یہ تو جین گرنتھوں کی وہ تاریخ ہے جو دگمبر فرقے کی روایات کے مطابق ہے، اب سوتیامبر فرقے کی روایات کے مطابق جین گرنتھوں کی کہانی سنیئے:

"مہابیر سوامی سے ۹۸۰ برس بعد دیو آردھی گن چھماستروں نے بلبھی نگر میں ۵۰۰ جین آچاریوں کو اکٹھا کر کے سوتروں کو پستک کی شکل میں لکھا، اب تک زبانی یاد کرنے کی رسم چلی آرہی تھی۔"

(صفحہ ۶۷)

گویا سوتیامبر روایات کی رو سے مہابیر سوامی سے تقریباً ایک ہزار سال بعد جین گرنتھ تحریری شکل میں قلم بند کیے گئے اور وہ اس طرح کہ ان میں سے بہت سے بھلائے جا چکے تھے:

"اس کا مفصل ذکر سوتیامبر جین اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دوادشانگ بانی کو گوتم گندھر نے سوتر روپ میں بنایا اور مہابیر سوامی سے پندرھویں پاٹ تک جو آچاریہ ۵۱۴ برس کے عرصے میں ہوئے انھوں نے ۷۲ اُپانگ سوتر (جن میں سے ۳۳ کو انگالک اور ۳۹ کو کالک سوتر کہتے ہیں) تصنیف کیے۔ اس طرح کل ۸۴ سوتر

ہو گئے ان کے نام نندی سوتر میں درج ہیں۔ یہ چوراسی تو مول (بنیادی) سوتر ہیں، پھر ان پر تریکیت، چورنی، بھاشیہ اور ٹیکا لکھے گئے اور پانچوں مل کر پنچ رنگی بانی کہلائے۔ ان میں سے بہت سے ساتھ ہی ساتھ بھولے بھی جانے لگے۔ چنانچہ مہابیر سوامی سے ۲۱۵ سال بعد جو پہلا بارہ سالہ قحط پڑا کئی سوتر سادھو اس میں بھول گئے اور پھر کئی مہابیر نروان (وفات) سے جو ۲۵۰ برس بعد راجہ سن پرتی اور آریہ سہست آچاریہ کے وقت میں بارہ سالہ قحط پڑا، اس میں بھول گئے اور کئی تیسرے قحط میں، جو مہابیر نروان سے ۵۱۴ برس بعد بجر سوامی کے وقت میں پڑا، بھول گئے، چوتھا بارہ سالہ قحط مہابیر سوامی سے ۹۸۰ برس بعد بکرم سمبت ۵۱۰ میں پڑا اس وقت اکتالیسویں پاٹ پر دیو آردھی گن چھما شرن براجمان تھے، انھوں نے شترنجے پہاڑ سے بلبھی نگر میں چوماسہ کیا۔ ایک روز انھوں نے کسی مطلب کے واسطے سونٹھ کی ایک چھوٹی سی گرہ منگائی تھی اور اسے اپنے کان پر رکھ لی تھی، تھوڑی دیر میں وہ اس کو بھول گئے۔ اس وقوعہ سے ان کو خیال ہوا کہ سوتر یکے بعد دیگرے بھولے جا رہے ہیں اور لوگوں کا حافظہ روز بروز کم ہوتا جاتا ہے اس لیے مناسب ہے کہ جو سوتر اب تک یاد ہیں ان کو تحریر میں لایا جائے۔ چنانچہ انھوں نے گجرات اور سورٹھ کے تمام سادھوؤں کو بلا کر سوتر لکھوائے۔ کچھ سادھو منہ سے بولتے جاتے تھے، کچھ لکھتے جاتے تھے۔ اس طرح صرف ۴۵ سوتر جو اس وقت تک یاد رہ گئے تھے تحریر میں آئے۔ ان ۴۵ سوتروں کو مورتی پوجک سوئیتامبری مانتے ہیں۔ ان میں سے ۳۲ کو ستھانک واسی سوئیتامبری مانتے ہیں۔" (صفحہ ۶۷ تا ۶۹)

ان ۴۵ سوتروں کے بارے میں مصنف کتاب کا ریمارک یہ ہے:

"یہ ۴۵ سوتر دوادشانگ بانی کا بہت ہی تھوڑا حصہ ہیں، فرقہ دگمبر ان کو مستند نہیں سمجھتا، ان سوتروں میں کہیں کہیں ایک دوسرے کے بیان میں فرق بھی ہے۔" (صفحہ ۶۹)

اب ناظرین خود ہی فیصلہ کریں کہ موجودہ جین گرنتھوں کی تعلیمات کو مہابیر سوامی کی طرف منسوب کرنا کہاں تک قرین صحت ہے اور انھیں حقیقت قرار دے کر ان پر ایمان لانا کس حد تک صحیح ہے۔

جین فرقے

جینیوں میں بہت سے فرقے ہیں، لیکن جیسا کہ اوپر گزر چکا، بنیادی طور پر اُن میں دو ہی فرقے ہیں، ایک دگمبر، دوسرے سوتیامبر، پھر ان دونوں کی دو قسمیں ہیں مورتی پوجا کرنے والے اور مورتی پوجا نہ کرنے والے، دگمبر اور سوتیامبر فرقوں کے اختلافات پر جین مت سار کے مصنف نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"دگمبر اور سوتیامبر فرقے میں خاص کر ۸۴ باتوں میں اختلاف رائے ہے جن کا ذکر دگمبر پنڈت ہیم راج نے اپنی "چوراسی بول" نامی پستک میں اور سوتیامبر سادھو شانتی بجے جی نے اپنی پستک "مالو دھرم سنگھتا" میں کیا ہے۔" (صفحہ ۴۷)

اس کے بعد تفصیل سے ان اختلافات کی نشاندہی کی ہے، آخر میں ان کا خلاصہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کسی کسی پستک میں چند اور بھی معمولی اختلافات لکھے ہیں، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ سوائے تین باتوں کے ایک

کیول گیان[1] کے لیے بیرونی پرگرہ کا تیاگ[2]، دوسرے استری[3] کو موکش[4]، تیسرے کیولی[5] کے کاہار روگ[6] وغیرہ، باقی تفاوت معمولی باتوں میں ہیں اور وہ قصہ کہانیوں کے تفاوت قابلِ غور نہیں ہیں۔ سوتیامبر فرقہ میں کلپش اور ستھاور کلپی[7]، دونوں طرح کے مینوں کو مانتا ہے، دگمبر فرقہ ان میں سے صرف پہلے کو، جو ہر دو دیں اعلیٰ ہے، تسلیم کرتا ہے۔ استری چونکہ کُلّی تیاگ نہیں کر سکتی اور بہ نسبت مرد کے قدرتاً کمزور ہوتی ہے۔ لہٰذا جمع شدہ کرموں[8] کے کاٹنے اور مکتی حاصل کرنے کے لیے جس قدر سخت تپسیا کی ضرورت ہے وہ اپنے موجودہ جسم میں نہیں کر سکتی اس کے لیے اس کو پھر مرد کے قالب میں آنا پڑتا ہے، مرد کے قالب میں آکر تپسیا وغیرہ کر کے مکتی ہوتی ہے۔ کیول گیان حاصل ہونے پر صرف چند کرم پرکرتیوں کے علاوہ باقی تمام کرم ناش ہو جاتے ہیں اس لیے کیول گیانی پُرش انسانی جسم سے ہوتا ہوا بھی ایک غیر معمولی انسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر دگمبر فرقہ اس کی بابت یہ کہتا ہے کہ اس کو معمولی انسانوں کی طرح بھوک اور پیاس نہیں رہتی تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے، وہ تو خود ہی ایک قابلِ تعجب شخص بن جاتا ہے (صفحہ ۸۶، ۸۷)

گویا اصل اختلاف تین باتوں میں ہے، ایک یہ کہ کامل عرفان اور مکتی حاصل کرنے کے لیے دگمبر فرقہ کپڑوں اور بیرونی علائق کو بالکل تج دینا

---

[1] کامل عرفان، ہر چیز کا علم [2] کپڑے وغیرہ [3] عورت [4] نجات [5] عارفِ کامل جیسے تیرتھنکر [6] غذا [7] بیماری [8] مادر زاد برہنہ [9] کپڑے پہنے ہوئے [10] پچھلے جنموں کے اعمال۔

ضروری سمجھتا ہے، اسی لیے ان کے سادھو مادر زاد ننگے رہتے ہیں سوتیامبر فرقہ ایسا نہیں سمجھتا۔ سوتیامبر سادھو، پہننے، اوڑھنے، بچھانے اور دیگر ضروریات کے لیے چودہ چیزیں رکھتے ہیں جن میں چادر، بستر اور لاٹھی وغیرہ شامل ہیں جب کہ دگمبر سادھو صرف تین چیزیں رکھتے ہیں (۱) شاستر (۲) مور کے پنکھ کی پنچھی زمین کو شدھ کر کے بیٹھنے کے لیے (۳) کمنڈل آب دست لینے کے لیے۔ اسی طرح سوتیامبر فرقے کی مورتیاں ننگی نہیں ہوتیں۔ دگمبر فرقے کی مورتیاں بالکل ننگی ہوتی ہیں۔ سوتیامبر فرقے کے سادھو منہ پر پٹی ڈال کر بولتے ہیں۔ دگمبر فرقے کے سادھو کپڑے سے بالکل کنارہ کش رہتے ہیں۔ دگمبر فرقے کے سادھو دن میں ایک بار کھانا کھاتے ہیں اور برتن کے بجائے ہاتھ میں لے کر کھانا کھاتے ہیں، سوتیامبر فرقے کے سادھو دن میں دو بار کھاتے ہیں، سوتیامبر سادھو شودر کے گھر کا کھانا لے لیتے ہیں، دگمبر سادھو اسے ناجائز خیال کرتے ہیں، اگر کھانے کے لیے کوئی شخص بلانے کے لیے آئے تو سوتیامبر سادھو چلے جاتے ہیں لیکن دگمبر سادھو اسے ناجائز خیال کرتے ہیں۔" (جین مت سار صفحہ ۸۲، ۸۳)

دوسری بات یہ ہے کہ سوتیامبر فرقہ کے نزدیک عورت اپنے موجودہ جسم ہی میں نجات حاصل کر سکتی ہے۔ چنانچہ ایک تیرتھنکر عورت ہی تھے جب کہ دگمبر فرقہ کی رو سے عورت کے قالب میں مکتی حاصل نہیں ہو سکتی، اس کے لیے مرد کے قالب میں جنم لینا ضروری ہے، یہ لوگ سب تیرتھنکروں کو مرد تسلیم کرتے ہیں، مصنف لکھتے ہیں:

"دگمبر اچاریہ کند کند سوامی نے کرت شست پاہڑ میں لکھا ہے کہ استریوں (عورتوں) کے اندامِ نہانی اور پستان اور ہر دو بغلوں میں سوکشم جیو (لطیف جانور) ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ ہنسا کا پورا تیاگ نہیں کر سکتی اور موکش نہیں جا سکتی (نجات نہیں پا سکتی)

سولھویں سورگ (جنت)[1] تک جاتی ہے۔ استریوں کے چت (دل) میں شدھتا (پاکی) نہیں ہوتی۔ ہر مہینے حیض آتا ہے اس لیے بے خطر دھیان (مراقبہ) نہیں کر سکتی لہٰذا موکش نہیں جاتی (نجات نہیں پاسکتی) (دیکھو پاہڑ دوم، اشلوک ۲۴، لغایت ۲۶)

استری پر گرہ (کپڑے وغیرہ) کا بھی پورتیاگ نہیں کر سکتی اس کو اپنے بدن پر کپڑا ضرور رکھنا پڑتا ہے" (جین مت سار صفحہ ۸)

عورت کی طرح دگمبر فرقہ چنڈال اور شودر کے لیے بھی نجات نہیں مانتا سونتیامبر مانتا ہے" (صفحہ ۸۴)

تیسری بات جس میں اختلاف ہے یہ ہے کہ عارف کامل یا تیرتھنکر انسانی جسم میں ہوتے ہوئے انسانی ضروریات رکھتا ہے اور بھوک، پیاس اور بیماری اسے لاحق ہوتے ہیں یہ سوتیامبر فرقے کا خیال ہے، دگمبر فرقہ اس کا انکار کرتا ہے، تیرتھنکروں کے متعلق بعض دوسری باتوں کے سلسلے میں بھی اختلافات ہیں، لیکن طوالت کے خوف سے ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں:

جینی عام طور پر تیرتھنکروں کی مورتیاں بنا کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔ "سوامی دیانند سرسوتی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مورتی پوجا جینیوں نے شروع کی اور انہی سے ہندوؤں میں آئی۔ اس بات کو جینی تسلیم کرتے ہیں۔ "جین مت سار" کے مصنف لکھتے ہیں:

"سوامی دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش کے گیارہویں سملاس (باب) کے بیسویں پیرے میں لکھتے ہیں کہ مورتی پوجن پہلے جینیوں نے چلایا۔ یہ درست ہے کیوں کہ جین

---

[1] یعنی عورت کے اعضا میں لطیف کیڑے ہوتے ہیں وہ مرتے رہتے ہیں، ان کی ہنسا کی وجہ سے آواگون کے چکر سے نجات پا کر خدا نہیں بن سکتی صرف جنت میں جا سکتی ہے۔

شاستروں میں لکھا ہے کہ بھرت چکرورتی نے کیلاش پربت پر ۷۲ مندر بنوائے، بھرت کا زمانہ تہذیب کا ابتدائی زمانہ ہے۔ بھرت کے بعد اور جینیوں نے مہا پرشوں کی مورتیاں بنوائیں اور اس طرح ان کی تعظیم کر کے دنیا کو گن کی قدر کرنا سکھایا۔" (صفحہ ۲۹۳)

لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دگمبر اور سوتیامبر دونوں میں جہاں اکثر لوگ مورتی پوجا کرنے والے ہیں، وہیں ان کے کچھ فرقے مورتی پوجا کے مخالف ہیں، اوپر گزر چکا ہے کہ دگمبر فرقہ میں مورتی پوجا کے منکرین کو تارن پنتھی کہا جاتا ہے اور سوتیامبر فرقہ کے مورتی پوجا نہ کرنے والوں کو ڈھونڈیا یا استھانک واسی کہتے ہیں۔ "جین مت سار" کے مصنف جو دگمبر فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور مورتی پوجا کے بہت بڑے حامی ہیں، ان فرقوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بعد ازاں بکرم کی سولھویں صدی (مہابیر سے دو ہزار سال بعد) کے شروع میں دگمبر فرقہ میں سے ایک تارن پنتھ نکلا جس نے مورتی پوجن ترک کیا، تارن پنتھ کے بانی تارن سوامی سمت ۱۵۰۵ بکرم میں پیدا ہوئے۔ تارن سوامی نے چودہ شاستر بنائے اور ۴۳۹۳ آدمیوں کو، جو مختلف اقوام کے تھے اور جن میں مسلمان بھی شامل تھے اپنا شاگرد بنایا، مورتی پوجن منع کیا، تارن سوامی سمت ۱۵۷۲ بکرم میں سورگ گئے۔ مورتی پوجن کی ہسٹری ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ یہاں صرف اتنا بتا دیتے ہیں کہ ہندوؤں میں مورتی پوجن ایک عرصے سے چلا آ رہا تھا، جین مت کے ہر دو فرقے دگمبر و سوتیامبر کے شاستروں میں اس کا ذکر ہے مگر جب

---

[1] جین مت کے پہلے تیرتھنکر رشبھ دیوجی کا لڑکا جو بہت بڑا راجہ تھا، جس کے نام پر اس ملک کا نام بھارت ہوا۔

مسلمانوں کا زور ہوا اور مسلمانوں نے ہندوؤں کے مندروں کو مسمار کرانا شروع کیا اور ان کے واعظان نے بت پرستی کے برخلاف وعظ دینے شروع کیے تو سولھویں صدی (بکرمی) کے شروع میں دگمبر فرقے میں سے تارن پنتھ، سوتیامبر میں سے لوکایا ڈھونڈیا[1] مت اور ہندوؤں میں سے کبیر اور نانک پنتھ نکلے، ان کے بانی تارن سوامی کو تما شاہ کبیر صاحب اور نانک صاحب ایک ہی وقت میں گزرے ہیں، ان سب نے مورتی پوجن کی تردید کی۔"

(صفحہ ۶۳)

مندروں کو مسمار کرنے کے الزام سے قطع نظر کہ مصنف نے یہی الزام ہندوؤں کے بعض بڑے مذہبی پیشواؤں پر بھی لگایا ہے:

"اور ساگار دھرم امرت سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ سمت ۱۰۱۰ بکرمی میں رامانج ہوجاتے ہیں جو شاستری رام چندر جی کے بڑے بھگت تھے، انھوں نے جینیوں کے سات سو مندر تڑوائے میسور کے راجہ ہویسال کو جینی سے وشنوی بنایا، جینیوں کو بڑی تکلیف دی۔" (صفحہ ۲۹۴)

یہ معلوم ہوتا ہے کہ مورتی پوجا کے "تارک اور منکر فرقے ہندوؤں اور جینیوں دونوں میں اسلام اور مسلمانوں کے اثر سے ہوئے ہیں، ہندوؤں کی حد تک بات تو صحیح ہے، کبیر اور گورونانک کا مسلمان صوفیا سے ربط اور ان سے متاثر ہونا تاریخ سے ثابت ہو سکتا ہے کہ یہی بات جین فرقوں کے بارے میں بھی صحیح ہو۔ جیسا کہ مصنف نے کہا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جین مت میں پہلے مورتی پوجا نہ ہو اور بعد کو اس کا رواج ہوا ہو۔

---

[1] یہ لوگ اپنے آپ کو ڈھونڈیا کہلانے کے بجائے ستھانک واسی کہلانا پسند کرتے ہیں۔

جَین مت کے عقائد

کسی مذہب کے سلسلے میں سب سے بنیادی چیز اُس کے عقائد ہوتے ہیں۔ "جین مت کے عقائد" کے عنوان کے تحت "جین مت سار" کے مصنف لکھتے ہیں :

"جین مت کے چھ بڑے عقائد حسب ذیل ہیں :

(۱) دنیا جیو (روح) پُدگل (مادہ) اور ان کے تعلق سے پیدا ہوئے کرشموں کا نام ہے۔ یہ دنیا انادی (ازلی) ہے، کوئی خاص علیحدہ طاقت اس کی خالق و منتظم نہیں ہے۔

(۲) جیو اور پُدگل کا تعلق کرم (دنیوی اعمال) کی وجہ سے ہے۔ کرم جیو کو سنسار میں گھماتا ہے (بار بار جنم) جیو اور پدگل کا تعلق اگرچہ انادی (بلا شروع) ہے مگر سانت (ختم ہونے والا) ہے۔

(۳) جیو کو کرم سے رہائی سمیک درشن (صحیح ایمان) سمیک گیان (صحیح علم) سمیک چارتر (صحیح کردار) کے اکٹھا ہونے سے ملتی ہے، اس رہائی کا نام مکتی ہے۔

(۴) شُدھ مکت یافتہ (نجات یافتہ) جیو ہی کا نام پرماتما ہے۔ وہ سنساری جیو کے لیے نمونہ بن کر اس کے لیے نجات میں رہبر کا کام دیتا ہے۔ اس لیے ہر انسان کو اپنی بہتری اور مکتی حاصل کرنے کے لیے اس کی کوشش واجب ہے۔ (تیرتھنکر خدا ہیں)۔

(۵) دنیا میں جیو بے شمار ہیں جن میں سے وقتاً فوقتاً مکتی حاصل کرتے رہتے ہیں اور مکتی حاصل کر کے پھر دنیا میں نہیں آتے دنیا جیووں سے کبھی خالی نہیں ہوتی۔

(۶) آہنسا سب سے بڑا دھرم ہے۔" (صفحہ ۸۹)

ان میں سے ہر چیز کی تشریح و تفصیل نہایت طویل اور پیچیدہ ہے، ہم اپنے موضوع کی مناسبت سے صرف ایک اور چار نمبر پر روشنی ڈالیں گے۔

جین مت میں خدا کا تصوّر

سب سے پہلے عقیدہ کو سمجھئے، جین مت دنیا کو ازلی و ابدی مانتا ہے اور اس لیے اس کا کوئی خالق و منتظم تسلیم نہیں کرتا۔ جین مت کی رو سے یہ دنیا مادہ اور روح سے پیدا شدہ مختلف شکلوں کا نام ہے، کوئی چیز پیدا ہوتی ہے نہ فنا ہوتی ہے بس شکلیں بدلتی رہتی ہے۔ سب کچھ آپ سے آپ پچھلے جنم کے اعمال کے نتیجہ میں ہوتا رہتا ہے۔ جین مت کے اس تصور کے تحت یہ مشہور ہو گیا ہے اور ہندوستان کے بڑے بڑے غیر جینی محقق ایسا ہی سمجھتے ہیں کہ جین مت ناستک (خدا کا منکر) ہے لیکن جین مصنف و رہنما اس کا انکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے منکر نہیں ہیں البتہ خدا کے خالق، منتظم اور مجازی ہونے کے منکر ہیں، اُن کے نزدیک خدا میں یہ صفات ماننا خدا کے شایانِ شان نہیں ہے۔ "جین مت اور پرماتما" کے مصنف رکھب داس جینی اپنی کتاب کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں:

"ناظرین کو معلوم ہوگا کہ اکثر لوگ جینیوں کو ناستک (ملحد) کے نام سے پکارتے ہیں، جین دھرم پر ماسکتا (الحاد) کا الزام لگاتے ہیں۔ ان کے ایسا کرنے سے ظاہر ہے کہ ان کا جین دھرم کی مطلق واقفیت نہیں۔ جین دھرم والے پرماتما کے وجود سے ہرگز انکار نہیں کرتے، جین گرنتھوں میں آتما و پرماتما کا سروپ (خاکہ) ایسا مشرح اور توضیح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ دوسری جگہ ویسا نہیں، صرف فرق اتنا ہے کہ جین دھرم والے پرماتما میں

کرتا ہرتا (پیدا کرنے والا اور دور کرنے والا) کی صفت نہیں مانتے ہیں۔" (صفحہ ۱)

پھر وہ یہ بتاتے ہیں کہ خدا کو خالق، منتظم یا مجازی ماننا کیوں غلط ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں:

"اب یہاں کوئی یہ اعتراض کرے کہ جب آپ پرماتما کو کرتا ہرتا نہیں مانتے، جب پرماتما سنساری جیو کو کچھ دکھ سکھ نہیں دیتا، جب پرماتما انسان کو کچھ مدد یا نفع نہیں پہنچا سکتا تو اس کی پرستش سے کیا فائدہ؟ جین دھرم والے پرماتما کی پرستش اس لیے کرتے ہیں کہ پرماتما کا دھیان کرنے سے دل دنیاوی عیش و عشرت سے ہٹ جاوے اور پرماتما کے اوصاف آتما (روح) میں ظاہر ہو کر آتما آواگون سے چھوٹ کر پرماتما پد (الوہیت کے مقام) پر پہنچ جائے۔" (صفحہ ۴۰)

یہی بات (Jainism not Atheism) (جین مت ملحدانہ نہیں ہے) کے مصنف نے لکھی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"جب یہ تمام خارجی طاقتیں (مادہ سے پیدا شدہ) روح سے ہٹا دی جاتی ہیں تو روح پاک ہو جاتی ہے اور پھر کبھی ناپاک نہیں ہوتی اور خدائی کے مقام پر پہنچ جاتی ہے۔" (صفحہ ۲)

"جین ازم (Jainism) میں" (The Fundamental of Jainism) (جین مت کے بنیادی اصول) کے مضمون نگار پی، آر، جین لکھتے ہیں:

"جینی شخصی وازلی خدا پر، جو شروع سے ہو، ہر جگہ ہو، ہر چیز کو جانتا ہو، قادرِ مطلق ہو، ساتھ ہی کائنات کا خالق بھی ہو یقین نہیں رکھتے، جین مت میں خدائی مقام پر پہنچی ہوئی، مکتی حاصل

کی ہوئی روحیں، جو تعداد میں بے شمار ہیں، خدا کی جگہ لیتی ہیں۔ ایک فرد کی روح مسلسل مساعی کے بعد الوہیت کا مقام حاصل کر لیتی ہے، وہ انسانی روح ہی ہے جو خارجی، مادی کرموں سے پوری طرح پاک صاف ہو جانے پر خدائی اوصاف کے بلند ترین مقام پر پہنچ جاتی ہے اس طرح اس نظام میں خود اپنی مدد آپ پر بھروسہ کرتے ہوئے خدا بن جاتا ہے۔" (صفحہ ۳۱)

"جین مت کے تصورِ خدا کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ عبادت مطلقاً غیر شخصی ہے اور تمام انسانی روحوں کو جو الوہیت کی مستحق ہیں بلا امتیاز رنگ، ذات، ملک عظمت وکبریائی کا مقام دیا گیا ہے۔ "جین نمسکار منتر" (کلمۂ عبودیت) میں جسے جینی ایک دن میں بہت سی بار جپ کرتے ہیں، افراد کو نہیں، پرمیشتھی (عظمت وکبریائی رکھنے والے) پانچ طبقات کو عقیدت ونیازمندی پیش کی گئی ہے جو حسب ذیل ہیں:

ارھت: جسم رکھنے والی روحیں جنھیں ہر چیز کا علم حاصل ہو گیا (جو جسم رکھتے ہوئے خدا بن گئیں جیسے تیرتھنکر وفات سے پہلے)

سِدّھ: وہ روحیں جو جسم کے چکر سے رہائی پا کر آخری نجات کے مقام پر فائز ہو گئیں (تیرتھنکر وغیرہ وفات کے بعد)

آچاریہ: راہبانہ سلسلہ کے سردار۔

اُپادھیائے: معلم سادھو۔

سادھو: عام سادھو" (صفحہ ۳۲، ۳۳)

جینیوں کا یہ کلمہ جسے وہ تمام مذہبی عبادتوں میں دہراتے ہیں

پراکرتی[1] میں ہے اور افسوس یہ ہے کہ اس کے سلسلے میں دگمبر اور سوتیامبر فرقوں میں اختلاف ہے:

"سوتیامبر نمشکار کے ۹ پد اور ۶۸ حروف مانتے ہیں، دگمبر ۵ پد اور ۳۵ حروف مانتے ہیں" (جین مت سار ص۸۴)

آتما اور پرماتما کے سلسلے میں "جین مت سار" کے مصنف لکھتے ہیں:

"جب جیو (روح) کرموں سے رہائی پاکر اور پدگل (مادہ) سے علیحدہ ہوکر نجات حاصل کر لیتا ہے تو اس کا نام جیو آتما سے پرماتما بن جاتا ہے۔ اس حالت والے جیو کو انتر آتما یا عارف بولتے ہیں۔ اس انتر آتما کی حالت میں جیو پہلے اکٹھے کئے ہوئے (پچھلے جنموں کے) کرموں کی نرجرا (خاتمہ) کرتا ہے اور آئندہ کرم باندھنے سے رو کتا ہے (عمل کے بجائے گیان دھیان میں لگا رہتا ہے) جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے اکٹھے کیے ہوئے کرم آہستہ آہستہ دور ہو جاتے ہیں۔ جب پہلے کرم دور ہو گئے اور آئندہ باندھے نہ گئے[2] تو جیو اکیلا رہ جاتا ہے اس کا ساتھ پدگل (مادہ) سے ہٹ جاتا ہے۔ جب پدگل سے اور پدگل روپ سے علیحدگی ہو گئی تو چوراسی لاکھ جونیوں سے رہائی بھی ہو گئی، جنم مرن کے جھگڑے سے بری ہو گیا، بری ہونے ہی کا نام نجات پا لیتی ہے، ایسی حالت میں جیو کا نام پرماتما یا عالم کل ہو جاتا ہے۔ پرماتما کی دو قسمیں ہیں ایک سکل پرماتما

---

[1] جین مت کی کتابیں اصلاً پراکرتی اور پھر سنسکرت میں ہیں، مہابیر سوامی نے پراکرتی میں اپدیش دیا تھا۔ [2] اس کے لیے جین دھرم میں ہنسا اور علائق دنیا کو ترک کرنا ضروری ہے۔ حتیٰ کہ موت کو قریب پاکر کھانا پینا بالکل چھوڑ دینا چاہیے۔ جین مت کی رو سے یہ خودکشی نہیں نجات کی یقینی راہ ہے۔

(جسمانی غذا) یا جیون مکت ، دوسرا نکل پرماتما یا بدیہہ مکت (بے جسم کا غدا) جیون مکت کی حالت جیو کی اس وقت ہوتی ہے جب اس کو کیول گیان ہوتا ہے۔ یعنی جب وہ سب اشیاء کی ہر حالت کو جاننے لگتا ہے اور اٹھارہ دوشوں (عیبوں) سے بری ہو جاتا ہے۔

اس وقت وہ اپنے آخری جسم میں ہوتا ہے اور سنساری جیووں کو دھرم اپدیش دیتا ہے اور جس راستہ پر چل کر اس کو یہ درجہ حاصل ہوا ہے اس کی تعلیم و تلقین دوسروں کو کرتا ہے۔ وید و شاستر اسی وقت بنتے ہیں جب وہ سکل پرماتما اگھاتیا کرموں کا بھی ناش کر دیتا ہے اور آیو کرم کو ختم کر کے آخری جسم کا تیاگ کر دیتا ہے تو پھر نکل پرماتما یا بدیہہ مکت کہلاتا ہے اس وقت جیو کا جسم اور کرم سب سے چھوٹ جاتا ہے، پاک جیو رہ جاتا ہے اس کا اکار (تعلق) اپنے آخری جسم کے ساتھ صرف ایک عکس کی مانند رہتا ہے اور پھر وہ پاک روح دنیا میں نہیں آتی۔ شدھ مکت یا نفس جیو، پرماتما اننت (لا انتہا) درشن (ایمان) اننت گیان، اننت سکھ، اننت ویریج (لا انتہا طاقت والا) امر، پونر، امورتیک (بغیر جسم کا) اور دتیراگ ہوتا ہے۔ وہ اپنے سرورِ روحانی میں مست رہتا ہے، وہاں اس کو کسی قسم کی خواہش، کسی قسم کا دکھ نہیں ہوتا۔ اس کو کسی سے کچھ مطلب نہیں ہوتا۔" (صفحہ ۲۸۴ تا ۲۸۶)

مندرجہ بالا اقتباسات سے حسب ذیل امور واضح ہوتے ہیں :

۱ : دنیا ازلی و ابدی ہے اس لیے نہ کوئی خالق ہے، نہ فنا کرنے والا، نہ منتظم۔

۲ : روح اپنے پچھلے کرموں کے نتیجہ میں نئے نئے مادی قالب ۸۴ لاکھ جونیاں اختیار کرتی ہے اور یہ سب کچھ خود بخود ہوتا ہے، اس لیے

کوئی جزا و سزا دینے والا خدا بھی نہیں ہے۔

۳ : روح جب اپنے پچھلے کرموں (اعمال) کے اثرات دھو دیتی ہے اور نئے کرم نہیں کرتی تو اسے کلی عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی روح کو پرماتما کہتے ہیں۔

۴ : جب تک یہ نجات یافتہ روح جسم ـــــ آخری جسم میں رہتی ہے اسے سکل پرماتما کہتے ہیں۔ اسی حالت میں وہ انسان کی رہنمائی کے لیے اپدیش دیتی ہے۔ انہی کو تیرتھنکر اور ارہت کہتے ہیں۔

۵ : جب سکل پرماتما اپنا جسم چھوڑ دیتا ہے (مر جاتا ہے) تو وہ نکل پرماتما ہو جاتا ہے وہ لاانتہا علم اور لاانتہا قدرت والا اور بغیر جسم کے ہوتا ہے اسے نہ کوئی خواہش ہوتی ہے نہ کسی سے کچھ علاقہ۔ دنیا سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

۶ : پرماتما بہت سے ہیں، ہر نجات یافتہ روح پرماتما ہی ہے۔

۷ : پرماتما (تیرتھنکر) کی پرستش اس لیے کی جاتی ہے کہ ہم بھی نجات پا کر پرماتما بن جائیں۔ اس طرح جین مت خدا کا منکر ہوتے ہوئے بھی خدا کا قائل ہے۔

واضح رہے کہ نجات یافتہ روح (پرماتما) کے علاوہ، جو بہت ہیں، جین مت دیوتاؤں کا بھی قائل ہے۔ یہ دیوتا تیرتھنکروں کی پیدائش، سنیاس، گیان اور نجات (موت) کے وقت آتے، جشن مناتے اور مختلف طرح کی خدمات انجام دیتے ہیں:

"دگمبر سنو اِندر (دیوتا) مانتے ہیں، سوئتامبر ۶۴" (جین مت سار ص ۸۳)

"سوئتامبر کہتے ہیں کہ تیرتھنکر کے موکش جانے (نجات پانے، مر جانے) کے بعد دیوتا اُنکی داڑھ سورگ (جنت) میں لے جا کر پوجتے ہیں، دگمبر کہتے ہیں کہ دیوتا ناخن اور بال سورگ میں لے

سے جاتے ہیں۔ سوتیامبر کہتے ہیں کہ تیرتھنکر کے جنم کے وقت اندر پالکی سے کر آتا ہے، دگمبر کہتے ہیں کہ ایراوت ہاتھی لے کر آتا ہے۔" (جین مت سار صفحہ ۷۷، ۷۸)

مورتی پوجا

"جین مت سار" کے مصنف "مورتی پوجن" کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں:

"جو نجات کے متلاشی ابھی مبتدی ہیں اور پرمیشور کی صفات کو اپنے چنچل دل میں جگہ نہیں دے سکتے۔ ان کے واسطے بزرگان قدیم نے اس کی صفات کو مجسم کر کے اس کی مورتی بنائی ہے جس کو سامنے رکھ کر مبتدی لوگ اس کی صفات کا دھیان اپنے دل میں کر سکتے ہیں جس کا سب سے اعلیٰ نمونہ جین دگمبر مورتی ہے۔ جینیوں کی یہ مورتی سکل پرماتما (تیرتھنکر) کی تصویر ہے اور مانند دیگر اہلِ ہنود کی مورتیوں کے سنساری جیون کیسی اور گرہستیوں جیسی نہیں ہے یعنی نہ اس کے پاس استری ہے، نہ کوئی ہتھیار ہے اور نہ کوئی پوشاک وغیرہ سامانِ عیش ہے (یعنی بالکل عریاں ہوتی ہے)۔

(صفحہ ۲۸۸، ۲۸۹)

"جو شخص ابتدائی حالت میں مورتی بدون دھیان لگایا اور چیت (دل) کا یکسو کرنا چاہتا ہے۔ وہ گویا خلا میں تیر پھینک کر تیر اندازی سیکھنا چاہتا ہے جو ناممکن ہے۔"

(صفحہ ۲۹۱)

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل ان مورتیوں کے آگے صرف ہاتھ جوڑ کر یا آن اشٹ انگ نمشکار کر کے ان کی پوجا یعنی تنظیم

کی جاتی تھی، بعدازاں پھل پھل اشٹ دربیہ[1] سے اُن کی پوجا کرنے کا رواج پڑا، پُرانے جین رِشیوں شری کُند کُند آچاریہ، شری سمنت بھدر سوامی، شری پوج پاد سوامی، شری امرت چندر سوامی کے کلام میں اشٹ دربیہ (آٹھ چیزوں) سے پوجا کرنے کا صاف طور پہ ذکر نہیں ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نویں صدی سے پہلے مورتی پوجن اشٹ دربیہ کو اگنی کنڈ میں ڈال کر ہوم کیا جاتا تھا۔ ساگار دھرم امرت سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ سمبت ۱۰۰۱ بکرمی میں رامانج ہوئے ہیں جو شری رامچندر جی کے بڑے بھگت تھے۔ انھوں نے شہر میں وشنو مندر بنوا کر رام چندر جی اور لکشمن جی اور سیتا جی کی مورتی اُن میں استھاپن (قائم) کرائی، دیپ، دھوپ، نئی وید سے اُن کی پوجا شروع کی اور لوگوں کو رغبت دلانے کے لیے لڈو، پیڑے بطور پرشاد کے تقسیم کرنے شروع کیے، غالباً ان کی دیکھا دیکھی جینیوں نے بھی بہت سے مندر شہر میں بنوائے

---

[1] آٹھ قسم کی اشیاء جن کو "اشٹ دربیہ" کہتے ہیں، جل، چندن، اکشٹ، پشپ، نئی وید، دیپ، دھوپ، پھل ہیں، جن میں سے جل میں تمام اقسام مائعات چندن میں بدن پر لگانے کی خوشبودار چیزیں، اکشٹ میں تمام اقسام کی اجناس، پشپ میں ہر قسم کے پھول، نئی وید میں ہر قسم کی شیرینی، دیپ میں ہر قسم کی روشنی، دھوپ میں بخارات اور پھل میں میوہ جات، غرض یہ کہ سب قسم کے سامانِ عیش آجاتے ہیں، بھگوان کی مورتی کے آگے پیش کر کے یہ کہتے ہیں کہ اے پرماتما مجھ کو سنسار کی ان اشیائے ہشتگانہ نے دکھ دے رکھا ہے اور دنیا میں پھنسا رکھا ہے۔ آپ نے ان سب کا تیاگ کیا ہے، آپ میرے دل سے ان کو ہٹا دیں۔"

(جین مت سار صفحہ ۲۹۷، ۲۹۸)

اور اس وقت سے وہ بھی اپنی مورتی کی اشٹ دربیہ پوجا کرنے لگے۔ بعد ازاں ۱۱۹۹ء یا سمبت ۱۲۵۶ بکرمی میں مادھو آچاریہ ہوئے انھوں نے وشنو مندر بنوا کر شری کرشن جی اور رادھکا جی کی مورتیاں اُن میں ستھاپن کرائیں اور مندروں میں نرت یا ناچ کروانے کا رواج چلایا۔ جب ویشنو لوگوں نے اس طرح اپنے مندروں کو سجانا شروع کیا اور مورتیوں کے بڑے بڑے سنگار ہونے لگے تب ان کی دیکھا دیکھی جینیوں کے سوتیامبر فرقے نے بھی اپنے مندر شہر میں بنوائے اور بڑی بڑی لاگت کے مکٹ بھگوان کی مورتی پر چڑھانے شروع کیے اور مورتی پوجن بڑی دھوم دھام سے اشٹ دربیہ کے ساتھ ہونے لگا۔ اس طرح جب پوجا مراد سے صرف تعظیم نہیں رہی بلکہ وہ اشٹ دربیہ (آٹھ چیزوں) کے ساتھ ہونے لگا اور مندروں میں ناچ رنگ نرت وغیرہ ہونے لگے تب سولھویں صدی بکرمی میں سوتیامبر فرقے میں لوکا یا ڈھونڈیا ت (ستھانک واسی) اور دگمبر فرقے سے تارن پنتھ اور ویدک ہندوؤں میں سے کبیر پنتھ، نانک پنتھ نکلا جنھوں نے مورتی پوجن کا نشیدھ (ممانعت) کیا، مورتی پوجن کے نشیدھ کے کئی باعث معلوم ہوتے ہیں، اوّل تو مسلمانوں کا اس وقت زور ہو گیا تھا جو ہندوؤں کے مندروں کو توڑ ڈالتے تھے اور مورتی کے برخلاف تھے دوسرے مورتی پوجا کا اس قدر زور ہو گیا تھا کہ لوگ مورتیوں کو مہاپرشوں کی صرف مورتی ہی نہیں بلکہ ساکشات (نظر آنے والا) پرمیشر سمجھنے لگ

لے اگر یہ بات صحیح ہوتی تو پرانے ہندو جین پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے موجود نہ ہوتے۔

گئے تھے۔" (صفحہ ۲۹۲ تا ۲۹۶)

اس پورے بیان کو غور سے پڑھیے، پہلے جینیوں نے مورتی پوجا کی پھر ہندوؤں نے اسے اپنایا، پھر مورتی پوجا کے سلسلے کے رسم و رواج جینیوں نے ہندوؤں سے سیکھے، اس طرح بغیر کسی عقلی یا نقلی ثبوت کے مورتی پوجا ایک دوسرے کی نقل اور آپس میں جین مت، بودھ مت اور ہندو مت کا جزو لاینفک بن گئی لیکن ہر مت میں ایک نہ ایک فرقہ ضرور ایسا پایا جاتا ہے جو مورتی پوجا کا مخالف ہے چنانچہ ستھانک واسی فرقہ جین سوتروں سے مورتی پوجا کے ثابت ہونے کا منکر ہے، جن الفاظ سے مورتی پوجک جینی فرقے مورتی پوجا مراد لیتے ہیں، اُن کا وہ کچھ اور مطلب قرار دیتے ہیں۔" (ملاحظہ ہو جین مت سار صفحہ ۳۰۰ و ۳۰۱)

مورتی پوجا پر اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے "جین مت سار" کے مصنف لکھتے ہیں:

"مورتی پر بعض اشخاص یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اموتیک (جس کی مورتی نہ ہو) پرمیشر کی مورتی نہیں بن سکتی مگر انھوں نے اعتراض کرنے سے پہلے یہ خیال نہیں کیا کہ مورتیاں جو ہیں وہ کسی اموتیک یا نکل پرماتما (غیر مجسم خدا) کی نہیں ہیں وہ تو رشب دیوجی پارس ناتھ جی، مہابیر جی وغیرہ سکل پرماتما (مجسم خدا) کی ہیں جو مورتیک (مجسم) تھے۔" (صفحہ ۳۰۳، ۳۰۴)

گویا پہلے بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے خدا کی مجسم اور غیر مجسم دو تقسیمیں کیں اور پھر بلا کسی ثبوت کے کچھ افراد کو مجسم خدا قرار دیا اور ان کی مورتیوں کی پرستش شروع کر دی۔

جین مت اور عریانی

جین مورتیوں کا تعارف کراتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں :

" جینیوں کی مورتیں دو قسم کی ہوتی ہیں ۔ دگمبر فرقہ کی بالکل برہنہ اور سوتیامبر فرقے کی مورتیوں پر مکٹ ہوتا ہے ۔ دگمبر فرقہ کی مورتیاں اس لیے برہنہ ہوتی ہیں کہ وہ اُن مہاتماؤں (تیرتھنکروں) کی مورتیں ہیں جو بالکل برہنہ رہتے تھے ۔ دونوں فرقوں کے خیال کے مطابق برہنہ ہی رہتے تھے ۔" (صفحہ ۳۰۲)

اس کے بعد مصنف نے عریانی کے حق میں دلائل دیے ہیں ۔" جین مت سار " میں تو یہ بحث ضمناً آئی ہے ۔ مشہور جینی مصنف چمپت رائے جین بار ایٹ لا کا ایک پمفلٹ (The Nudity of Jain Saints) (" جین سادھوؤں کی عریانی ") کے نام سے ہے جس میں انھوں نے عریانی کو لباس فطرت قرار دیا ہے ، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر مذہب میں عریانی موجود ہے اس لیے جین سادھوؤں اور جین مورتیوں کی عریانی صحیح ہے ۔ استدلال کی خوبی اور قوت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام میں عریانی ثابت کرنے کے لیے انھوں نے مثنوی مولانا رومؒ کے بعض اشعار ، سرمد وغیرہ بعض مجذوب درویشوں کے ننگے رہنے سے اور اس بات سے استدلال کیا ہے کہ ابدال ننگے رہتے ہیں ۔ (صفحہ ۸ تا ۱۰)

حالانکہ آخری بات بالکل بے بنیاد ہے ، دوسری بات سند کا درجہ نہیں رکھتی ، جو لوگ عالم ہوش میں نہ ہوں ان کے قول و فعل کا کیا اعتبار ، اور مثنوی مولانا رومؒ کے اشعار (دفتر دوم صفحہ ۲۹ ، مطبوعہ مطبع نامی) کا مطلب وہ نہیں ہے جو مصنف نے سمجھا ہے ، ان اشعار میں ، جیسا کہ شارحین نے صراحت کی ہے ، جامہ پوشی سے مراد ظاہر پرستی اور عریانی سے مراد باطن کی طرف توجہ

کرتا ہے۔ مثنوی مولانا رومؒ میں متعدد جگہ اس طرح کی بات آئی ہے اور ہر جگہ یہی مفہوم مراد ہے، لیکن اگر ان اشعار کا مطلب وہی ہو جو مصنف نے سمجھا ہے، تب بھی اسلام میں عریانی ثابت نہیں ہوتی۔ اسلام نام ہے قرآنِ مجید اور احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور ان دونوں سے عریانی کی ممانعت و حرمت اور جامہ پوشی کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔ نہ کہ مثنوی مولانا رومؒ کا، کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم، صوفی، مصنف اور محقق ہو، اگر اس کی بات کتاب و سنت سے ٹکراتی ہے تو پر کاہ کے برابر وزن نہیں رکھتی اور اسلام میں اس کا کوئی مقام نہیں۔

جین مت کے اثرات

جین مت کے ماننے والے آج بہت کم ہیں، کچھ پتہ نہیں چلتا کہ پہلے اس مذہب کی مقبولیت کا کیا حال تھا، جو کچھ بھی ہو، اس مذہب نے ہندوستان کے مذاہب اور ہندوستانی افکار و خیالات پر غیر معمولی اثر ڈالا ہے۔ بودھ مت تو جین مت کے بہت مشابہ ہے اور اس کا نقشِ ثانی معلوم ہوتا ہے، ویدک دھرم نے بھی، جو جین مذہب کا حریف تھا، جین مت کا غیر معمولی اثر قبول کیا ہے، ویدوں میں جیسا کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن جیسے محققین کی صراحت ہے، مورتی پوجا، مندر اور تیرتھ یاترا کا ذکر نہیں ملتا، یہ سب چیزیں جین مت سے ہندو مت میں آئیں اور اس کا جزو لاینفک بن گئیں، ویدوں میں ہنسا اور جانوروں کی قربانی کی تعلیم ہے۔ سوامی ویکانند جیسے ہندو مت کے محقق کی بھی یہی تحقیق ہے اور گیتا ہنسا کی سب سے بڑی مبلغ لیکن جین مت کے اثر سے اہنسا انسان کا سب سے بڑا دھرم قرار پایا۔ بلاشبہ بودھ مت نے بھی اہنسا کی تبلیغ کی ہے لیکن بودھ مذہب سے بھی پہلے اور بودھ مت سے بھی زیادہ جامعیت و شدت کے ساتھ جین مت نے اہنسا کی تبلیغ کی اور گزشتہ تھوڑی ہی نہیں،

کسی بھی جاندار کو مارنا یا تکلیف دینا ممنوع قرار دیا۔[1] ویدوں میں آواگون کے بجائے جنت اور دوزخ کا تصور تھا، ہندوؤں نے یہ عقیدہ بھی جینیوں سے لیا اور اسے ہندومت کی اساس بنا دیا۔ آریہ ایک جنگ جو قوم تھے جس کا سنیاس اور ترکِ دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو سکتا تھا۔ سنیاس اور ترکِ دنیا کی تعلیم بھی ہندومت میں جین مت سے آئی، اس طرح ہندوؤں کے ننگے رہنے والے سادھو بھی غالباً جین مت کے دگمبر فرقے سے متاثر ہیں۔ واللہ علم بالصواب،!

---

[1] جین مت کی رو سے نباتات، دودھ اور پانی وغیرہ میں بھی جان ہے مگر ان جانداروں کے کھانے پینے کو ممنوع قرار نہیں دیا گیا ہے اسی طرح ملک کی فلاح اور حفاظت کیلئے جنگ بھی جائز تسلیم کی گئی ہے۔

باب نہم

شرک عظیم ترین گمراہی

مذاہب کی کثرت

کائنات کے عمیق اور سائنٹفک مطالعہ کے بعد اس حقیقت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ یہ وسیع و عریض بزم ایک قادر و حکیم ہستی کی سجائی ہوئی ہے۔ کائنات کی تخلیق ایک خالق و موجد کی، کائنات کا محکم نظم ایک منتظم و مدبر امر کی، کائنات کے ہمہ گیر اور بے لچک قوانین ایک زبردست مقنن و فرمانروا کی اور کائنات کا حکیمانہ نظام ایک حکیم و دانا ہستی کی شہادت دیتے ہیں۔ خدا کی معرفت ایک شاہ کلید (Masterkey) ہے جس سے کائنات کے تمام سربستہ راز ایک ایک کر کے کھل جاتے ہیں اور اس کے گم ہوتے ہی کائنات ایک معمّہ بن جاتی ہے جسے کسی طرح حل نہیں کیا جا سکتا۔

پھر معاملہ کائنات کے رازہائے سربستہ کو سمجھنے ہی کا نہیں، انسان کو سمجھنے، اس کا مقصدِ زندگی متعین کرنے اور انسانی مسائل کو حل کرنے کا بھی ہے۔ الحاد کے پاس ان میں سے کسی بات کا بھی تشفی بخش حل موجود نہیں ہے الحاد سے انسانی زندگی کی کوئی گتھی نہیں سلجھتی جب کہ خدا پرستی کی راہ اختیار کرنے سے تمام لاینحل مسائل ایک ایک کر کے حل ہو جاتے ہیں۔

خدا کی معرفت کا لازمی ثمرہ خدا کی بندگی و رضا جوئی ہے۔ خدا خالق و پروردگار ہے اور ہم اس کی مخلوق اور اس کے پروردہ ہیں، خدا کائنات اور ہم سب انسانوں کا مالک ہے اور ہماری حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کے پیدائشی بندے ہیں، خدا کائنات اور نوعِ انسانی کا مقتدرِ اعلےٰ (Sovereign) ہے اور ہم سب اس کی رعیت ہیں، خدا حاجت روا و مشکل کشا ہے اور ہم ہر ہر چیز حتیٰ کہ جینے اور سانس لینے میں بھی اس کے محتاج ہیں، خدا علیم و خبیر اور حکیم و منصوبہ ساز ہے، اس نے علم حکمت اور منصوبہ کے ساتھ ہماری تخلیق کی ہے اگر یہ صحیح ہے اور کائنات کا پورا صحیفہ اس کے صحیح ہونے پر شاہد عدل ہے تو انسان کے لیے فلاح و کامرانی کی راہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ عجز و نیاز سے اس کے آگے جھک جائے اس کی بخشی ہوئی زندگی، اس کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے عطا کردہ ذرائع و وسائل کو اس کی بندگی و رضا جوئی میں صرف کرے اور اس حکیمانہ منصوبہ کی بجا آوری میں منہمک ہو جائے جس کے لیے خالقِ کائنات نے اسے پیدا فرمایا ہے۔

خدا کو پا لینے کے بعد اس کی بندگی و رضا جوئی کے فیصلہ تک پہنچنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے۔ یہ تو عقل و دانش کا صریح تقاضا ہے، اصل پریشانی کُن مرحلہ اس کے بعد آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کی بندگی کیسے کی جائے اور اس کی مرضی کیا اور اس کا قانون کہاں ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب پانے کے لیے ہم اپنے ذرائع علم ہی کی طرف رجوع کریں گے جہاں تک حواسِ خمسہ اور آلات کا تعلق ہے ان سے تو ہم خدا کی مرضی درکنار، خدا کو بھی نہیں جان سکتے۔ عقل خدا کے وجود کا پتہ دیتی ہے مگر اس کے آگے اس کی تگ و دو بھی تمام ہو جاتی ہے۔ رہا وجدان تو اس سے بھی مبہم اشاروں کے سوا کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔ یوں علم کے ذرائع ایک ایک کر کے سب

ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا دور نہیں ہوتا اور ہم خدا کی بندگی کا فیصلہ کرنے کے باوجود خدا کی بندگی کر لے سے قاصر رہتے ہیں۔

حیرانی و سرگشتگی کے اس عالم میں مذاہب رہنمائی کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ وہ خدا تک پہنچانے کا ذمہ لیتے ہیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے پاس خدا کا وہ مقدس قانون موجود ہے جس کی پیروی لازوال کامرانی کی ضامن اور جس سے انحراف ابدی خسران کا موجب ہے۔ ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا، جس منزل کا سراغ ہمیں کسی طرح نہ ملا تھا، مذاہب کے ذریعے ہمیں اس کا سراغ ملتا نظر آتا ہے۔ ہم فرطِ شوق سے مذاہب کی طرف لپکتے ہیں مگر قریب پہنچتے ہیں تو ہماری ساری خوشی کافور ہو جاتی ہے۔

ہمارے سامنے ایک دو نہیں، لاتعداد چھوٹے بڑے، زندہ اور مردہ مذاہب آجاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دینِ حق ہونے کا دعوے رکھتا ہے۔ ان مذاہب کے درمیان اختلافات فروع میں نہیں، اساسات اور بنیادی عقائد و احکام میں بھی ہے اور یہ اختلاف گہرا اور شدید ہے، مذاہب کے ان اختلافات سے اچھے اچھے ذی علم اور صاحبِ فکر و نظر افراد کی نوبت فیصلہ جواب دینے لگتی ہے کچھ اصحاب تو ان اختلافات کے باعث نفسِ مذہب ہی سے بیزار ہو جاتے ہیں، کچھ دوسرے لوگ آنکھیں میچ کر اپنے آبائی مذہب سے چمٹ جاتے ہیں، خواہ وہ اوہام و خرافات کی پوٹ ہی کیوں نہ ہو، کچھ دوسرے افراد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تمام مذاہب حق پر ہیں اور پھر وہ اپنے ذوق سے ان متضاد مذاہب کے متضاد رسوم و اعمال میں سے چند امور کو چھانٹ کر ایک ملغوبہ تیار کر لیتے ہیں۔

لیکن یہ تینوں صورتیں خدا کی بندگی و رضا جوئی کی نہیں ہیں، پہلی صورت تو خدا پرستی سے کھلا ہوا انحراف ہے، دوسری صورت بھی خدا پرستی کی نہیں ہے، اسے آپ آبا پرستی، رسوم پرستی اور اوہام پرستی جو نام چاہیے دے

ہیں، خدا کی بندگی و رضاجوئی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ خدا کی بندگی یہ ہے کہ آپ اس کے بندے بنیں اور اس کی زمین پر اس کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے اس کی مرضی پوری کریں۔

رہی تیسری صورت تو وہ بداہتہً خلافِ عقل ہے۔ ایک مذہب کہتا ہے کائنات کا کوئی خالق نہیں، دوسرا کہتا ہے کہ کائنات کا ایک خالق ہے اور وہی اس کا منتظم و فرمانروا ہے۔ تیسرا کہتا ہے، خدا تین ہیں۔ چوتھا کہتا ہے خدا بے شمار ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ یہ سب باتیں حق ہوں؟ پھر آپ اسی پر بس نہیں کرتے، آپ متضاد ادیان کے مختلف و متضاد رسوم و اعمال میں سے اپنے ذوق سے کچھ امور کا انتخاب کرتے ہیں اور ان کا ایک معجون مرکب تیار کر لیتے ہیں اور پھر بطورِ خود یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اس ملغوبہ کو اختیار کرنے سے خدا خوش ہوگا اور اس کی بندگی کے تقاضے پورے ہو جائیں گے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است!

مذاہب کی قسمیں

مذاہب کی کثرت اور ان کے اختلافات کی شدت سے بہت سے لوگوں کو یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ یہ سخت گنجان اور ناپیدکنار جنگل ہے، اس جنگل کا صاف ہونا اور اس میں سے سچی خداپرستی کے نشاناتِ راہ واضح ہونا سخت مشکل بلکہ ناممکن ہے لیکن اس طرح کے تاثرات دراصل اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ بنیادی امور طے کرنے سے پہلے جزئیات و تفصیلات میں الجھ جاتے ہیں۔ اگر ہم اساسات سے غور و فکر کا آغاز کریں تو یہ ہوش رُبا جنگل آسانی صاف ہو سکتا ہے۔

مذہب کے سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ خدا کے وجود کا ہے اس پہلو سے غور کیجئے تو مذاہب کی صرف تین قسمیں قرار پاتی ہیں:

۱ : وہ مذاہب جو خدا کے منکر یا اس کے بارے میں خاموش ہیں جیسے جین مت اور بدھ مذہب۔

۲ : وہ مذاہب جو توحید کے علمبردار ہیں مثلاً یہودیت اور اسلام۔

۳ : وہ مذاہب جو ایک سے زیادہ خداؤں کے قائل۔ گنتی کے چند مذاہب کو چھوڑ کر بقیہ سب مذاہب اسی قسم میں داخل ہیں۔ موجودہ مسیحیت کا شمار بھی اسی زمرے میں ہے کیونکہ وہ تثلیث ــــ باپ، بیٹا اور روح القدس تین خداؤں کا قائل ہے۔

جہاں تک پہلی قسم کا تعلق ہے وہ ہمارے لیے قطعاً خارج از بحث ہے۔ ہم خدا پر یقین کر کے اس کی بندگی و رضاجوئی کے نشاناتِ راہ ڈھونڈنے نکلے ہیں اور یہ مذاہب خدا کے منکر یا اس سے بے نیاز ہیں۔ ایسے مذاہب سے خدا پرستوں کو نہیں، ملحدین یا خدا سے بے نیاز لوگوں ہی کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد دوسرے اور تیسرے قسم کے مذاہب رہ جاتے ہیں۔ ان مذاہب کے سلسلے میں کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم بنیاد سے چلیں اور فیصلہ کریں کہ شرک صحیح ہے یا توحید۔ اگر ہمیں خدا کی بندگی کرنا ہے تو اوّل مرحلہ ہی میں یہ بات صاف ہونی چاہیے کہ کائنات اور انسانی دنیا کا انتظام و انصرام ایک خدا کے ہاتھ میں ہے یا اس ہنگامۂ وجود کے پیچھے کئی ہاتھ کارفرما ہیں اس بنیادی سوال کو حل کیے بغیر ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔

اوپر کی بحث سے قطع نظر کائنات، انسان اور خدا کے تعلق سے تین ہی نقطۂ نظر ممکن ہیں، الحاد، شرک اور توحید۔ ان ہی نقطہ ہائے نظر کی بنیاد پر مختلف نظام ہائے زندگی تشکیل پاتے ہیں۔ ان میں سے کسی نہ کسی نظام کو اختیار کرنا ناگزیر ہے، لیکن ان میں سے کسی نظام کے انتخاب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان بنیادوں کے بارے میں کسی نتیجہ پر پہنچیں، الحاد پر ہم نے گزشتہ

ابواب[1] میں غور کیا ہے اور ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ وہ عقلاً غلط اور نتائج کے اعتبار سے مہلک ہے۔ اب شرک اور توحید دو نقطہ ہائے نظر رہ جاتے ہیں اور ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ ان میں سے کون سا نقطۂ نظر عقلاً صحیح عملاً کامیابی کا ضامن ہے۔

ایک اور پہلو سے غور کیجئے۔ انسانی زندگی کے چند سوالات بنیادی ہیں اور ہر انسان شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کا کوئی نہ کوئی جواب دینے پر مجبور ہے۔ ایک سوال یہ ہے کہ زندگی و موت، نفع و نقصان، صحت و مرض عزت و ذلت اولاد و سامان، زلیست بغرض انسان اور انسان سے متعلق تمام امور انسان کے اپنے ہاتھ میں ہیں یا کسی اور کے ہاتھ میں؟ اگر کسی اور کے ہاتھ میں ہیں تو وہ اور کون ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ وہ دین یا نظام زندگی کون سا ہے جو انسانوں کو کامرانی سے ہمکنار کر سکتا ہے؟ اور چوتھا سوال یہ ہے کہ انسان کس کے سامنے جواب دہ ہے تو کس کے سامنے؟ اور جواب دہی اسی زندگی میں ہو گی یا مرنے کے بعد؟ —— یہ انسانی زندگی کے بنیادی سوالات ہیں، اور اس پہلو سے بھی ضروری ہے کہ ہم ان میں سے صحیح جواب کا انتخاب کریں۔

شرک ایک زندہ مسئلہ ہے!

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شرک ایک مردہ مسئلہ ہے۔ موجودہ سائنٹیفک دور میں شرک کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ آج کا ترقی یافتہ انسان خدا کا انکار کر سکتا ہے۔ وہ یہ بھی تسلیم کر سکتا ہے کہ کائنات کا ایک

---

[1] خدا کا انکار کیوں؟ خدا ہے۔ کیا خدا کی ضرورت نہیں؟ ملحدین کے شبہات، خدا پرستی ملحدین کی نظر میں۔

خالق و فرمانروا ہے، لیکن وہ یہ کسی طرح نہیں مان سکتا کہ یہ عالم رنگ و بُو بہت سے دیوتاؤں کی رزم گاہ ہے۔ بلاشبہ شرک آج بھی موجود ہے مگر اس کے ماننے والے بہت تھوڑے ہیں اور وہ بھی اگلے وقتوں کے لوگ ہیں، علم کی روشنی پھیلنے کے ساتھ شرک خود بخود ختم ہو جائے گا۔ آج سارا معرکہ الحاد اور توحید کے مابین ہے۔ شرک کے سلسلہ میں کچھ کہنا یا کرنا گڑے مردے اکھاڑنے کے مترادف ہے۔

لیکن یہ نقطۂ نظر جائزہ کے بغیر قائم کر لیا گیا ہے۔ یقیناً شرک ایک غیر عقلی نظریہ ہے مگر الحاد بھی تو غیر عقلی اور اَن سائنٹیفک ہے، اگر الحاد اس دور میں فروغ پا سکتا ہے تو شرک کے زندہ نہ رہنے کی کیا وجہ ہے؟ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ الحاد کی گرم بازاری کے باوجود انسانوں کی بہت بڑی اکثریت آج بھی مذہب کو مانتی ہے اور مذہب کے ماننے والوں کی عظیم ترین اکثریت شرک میں مبتلا ہے۔ دنیا کے اکثر و بیشتر مذاہب شرک کے قائل ہیں حتیٰ کہ وہ مذاہب بھی جو خدا کے منکر تھے یا اس کے بارے میں سکوت اختیار کیے ہوئے تھے بالآخر شرک کے علمبردار بن گئے۔ گوتم بدھ نے خدا کے بارے میں نفیاً یا اثباتاً کچھ نہ کہا تھا، لیکن اُن کے ماننے والوں نے خود ان ہی کی پرستش شروع کر دی۔ بعض اہلِ علم کی تحقیق تو یہ ہے کہ ہندوستان اور اس کے گرد و نواح میں بت پرستی کا فروغ بودھ مذہب کا مرہونِ منت ہے اور بُت کا لفظ بودھ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جین مت کے نزدیک خدا پر ایمان رکھنا عظیم ترین گمراہی ہے۔ جو کچھ ہے جیو (روح) ہے جو مکتی — آواگون سے نجات پا کر ایشور بن جاتا ہے، لیکن یہ مذہب بھی شرک میں لت پت ہو گیا۔ جین مت کے تیرتھنکر (ربانی و پیشوا) خدا بنا لیے گئے اور جینیوں نے دھڑلے سے اُن کی پوجا شروع کر دی۔ آج جین مت مورتی پوجا کا

مذہب[1] ہے۔ رہے وہ مذاہب جو توحید کے علمبردار تھے تو ان کے ماننے والوں کی عظیم اکثریت بھی مشرکانہ توہمات و اعمال میں مبتلا ہو گئی۔ مشرکانہ مذاہب اور ان کے معتقدین کا تو کہنا ہی کیا ہے، ان کا تو اوڑھنا بچھونا ہی شرک ہے۔

اور ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھیے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ الحاد بھی شرک ہی کا ایک رخ ہے۔ الحاد یہ ہے کہ انسان خدا کے بجائے مادہ اور مادی قوانین کو کائنات کی اصل کارفرما طاقت خیال کرے۔ دینِ خداوندی کے بجائے خود ساختہ نظام ہائے زندگی کو اپنائے۔ خدا کے بجائے اس کی مخلوقات سے ڈرے اور رضائے الٰہی کی پیروی کرنے کے بجائے اپنے نفس کی، اپنے ہی جیسے انسانوں کی اور اپنے مفادات کی پیروی اختیار کرے۔ بہ الفاظِ دیگر خدا پرست ہونے کے بجائے مخلوق پرست بن جائے اور یہی شرک ہے۔

ملحد اور مشرک میں فرق ہے کہ مشرک خدا کو ماننے کے باوجود مخلوق پرستی کا مرتکب ہوتا ہے جب کہ ملحد خدا کو نہ ماننے کے نتیجہ میں مخلوق پرست بنتا ہے۔ لیکن یہ کوئی جوہری فرق نہیں ہے جس طرح بہت سے خدا گھڑ لینے سے یہ خدا موجود نہیں ہو جاتے، اسی طرح خدا کا انکار کرنے سے خدا معدوم نہیں ہو جاتا۔ خدا موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ اس کے ہوتے ہوئے ماسوا کی پرستش و بندگی شرک ہی ہے خواہ اس پر الحاد کا لیبل کیوں نہ چسپاں ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ موحدین کی مختصر سی تعداد کو چھوڑ کر دنیا میں ہر طرف شرک ہی شرک ہے اور شرک نہ صرف یہ کہ زندہ ہے بلکہ وہی دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ رہا اپنا ملک بھارت ورش ـــــ تو اس پر تو شرک کی گرفت

---

[1] سوامی دیانند جی کا خیال ہے کہ ہندوستان میں بت پرستی کا رواج جینیوں کی نقالی میں ہوا ورنہ ویدک دھرم کا شرک کا نہیں، توحید کا مذہب ہے۔

بہت ہی سخت ہے، یہاں کی تہذیب، روایات، ادب، آرٹ، آثارِ قدیمہ، ہر چیز پر شرک کی گہری چھاپ ہے یہی نہیں، ملک کی نشاۃِ ثانیہ بھی شرک ہی کی بنیاد پر ہو رہی ہے۔ اس لیے کم از کم بھارت کی حد تک تو شرک کا مسئلہ زندہ اور بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے۔

شرک کیا ہے؟

شرک پر غور کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم شرک کو اچھی طرح سمجھ لیں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، شرک نام ہے مخلوق پرستی کا، یعنی یہ کہ:

۱ : آپ کسی مخلوق کو کائنات یا اس کے کسی جزء کا خالق مانیں[1]۔

۲ : کسی مخلوق کو خالق کا بیٹا، بیٹی، ماں، باپ یا بیوی، شوہر قرار دیں۔

۳ : کسی مخلوق کو کائنات یا اس کے کسی جزء کا مالک و فرمانروا (خدا) تصور کریں۔

---

[1] یونان کے فلسفیوں کا عقیدہ تھا کہ خدا نے عقلِ اول کو پیدا کیا، عقلِ اوّل نے عقلِ دوم اور فلکِ اول کو اس طرح سلسلہ بسلسلہ عقول، افلاک اور کائنات کی تخلیق ہوئی گویا کائنات کے بہت سے خالق یا بالفاظ صحیح تر علل (Causes) اور خدا علۃ العلل (First cause) ایران کے مجوسی دو خالق مانتے تھے۔ خیر کا خالق یزداں اور شر کا خالق اہرمن۔ ہندومت کی مشہور کتاب منوسمرتی کی رو سے پرماتما نے پہلے پانی پیدا کیا، پھر پانی میں بیج ڈالا تو وہ ایک انڈے کی شکل کا ہو گیا جس سے برہما جی آپ سے آپ پیدا ہو گئے، برہما جی نے ساری کائنات بنائی۔ برہما جی نے اپنے قالب کے دو حصے کیے نصف سے مرد کی صورت پیدا ہوئی اور نصف سے عورت کی۔ ان دونوں کو لانے سے برہما جی نے براٹ کو پیدا کیا، براٹ جی نے منوجی کو پیدا کیا اور منوجی نے رشیوں، دیوتاؤں، راکششوں اور سورگ وغیرہ بہت سی چیزوں کو پیدا کیا۔
(منوسمرتی ادھیائے ۱ تا ۴)

۴ : کسی مخلوق کے بارے میں یہ عقیدہ رکھیں کہ نظمِ کائنات میں اس کا کوئی دخل نہیں۔

۵ : کسی مخلوق کو حاجت روا، مشکل کشا اور فریاد رس سمجھیں اور یہ خیال کریں کہ زندگی، موت، نفع، نقصان، صحت، مرض، رزق، اولاد، عزت، ذلت یا قسمت اس کے ہاتھ میں ہے۔

۶ : کسی مخلوق کے بارے میں یہ تصور ہو کہ وہ فوق الطبعی (Supernatural) قوتوں کی مالک ہے۔

۷ : کسی مخلوق کے بارے میں یہ عقیدہ ہو کہ اس کی سفارش یا مرضی کے بغیر خدا کچھ نہیں کرتا۔

۸ : کسی مخلوق کو عبادت و پرستش کا مستحق سمجھیں، اس کے حضور رکوع و سجدہ کریں، اسی سے دعائیں اور مرادیں مانگیں، مدد کے لیے اُسے پکاریں، اس کے نام کا ورد کریں، عجز و نیاز سے اُس کے آگے جھک جائیں، اُسے راضی کرنے کے لیے قربانیاں دیں، چڑھاوے چڑھائیں، اس کے گرد طواف کریں، روزہ رکھیں، یا کسی اور طرح اُس کی پُوجا کریں۔

۹ : کسی مخلوق کو مالک و مطاع مطلق مانیں، اس کی بندگی و غلامی اختیار کریں، اس کی رضا جوئی کو زندگی کا مقصود ٹھہرائیں اس سے اس طرح ڈریں جس طرح خدا سے ڈرنا چاہیے۔ اس پر اس طرح بھروسہ کریں جس طرح خدا پر کرنا چاہیے۔

۱۰ : کسی مخلوق کو انسانی زندگی کے لیے شارع و قانون ساز مانیں۔

یہ ہے شرک یا مخلوق پرستی!

آئیے، اب شرک کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے غور کریں۔

مخلوق خداؤں کی کوئی حد نہیں ہے

شرک کا ایک پہلو یہ ہے کہ ایک بار جب راہ کھل جاتی ہے تو کسی حد پر جا کر نہیں رکتی۔ ایک دفعہ جب انسان نے کسی مخلوق کو خدا مان لیا اور بلا کسی دلیل کے مان لیا کیوں کہ شرک کے پاس فی الواقع کوئی دلیل نہیں ہے تو وہ ہر مخلوق کے آگے جھک سکتا ہے اور ہر ایک کو خدا بنا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ مشرک بہت آسانی سے اپنے خداؤں میں نئے خداؤں کا اضافہ کر لیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دیومالائی فہرست میں دنیا کی ہر قابلِ ذکر شئے شامل ہے۔ فرشتے، انبیاء اولیا، جن بھوت، سورج، چاند، زمین، آسمان ستارے، جانور، درخت، پہاڑ، دریا، کیڑے مکوڑے، ہوا، آگ، پانی، دولت، قبریں، استھان، بُت، ارواح، زندہ و مردہ انسان، مختلف انسانی اعضا حتیٰ کہ عورت اور مرد کے اعضائے مخصوصہ، پیشاب، پاخانہ غرض ہر چھوٹی بڑی اور ذلیل سے ذلیل شئے خدا خیال کر لی گئی، اور اسی پر بس نہ ہوا تو وہم پرستی نے زور لگایا اور بہت سے خیالی خدا ایجاد ہو گئے۔ اس طرح کے خیالی خدا ہر قوم کے یہاں گُوناگُوں ہیں۔ اور اُن کی تخلیق، اُن کے ابدان، ان کے اعضا اُن کے قدوقامت کی طوالت، اُن کی عمر، اُن کی جائے سکونت، ان فوق الطبعی قوتوں اور اُن کے محیر العقول کرشموں سے ہر قوم مذہبی کتابیں پُر ہیں اور اس ساری دیومالائیت کا نام مذہب رکھ دیا گیا ہے۔ جسے سُن سُن کر پڑھے لکھے لوگ مذہب سے اس طرح متنفر ہونے لگتے ہیں جیسے کوئی لطیف الطبع آدمی غلاظت کے ڈھیر سے۔

مخلوق خداؤں کی کمزوریاں

شرک کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ سارے خدا مخلوق ہیں، اس لیے اپنے

اندر مخلوقات کی کمزوریاں رکھتے ہیں۔ یہ تندخو ہیں اور مغلوب الغضب انسانوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر آگ بگولہ ہو جاتے ہیں، یہ سخت خونخوار اور جنگجو ہیں۔ آپس میں لڑتے رہنا اور انسانوں کے مابین جنگ کراتے رہنا ان کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ انسانوں کی طرح انھیں بھوک پیاس لگتی ہے، اونگھ اور نیند آتی ہے، یہ غفلت کا شکار ہوتے ہیں اور دھوکے میں مارے جاتے ہیں۔ یہ جنسی خواہشات رکھتے ہیں، اُن کے بیوی بچے اور اعزّہ و اقربا ہوتے ہیں، ان میں خانگی جھگڑے بھی ہوتے ہیں جو بالعموم بڑی خوف ناک شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ خوشامد سے خوش ہوتے اور آن کی آن میں مالا مال کر دیتے ہیں۔ یہ انتقام کا شدید جذبہ رکھتے ہیں اور ذرا سی دیر میں سب کچھ بھسم کر دیتے ہیں، ان کی رضامندی و ناراضگی کا کوئی پیمانہ مقرر نہیں، یہ کسی بھی چیز سے خوش اور کسی بھی چیز سے ناراض ہو سکتے ہیں، ہم انسانوں کی طرح اُن کے سامنے بھی اصل مسئلہ کھانے پینے، رہنے سہنے، شہوانی خواہشات پوری کرنے، اقتدار حاصل کرنے اور حریفوں کو شکست دینے کا ہوتا ہے، ان میں باہم سخت کش مکش رہتی ہے، یہ دوسرے خداؤں کو نیچا دکھانے کے لیے طاقت، مکر و فریب، جھوٹ اور ہر فن سے کام لیتے ہیں۔ انھیں لڑائیوں میں شکست بھی ہوتی ہے اور یہ خداؤں ہی سے نہیں، انسانوں سے مات کھا جاتے ہیں۔ ان کی جنگ شیاطین سے بھی ہوتی ہے اور اس جنگ میں کبھی یہ اور کبھی وہ غالب ہوتے ہیں۔ یہ خداؤں اور شیاطین دونوں سے خائف رہتے ہیں۔ دکھی ہونے پر بے صبروں کی طرح روتے چلاتے اور مضطرب و بیقرار ہوتے ہیں، انھیں بسا اوقات یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ آن کے کسی اقدام کا اچھا یا بُرا کیا نتیجہ نکلے گا اس لیے انھیں بار بار پچھتانا اور پریشان ہونا پڑتا ہے اور بعض اوقات تو وہ ایسی سخت مصیبت میں پھنس جاتے ہیں کہ دیوتاؤں کا پورا گروپ اپنی پوری قوت اور سارا مکر و فن

استعمال کر کے بہ دقت تمام اس مصیبت کو دُور کر پاتے ہیں۔ مخلوقات کی طرح انھیں موت بھی آتی ہے۔ چنانچہ کچھ طبعی موت مرتے ہیں، کچھ خودکشی کر لیتے ہیں، کچھ کو ان کے مخالفین قتل کر دیتے ہیں یا سولی پر چڑھا دیتے ہیں مگر اس سب کے باوجود وہ خدا ہی رہتے ہیں اور ان کی فوق الطبعی قوتوں میں کوئی فرق نہیں آتا وہ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں اور لوگوں کی حاجت روائی اور مشکلکشائی کرتے ہیں۔ یہ ناچ گانے، کھیل، تفریح، نشہ، جوئے اور اس طرح کی دوسری تمام بازیوں سے شغف رکھتے ہیں۔ یہی نہیں یہ سارا ہنگامۂ وجود ان کے لیے کھیل تماشہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، ان میں سے بعض تو بڑے ہی خوف ناک اور مہیب ہیں، قتل و غارت گری کا خونی ناچ اور انسانی خون انھیں بہت بھاتا ہے گویا دنیا رومی شہنشاہوں کا تھیٹر ہے جس میں نہتے انسانوں کو شیروں اور چیتوں سے لڑایا اور بھڑوایا جاتا تھا۔

شرک کا یہ پہلو مخلوق کو خدا بنانے کا براہِ راست نتیجہ ہے، اس لیے کم و بیش ہر مشرکانہ نظام میں موجود ہے اور تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی انتہائی بلندیوں کے باوجود موجود ہے۔ یونان، فلسفہ، شعر و ادب اور علوم و فنون میں دنیا کا امام رہا ہے تاہم یونانی شرک میں بھی یہ پہلو شدت سے موجود تھا۔ مشہور یونانی فلسفی افلاطون اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "ریاست" میں یونانی شرک کے اس پہلو پر ان الفاظ میں تنقید کرتا ہے[1]:

"اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے محافظ آپس میں لڑنے بھڑنے کو بدترین عادت متصور کریں تو ہمارا فرض ہے کہ انھیں آسمانی

---

[1] ہمارے سامنے کتاب کا اردو ترجمہ ہے جو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (سابق صدر جمہوریہ ہند) نے کیا ہے۔

جنگوں کے متعلق ایک حرف بھی نہ سننے دیں، ان سازشوں اور باہمی تنازعات، کا مطلق ذکر کرنا چاہیے جو دیوتاؤں کے درمیان بتلائے جاتے ہیں، کیونکہ یہ تمام روایتیں سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔ مگر اس قسم کے بیانات کہ ہیفیسٹس[1] نے اپنی ماں ہیرا[2] کو باندھ کر ڈال دیا۔ دوسرے موقع پر زیس[3] نے اسے اس قصور پر مار کر نکال دیا تھا کہ اس نے مار پڑتے وقت اپنی ماں کی طرف داری کی تھی ہم ہرگز اپنی ریاست میں روا نہ رکھیں گے۔"

(صفحہ ۱۱۴، ۱۱۵)

ایک اور موقع پر وہ اس طرح اظہارِ خیال کرتا ہے:

"کسی شاعر کو اس بات کی اجازت نہ ہونی چاہیے کہ دیوتاؤں پر اس قسم کے اتہام لگائے کہ وہ اجنبی باشندوں کا بھیس بدل کر ہمارے شہروں میں اِدھر اُدھر پھرتے ہیں، نہ پروٹیس[4] اور تھیٹس پر جھوٹے بہتان لگانے کی اجازت ہونی چاہیے۔ نہ ہمارے لیے اس طرح کے قصوں کی اشاعت جائز ہے کہ ہیری ایک پجارن کا لباس پہن کر دریائے آرگس کی بیٹی آئناکس کے لیے دربدر بھیک مانگتی پھری تھی، اس قسم کے تمام جھوٹے بیانات کو یک قلم مسترد کر دینا چاہیے۔" (صفحہ ۱۲۲، ۱۲۳)

"تقریر و تحریر کے متعلق دوسرا اصول یہ ہونا چاہیے کہ دیوتاؤں کو

---

[1] آگ اور آگ سے متعلق فنون کا دیوتا [2] آسمانوں کی ملکہ زیس کی بہن بھی اور بیوی بھی [3] یونان کا سب سے بڑا دیوتا [4] سمندر کا دیوتا، یہ مستقبل کا تمام حال بتا سکتا تھا لیکن جب کسی کے ہاتھ آتا تو پیشین گوئی سے بچنے کے لیے طرح طرح کی شکلیں اختیار کر لیتا تھا۔

جادوگر اور بہروپیہ نہ بتلایا جائے، نہ ان پر تغیر پذیر ہونے یا انسانوں کو دھوکا دینے کے الزامات لگائے جائیں۔ اس لیے اگرچہ ہم ہومر[1] کے مداحوں میں سہی لیکن ہم اس جھوٹے خواب کو ہرگز بنظر استحسان نہیں دیکھ سکتے جو ہومر کے بیان کے مطابق زیس نے اگامنان[2] کو دکھایا۔" (صفحہ ۱۲۶)

ایک اور مقام پر افلاطون رقمطراز ہے:

"گویا ہمیں ایک بار اور ہومر اور دوسرے شعراء سے درخواست کرنی ہوگی کہ وہ دیوی کے بیٹے اکیلیس کے متعلق یہ بیان نہ کریں کہ وہ کبھی بے قراری سے زمین پر لوٹتا اور مضطربانہ کروٹیں بدلتا تھا اور کبھی سمندر کے کنارے دوڑا دوڑا پھرتا تھا یا دونوں مٹھیوں میں راکھ بھر بھر کر سر پر ڈالتا تھا۔ ہم ہومر سے نہایت خلوص کے ساتھ یہ التجا کریں گے کہ اپنے کلام میں دیوتاؤں کو تو شکوہ و شکایت کرتا ہوا ظاہر نہ کرے اور اگر دیوتاؤں کا ذکر ایسا ہی ضروری ہے تو کم سے کم سب سے بڑے دیوتا کو تو اس قدر سخت غلط بیانی سے معاف رکھے کہ اس کی طرف ذیل کے الفاظ منسوب کیے جائیں، الاماں! الاماں! میں اپنی ہی آنکھوں سے دیکھتا ہوں کہ میرے ایک دوست کا پیچھا کر کے اس شہر کے چاروں طرف دوڑایا جا رہا ہے اور میں اس سے اس قدر غمناک و رنجیدہ ہوں۔"

(صفحہ ۱۳۴، ۱۳۵)

ایک جگہ وہ لکھتا ہے:

"اور یہی نہیں زیس ہی کا قصہ لیجیے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تمام

---

[1] یونانیوں کا مشہور شاعر [2] مائیسنی کا بادشاہ اور لڑائی کے مقابلہ میں یونانیوں کا سردار

عالم محوِ خواب اور صرف زی اس بیدار تھا اور مختلف تدابیر پر غور کر رہا تھا کہ ہیری نظر آئی اور وہ اپنی تمام تدابیر غلبۂ شہوت کے باعث بھول گیا۔ حتیٰ کہ ہیری کو اپنے جھونپڑے کے اندر تک نہ لے گیا اور وہیں زمین پر اس سے مباشرت کرنا چاہی اور اس سے کہا کہ ہم تم جب پہلی مرتبہ اپنے والدین کی لاعلمی میں ملے تھے اس وقت بھی مجھ پر یہ کیفیت طاری نہ ہوئی تھی یا دوسرا افسانہ جس میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس قسم کے اعمال کی وجہ سے ہی فیس لٹ سنے اریس اور الیفرودائٹ کو زنجیر سے جکڑ دیا تھا۔" (صفحہ ۱۴۰)

آخر میں یہ مایۂ ناز اور شہرۂ آفاق فلسفی صاف صاف کہتا ہے:

"ہمیں ان (نوجوانوں) کے سامنے کبھی یہ نہیں کہنا چاہیے کہ نذرانوں سے بڑے دیوتا اور واجب الاحترام بادشاہ تک ہر کام کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، نہ ہمیں ایکی لیس کے استاد فی نکس کی تحسین کرنی چاہیے کہ اس نے اپنے شاگرد کو یہ نصیحت کی کہ یونانیوں کی نذریں قبول کر کے ان کی امداد پر تیار ہو جائے لیکن جب نذر نہ ملے اپنے غصّہ کو ہرگز کم نہ کرے۔

سچ پوچھو تو مجھے ہومر سے ایک طرح کا انس سا ہے لیکن جہاں اُس نے ایکی لیس سے اس قسم کے ذمیمہ صفات کو منسوب کیا ہے یا یہ یقین ظاہر کیا ہے کہ یہ صفات فی الحقیقت اس کے ساتھ منسوب کی جا سکتی ہیں تو میرے خیال میں وہ ایک سخت معصیت کا مرتکب ہوا ہے اسی طرح میں ہرگز اس بیان کو قابلِ پذیرائی نہیں سمجھتا جو بارگاہ اپولو میں ایکی لیس کے گستاخانہ کلام

لے ہیری زی اس (یونان کے سب سے بڑے دیوتا) کی حقیقی بہن تھی۔

کے متعلق ہومر نے اس طرح نظم کیا ہے کہ اسے دیوتاؤں میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت دیوتا! اسے دراز دست! اسے دراندار! تو نے میرے ساتھ دغا کی! میرے بس میں ہوتا تو تیرے برابر بن کر دکھاتا۔ نہ یہ بات میرے نزدیک قابلِ یقین ہے کہ اکیلیس نے دریائی دیوتا سے سرکشی کی اور اس کی خدائی تک دست درازی کا ارادہ کیا۔

اسی طرح ہم پوسی دان کے بیٹے تھی سی اس یا زی اس کے بیٹے پیری تھس کے متعلق ارتکابِ زنا کی روایات کو ہرگز سچ نہ مانیں گے اور نہ ہم اجازت دے سکتے ہیں کہ اس قسم کے قصے ہماری ریاست میں بیان کیے جائیں۔

ہم شاعروں کو ہدایت کر دیں گے کہ یا تو وہ ان افعالِ قبیحہ کو ان لوگوں سے منسوب نہ کریں یا پھر انھیں دیوتاؤں کی اولاد نہ بتائیں کیوں کہ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔"

(صفحہ ۱۴۱ تا ۱۴۳)

آخری الفاظ پوری بحث کا نچوڑ ہیں۔ افلاطون کا کہنا یہ ہے کہ خدا کے تصور کے ساتھ اخلاقی معائب کا کوئی جوڑ نہیں۔ اگر کسی میں اخلاقی کمزوریاں پائی جاتی ہیں تو وہ خدا نہیں ہو سکتا اور خدا ہے تو اس میں اخلاقی معائب نہیں پائے جا سکتے۔ لیکن ایک کھلی ہوئی حقیقت کی طرف افلاطون کی نظر نہیں گئی یا اس نے دانستہ صرفِ نظر کیا ہے اور وہ یہ کہ مخلوق اپنی سرشت کے لحاظ سے کمزور ہے، وہ خامیوں اور کمزوریوں سے پاک نہیں ہوتی اور نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس خدا نقائص و معائب سے پاک ہوتا ہے اور اسے پاک و منزہ ہونا ہی چاہیے۔ مخلوق کو خدا ماننا اور پھر یہ

توقع رکھنا کہ اس سے خامیوں کا صدور نہ ہو گا دوہری خام خیالی ہے۔[1]

اقتباسات طویل ہو گئے، مگر اس کے بغیر یہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا کہ مخلوق خداؤں کا کردار کتنا گھناؤنا ہو تا بیان کیا جاتا ہے اور یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ یونان کی میتھالوجی اس طرح کے بہت سے گندے افسانوں سے بھری ہوئی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ اس طرح کے گندے اور سر و پا افسانوں ہی کا نام یونانی میتھالوجی ہے اور یہ کچھ یونانی میتھالوجی کا خاصہ نہیں ہے، دوسرے مشرکانہ نظاموں میں بھی مخلوق خداؤں کا کردار اتنا یا اس سے بھی زیادہ گھٹیا اور گھناؤنا بیان کیا گیا ہے۔ اس قدر گھٹیا اور گھناؤنا کہ کسی گرے سے گرے انسان کا بھی نہیں ہوتا۔

یہ بات بظاہر بڑی حیرت انگیز ہے مگر تھوڑے سے غور و فکر کے بعد سمجھ میں آجاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ مخلوق خدا، مخلوق ہوتے ہیں اور اس لیے مخلوقات کی جملہ خامیاں اور کمزوریاں ان کے اندر ہوتی ہیں لیکن وہ خدا بھی ہوتے ہیں اور اس لیے وہ خامیوں میں عام مخلوقات سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ آخر وہ خدا ہی کیا ہے جس کی خامیاں مخلوق کے برابر ہوں! یہی وجہ ہے کہ مشرکانہ میتھالوجی میں خداؤں کا کردار ناقابلِ بیان حد تک گھٹیا بیان کیا جاتا ہے یہ ظلم و خونخواری میں انسانوں سے بدرجہا بڑھ کر ہوتے ہیں۔ یہ بہت تیز اشتہا رکھتے ہیں۔ ان کی جنسی خواہش کبھی ختم ہونے میں نہیں آتی اور ماں، بیٹی، بہن کسی کو نہیں چھوڑتی۔ ان کی ہوس رانی سے دیوی دیوتا ہی نہیں، خود اُن

---

[1] ہمارا خیال ہے کہ افلاطون نے اصل حقیقت کو پا لیا تھا، مگر یونانیوں کے مخصوص حالات کے تحت دیوتاؤں کا انکار نہ کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے اپنے استاد سقراط کا دردناک انجام تھا۔ اس نے مخلوق خداؤں کے پست کردار کا انکار کیا جو بالواسطہ یونانی شرک ہی کا انکار ہے۔

کے پرستار بھی محفوظ نہیں رہتے۔ فحش سے فحش ناول اور گندے سے گندے کوک شاستر میں بھی آپ وہ فحاشی نہیں پا سکتے جو ان مخلوق خداؤں کی مقدس اور پاکیزہ داستانوں میں قدم قدم پر ملتی ہے، حتیٰ کہ ان کی عیاشی ضرب المثل بن جاتی ہے۔ ان کی ہوسِ اقتدار انسانوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ اپنے اقتدار کے لیے لڑتے ہی رہتے ہیں اور جب لڑائی سے جیتنے کی امید نہیں رہتی تو جھوٹ، دغا اور مکر و فریب کے ہتھیاروں سے اپنے حریف کو چت کرتے ہیں۔

مخلوق خداؤں کی پستی کردار کی ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ خدا ہونے کے باعث وہ اخلاقی ضوابط سے بالاتر ہیں۔ اُن کے لیے ہر برائی جائز ہے اور ہر فحاشی روا۔ یہ کلیتہً خود مختار ہیں، یہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں، یہ جو چاہیں کریں کوئی ان کی راہ روکنے والا نہیں۔ انسان برائی اور ظلم میں ایک حد تک جا سکتا ہے، مگر یہ خدا ہیں، اُن کے لیے کوئی حد نہیں، یہ برائی، ظلم اور فحاشی میں بھی مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔

خدا بھی اور مخلوق بھی

شرک کا ایک پہلو یہ ہے کہ مخلوق خدا، مخلوق اور خدا دونوں کا مرکب ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ متضاد صفات و رجحانات رکھتے ہیں۔ مخلوق ہونے کے لحاظ سے یہ مجسم ہیں اور خدا ہونے کے لحاظ سے غیر مجسم۔ مخلوقات کی طرح اُن کا کوئی روپ نہیں ہوتا، یہ کبھی ایک انسان کے روپ میں آتے ہیں، کبھی دوسرے انسان کے، کبھی ایک جانور کی شکل اختیار کرتے ہیں، کبھی دوسرے جانور کی، یہ مخلوق ہیں، اس لیے جسم رکھتے ہیں مگر خدا ہونے کے ناتے ان کے جسم مخلوقات کے اجسام سے مختلف ہوتے ہیں اُن کے کئی کئی سر، بہت سے بازو، کئی کئی چہرے، بہت سی آنکھیں اور کئی کئی پیر

ہوتے ہیں، اور کسی کسی کے پر بھی لگے ہوتے ہیں، ان میں سے کچھ خدا اور انسان کا مرکب ہوتے ہیں اور یہ بحث طے ہونے میں نہیں آتی کہ وہ کتنے خدا اور کتنے انسان ہیں۔ کوئی انسان اور پری کا مرکب ہوتا ہے۔ کوئی انسان اور دیوتا کا اور کوئی انسان اور جانور کا ___ حقیقت یہ ہے کہ تخیل کو اپنی بلند پروازی کا جتنا موقع اس میدان میں ملا ہے، شاید ہی کہیں ملا ہو۔

یہ داستان تو مخلوق خداؤں کے جسم کی ہوئی! یہ مخلوق اور خدا کا مرکب ہونے کے باعث متضاد صفات رکھتے ہیں۔ یہ خدا ہیں اس لیے قوانینِ فطرت پر حکمرانی کرتے ہیں، لیکن دوسری طرف یہ مخلوقات کی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ دکھوں اور بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔ کھانے پینے کی احتیاج رکھتے ہیں۔ جنسی خواہش سے مجبور ہیں۔ سہارے کے لیے انھیں بھی اولاد کی ضرورت ہے اور ساگران کے یہاں اولاد نہیں ہوتی تو اولاد حاصل کرنے کے لیے سینکڑوں جتن کرتے ہیں۔ یہ خدا ہیں مگر بعض اوقات انسانوں کے مقابلے میں بے بس نظر آتے ہیں اور مجبور ہو کر مکر، فریب اور جھوٹ سے کام لیتے ہیں یہ خدا ہیں، اس لیے ہتھیاروں کی ضرورت نہیں، مگر مخلوق ہونے کے ناتے یہ ہتھیار رکھتے ہیں اور ہتھیار بھی مخلوقات جیسے۔ یہ خدا ہیں اس لیے ہر ایک کی مدد کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، مگر بعض اوقات یہ خود مدد کے شدید محتاج ہوتے ہیں۔ یہ دلوں کا حال جانتے ہیں، مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بالکل سامنے کی چیزیں انھیں نظر نہیں آتیں۔ لوگوں کی قسمت اور ان کا مستقبل اُن کے ہاتھ میں ہوتا ہے مگر اُن کا اپنا مستقبل محفوظ نہیں ہوتا اور یہ ہر دم خطرات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ خدا ہونے کے باعث یہ عقل و دانش کا پیکر ہوتے ہیں، مگر بالعموم یہ جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور ایسے ایسے کام کر گزرتے ہیں جنھیں سُن کر معمولی عقل کا آدمی بھی ہنسنے یا ماتم کرنے پر مجبور ہو جائے۔

یہ خدا ہیں، اس کے باوجود موت کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ مگر پھر

بھی جی اٹھتے ہیں اور زندہ جاوید بن کر حاجت روا مشکل کشا ثابت ہوتے ہیں حتیٰ کہ لوگوں کو موت کے چنگل سے چھڑانے لگتے ہیں۔ یہ خالقِ کائنات کی مخلوق اور اس کے پروردہ ہیں، اس لیے اس کے بندے اور اس کے سامنے عاجز و بے بس ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ خدا بھی ہیں۔ اس لیے خالقِ کائنات کے اقتدار میں شریک اس کے کاموں میں مداخلت کرنے والے اور اس کے احکام کو منسوخ کرنے والے ہیں۔ تضاد، ہمہ گیر اور گہرا تضاد، شرک کی غیر منفک خصوصیت ہے، آپ کی عقل اگر ان تضادات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے تو اپنی عقل پر ماتم کیجئے۔ مخلوقِ خدا بہر حال مانے جائیں گے خواہ عقل و دانش کا جنازہ کیوں نہ نکل جائے۔

نظم یا انارکی

مشرکانہ آئیڈیالوجی (Ideology) میں خالقِ کائنات کو خدائے اعلیٰ اور مخلوق خداؤں کو چھوٹا تصور کیا جاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کسی خاص طاقت یا کائنات کے کسی خاص گوشے کا منتظم و فرمانروا خیال کیا جاتا ہے۔ اس تصور کا تقاضا یہ تھا کہ مشرکین کائنات کا ایک نظم مانتے، اس نظم میں خدا مقتدرِ اعلیٰ ہوتا، باقی خدا اس کے ماتحت ہوتے، ہر خدا کا دائرہ اقتدار و اختیار الگ ہوتا اور اس کے باوجود ان کے مابین اشتراک و تعاون ہوتا اور یوں کائنات کا نظم توافق و ہم آہنگی کے ساتھ چلتا، مگر مشرکانہ آئیڈیالوجی میں اس طرح کا تصور موجود نہیں ہے۔ شرک کی رو سے کائنات میں نظم و ہم آہنگی نہیں۔ تضاد اور انارکی ہے۔ مکمل انارکی۔

ایسا کیوں ہے؟ یہ بات تھوڑے سے غور و فکر کے بعد سمجھ میں آجاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ کائنات کا اس طرح کا نظم متعدد خداؤں کی الوہیت کے تصور کے منافی ہے۔ وہ خدا ہی کیا ہوا جو دوسرے خدا یا خداؤں کا ماتحت ہو،

ان کے سامنے بیچارہ ہو اور اُن کے مشورے سے کام کرنے کا مکلف ہو، الوہیت کے تصوّر کے ساتھ ماتحتی، جواب دہی، مشورہ طلبی اور ذمہ داری کے تصوّرات قطعاً میل نہیں کھاتے۔ خدا خود مختار ہے اور اسے خود مختار ہونا چاہیے۔ اگر کائنات کا منتظم و فرمانروا ایک ہوگا تو کائنات کے مختلف گوشوں میں اس کی مرضی چلے گی اور کائنات کا انتظام توافق و ہم آہنگی اور نظم و باقاعدگی کے ساتھ ہوگا — جیساکہ فی الواقع ہے — اس کے برعکس اگر کائنات کے خدا ایک سے زیادہ ہوئے تو ان میں مستقل جنگ رہے گی، اُن میں اقتدار کے لیے رسہ کشی ہوگی۔ اُن کی خواہشات و آراء میں ٹکراؤ ہوگا، اُن میں سے ہر ایک کا شعبہ جداگانہ اور آزادانہ کام کرے گا اور اس سے مزید انتشار پھیلے گا، اس طرح کائنات میں ہر طرف انارکی رونما ہوگی اور یہ دنیا خداؤں کی جنگ کا اکھاڑہ بن جائے گی۔

مشرکانہ میتھالوجی میں یہی کچھ بیان کیا جاتا ہے، یہاں قدم قدم پر کشمکشیں اور جنگیں ملتی ہیں۔ یہ جنگیں بڑی خونخوار اور مہیب ہوتی ہیں۔ یہ جنگیں کبھی دو خداؤں کے درمیان ہوتی ہیں، کبھی خداؤں کے دو جتھوں کے درمیان کبھی خدائے اعلیٰ اور چھوٹے خداؤں کے درمیان، اور کبھی خداؤں اور شیاطین کے درمیان۔ اب اگر آپ کو کائنات میں تصادم اور انارکی کے آثار نظر نہ آرہے ہوں بلکہ یہ عظیم کارخانہ انتہائی نظم و ہم آہنگی کے ساتھ چلتا دکھائی دیتا ہو تو یہ آپ کے علم، آپ کی دانش اور آپ کی سائنس کا قصور ہے۔ شرک پر اس کی کیا ذمہ داری آتی ہے! جب کائنات کے کئی خدا تسلیم کیے جائیں گے تو جنگ و تصادم کی داستانیں خود بخود تصنیف ہو جائیں گی۔

سائنس کے ذریعے ہم پر صرف یہ حقیقت منکشف نہیں ہوتی کہ کائنات کا نظم کامل توافق و ہم آہنگی کے ساتھ چل رہا ہے بلکہ نظم، منصوبہ بندی اور توافق و ہم آہنگی کے بغیر کائنات اور اس کی مختلف اشیاء کا تصور بھی

نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر آپ گیہوں کے ایک دانے کو لیجئے، یہ اس وقت پیدا ہو سکے گا جب زمین و آسمان کی تمام قوتیں مل کر کام کریں۔ زمین کی معدنیات و نمکیات، پانی، ہوا، بادل، سورج کی گرمی و روشنی، چاند کی چاندنی، شبنم، موسم کی موافقت، فضائی و خلائی لہریں، جب یہ سب چیزیں ایک خاص منصوبے کے تحت پورے تعاون و ہم آہنگی سے مل جل کر کام کرتی ہیں تب کہیں جا کر گیہوں کا ایک دانہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر سورج کا خدا اور ہو اور چاند کا اور زمین کا اور ہوا کا اور، آسمان کا اور، فضا کا اور، خلا کا اور، بارش کا اور ہوا اور موسم کا اور، اور ہر ایک خدا اپنی آزاد مرضی پر چلنے والا ہو۔ جیسا کہ خدا کو ہونا چاہیے، تو گیہوں کا ایک دانہ بھی پیدا نہیں ہو سکتا، یہی حال دوسری تمام چیزوں کا ہے۔

کائنات کی ہمہ ہمی اور اس میں لاتعداد اشیا کا وجود اس بات کا شاہد ہے کہ کائنات کی بے شمار قوتوں میں جو انتھاہ خلا میں پھیلی ہوئی ہیں، کامل تعاون ہم آہنگی اور نظم ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ان سب قوتوں و متضاد قوتوں پر کنٹرول کرنے والا ایک عظیم و حکیم منتظم موجود ہو جو اپنے مضبوط ارادہ اور اعلیٰ حکمت سے ایک منصوبہ کے تحت کائنات کی تمام قوتوں کو مل کر کام کرنے پر مجبور کر رہا ہو اور ان میں توافق و ہم آہنگی پیدا کر رہا ہو۔

قرآن مجید کائنات کے نظم اور اس کی مختلف قوتوں کے مابین توافق و ہم آہنگی کا بار بار ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک ہی صورت میں ممکن ہے اور وہ یہ کہ کائنات کی تخلیق اور اس کا نظم و نسق ایک ہی ہستی کے ہاتھ میں ہو اور وہ علیم و تدبیر ہو۔ مختلف خداؤں کی موجودگی سے کائنات کا نظم نہ رہا تو ہوگا مضبوط و مستحکم ہرگز نہیں ہو سکتا۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (انبیاء ۲۲)

زمین و آسمان میں اگر اللہ کے سوا کچھ اور خدا ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے!

خدا ہیں مگر رہنمائی نہیں کرتے!

شرک کا ایک پہلو یہ ہے کہ مخلوق خدا، خدا تو بن بیٹھتے ہیں، لیکن انھیں انسانی زندگی کی فلاح و کامرانی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، یہ نوعِ انسانی کی رہنمائی نہیں کرتے ــــ اور ایک خدا ہو تو رہنمائی کرے، یہاں تو خداؤں کا جم غفیر ہے اور ان میں اشتراک و تعاون کے بجائے کشمکش و تصادم ہے یہ مل کر نہیں بیٹھ سکتے ان کی خواہشات و آرا مختلف ہیں اس لیے مل کر کچھ طے نہیں کر سکتے، یہ انسانی زندگی کو منضبط و کامیاب کیا بنائیں گے، یہ نظامِ عالم کو اپنی کشمکش اور پھوٹ سے تہ و بالا کیے رہتے ہیں۔

یہ خدا ہیں مگر انسان کے حقیقی مفاد سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں انھیں اپنی پرستش درکار ہے، یہ چڑھاوے، قربانیاں، سجدے، پوجا پاٹ اور جپ چاہتے ہیں، انھیں خدا مان لیجیے اور ان کی پرستش کر دیجیے، یہ آپ سے خوش ہو جائیں گے اور آپکے سب گناہوں کو ــــ خواہ آپ سر سے پیر تک گناہوں میں غرق ہوں ــــ دھو ڈالیں گے، لیکن رسوم پرستش کی ادائیگی میں آپ سے ذراسی اونچ نیچ ہو گئی تو یہ غضب ناک ہو جائیں گے اور آپ کی دنیا و آخرت برباد کر ڈالیں گے خواہ آپ سراپا نیک ہوں۔

پوجا پاٹ کی یہ رسوم جاہلانہ، خلافِ عقل اور لبا اوقات انسانیت سوز ہوتی ہیں، حتیٰ کہ ننگا رہنا تقدس کی علامت قرار پاتا ہے، خداؤں ــــ نر و مادہ کے اعضائے تناسل تک کی پوجا ہوتی ہے اور بعض دفعہ یہ سلسلہ یہاں تک بڑھتی ہے کہ زندہ انسانوں کے اعضائے مخصوصہ پوجے جانے لگتے ہیں۔

مذہبی پیشواؤں کی خدائی

اس نظام کی پرستش کا ایک لازمی جزء یہ ہے کہ آپ ــــ ان

مذہبی پیشواؤں کو ہر قیمت پر خوش رکھیں جو ان خداؤں کے نمائندے کہلاتے ہیں، ان کے چرنوں میں اپنے آپ کو ڈال دیجئے، دان پُن سے انھیں مالا مال کیجئے، ہر اخلاقی ضابطہ سے انھیں بالاتر تسلیم کیجئے۔ اُن کے اشارۂ چشم و ابرو پر رقص کیجئے، انھیں اپنا نجات دہندہ تصور کیجئے۔ انھیں خداؤں کی اولاد، خداؤں کا اوتار، بلکہ خود خدا سمجھئے۔ اسی میں آپ کی نجات منضمر ہے اور اس سے انحراف میں ہلاکت دارین مقدر۔

یہ طبقہ انسانوں اور خداؤں کے درمیان ناگزیر واسطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی سفارش کے بغیر آپ کی دعا مسموع نہیں۔ ان کی آشیرباد کے بغیر آپ کی کوئی عبادت قبول نہیں ہوسکتی، اُن کے توسط کے بغیر کسی خدا تک آپ کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ ان کی عظمت، اُن کے تقدیس، بلکہ الوہیت کو تسلیم کیے بغیر آپ نجات نہیں پاسکتے اس طرح مشرکانہ نظام میں ایک مخصوص طبقہ خدا اور مذہب کے نام پہ باقی انسانوں پر مسلّط ہو جاتا ہے اور ان کے مذہب، اخلاق، جان، مال، آبرو اور عقل و خرد پر مسلسل ڈاکے ڈالتا رہتا ہے اور لوگوں کے لیے اتنا مدفع بھی نہیں ہوتا کہ ان کے مظالم اُن کی سیاہ کاریوں اور اُن کے ہتھکنڈوں کے خلاف اُف بھی کرسکیں، اُن کے خلاف منھ سے آواز نکالنا خود کو بے دین اور اَدھرمی بنانا ہے۔

۱؎ مشرکانہ مسیحیت کے علمبرداروں نے قرونِ مظلمہ (Dark ages) میں خدا اور مذہب کے نام پر یورپ کے عوام کو جس طرح توہمات و خرافات میں پھنسائے رکھا، ظالمانہ قوانین کے گردن توڑ جوئے میں جس بے دردی سے انھیں جوتا اور اربابِ علم اور اہلِ سائنس پر ظلم و ستم کے جو پہاڑ توڑے وہ لرزہ خیز اور انسانیت منتقم ہونے کے باوجود مذہب کے اجارہ داروں کی سیاہ تاریخ کا ایک باب ہی ہے۔ یہ طبقہ ہر زمانے اور ہر ملک میں اسی طرح کی شرمناک حرکات کرتا رہا ہے۔ اس طبقہ کی انہی حرکات کے ردّعمل

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حقیقت یہ ہے کہ شرک کا قیام و بقا اسی طبقہ کا مرہونِ منّت ہے۔ ستارہ، فرشتہ، قبر، بُت، استھان، چاند، سورج، مختصر یہ کہ مخلوقات میں سے کوئی بھی انسان سے یہ نہیں کہتا کہ میں تیرا معبود ہوں، میری پرستش کر، نہ انسانی عقل کسی مخلوق کی الوہیت کی شہادت دیتی ہے، دھرم کے یہی پرچارک، مخلوقات فوق الفطری طاقتوں کی جھوٹی داستانیں گھڑتے اور انھیں عوام میں پھیلاتے ہیں۔ زود اعتقاد اور اوہام پرست عوام ان "مقدس" نفوس کی باتوں میں آجاتے ہیں اور اس طرح خود ساختہ خداؤں کی خدائی کا سکّہ چلنے لگتا ہے۔

پرستش کا یہ کاروبار جس قدر چلتا ہے، مذہب کے ان اجارہ داروں کی دکانداری چمکتی اور عوام کے دل و دماغ پر ان کی عقیدت کی گرفت مضبوط ہوتی ہے، یہاں تک کہ لوگ خود ان کو خدا بنا لیتے ہیں، اور یہی کچھ ان کا مقصود ہوتا ہے، کچھ لوگ تکلّف برطرف کر کے خود ہی یا اپنے چیلوں کے ذریعہ اپنی خدائی کا اعلان کر دیتے اور طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے عوام کو مسحور کر کے ان کے خدا بن بیٹھتے ہیں۔

یہ ہے انسان پر انسان کی خدائی کی بدترین شکل! جس کسی پر اس خدائی کا جادو چل جاتا ہے وہ مال و متاع، عزت و آبرو، دین و اخلاق اور عقل و خرد کھو کر بھی یہی سمجھتا ہے کہ اس نے سب کچھ پا لیا۔

خالقِ کائنات مخلوقات کی سطح پر

شرک کا ایک عجیب و غریب پہلو یہ ہے کہ وہ مخلوقات کو تو الوہیت

(گزشتہ سے پیوستہ) میں تعلیم یافتہ طبقہ خدا اور مذہب سے بیزار ہوا ——— اس طبقہ کا چراغ مشرکانہ نظام ہی میں جلتا ہے۔ توحید کی سحر نمودار ہوتے ہی اس طبقہ کی خدائی ختم ہو جاتی ہے اور انسان خدا سے براہِ راست تعلق جوڑنے کا راستہ پا لیتا ہے۔

کا مقام دیتا ہے، لیکن خالقِ کائنات کو مخلوق کی سطح پر اتار لاتا ہے۔ مشرکین کے ذہن کا بنیادی نقص یہ ہے کہ وہ خالق کو مخلوق پر قیاس کرتے ہیں۔ حالانکہ خود مخلوقات کی مختلف انواع کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔

ہم حیوانات میں انسانی صفات کا تصور نہیں کر سکتے۔ ہم درختوں کے بارے میں یہ خیال نہیں کر سکتے کہ وہ بھی حیوانات کی طرح چلتے پھرتے ہوں گے۔ پانی کے متعلق ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ بھی ہوا کی طرح خود بخود اوپر اٹھتا ہو گا۔ جب مخلوقات کی مختلف انواع و اقسام کے درمیان اتنے بہت سے فرق ہیں تو خالق و مخلوقات کے مابین کتنا عظیم فرق ہو گا!

مشرکین خالق اور مخلوق کے مابین فرق نہیں کرتے، وہ خالق کو مخلوق پر قیاس کرتے اور مخلوق کی تمام کمزوریاں خالقِ کائنات کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ کائنات کو وجود بخشنے والا خدا تنہا کائنات کا انتظام نہیں کر سکتا۔ اس لیے وہ "مخلوق خداؤں" کے جم غفیر کو اس کے ساتھ بطور معاون چپکا دیتے ہیں۔ وہ انسانی حکمرانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کے تعاون کے بغیر حکومت کی گاڑی نہیں چلا سکتے، اسی پر وہ خدا کو قیاس کرتے ہیں، لیکن یہ قیاس مع الفارق ہے انسان بذاتِ خود عاجز و بے بس ہے۔ وہ اسی وقت کوئی چھوٹا یا بڑا کام کر سکتا ہے جب خدا طاقت ارزانی فرمائے اور مشیت ایزدی کے تحت کائنات کی قوتیں اور دوسرے انسان اس کے ساتھ تعاون کریں۔ اس کے برعکس خدا کی قوت ذاتی ہے۔ ساری کائنات اس سے قوت حاصل کرتی ہے اور کائنات اس کے قادرِ مطلق ہونے پر شاہدِ عدل ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ خالق سرچشمۂ قوت اور قادرِ مطلق تو ضعیف و ناتواں ہو اور اسے سہارا وہ مخلوقات دیں جنھیں خود اس نے وجود بخشا ہو اور جو اسی سرچشمۂ قوت کے سہارے جی رہی اور قوت حاصل کر رہی ہوں!

مشرکین کا تصور یہ بھی ہے کہ خالقِ کائنات ہمارے حالات نہیں جانتا۔ ہماری دعائیں اور التجائیں بھی اس تک نہیں پہنچتیں، بغیر وسیلہ کے اس تک رسائی ممکن نہیں، اس سے اپنی بات منوانے کے لیے سفارشی چاہیے، پھر وہ "مخلوق خداؤں" کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ اور اپنا سفارشی سمجھ کر انہیں چڑھاووں اور پوجا پاٹ سے راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں مشرکین خدا کو بھی انسانی فرمانرواؤں پر قیاس کرتے ہیں۔ انسانی فرمانروا بنفسِ نفیس رعایا کے حالات نہیں جانتے۔ وہ بذاتِ خود ہر ایک کی دادرسی نہیں کر سکتے، ان تک ہر ایک کی رسائی نہیں ہوتی۔ وہ ان سب امور میں ماتحتوں کے محتاج ہیں اور ان کی بادِ دبے جا سفارشیں قبول کرنے پر مجبور، لیکن کیا خالقِ کائنات کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے؟ کیا کائنات کا پیدا کرنے والا اور مخلوقات پر ہر آن زندگی اور ضروریاتِ زندگی کا فیضان کرنے والا کائنات اور اُس کی اشیا سے بے خبر ہو سکتا ہے؟ کیا کسی مخلوق کا اس پر دباؤ ہے کہ وہ جا و بے جا ہر طرح کی سفارشیں مانے؟ کیا خدا سے بھی انصاف حاصل کرنے کے لیے سفارشوں کی ضرورت ہے؟ اگر ان سب سوالات کا جواب نفی اور قطعی نفی میں ہے تو پھر خدا سے دعا مانگنے اور اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کسی "مخلوق خدا" کے ذریعے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا اس طرح کے کسی وسیلہ کو تسلیم کرنا خدا کے علم، اُس کے انصاف اور اس کی قدرت کی نفی نہیں ہے؟

انسانی فرمانروا تنِ تنہا پورے مُلک پر حکومت نہیں کر سکتے، اس لیے وہ مُلک کو مختلف علاقوں میں بانٹ کر ایک ایک علاقہ کا ایک ایک شخص کو ذمہ دار بنا دیتے ہیں، ہر علاقے کے سفید و سیاہ کا مالک اس علاقے کا حاکم ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے حاکمِ اعلیٰ تک رسائی ہو سکتی ہے۔ نظمِ کائنات کے بارے میں مشرکین اسی طرح کا تصور رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک کائنات کے مختلف شعبے مختلف خداؤں کے زیرِ انتظام ہیں اور لطف

یہ ہے کہ یہ خدا فرمانروائے کائنات کے سامنے جواب دہ بھی نہیں، گویا خدا دورِ آخر کے مغل فرمانرواؤں کی مانند ہے جو کہنے کو فرمانروائے ہند تھا لیکن حقیقتاً سارا اقتدار نوابوں، راجاؤں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو حاصل تھا۔

یہ انسان پر خدا کو قیاس کرنے ہی کا نتیجہ ہے کہ مخلوقات میں سے خالقِ کائنات کے بیوی بچے گھڑ لیے گئے اور یہ سادہ سی حقیقت لوگوں کی سمجھ میں نہ آئی کہ جوڑا ہم جنس ہوتا ہے اور اولاد بھی ہم جنس ہی ہوتی ہے، نہ انھوں نے یہ سوچا کہ خالقِ کائنات کو اولاد کی کیا ضرورت ہے، کیا وہ ہماری طرح فانی ہے کہ اپنے بعد اپنا نام اور اپنا کام چلانے کے لیے اولاد کا خواہشمند ہے؟ کیا وہ ہم انسانوں کی طرح کمزور ہے کہ اسے سہارے کے طور پر بیٹے بیٹیوں کی ضرورت ہے؟ یا وہ ہماری طرح شہوانی خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر (العیاذ باللہ) جنسی فعل کرتا اور اس کے نتیجہ میں اولاد ہوتی ہے۔

شرک ـــــ ایک غیر عقلی مفروضہ

شرک کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس کی بنیاد کسی عقلی استدلال، کسی منطقی بُرہان اور کسی سائنٹیفک انکشاف پر نہیں ہے۔ ایک خدا کا وجود تو علم، عقل اور سائنس کا صریح مقتضا ہے۔ لیکن یہ بات کہ کچھ قوتیں اور ہیں جو ہیں تو مخلوق مگر تخلیق و فرمان روائی میں خالقِ کائنات کے ساتھ ہیں، اس کا کوئی عقلی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس کی بنیاد فی الحقیقت وہم، جہالت اور اوہام پرستی ہے اور ان تینوں چیزوں کے اجتماع سے جو مشرکانہ میتھالوجی ترتیب پاتی ہے اسے کوئی صاحب عقل آدمی بسلامتی ہوش و حواس باور نہیں کر سکتا۔ الا یہ کہ اس کے نزدیک مذہب کی حدود میں عقل و خرد کا داخلہ ممنوع ہو۔

یہ میتھالوجی جتنی بعید از قیاس اور خلاف عقل ہوتی ہے اتنی ہی گندی بھی ہوتی ہے اور اس میں تھوڑے سے تھوڑے عرصہ کے بعد اضافہ بھی ہوتا

رہتا ہے۔ "مخلوق خدا" بھی بڑھتے رہتے ہیں اور ان کی محیر العقول داستانیں بھی لوگ بیان کرتے ہیں۔ لوگ پرانے خداؤں کو بدلتے بھی ہیں اور نئے خداؤں کو تصنیف در آمد بھی کرتے ہیں، خداؤں کا لین دین اور تبادلہ بھی ہوتا ہے۔ ان "مخلوق خداؤں" کے نام، ان کی تعداد، ان کی نوعیت، ان کی صفات، ان کے اختیارات، ان کے کارنامے اور ان کی داستان ہائے حیات ہر گروہ کے پاس ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور ان میں سے کسی چیز کا کوئی علمی یا عقلی ثبوت نہیں ہے، نہ ان میں سے کسی بات کو عقل کے ذریعے طے کیا جا سکتا ہے۔

بلاشبہ ایک سے زائد خداؤں کا ذکر بعض ایسی کتابوں میں ہے جنھیں لوگ مذہبی یا خدائی کتابیں سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کتابوں کے سلسلے میں نہ یہ بات ثابت کہ وہ واقعتہً خدا کی بھیجی ہوئی کتابیں ہیں، نہ یہ کتابیں بالفاظہٖ محفوظ ہیں۔ ان کتابوں کے بعید از عقل اور انسانیت سوز مضامین اس بات کی داخلی شہادت ہیں کہ یہ حکیم و دانا خالقِ کائنات کی وحی و القاء کا نتیجہ نہیں ہیں، علاوہ ازیں ان مذہبی کتابوں کی تعلیمات میں شدید اختلافات و تضاد ہے اور عقل یہ فیصلہ کرنے سے عاجز ہے کہ کس کی بات مانے اور کس کی بات نہ مانے، پھر ایسی مذہبی کتابیں بھی تو موجود ہیں جو پُر زور الفاظ میں شرک کی تردید کرتی ہیں۔ یہ کتابیں بعید از قیاس اور تہذیب سے گرے ہوئے مضامین سے پاک بھی ہیں

یہی نہیں کہ ایک سے زائد خداؤں کا وجود عقل سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ صراحتاً خلافِ عقل ہے۔ یہ بات کس طرح عقل میں آسکتی ہے کہ جو ہستیاں ذاتی زندگی نہیں رکھتیں بلکہ خدا کی مخلوق ہیں، وہ کائنات یا اس کے کسی جزء کی خالق ہوں اور خدا جس کا وجود اور جس کی قوت ذاتی ہے، خالق نہ ہو؟ یہ بات کیونکر باور کی جا سکتی ہے کہ خالقِ کائنات ان مخلوقات کے سہارے کا محتاج ہو جو زندگی اور قوت اسی سے پا رہی ہیں اور یہ ایک

ایک چیز میں خود اس کی محتاج ہیں؟

یہ بات کس طرح عقل میں آسکتی ہے کہ خدا کی پیدا کردہ اور اس کی پروردہ ہستیاں اس کے اقتدار و فرمانروائی میں شریک ہوں؟ جب کہ وہ اس کے آگے دستِ نگر بھی ہوں؟ جن ہستیوں نے کائنات کی مالکیت و فرمانروائی کا حق انھیں کیسے پہنچتا ہے؟ جو ہستی تنہا کائنات کی خالق ہے اس میں مخلوق کی کمزوریاں، مجبوریاں اور محتاجیاں کس طرح ہو سکتی ہیں؟

یہ سب باتیں بداہتاً عقل کے خلاف ہیں، اور اس لیے کلیتاً رد کیے جانے کے قابل۔

شرک، یعنی مخلوق پرستی

شرک کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ اوّل تا آخر مخلوق پرستی ہے۔ یوں تو خدا کا انکار کرنے کا مآل بھی مخلوق پرستی ہی ہے[1] اور خدا پرستی سے انحراف کے بعد مخلوق پرستی سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ لیکن شرک میں مخلوق پرستی کا دائرہ انتہائی وسیع اس کی شکل حد درجہ گھناؤنی ہوتی ہے۔ ذلیل سے ذلیل شئے بڑی آسانی سے خدا بنالی جاتی ہے اور اشرف المخلوقات انسان خوشی خوشی اس کے آگے سر جھکا دیتا ہے، وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے خدا گھڑتا اور خود ہی اُن کے آگے سجدہ ریز ہوتا ہے، یہی نہیں وہ اپنے وہم و خیال سے بہت سے خداؤں کی تخلیق کرتا اور پھر اُن کی پرستش میں لگ جاتا ہے۔ مخلوق خداؤں کے اس ہجوم میں خالقِ کائنات کی پرستش کی باری مشکل ہی سے آتی ہے۔ جب تمام مفروضہ مخلوق خداؤں سے پوری ہو جاتی

---

[1] یہ مخلوق پرستی بالعموم وطن پرستی، قوم پرستی، اکابر پرستی، مفاد پرستی اور نفس پرستی کا روپ دھارن کرتی ہے۔

ہوں تو خالقِ کائنات کو کوئی کیوں پوچھے۔ اور آتی بھی ہے تو اس طرح جیسے مخلوق خدا کی خالقِ کائنات میں مخلوق کی تمام کمزوریاں پیدا کر دی جاتی ہیں اور اس کے بعد اس کی پرستش بھی "مخلوق خدا" ہی کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ مشرکانہ نظام میں یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی جاتی کہ خالقِ کائنات کی مرضی اور اس کی پرستش و بندگی کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ جس طرح دل میں آیا جس طرح مذہب کے ٹھیکیداروں نے کہہ دیا، جس طرح باپ دادا کو کرتے دیکھا، بس اس طرح خدا کو پوج لیا، ظاہر ہے کہ یہ خدا پرستی نہیں، نفس پرستی، آباء پرستی اور رسم پرستی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شرک خالص مخلوق پرستی ہے، خدا پرستی سے اس کا کوئی تعلق نہیں، جو شخص شرک میں جتنا آگے ہوگا خدا کی بندگی میں اسی قدر پیچھے اور مخلوق پرستی میں اسی قدر غرق ہوگا۔ خالقِ کائنات سے اس کا کوئی قریبی تعلق نہ ہوگا، البتہ مخلوقات میں اس نے بے شمار خدا بنا رکھے ہوں گے جن کے آگے وہ سر جھکاتا ہوگا، جو لوگ خدا کی پرستش و بندگی کرنا چاہتے ہیں انھیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ شرک میں خدا کی نہیں مخلوق کی پرستش و بندگی ہوتی ہے۔

شرک، خدا پرستی کی ضد

شرک کا ایک پہلو — سب سے اہم اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ وہ خدا پرستی کی عین ضد ہے۔ شرک خدا سے انسان کا تعلق منقطع کر دیتا ہے اور اسے خدا پرست کے بجائے مخلوق پرست بنا تا ہے۔ مشرکانہ مذاہب اختیار کر کے سادہ لوح افراد یہ خیال کرتے ہیں کہ انھوں نے خدا کو پا لیا اور یہ سوچ کر انھیں ایک طرح کی روحانی تسکین ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ اپنی ہی جیسی مخلوقات کے دامِ محبت و عقیدت میں پھنس جاتے ہیں اور خدا سے قریب تر ہونے

سے کے بجائے اُس سے دُور تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

خدا سے انسان کا ایک تعلق یہ ہے کہ خدا اُس کا حاجت روا و مشکل کشا ہے۔ ہر آڑے وقت میں وہ اُس کے کام آتا ہے، زندگی اور موت، نفع اور نقصان، عزت اور ذلت، تندرستی و بیماری، اولاد اور رزق، غرض تمام ضروریات اور زندگی سے متعلق امور اُس کے ہاتھ میں ہیں، اس یقین کے نتیجہ میں انسان خدا کا دامن تھامتا اور اُسے راضی رکھنے میں فلاحِ دارین تصور کرتا ہے، لیکن مشرکانہ نظام میں "مخلوق خدا" اس کے حاجت روا ہوتے ہیں، اس لیے مشرک انھیں راضی کرنے میں لگا رہتا ہے۔ مشرکین کا قریبی اور عملی رشتہ ان "مخلوق خداؤں" ہی سے ہوتا ہے، خدا سے اُن کا کوئی عملی اور حقیقی تعلق باقی نہیں رہتا، وہ خدا کو مانتے ضرور ہیں مگر اُن کے نزدیک خدا کی وہی حیثیت اور قدر و قیمت ہوتی ہے جو ایک ماڈرن نوجوان جوڑے کی نظر میں از کار رفتہ دقیانوسی بوڑھے کی!

خدا سے تعلق کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان اس کی پرستش کرتا، اس سے دعائیں مانگتا، اور سپردگی کے پورے جذبہ کے ساتھ اس کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے، لیکن مشرکانہ نظام میں یہ عبودیت، جو خالق اور مالک ہی کے لیے مخصوص ہونی چاہیے چھوٹی، بڑی، ہر مخلوق کے قدموں میں ڈال دی جاتی ہے، یہاں تک کہ خدا کے لیے کوئی سجدہ نہیں بچتا اور بچتا ہے تو اس طرح کہ اس میں کوئی معنویت اور کوئی جذبِ دروں نہیں ہوتا۔ انسان دل سے ایک ہی آقا کا وفادار ہو سکتا اور سپردگی اور حوالگی کے جذبہ کے ساتھ کسی ایک ہی کے حضور جبینِ نیاز خم کر سکتا ہے۔ اگر وہ بہت سے خداؤں کو مان رہا اور سب کے آگے مراسمِ پرستش بجا لا رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی پرستش رسمی نوعیت کی ہے۔ اس کے اندر نہ جذبۂ انقیاد ہے نہ وفاداری و نیازمندی۔ ایسا انسان فی الحقیقت خدا کا پرستار ہے

نہ کسی اور کا، صرف اپنا پرستار ہے۔

خدا سے تعلق کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ انسان والہیت و نیازمندی کے ساتھ خدا کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کرتا اور اس میں دنیا و آخرت کی کامرانی مضمر سمجھتا ہے، لیکن شرک انسان کو یہ باور کراتا ہے کہ پوجا پاٹ کی چند بے معنیٰ رسمیں جو مخلوق خداؤں کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دی جائیں اور جن کے بجا لانے میں کوئی خاص زحمت نہیں ہوتی اور نہ کوئی قربانی دینا ہوتی ہے، انسان کی نجات و کامرانی کے لیے کافی ہیں۔

اس یقین کے حاصل ہو جانے کے بعد کوئی احمق ہی ہو گا جو قانونِ الٰہی کو درخورِ اعتنا سمجھے اور اللہ کی رضا کے لیے خواہشات و مفادات کو قربان کر دے، یہی وجہ ہے کہ شرک کے فروغ پاتے ہی خدا کے قانون کا احترام اور اس کی پیروی کا جذبہ رخصت ہو جاتا ہے اور مذہب کے نام سے چند لایعنی رسوم رہ جاتی ہیں، یا وہ ظالمانہ قوانین جو مذہب کے اجارہ دار اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے خدا کے نام پر بنائیں اور عوام کے سروں پر مسلّط کر دیں۔

مثال کے طور پر آپ مسیحیت کو لے لیجئے۔ حضرت مسیحؑ کی دعوت جیسا کہ آج بھی انجیل سے واضح ہے ـــــ تثلیث کی نہیں، توحید کی دعوت تھی اور اسی لیے انھوں نے قانونِ الٰہی کی پیروی پر انتہائی زور دیا تھا، لیکن جب شرک نے توحید کی جگہ لے لی تو اتباعِ شریعت کی اہمیت خود بخود ختم ہو گئی ـــــ مسیحیت نے اعلان کیا کہ انسان عمل سے نہیں، صرف ایمان سے نجات پاتا ہے اور ایمان بھی یہ کہ حضرت مسیحؑ خدا کے بیٹے ہیں۔ یہاں تک کہا گیا کہ شریعت ایک لعنت تھی۔ جس سے انسان پاک ہونے کے بجائے گنہگار ہوتا تھا۔ لعنت کا دور اب ختم ہوا، اب نجات خدا کے بیٹے پر ایمان لانے سے ہو گی جو انسانوں کے گناہوں کے کفارے

کے لیے سولی پر چڑھ گیا۔[1]

یہ ہیں شرک کے اثرات ایک دینِ توحید پر! اسی پر آپ ادیانِ شرک کو قیاس کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شرک خدا پرستی کی عین ضد ہے، وہ مذہب کے پردے میں خدا سے بغاوت ہے۔ شرک الحاد ہے بلکہ الحاد سے بھی بدتر۔

---

[1] ملاحظہ ہو "عہد نامہ جدید" پولوس رسول کے خطوط

شرک کے اثرات

انسانی زندگی پر

فیصلے کا طریقہ

کائنات کی تخلیق اور اس کا نظم و انصرام، ایک سے زائد خداؤں کا مرہونِ منت ہے، اس عقیدے کی صحت کو جانچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ فکر و استدلال کی کسوٹی پر اسے پرکھیں اور عقل و خرد کی عدالت سے اس کا فیصلہ چاہیں کیونکہ اسی قوت کے ذریعہ ہم صحیح اور غلط میں تمیز کر سکتے ہیں[1]۔

---

[1] کہا جاتا ہے کہ مذہبی معاملات میں عقل کا دخل نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر صحیح اور غلط کا فیصلہ کیونکر ہو؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ فیصلہ انسان کا ضمیر (Conscience) کر سکتا ہے، لیکن ضمیر کی آواز نہ صرف یہ کہ مدھم ہوتی ہے، نہ صرف یہ کہ اس طرح کے نظری مسائل میں دو ٹوک فیصلہ نہیں دیتی بلکہ وہ انسان کے ایمان و یقین سے متاثر بھی ہوتی ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کشف و اشراق کی روحانی طاقت ہی اس سلسلے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے لیکن اس بات سے قطعِ نظر کہ یہ قوت انگلیوں پر گنے جانے والے چند افراد کو حاصل ہوتی ہے، سوال یہ ہے کہ کشف و اشراق کے ذریعہ انسان کو جو کچھ نظر آتا ہے وہ حقیقی علم ہے یا انسان کے اپنے تخیل اور طرزِ ریاضت کا انعکاس؟ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف اصحاب کا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس عقیدے کی صحت کو جانچنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ انسانی زندگی اور سماج پر اس کے اثرات کا جائزہ لیں۔ جو نظریہ حقیقتِ نفس الامری کے مطابق ہوگا وہ انسانی زندگی کی تعمیر اور سماج کے ارتقا کا موجب ہوگا اس کے برعکس کسی عقیدے کو اپنانے سے اگر انسانی سماج فاسد افکار و اعمال میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کا قدم زوال و انحطاط کی طرف بڑھتا ہے تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ عقیدہ حقائقِ فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہے، اور اس لیے باطل ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی نظریہ حقائقِ فطرت کے عین مطابق ہو اور اسے اپنانے سے انسانی زندگی فساد سے دوچار ہو۔

"شرک عظیم ترین گمراہی" میں ہم شرک کو استدلال کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ چکے ہیں، یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی ہے کہ یہ عقیدہ نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں ہے، نہ صرف یہ کہ استدلال کی میزان میں پورا نہیں اترتا، بلکہ اس کی پشت پر فی الواقع کوئی دلیل ہے بھی نہیں۔

آج کا دَور بحث و استدلال کا دور ہے، کمزور سے کمزور پوچ سے پوچ دعوے کے لیے لوگ دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تجزیہ کے بعد یہ دلائل تارِ عنکبوت ثابت ہوں، لیکن شرک کے حامی شرک کے حق میں دلائل دینا تو دور کنار، وہ اپنے آپ کو مشرک کہلانا بھی پسند نہیں کرتے، حالاں کہ وہ عظیم اکثریت میں ہیں۔ ان کا سارا زورِ بیان و استدلال شرک

(گزشتہ سے پیوستہ) مشاہدۂ قلبی مختلف ہوتا ہے پھر ہم کس کے مشاہدہ کو صحیح تسلیم کریں جبکہ ہمارے پاس کسی کی تصدیق یا تردید کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اس کے بعد وحی الٰہی رہ جاتی ہے بلاشبہ اس کے ذریعہ یقینی علم حاصل ہوتا ہے، مگر عام افراد تو مدعیٔ نبوت کے کردار اور اس کی تعلیمات کو عقل کی روشنی میں پرکھ کر ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ وحیٔ الٰہی یا مکرِ شیطانی۔ مختصر یہ کہ عقل سے مدد لیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

کی تاویل کرنے میں صرف ہوتا ہے تاکہ وہ توحید سے قریب نظر آسکے یا کم از کم ان پر شرک کا مکروہ الزام تو نہ لگنے پائے!

عیسائی تثلیث کے قائل ہیں اور ان میں سے کیتھولک تو کھلے ہوئے بُت پرست ہیں، لیکن اس فرقے سمیت تمام مسیحی خدا کو ایک ہی مانتے ہیں البتہ وہ ایک خدا کے تین اُقنوم — باپ بیٹا اور روح القدس — قرار دیتے ہیں "تین میں ایک" اور "ایک میں تین" (One God in three and three in one) کے گورکھ دھندے میں مسیحیت کے پیرو تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے صرف اس لیے گرفتار ہیں کہ شرک کے قائل ہوتے ہوئے وہ توحید کے دامن میں منھ چھپانے پر خود کو مجبور پا رہے ہیں۔

بھارت میں، جہاں کے عوام و خواص بے شمار خداؤں کو مانتے اور پوجتے ہیں[1] تعلیم یافتہ اصحاب شرک سے تبرّی کرتے نظر آتے ہیں حالانکہ وہ صریحاً مشرکانہ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ مورتیاں تو خدا کا تصور کرنے اور توجہ کو مرتکز کرنے کے لیے ہیں معبود خدا ہے نہ کہ مورتیاں[2]۔ کسی کا کہنا ہے کہ مختلف نام و صفات رکھنے والے دیوی دیوتا فی الحقیقت ایک ہی خدا کے مختلف نام و صفات ہیں۔ خدا ایک ہی ہے، نہ کہ بہت سے۔ کسی کا ارشاد ہے کہ خدا تو ہر جگہ ہے اور جہاں اس کا تصور کرو وہ مل جاتا ہے، ہم بتوں میں اس کا تصور کر کے اسے پاتے اور اس کی پرستش[3] کرتے ہیں، کچھ

---

[1] یہ بات اکثر افراد کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہے۔

[2] سوامی دیانند جی نے اس تاویل کی بہت عمدہ تردید کی ہے (ستیارتھ پرکاش، اردو ایڈیشن شائع کردہ لالہ لاجپت رائے صفحہ ۴۰۲ و ۴۱۰ و ۴۱۱)

[3] سوامی دیانند جی نے اس تاویل کے بخیے ادھیڑ دیے ہیں۔ (ستیارتھ پرکاش، اردو ایڈیشن صفحہ ۴۰۴، ۴۰۵)

لوگ کہتے ہیں کہ خدا تو ایک ہی ہے، اس کے سوا جن ہستیوں سے ہم مرادیں مانگتے ہیں اور جن کے حضور میں ہم سجدہ ریز ہوتے ہیں وہ خدا نہیں، خدا کے محبوب و مقرب بندے ہیں۔ خدا نے انھیں کائنات کے نظم اور انسانی زندگی سے متعلق تمام اختیارات دے رکھے ہیں، اور کوئی ہے جو "ہمہ اوست" کے پردے میں اپنے شرک کو چھپاتا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اہل عرب شرک میں سرتاپا غرق تھے۔ وہ اتنے پختہ کار مشرک تھے کہ انھوں نے توحید کی دعوت کو کچلنے کے لیے اپنی تلواریں سونت لیں اور ربع صدی تک اس مقصد کے لیے جان و مال کی قربانی دیتے رہے۔ شرک کے یہ فدائی جو جنگ کے میدان میں پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیتے تھے، استدلال کے میدان میں تھوڑی دیر بھی نہ ٹکتے تھے، ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی دلیل نہ تھی کہ انھوں نے باپ دادا کو اس روش پر پایا ہے اور چودہ سو برس گزر جانے کے بعد آج بھی اہلِ شرک کے پاس "اس اکلوتی دلیل" کے سوا ــــ بشرطیکہ اسے دلیل کہا جا سکے اور کوئی دلیل نہیں ہے، بس اسی دلیل کا وہ ہمیشہ سہارا لیتے رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لوگ پہلے کھلم کھلا شرک کی حمایت اور توحید کی مخالفت کرتے تھے اور اسی دلیل کے بل بوتے پر کرتے تھے اور اب شرک کے قائل اور پرچارک بھی توحید کا لبادہ اوڑھے نظر آتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شرک کے حق میں پہلے بھی کوئی دلیل نہ تھی اور نہ اب ہے۔ شرک کا عقیدہ پہلے بھی بے دلیل مانا جاتا تھا اور آج بھی، جب کہ علمی و عقلی ارتقا نے شرک کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ شرک کا عقیدہ صرف اس لیے زندہ ہے کہ مذہب کی حدودِ حکمرانی سے عقل کو بے دخل کر دیا گیا ہے اور باپ دادا سے جو کچھ ہوتا آیا ہے اسے آنکھیں میچ کر مان لینے کا دستور پڑ گیا ہے یا اس کے لیے پھل پھول رہا ہے کہ کسی خاص قومی تہذیب

کے بقا اور مخصوص قومی زندگی کے تسلسل کے لیے شرک کو تسلیم کرنا ناگزیر ہے ورنہ قومیت کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ الفاظ دیگر شرک کی حمایت سرپرستی خدا پرستی کے محمود جذبے کے تحت نہیں، قوم پرستی (Nationalism) کے داعیہ کے تحت ہو رہی ہے!

مشرکین کی عقلی بے مائگی کو قرآنِ مجید ان الفاظ میں نمایاں کرتا ہے:

مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ٥ (زخرف، ۲۰)

"ان کے پاس اس سلسلے میں کوئی علم نہیں ہے، وہ صرف تیر تکے چلا رہے ہیں۔"

قرآن ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ ان کے پاس دلیل ہو تو پیش کریں۔

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ٥ (الانعام ۱۴۸)

"کہہ دو! کیا تمہارے پاس (شرک کی) کوئی علمی سند ہے؟ ہے تو ہمیں نکال کر دکھاؤ! نہیں، تم صرف وہم و خیال کی پیروی کر رہے ہو! تم اٹکل پچو تیر چلا رہے ہو"!۔

وہ کہتا ہے کہ ان کے پاس صرف ایک دلیل ہے اور وہ یہ کہ:

بَلْ قَالُوا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِمْ مُهْتَدُونَ ٥ زخرف، ۲۲)

"بلکہ انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان کے نقشِ قدم پر چل کر ہی ہدایت حاصل کر سکتے ہیں"!

یہ تھا شرک کو استدلال کی کسوٹی پر پرکھنے کا نتیجہ! اب آئیے انسانی زندگی اور معاشرہ پر شرک کے اثرات کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ عقیدہ انسانیت کے لیے موجب خیر و فلاح ہے یا باعثِ تخریب و فساد اور اس طرح اس کے

حق یا باطل ہونے کا فیصلہ کریں۔

غیر علمی و غیر عقلی رجحان

شرک کا عقیدہ، جیسا کہ اوپر گذر چکا، کسی دلیل کے بغیر بس یونہی مان لیا گیا ہے، دیکھنے میں یہ ایک مذہبی غلطی ہے، لیکن اس کا اثر پوری انسانی زندگی اور سارے سماج پر پڑتا ہے۔ ایک بار جب کوئی قوم زندگی کے سب سے بنیادی مسئلہ ـــــ وجودِ خدا ـــــ میں دلیل کے بغیر آنکھیں بند کر کے ایک عقیدہ کو مان لیتی ہے اور دل و دماغ کی گہرائیوں میں اسے پیوست کر لیتی ہے تو آنکھیں بند کر کے ماننے کی یہ لت اس کی ذہنی دنیا کو غارت کر دیتی ہے، اس کا ذہن مستقل طور پر غیر علمی و غیر عقلی رخ اختیار کر لیتا ہے۔ وہ بے سرو پا اور اعجوبہ قسم کی باتوں اور جھوٹی ان ہونی افواہوں پر بہت جلد ایمان لے آتی ہے۔ اُسے آباء پرستی کا مہلک روگ لگ جاتا ہے اور وہ شدید جذباتیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایسی قوم سے آپ یہ توقع نہیں کر سکتے کہ حق و صداقت کے سامنے آنے پر وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے اس پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے گی۔ ایسی قوم کے اکابر علم کی روشنی کو عام نہیں ہونے دیتے، مبادا عوام میں شعور پیدا ہو جائے اور مذہبی مزعومات کا طلسم شکست و ریخت ہو جائے۔ وہ حق و صداقت کے خلاف نفرت و عناد اور جھوٹے پروپیگنڈے کے طوفان اٹھاتے رہتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ عوام حق و صداقت کے قریب جا کر اس سے متاثر ہو جائیں۔[1]

---

[1] یورپ میں تثلیث کے علمبرداروں نے توحید کے اثرات کو روکنے کے لیے اسلام کے خلاف صدیوں تک انتہائی زہریلا اور صد فی صد جھوٹا پروپیگنڈہ کیا۔ اس پروپیگنڈے کے اثرات صد ہا سال گزرنے کے بعد آج بھی موجود ہیں۔ ہمارے ملک کے فرقہ پرست اسی ٹیکنیک کو آج اختیار کر رہے ہیں۔

چشمِ فلک نے یہ منظر بھی دیکھا ہے کہ شرک کے علم برداروں نے تحصیلِ علم پر شدید پابندیاں عائد کیں، اربابِ علم و دانش پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے، خالص علمی و سائنسی انکشافات پر تکفیر کی اور مذہبی عدالتیں قائم کر کے ایسی ہولناک سزائیں دیں کہ ان کے تصور سے آج بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے، اور یہ سب کچھ اس لیے کہ ان کا طلسمِ جہالت و حماقت محفوظ رہے لیکن وہ محفوظ نہ رہ سکا اور چونکہ علم اور سائنسی انکشافات کی یہ مخالفت خدا اور مذہب کے نام پر ہوئی تھی اس لیے اربابِ علم و اہلِ سائنس شرک ہی نہیں خدا اور مذہب سے بھی بیزار ہو گئے اور پوری دنیا کو الحاد کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ مخالفت بھی جذباتی اور شدید تھی اور ردِ عمل بھی جذباتی اور شدید ہوا!

یہ تو شرک کا وہ اثر ہے جو عام انسانی زندگی پر ہوتا ہے، مذہبی دائرے میں اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ عقل کو مذہب کے دائرے سے بالکلیہ خارج کر دیا جاتا ہے۔ اچھے اچھے اصحابِ علم و فکر، جن کی فہم و دانش مسلّم ہوتی ہے مذہبی معاملات میں عقل سے کورے نظر آتے ہیں۔ وہ مہمل سے مہمل باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتے ہیں اور حقیر سے حقیر اشیاء کو بے تامل اپنا معبود مان لیتے ہیں۔ اس کی کھلی ہوئی غیر علمی و غیر عقلی روش میں مغرب مشرق سے پیچھے نہیں ہے۔ اہلِ علم اور عوام کے اس لایعنی رویہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مذہب میں روز بروز مہمل حرکات و اعمال اور خلافِ علم و عقل اذعانات کا اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ مجموعۂ خرافات اور "طلسمِ ہوش ربا" بن جاتا ہے جسے کچھ لوگ آنکھیں میچ کر صرف اس لیے مانتے رہتے ہیں کہ مذہب کی باتوں کو آنکھیں میچ کر ماننے کا دستور ہے۔ کچھ لوگ ذاتی و قومی مفادات کی خاطر اسے مانتے یا بہ الفاظِ صحیح تر اسے استعمال کرتے ہیں اور

لے یہ سب کچھ یورپ میں ہوا۔

کچھ لوگ ان مہمل رسوم و روایات سے بغاوت کر کے الحاد کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ آخر وہ کریں بھی کیا! مذہب کا نقشہ اُن کے سامنے آتا ہے، کوئی ذی عقل آدمی بہ سلامتیٔ ہوش و حواس اُسے اپنانے کی ہمت نہیں کر سکتا، اِلّا یہ کہ وہ عقل و خرد کو مذہب کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا چکا ہو۔ اس طرح شرک کی غیر عقلیت سے الحاد کی غیر عقلیت جنم لیتی ہے۔ الحاد کے امنڈتے ہوئے طوفان کو اگر مذہب رد کرنے سے عاجز ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ مذہب کے نام سے دنیا میں شرک کا دور دورہ ہے اور آج کا تعلیم یافتہ انسان شرک کے غیر عقلی تصور اور مشرکانہ دیومالائیت (Mythology) کو سوچ سمجھ کر تسلیم نہیں کر سکتا۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ شرک جہالت و بے عقلی کی تاریک فضا میں جنم لیتا اور اپنے وجود سے جہالت و بے عقلی کو پروان چڑھاتا ہے اس کے برعکس توحید کی بنیاد بصیرت و آگہی پر ہے۔ توحید خدا پرستی کی بنیاد پر پوری زندگی کی تعبیر کرتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ خدا پرستی عقل و حکمت کا صریح تقاضا ہے، توحید خدا پرستی کے علاوہ ہر پرستش کا خاتمہ کرتی ہے۔ آبا پرستی اور اندھی تقلید کا بھی! آبا پرستی اور تقلیدِ اعمیٰ شرک ہی نہیں ہر جہالت و بے دانشی کی اساس ہیں۔ توحید حق و صداقت کو بے تامل سینے سے لگا لینے کی دعوت دیتی ہے۔ خواہ وہ آبائی طور طریق اور رسمِ زمانہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔[1]

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا اور علمی، عقلی اور تہذیبی لحاظ سے اتنا پسماندہ تھا کہ دنیا میں اس کا کوئی مقام نہ تھا، لیکن توحید کی دعوت کو قبول کرنے کے بعد ہی اہلِ عرب

---

[1] یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید شرک کو جہل اور ظلمت، توحید کو علم اور نور، مشرک کو جاہل (نادان و جذباتی) اور شرک کے دور کو دورِ جاہلیت قرار دیتا ہے۔

جہالت و وحشت کی تاریکیوں سے نکلے اور آناً فاناً علم، فکر اور تمدن میں دنیا کے امام بن گئے۔ وہ مشرق و مغرب کے علوم کے وارث بنے، یہی نہیں کہ ان علوم کو انھوں نے محفوظ کیا اور دوسری قوموں تک انھیں منتقل کیا بلکہ ان میں بہت سی اصلاحات کیں، اپنی اجتہادی قوت سے انھیں بلندیوں پر پہنچایا اور متعدد نئے علوم و فنون ایجاد کیے۔ یہ لوگ جہاں بھی گئے علم و فن اور تہذیب و تمدن کی روشنی کو اپنے ساتھ لے گئے، ان کے یہاں علم سیکھنے سکھانے پر کوئی پابندی نہ تھی، کوئی شخص ہو، کسی نسل، کسی برادری اور کسی پیشہ کا ہو علم سیکھ سکتا تھا۔ حتیٰ کہ غلاموں پر بھی کوئی روک ٹوک نہ تھی اور دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب غلاموں کی بہت بڑی تعداد امامتِ علم و فن کے لیے آگے بڑھی۔ علم سیکھنے سکھانے میں عقیدہ و مذہب کی بھی کوئی تفریق نہ تھی انھوں نے حصولِ علم کے لیے ہر طرح کی مصیبتیں سہیں اور ہزاروں میل کے بری و بحری سفر کیے۔ یہی نہیں، توحید نے انھیں صحیح اور متوازن ذہن اور خالص علمی و عقلی نقطۂ نظر دیا۔ انھوں نے انسان کے بارے میں بالکل صحیح اور متوازن تصور قائم کیا جو تہذیب و تمدن کی تمام تر بلندیوں کے باوجود آج بھی موجود نہیں ہے، انھوں نے ہر طرح کی اونچ نیچ اور چھوت چھات کا خاتمہ کیا، مادیت و روحانیت میں صحیح توازن برپا کیا، علم و عمل کے مابین رشتہ استوار کیا، ایمان و تحقیق میں رابطہ قائم کیا، اپنے عقیدہ و مذہب میں سخت ہونے کے باوجود لوگوں کو عقیدہ و مذہب کی مکمل آزادی بخشی اور اس طرح بخشی کہ دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے، اطاعتِ امر کے ساتھ تنقید، آزادیٔ رائے اور جمہوریت کے بے مثال نمونے پیش کیے، تمدن کی تاریخ میں پہلی بار سیاسی و اجتماعی زندگی کو اخلاقی اقدار (Moral values) اور بے لاگ انصاف پر قائم کیا۔ بین الاقوامی انصاف کے اصول سب سے پہلے دنیا کے سامنے پیش کیے اور سختی کے ساتھ ان پر عمل کیا، اور یہ سب

کچھ اس وقت کیا جب مسیحی یورپ ابھی جہالت و بربریت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

یہ مسلمانوں کے دورِ عروج کی داستان ہے۔ یہی قوم جب عروج کی بلندیوں سے گری تو زوال وانحطاط کی پستیوں کی پستیوں میں گرتی چلی گئی۔ اس قوم کا عروج عقیدۂ توحید کا مرہونِ منت تھا۔ وہ جس قدر اپنے دین اور عقیدۂ توحید سے دُور اور دُور تر ہوتی گئی اسی قدر علم و عمل میں اور تہذیب و تمدن میں پست سے پست تر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ دنیا کی امامت اس سے چھین لی گئی، وہ قوم جو علم و فن اور تہذیب تمدن میں قوموں کی امام تھی وہ اب پیرو بننے کے لائق بھی نہ رہی۔ جس کے پاس طالبانِ علم اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے اطراف و اکنافِ عالم سے آتے تھے اس کی علمی بے مائگی ضرب المثل بن گئی۔ جس نے دنیا میں علم و تحقیق کی شمعیں روشن کی تھیں، وہ جمود، آباپرستی اور اندھی تقلید کا شکار ہو گئی۔ وہ جو توحیدِ خالص کی علمبردار تھی وہ مشرکانہ توہمات و اعمال میں الجھ کر رہ گئی۔ توحید سے دُوری نے اس میں جہالت، آباپرستی اور اندھی تقلید کے جھلک روگ پیدا کیے اور جہالت، آباپرستی اور اندھی تقلید نے اسے مشرکانہ توہمات و اعمال میں اور بھی پھنسا دیا۔ وہ قوم جو علمی امامت، تمدنی ارتقاء اور سیاسی عروج میں دنیا کے لیے باعثِ صد حیرت و استعجاب تھی توحید سے دوری کے بعد جہالت، پستی اور سیاسی و اجتماعی انحطاط میں سامانِ صد عبرت بن گئی اور تاریخ کا مستند ذخیرہ موجود نہ ہوتا تو کوئی شخص یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ اس سراپا عبرت قوم کا ماضی اس قدر شاندار تھا!

کہا جا سکتا ہے کہ شرک اور علمی و فکری ارتقا میں کوئی بیر نہیں، دنیا کی مشہور ترین تہذیبیں شرک ہی کی بنیاد پر قائم ہوئی ہیں۔ چین، ہندوستان، عراق، ایران، مصر، یونان اور روم اپنے اپنے دور میں تہذیب و تمدن کے گہوارے اور علوم و فنون کے مرکز تھے۔ ان ممالک کی انفرادی و اجتماعی

زندگی کی اساس شرک ہی تھی۔ یورپ اور امریکہ موجودہ دور میں علوم وفنون کے مرکز اور تہذیب وتمدن کے گہوارے ہیں اور وہ بھی دینِ شرک —— دینِ مسیحی کے حلقہ بگوش ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ شرک اور علم میں بیر نہیں، خصوصی ربط ہے۔

لیکن یہ بات متعدد وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ سب سے پہلے اس بات کو لیجیئے کہ یہ ممالک ہمیشہ سے شرک کا گہوارہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال اس انداز میں صحیح نہیں ہے، ان سب ممالک میں ابتداً توحید کا دور دورہ تھا۔ اور یہی ان کے حقیقی عروج کا وقت تھا، اس کے بعد جہالت و توہم پرستی کا دور ہوا اس کے نتیجہ میں رفتہ رفتہ شرک کا غلبہ ہوگیا۔ حتیٰ کہ ان کا تعارف اس حیثیت سے ہونے لگا کہ وہ شرک کے گہوارے ہیں، لیکن اس کے بعد وہ ایسے گرے کہ پھر سنبھل نہ سکے۔

تمام ممالک کے بارے میں بحث کا یہ موقع نہیں ہے، لیکن دو تین ملکوں کے بارے میں مجملاً گفتگو کیے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر عراق کو لیجیے جس کا پرانا نام کالڈیا یا کلڈانیہ ہے۔ دجلہ اور فرات کی سرزمین نوعِ انسانی کا قدیم ترین گہوارہ ہے اور اس کی تہذیب معلوم دنیا کی قدیم ترین تہذیب، حضرت نوحؑ اسی ملک میں پیدا ہوئے اور ایک طویل عرصے تک توحید کی دعوت دیتے رہے۔ طوفانِ نوح اسی ملک میں آیا اور اس کے بعد یہاں توحید کا دور دورہ ہوا، حضرت ابراہیمؑ بھی اسی ملک کے رہنے والے تھے اور یہیں سے ان کی دعوتِ توحید تمام متمدن دنیا میں پھیلی، حورابی جیسے عادل اور موحد فرمانروا نے اسی سرزمین میں جنم لیا۔ جس کے عادلانہ قوانین کا ایک حصہ آج بھی محفوظ ہے۔ یہ توحید کا دور تھا۔ اس کے بعد یہاں شرک کا دور دورہ ہوا اور ایک دن آیا جب کہ عراق کی شاندار تہذیب صفحۂ ہستی سے غائب ہوگئی، ہاں کچھ آثارِ قدیمہ اس پر ماتم کرنے کے لیے آج بھی موجود ہیں۔

ایک اور ملک مصر کو لیجیے جو علم وفن اور تہذیب وتمدن کا مرکز ہونے

کی حیثیت سے عالم گیر شہرت رکھتا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ اس ملک کے عروج کا دور وہی ہے جب سامی النسل عرب حکمراں یہاں حکومت کرتے تھے اور یہ سب ہی جانتے ہیں کہ عرب ممالک میں توحید کی دعوت مسلسل اٹھتی رہی ہے، یہی نہیں، ہمیں متعین طور سے یہ معلوم ہے کہ تہذیب و تمدن کے اس قدیم گہوارے میں عرصے تک توحید کا چلن رہا ہے۔ یہاں کے فرمانروا نے حضرت ابراہیمؑ جیسے توحید کے داعیِ اعظم کی پذیرائی کی اور اپنی بیٹی ہاجرہ ان کی زوجیت میں دی، اس ملک کے ایک دوسرے فرمانروا نے توحید کے ایک دوسرے عظیم داعی حضرت یوسفؑ کو اپنا تاج و تخت پیش کر دیا اور حضرت یوسفؑ کے بعد ان کی اولاد ایک عرصے تک مصر میں حکومت کرتی رہی، یہ وہ زمانہ تھا جب یہاں توحید کا دور دورہ تھا، اس کے بعد شرک کا چلن عام ہوا اور مصر کی شہرۂ آفاق تہذیب پیوندِ خاک ہو گئی۔

اب ایران کو لیجئے، ایک عرصے تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ ایران کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا، زرتشت موجودہ مجوسیت آتش پرستی کا بانی تھا، لیکن موجودہ تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ زرتشت دینِ توحید ہی کا داعی تھا۔ آتش پرستی بہت بعد کی دورِ زوال کی پیداوار ہے، اسی دورِ زوال نے مزدک جیسا اباحیت پسند پیدا کیا، جس نے عورت کو سب جیسے کی ہانڈی قرار دیا۔ اس سے ملک میں آوارگی و فحاشی کا ایک طوفان اٹھا اور بالآخر ایران کی قدیم تہذیب کا نام و نشان مٹ گیا۔

اگر ایران کے بارے میں یہ بات صحیح ہے کہ وہ اصلاً توحید کا گہوارہ تھا ـــــ اور یقیناً صحیح ہے ـــــ تو بھارت کے سلسلے میں بھی یہی بات صحیح ہے، تمام آثار اس بات کے حق میں ہیں کہ آریہ قوم ایران کی سرزمین سے ہندوستان آئی تھی، بگڑی ہوئی مجوسیت اور بگڑے ہوئے ویدک دھرم میں بہت کچھ مشابہت ہے، یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ آریہ، ہندوستان

کی قدیم قوم دراوڑ[1] کے مشرکانہ رسوم واعمال سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ موجودہ بُت پرستی بودھ اور جین دھرم کا دین ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ ان دونوں مذہبوں میں بھی بت پرستی کا رواج بعد میں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت کا حقیقی چہرہ تہہ بہ تہہ افسانوں[2] کی اوٹ میں چھپ گیا ہے تاہم ڈھونڈنے سے توحید کے کچھ آثار آج بھی ملتے ہیں۔

آریہ سماج فرقے کے بانی سوامی دیانند جی کا اصرار ہے کہ وید توحید خدا پرستی کی دعوت دیتے اور شرک وبُت پرستی کی مذمت کرتے ہیں، اپنے دعوے کے ثبوت میں انھوں نے ویدوں کے بہت سے منتر بھی پیش کیے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی موجودہ بت پرستی پر شدید تنقید اور اس کے اسباب ووجوہ پر تفصیلی بحث کی ہے ——— ستیارتھ پرکاش کا گیارھواں باب جو پورے پونے دوسو صفحات پر پھیلا ہوا ہے (اردو ایڈیشن صفحہ ۳۵۴ تا صفحہ ۵۲۸) اور کل کتاب کا تقریباً چوتھائی حصہ ہے، اسی بحث پر مشتمل ہے۔

لیکن ہندوؤں کی عظیم اکثریت جو سناتن دھرمی ہے، سوامی دیانند جی کو ویدوں کا صحیح ترجمان تسلیم نہیں کرتی، اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ویدوں کے کچھ منتر ضرور ایسے ہیں جو توحید کی تائید کرتے نظر آتے ہیں مثلاً

---

[1] یہ قوم اپنے دور میں شاندار تہذیب وتمدن کی مالک تھی، لیکن آخر میں جہالت، توہم پرستی اور شرک میں گرفتار ہو کر بدترین پستیوں میں گرتی چلی گئی یہاں تک آریوں کے ہاتھوں اسے عبرتناک شکست ہوئی، اس نسل کے لوگ وسطی اور جنوبی ہند میں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔

[2] یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ اس ملک میں تاریخ نویسی کے بجائے افسانہ نویسی کا رواج رہا ہے، تاریخ نویسی کی ابتدا تو مسلمانوں کے دور سے ہوتی ہے۔

رِگ وید میں ہے :

एकं सद् विप्रा बहुधा वदन्ति [1]

(ऋ०१-१६४.४६)

" خدا ایک ہے، رشی اُسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ "

(۱، ۱۶۴، ۴۶)

اس مجمل بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کی مشہور تہذیبوں کی بنیاد حقیقتہً توحید پر تھی، البتہ دورِ زوال میں یہ تہذیبیں شرک سے متاثر ہو گئیں اور امتدادِ زمانہ کے بعد انھیں مُشرکانہ تہذیبوں میں شمار کیا جانے لگا، اس انقلابِ ہیئت کی واضح ترین مثال موجودہ مسیحیت ہے، یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ حضرت مسیحؑ کی دعوت، توحید کی دعوت تھی، لیکن مسیحیت دورِ زوال میں تثلیث کی قائل ہو گئی اور آج اپنے اور پرائے سب اسے دینِ تثلیث ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں، اگر بائبل کے عہد نامۂ عتیق (Old testament) اور عہد نامۂ جدید (New testament) موجود نہ ہوتے تو مسیحیت کی اصل حقیقت کا سراغ لگانا سخت مشکل ہوتا، خود مسلمانوں کو لیجیے اگر قرآن مجید بالفاظہٖ موجود نہ ہوتا، احادیثِ نبوی کا مستند ذخیرہ ہمارے ہاتھوں میں نہ ہوتا اور مسلمانوں کی مدوّن تاریخ

۱؎ سوامی وویکانند نے بھی، جو ہندو دھرم میں بت پرستی کی گنجائش تسلیم کرتے اور اس کی مذمت کے مخالف ہیں اور جنھوں نے مغربی ممالک میں ہندو دھرم کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے اپنے لیکچروں میں ان منتروں کو بڑی اہمیت سے اور بار بار پیش کیا ہے اور اس کا مطلب یہی سمجھا ہے۔ انھوں نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے

(That which one exists is one)

(Sages call it by various names)

(سوامی وویکانند کے پانچ انگریزی خطبات ومقالات کا مجموعہ صہ ۲۴۳)

موجود نہ ہوتی تو ان کی اکثریت کے مشرکانہ توہمات و اعمال کو دیکھ کر کون شخص یہ باور کر سکتا تھا کہ اسلام دینِ توحید ہے اور مسلم تہذیب کی بنیاد شرک پر نہیں توحید پر تھی۔

یہ تو قدیم تہذیبوں کا معاملہ تھا، رہی موجودہ مغربی تہذیب تو اس کا مسیحیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس تہذیب کا ارتقاء مسیحی پیشواؤں کی شدید بلکہ ہولناک مزاحمت و مخالفت کے علی الرغم ہوا اور اسی لیے لادینیت (Secularism) تشکیک (Agnosticism) اور الحاد (Atheism) اس تہذیب کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ یہ مشرکانہ نہیں، خالص ملحدانہ تہذیب ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تہذیب کے اکثر و بیشتر افراد انفرادی زندگی کے ایک چھوٹے سے اور بہت ہی محدود گوشے میں مسیحیت سے رسمی سا تعلق رکھتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ کتابوں سے لائبریریاں بھر دینے اور نت نئے فلسفوں سے ذہنوں کو پریشان و مختل کر دینے کا نام علم نہیں ہے، حقائقِ کائنات اور فطرتِ انسانی کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور حقیقت (Reality) کو پا لینے کا نام علم ہے اور فکرِ صحیح یہ ہے کہ کائنات، نوعِ انسانی، مختلف انسانی طبقات اور انسانی مسائل کے بارے میں صحیح نہج پر سوچا جائے۔ اگر علم و فکر کی یہ تعریف صحیح ہے ـــــ اور اس کے صحیح ہونے میں کلام ہو سکتا ہے ـــــ تو آپ کو مشرکانہ تہذیبوں کے کارنامہ ہائے علم و فن قابلِ فخر ہونے کے بجائے قابلِ شرم نظر آئیں گے۔

اگر یہ بات صحیح ہے کہ ان ممالک کے بڑے بڑے اہلِ علم و فکر افراد نے شرک کے غیر عقلی تصور اور مشرکانہ میتھالوجی کی بے سروپا تفصیلات کو کسی دلیل کے بغیر آنکھیں میچ کر مان لیا تھا تو یقیناً یہ بات قابلِ صد افسوس ہے، کائنات کی تخلیق کیونکر ہوئی ـــــ؟ اس کے نظم و انصرام کی کیا صورت

ہے ؟ خدا ہے یا نہیں ؟ اور ہے تو ایک یا ایک سے زائد ؟ یہ کائنات اور انسانی زندگی کے سب سے اہم اور بنیادی سوالات ہیں اور عمیق غور و فکر اور اوّلین اور سنجیدہ ترین توجہ کے مستحق۔ اگر کچھ اربابِ علم و فکر نے اِن سوالات کا جواب شرک کے تصور کو اپنا کر مشرکانہ میتھالوجی کی خلافِ عقل اور متضاد تفصیلات کی صورت میں دیا ہے تو اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں، یا تو یہ کہ ان کی نگاہ میں ان بنیادی سوالات کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی اور اس لیے وہ ان "جزوی مسائل" کے لیے اپنی مشرک قوم کی ناراضگی کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے یا وہ ان مسائل کی اہمیت سے تو بخوبی آگاہ تھے مگر آبا پرستی اور اندھی عقیدت (Blind Faith) نے ان کے ذہن و دماغ کو مفلوج کر دیا تھا اور وہ ان مسائل پر کھلے دل و دماغ کے ساتھ سوچنے کے موقف میں نہ تھے، جو شکل بھی رہی ہو، اسے علم و فکر کی عبرت ناک شکست اور جہالت و آبا پرستی کی عظیم فتح ہی تصور کیا جائے گا۔

زندگی کے دوسرے مسائل کے سلسلے میں بھی ان تہذیبوں کا نقطۂ نظر غیر متوازن اور قطعاً غیر عقلی رہا ہے۔ مثلاً دنیا اور اس کے لذائذ و نعم کے بارے میں کچھ لوگ تو یہ انتہا پسندانہ (Extreme) نقطۂ نظر رکھتے تھے کہ دنیا ایک طلسمِ خیال ہے اور اس کی نعمتیں "مایا کا جال" اور کائنات کے وجود سے انکار، لذائذ و مرغوبات سے اعراض اور ضروریاتِ زندگی کو ترک کرنے اور جسم و جان کو اذیت ناک مصیبتیں دے دے کر گھلا ڈالنے ہی سے آدمی نجات پا سکتا ہے جب کہ دوسرا گروہ اس کے بالکل برعکس دوسرا انتہا پسندانہ نقطۂ نظر رکھتا تھا، اس کے نزدیک دنیا اور اس کے مادی مفادات ہی سب کچھ تھے، اس کا سوچ بچار، اس کی دوڑ دھوپ، اس کا سونا اور جاگنا، اس کی محبت اور نفرت، اس کی صلح اور جنگ اور اس کا جینا اور مرنا، سب کچھ دنیا کے انہی چند روزہ لذائذ و نعم ہی کے لیے تھا، اس کے نزدیک علم و فن، تہذیب و تمدن

عبادت و پرستش اور ادب اور آرٹ، ان سب کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ خوب گلچھرے اڑائے جائیں اور زیادہ سے زیادہ داد عیش دی جائے مغل شہنشاہیت کے بانی ظہیر الدین بابر کے الفاظ میں ؎

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

تہذیب کی صورت گری تمام تر اس طبقہ کے ہاتھ میں تھی اور اسی دنیا طلبی اور عیش پرستی کا شاندار نام تہذیب قرار پایا ـــــ بلا استثنا ہر مشرکانہ تہذیب آپ کو اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آئے گی۔

انسان کے بارے میں بھی مشرکانہ تہذیبوں کا نقطۂ نظر غیر عقلی بلکہ غیر انسانی رہا ہے۔ عام انسان ان کی نظر میں جانوروں، درختوں بلکہ پتھروں سے بھی فروتر تھے۔ لیکن مخصوص مذہبی و سیاسی طبقوں کو یہ کبریائی کا بلند ترین مقام دیتیں۔ یہ طبقے دیوتاؤں کی اولاد بلکہ خود دیوتا خیال کیے جاتے اور ان کی بے چون و چرا اطاعت بلکہ پرستش عوام کے لیے تمام فرائض سے بڑھ کر فرض کی حیثیت رکھتی۔ ان تہذیبوں میں عوام کے حقوق برائے نام ہوتے اور ان کے فرائض کی فہرست بہت طویل ہوتی، جب کہ مذہبی و سیاسی آقاؤں کے حقوق سب کچھ اور فرائض برائے نام ہوتے، عوام کی جان، مال اور آبرو کی کوئی قیمت نہ تھی، وہ مصیبتیں سہہ سہہ کر اور ظلم و ستم برداشت کر کر کے اپنے آقاؤں کی خدمت کے لیے جیتے تھے۔ برسراقتدار لوگ زندگی بھر ان کے خون پسینے کی کمائی کو بے دریغ لوٹتے اور مرنے کے بعد ان عظیم الشان مقبروں میں استراحت فرماتے جو غریب عوام کی کمائی اور ان ہی کی جان توڑ محنت سے تعمیر کیے جاتے۔ دنیا کا عظیم العجوبہ اہرامِ مصر اس سلسلے کی سب سے نمایاں اور سب سے زیادہ ہولناک یادگار ہے۔ یہ مصر کے فرمانرواؤں کے، بہت بڑی بڑی چٹانوں سے بنے ہوئے محیر العقول اور سربہ فلک مقبرے ہیں جن کی تیاری میں بے اندازہ رقم صرف ہونے کے علاوہ بیشمار

انسانی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ مصر کے فرمانروا تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہوتے ہی اپنے مقبرے کی تیاری کا کام شروع کرا دیتے اور مرنے کے بعد عیش و عشرت کے جملہ ساز و سامان کے ساتھ اس میں دفن کر دیے جاتے۔ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اس طرح کی یادگاریں آپ کو ہر جگہ نظر آئیں گی۔[1]

برسرِ اقتدار طبقہ کی بزم ہائے عیش و عشرت میں شراب کے خم کے خم لنڈھائے جاتے۔ قمار بازی اور ہر طرح کی ناپاک بازیاں ہوتیں، عورت کی آبرو پانی کی طرح بے دریغ بہائی جاتی۔ یہی نہیں، اس طبقہ کی تفریحِ طبع کی خاطر انسانوں کو تڑپا تڑپا کے قتل کیا جاتا اور چیتوں اور درندوں سے لڑایا اور پھڑوایا جاتا تاکہ ان کی تڑپتی ہوئی لاشیں ان کے لیے سامانِ فرحت و انبساط بن سکیں۔

آرٹ کے باب میں بھی ان تہذیبوں کا نقطۂ نظر غیر عقلی اور حد درجہ جذباتی رہا ہے۔ جنسی معاشقوں کی داستانوں سے بھرے ہوئے اشعار، شہوانی جذبات میں تلاطم پیدا کرنے والے ناچ گانے، عریاں حسن کے فحش مظاہرے، گندے اور شرافت سوز ناٹک اور ڈرامے، حسن کو عریاں سے عریاں تر شکل میں پیش کرنے والی تصویریں اور مجسمے اور جنسی فعل کرتے ہوئے دکھائے جانے والے مناظر، یہ ہے ان تہذیبوں کا آرٹ! اس آرٹ کے نمونے اجنتا اور ایلورا کی گپھاؤں ہی میں نہیں، دنیا کی ہر مشرکانہ تہذیب کے آثارِ قدیمہ میں آپ کو نظر آ سکتے ہیں!

یہ ہے مشرکانہ تہذیب! کیا یہ کسی طرح بھی قابلِ فخر ہے؟ یہ ہے اس کا نقطۂ نظر خدا، کائنات، انسان اور مسائلِ حیات کے سلسلے میں! کیا اس

---

[1] دنیا کا ایک ادرا عجوبہ "تاج محل" اور سلاطین و بزرگانِ دین کے عظیم الشان مقبرے موحدانہ ذہنیت سے ہرگز مناسبت نہیں رکھتے، یہ مقبرے بلاشبہ مسلمان فرمانرواؤں کے بنوائے ہوئے ہیں مگر دینِ توحید — اسلام کی صریح ممانعت کے علی الرغم!

نقطۂ نظر کو آپ علم صحیح اور فکرِ صحیح قرار دے سکتے ہیں ؟

انسانیت کی تذلیل

شرک کے نقطۂ نظر سے ہر مخلوق معبود بننے کی پوزیشن میں ہے ، اس کے معبود بننے میں اتنی دیر ہے کہ انسان اسے اپنا حاجت روا دستگیر مان لے اور اس کے آگے ہاتھ پھیلائے اور سر جھکا دے اور مشرکانہ نظام میں وہ بہت آسانی سے ایسا کر دیتا ہے ، گویا دنیا کی ہر مخلوق انسان سے برتر ہے اور انسان سب سے فروتر ، ہر شئے انسان کی مالک و معبود ہے اور انسان سب کا حقیر و ذلیل بندہ ! مرنے اور گل سڑ جانے کے بعد بھی اس صورت حال میں فرق واقع نہیں ہوتا ، زندہ چلتا پھرتا اور عقل شعور رکھنے والا انسان عاجز و محتاج بندہ ہے اور مُردہ مخلوقات ، جس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا ، اس کی حاجت روا معبود ! کیا انسان کے لیے جو اشرف المخلوقات ہے ، اس سے پست تر کسی مقام کا آپ تصور کر سکتے ہیں ؟ بلاشبہ الحاد بھی انسان کو انسانیت کے مقام بلند سے گراتا اور اسے سلسلۂ حیوانات کی ارتقا یافتہ کڑی قرار دیتا ہے مگر اسے حیوانات سے فروتر تو نہیں سمجھتا مگر بُرا ہو شرک کا ! وہ انسان سے کہتا ہے کہ اپنے ہی جیسے انسانوں ہی کو نہیں ، حیوانات ، کیڑے مکوڑے ، سانپ بچھو ، درخت ، دریا ، پہاڑ ، پتھر زمین ، آگ ، پانی ، ہوا ، جنسی اعضاء غرض ہر چھوٹی بڑی چیز کو اپنا خدا سمجھ اور عبودیت و نیازمندی کے جذبے کے ساتھ اس کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ ۔ یہ ذلت کا وہ پست ترین اور غلیظ ترین مقام ہے جس سے زیادہ ذلت و پستی کا تصور نہیں کیا جا سکتا ۔ کوئی بھی انسان جو انسانیت کے مقام بلند کو پہچانتا اور عزت نفس رکھتا ہو ، بہ سلامتی ہوش و حواس اس پستی کو قبول نہیں کر سکتا ، نہیں ، نہیں ، اس پستی کو گوارا نہیں کر سکتا ! اس پستی کا تصور بھی

نہیں کر سکتا!

اس ذلّت وخواری کو قرآن مجید بہت مختصر لیکن بہت بلیغ اور جامع انداز میں اس طرح بیان کرتا ہے:

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِىْ بِهِ الرِّيْحُ فِىْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝ (حج ۳۱)

"اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو گویا وہ آسمان سے گرا تو اُچک لے جائیں اس کو پرندے یا ہوا کسی دور دراز مقام پر لے جا کر پھینک دے!"

قرآن مجید انسان کو اس کے مقامِ بلند سے آگاہ کرتا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل ۷۰)

"اور بلاشبہ ہم نے بنی آدم کو بزرگ بنایا، خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں، ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت بخشی۔"

وہ زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ (بقرہ ۳۰)

"اور یاد کرو اس بات کو کہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں (اپنا) خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

ایسی ایک مخلوق، خدا کے حضور تو سجدہ ریز ہو سکتی ہے اور اس کے حضور اسے سجدہ ریز ہونا ہی چاہیے۔ کیوں کہ وہ اس کا اور سارے جہان کا

خالق، مالک، پروردگار اور فرمانروا ہے۔ مگر اس کے علاوہ کسی اور کو معبود و مسجود بنانا اس کے لیے کسی طرح صحیح نہیں ہے کیوں کہ یہ حقیقت نفس الامری کے بھی خلاف ہے اور انسان کی انتہائی ذلت و خواری بھی!

قرآن مجید انسان سے پوچھتا ہے کہ اس کی ضرورتوں کی تکمیل اور عقیدت و نیاز مندی کے جذبات کی تسکین کے لیے کیا ایک خدا کافی نہیں ہے جو وہ بہت سے خدا بنانا چاہتا ہے:

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ (زمر، ۳۶)

"کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟"

وہ انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتا اور کہتا ہے کہ کون سی بات بہتر ہے یہ کہ انسان کا مالک و آقا ایک ہی ہو اور وہ قادرِ مطلق خدا ہو اور اسے اس ایک مالک ہی کی اطاعت و بندگی کرنی پڑے یا یہ بہتر ہے کہ اس کے بہت سے مالک و آقا ہوں اور وہ سب کے آگے ناک رگڑنے اور سب کی رضاجوئی میں لگا رہے؟

ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ

(یوسف، ۳۹) "کیا مختلف و متفرق بہت سے مالک و آقا بہتر ہیں یا اللہ جو واحد معبود ہے اور ہر چیز پر غلبہ رکھتا ہے"۔

اور مالک و آقا بھی ایسے جو فرضی اور خیالی ہوں؟

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ط (یوسف، ۴۰)

"اللہ کے سوا تم جن معبودوں کو پوجتے ہو وہ تو محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں، اللہ نے ان (کے معبود ہونے) کی کوئی سند نہیں اتاری ہے، حکم

تو سارے کا سارا اللہ کے لیے ہے"۔

عزتِ نفس رکھنے والا کوئی شخص اسے ہرگز گوارا نہیں کرسکتا کہ وہ خواہ مخواہ بہت سے فرضی مالک و آقا بنا لے اور ہر ایک کے چرنوں میں اپنی خودی قربان کرتا پھرے!

مشرکانہ نظام میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، وہ ادنیٰ سے ادنیٰ مادی فائدے کے لیے ختم کی جاسکتی ہے، وہ دیوی دیوتاؤں کے استھان پر بھینٹ چڑھائی جاسکتی ہے[1]۔ وہ مذہبی پیشواؤں کے قدموں میں نچھاور کی جاسکتی ہے۔ وہ سیاسی آقاؤں کے اشارۂ چشمِ ابرو پر قربان کی جاسکتی ہے یہی نہیں نجات حاصل کرنے کے لیے بھی جسم و جان کو گھلا گھلا کر انسانی زندگی کو ختم کیا جاسکتا ہے[2]۔ بہرحال انسانی زندگی ایک حقیر شے ہے، جہاں چاہے اسے پھینک دو اور جس طرح چاہے اسے ضائع کردو۔ انسانی جان ایک جانور کی جان سے بھی کم قیمتی ہے، اسے ضائع کرنا بس ایسا ہی ہے جیسے پرانے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لینا!

انسانیت کی تذلیل کا ایک اور پہلو، جو شرک کے ساتھ بُری طرح چپٹا ہوا ہے اونچ نیچ اور نسلی عزت و ذلت کا روگ ہے، یہ خرابی تقریباً تمام مشرکانہ تہذیبوں میں مشترک ہے۔ اس خرابی کی ایک شکل یہ ہے کہ مذہبی اور سیاسی پیشوا اپنے آپ کو عوام سے برتر ثابت کرنے کے لیے خود کو دیوتاؤں کی اولاد بلکہ دیوتا ظاہر کرتے ہیں۔ عراق کی مشرکانہ تہذیب ہو یا مصر کی، یونان کی ہو یا ہندوستان کی، یہ روگ سب ہی تہذیبوں میں موجود رہا ہے، یونان کے

---

[1] ہر مشرکانہ نظام میں بتوں اور دیوتاؤں پر انسانی قربانی دینے کا رواج رہا ہے۔

[2] یہ رواج بھی تقریباً ہر مشرکانہ نظام میں رہا ہے اور اسے روحانیت کا بلند ترین مقام تصور کیا جاتا ہے۔

عظیم فلسفی بھی یونانی فرمانرواؤں کو دیوتاؤں کی اولاد سمجھتے تھے ہندوستان میں برہمن سب سے اونچے مانے جاتے تھے۔ یہ دیوتاؤں کی اولاد بلکہ پرمیشور تھے اور سب سے نیچا مقام شودر کا تھا جو صرف خدمت کے لیے تھا۔ منوسمرتی[1] میں ہے:

"(برہماجی نے) دنیا کی ترقی کے واسطے منہ سے برہمن کو بانہہ سے کشتری کو جانگھ سے ویش کو اور پاؤں سے شودر کو پیدا کیا۔"

(ادھیائے ۱۔۳۱)

"ساکن و متحرک جانداروں میں کیڑا افضل ہے اور اس سے چوپایہ اور ان سے آدمی اور اس سے برہمن افضل ہے برہمن دھرم کی صورت ہے اور دھرم کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اس لیے مکتی پانے کے لائق ہوتا ہے، پرمیشور نے دھرم کے خزانے کی حفاظت کے واسطے برہمن کی صورت میں نزول فرمایا ہے۔ جو کچھ دنیا میں ہے وہ سب گویا برہمنوں کی نج کی چیز ہے کیونکہ برہماجی کے منہ سے پیدا اور سب سے افضل ہے اس لیے برہمن سب چیزوں کا مالک ہو سکتا ہے۔"

(ادھیائے ۱۔۹۶، ۹۸، ۱۰۰)

"شودر کے لیے پربھو نے ایک ہی کرم (عمل) ٹھہرایا یعنے صدق دل سے تینوں ورنوں کی خدمت کرنا۔"

(ادھیائے ۱، ۹۱)

---

[1] ہمارے سامنے منوسمرتی کا سنسکرت نسخہ ہے جس کے ساتھ لالہ سوامی دیال کا اردو ترجمہ بھی ہے، یہ نسخہ نول کشور پریس کانپور سے ۱۹۶۵ء کراچی میں شائع ہوا ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم متن نہیں دے رہے ہیں۔

"برہمن، کشتری، ویش، تینوں ورن اگر محبت کی وجہ سے نیچ ذات کی لڑکی کے ساتھ وواہ کریں تو اولاد اپنی کل کو جلد ناش کر دیتے ہیں۔" (ادھیائے ۳، ۱۵)

"شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بٹھانے سے برہمن نرک میں جاتا ہے اور اس سے لڑکا پیدا ہونے سے برہم کرم سے الگ ہو جاتا ہے۔" (ادھیائے ۳، ۱۷)

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے، ورنہ منوسمرتی میں اس طرح کے اشلوک بہت سے ہیں، اور یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ بھارت میں برہمنوں کا مقام بہت بلند رہا ہے اور شودروں کا بے حد پست اور مسلسل اصلاحی کوششوں اور چھوت چھات کے قانونی امتناع کے باوجود بہت بڑی حد تک یہ ذہنیت آج بھی موجود ہے اور اوپر سے نیچے تک موجود ہے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ منوسمرتی کا مذہبی مقام فی الواقع کیا ہے، ہاں اتنا ضرور جانتے ہیں کہ سوامی دیانند جی جیسے آدمی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا[1] ہے۔ حالانکہ انھوں نے ہندوؤں کی بہت سی مذہبی کتابوں کا، جن کی فہرست طویل ہے، انکار کیا ہے اور انھیں جھوٹا اور قابلِ ترک بتایا[2] ہے، البتہ انھوں نے یہ ضرور کہا ہے کہ منوسمرتی میں باہر سے کچھ اشلوک ڈال دیئے گئے[3] ہیں، اب

---

[1] چاروں ورنوں اور ان کے کرموں کو ماننے کے باوجود سوامی دیانند جی یہ تاویل کرتے ہیں کہ وہ برہمن وہ ہے جو اعلیٰ کام کرے اور شودر وہ جو خراب کام کرے اور یہ کہ برہمن برے کام کرنے سے شودر ہو سکتا ہے اور شودر اعلیٰ کام کرنے سے برہمن، مگر منوسمرتی کے اشلوک ان تاویلوں کا ساتھ نہیں دیتے اور نہ ورن سسٹم ہی سے ان کا جوڑ ہے۔

[2] مثلاً تمام پران، تلسی داس جی کی رامائن، منوسمرتی کے علاوہ تمام سمرتیاں (ستیارتھ پرکاش باب ۳ صفحہ ۹۵) [3] حوالہ مذکور۔

یا تو صاف صاف یہ اعلان کیا جائے کہ منوسمرتی مذہبی کتاب نہیں ہے اور عوام و خواص کے دل و دماغ میں اس حقیقت کو راسخ کیا جائے یا یہ کہا جائے کہ اس طرح کے تمام اشلوک جن سے اونچ نیچ اور چھوت چھات کے امتیازات کا اظہار ہوتا ہے، جعلی و الحاقی ہیں اور انھیں منوسمرتی سے ہمیشہ کے لیے خارج کر دیا جائے[1]، ورنہ ملک سے اونچ نیچ اور چھوت چھات کا خاتمہ نہ ہوگا اور یہ بہت بڑی ٹریجڈی ہوگی۔

ہمیں یقین ہے کہ جب آریہ تہذیب عروج پر ہوگی اور آریہ توحید کے تقاضے پورے کر رہے ہوں گے اس وقت ان میں ذات پات اور چھوت چھات کا نام و نشان نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ سہولت کار کے لیے انھوں نے تین چار طبقات بنا لیے ہوں اور تقسیم کار کے اصول پر ان کے لیے علیحدہ علیحدہ کام متعین کر دیے ہوں مگر اس تقسیم میں اونچ نیچ اور عزت و ذلت کا کوئی تصور موجود نہ ہوگا ــــــ توحید کے ساتھ اس طرح کی باتیں جوڑ نہیں کھاتیں اور اس طرح کی خرابیوں کے ساتھ کوئی قوم گر تو سکتی ہے مگر ابھر نہیں سکتی۔ لیکن جب پڑوسی قوموں کے اثر سے ان میں شرک و بت پرستی کا رواج بڑھا تو یہی طبقات جو تقسیم کار کے لیے بنائے گئے تھے عزت و ذلت کا نشان بن گئے، مذہبی و سیاسی پیشواؤں نے عزت و برتری کو اپنے لیے خاص کر لیا اور قوم کے سب سے نچلے طبقہ کو، جو کمزور، غریب اور ان پڑھ تھا، اپنی خدمت اور چاکری کے لیے مخصوص کر لیا اور ذلت و رذالت اس کی قسمت میں لکھ دی گئی، یہ چیز مذہبی، اخلاقی، سیاسی ہر لحاظ سے صد درجہ غلط تھی اور اس نے آریوں

---

[1] ہریجنوں کی چیخ پکار اور صوبائی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں شدید احتجاج کے باوجود اب تک کچھ نہ ہو سکا ہے، اس کے برعکس منوسمرتی بعض ریاستوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہے اور اس سے ہریجن اور بھی چیخ پڑے ہیں۔

کے انتشار اور ان کے زوال کے تاریخی عمل کو تیز تر کر دیا، یہاں تک کہ دب ایسے گئے کہ پھر ابھر نہ سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ اونچ نیچ اور چھوت چھات بھارت کے دورِ عروج کی نہیں، دورِ زوال کی یادگار ہے اور بھارت کے لوگ اس منحوس یادگار سے جس قدر جلد چھٹکارا پالیں اتنا ہی بہتر ہے ورنہ یہ لعنت پورے ملک کو لے ڈوبے گی۔[1]

اونچ نیچ کے غیر انسانی تصور کا یہ تو داخلی پہلو ہے جو قوموں کے اندرونی طبقات سے متعلق تھا، اس کا ایک خارجی پہلو بھی ہے جس کا تعلق دوسری قوموں سے ہے۔ تقریباً تمام قوموں میں یہ بات مشترک رہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسری قوموں سے برتر اور دیوتاؤں کی اولاد سمجھتی رہی ہیں اور دوسری قوموں کو انسانیت سے خارج، وحشی اور ملیچھ اور نہ جانے کیا کیا خیال کرتی رہی ہیں۔ قوموں کے اپنے طبقات کے مابین اونچ نیچ کا تصور ہر جگہ شدید نہیں رہا ہے مگر اپنی برتری اور دوسری قوموں کی ذلت و پستی کا تصور ہر مشترک قوم میں شدت سے رہا ہے یونان کے بڑے بڑے فلسفی بھی انسانیت کو یونانیوں کی مخصوص متاع سمجھتے تھے، غیر یونانی ان کے نزدیک جانور تھے اور غلام بنائے جانے کے قابل۔ رومیوں کے نزدیک غیر رومی غلاموں کا بہترین مصرف یہ تھا کہ انھیں اذیت ناک سزائیں دے کر شیروں اور چیتوں سے لڑوا کر اور پھڑوا کر تفریح حاصل کی جائے مصر میں بنی اسرائیل نیچ شمار ہوتے اور مصریوں کی خدمت کرنے اور ان روزانہ کی سزائیں جھیلنے کے لیے جیتے تھے اور بعض دفعہ تو ان کا قتل عام ہونے لگتا، عرب کے مشرکین اپنے کو دنیا کی سب سے زیادہ شریف قوم اور دوسری قوموں

---

[1] اسلام سے بڑھ کر اونچ نیچ کا دشمن اور مساوات کا پیامبر کوئی مذہب نہیں، اس لیے یہ مسلمانوں کی عظیم ذمہ داری ہے کہ وہ اس لعنت کو دور کرنے کے لیے آگے بڑھیں اور وہی اس خدمت کو بہ احسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں۔

کو صد درجہ ذلیل اور پست خیال کرتے تھے، ہندوستان کی قدیم اقوام بھی اس لعنت کا نشانہ بنیں، انھیں ملیچھ، چنڈال اور راکشش کے خطاب ملے، جنگلوں میں پناہ لینے اور جنگلی زندگی گزارنے پر انھیں مجبور کیا گیا اور ان کے ساتھ انسانیت سوز رویہ اختیار کیا گیا کہ ہزاروں سال گزرنے کے بعد اس کی تلخ یادیں آج بھی باقی ہیں[1]۔ یورپ کے مسیحیوں نے صدیوں سال تک ایشیا اور افریقہ کی قوموں کو اپنے سے فروتر اور جنگلی و وحشی خیال کیا، ان کے انسانی حقوق پر ڈاکہ ڈالا، ان پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے اور ان "وحشی" قوموں کو مہذب بنانے کے نام پر وحشت و بربریت کا وہ ننگا ناچ ناچے کہ انسانی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے اور آج بھی امریکہ اور افریقہ میں گوروں کی نسلی برتری کا زعم، کالوں کو ذلیل اور وحشی سمجھنے کا تصور اور بہیمیت و بربریت کا ننگا ناچ جاری ہے اور تو اور یہود، جو توحید کے داعی اور دینِ توحید کے حامل تھے، جب مشرکانہ توہمات و اعمال میں مبتلا ہوئے تو دوسری خرابیوں کے ساتھ ان میں بھی نسلی برتری کا زعم پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کی تمام قوموں سے برتر خیال کرنے لگے، ان کا یقین تھا کہ وہ اللہ کے چہیتے اور اس کی خاص قوم ہیں اور یہ زعم باطل آج بھی ان میں موجود ہے۔

توحید کے نقطۂ نظر سے سارے انسان ایک ہی خدا کے پیدا کردہ، ایک ہی خدا کے بندے اور ایک ہی جوڑے (آدم و حوّا) کی اولاد ہیں، خدا کا کسی نسل، کسی برادری، کسی رنگ اور کسی پیشہ کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہیں، اس کی نظر میں سب انسان برابر ہیں، وہ نیک و بد اور خدا ترس و ناخدا ترس میں ضرور فرق کرتا ہے ـــــ اور یہی ایک معقول فرق و امتیاز ہے جو انسانوں

---

[1] دراوڑ کا زگھم اور دولت پسنتھر جیسی تنظیمیں انھی تلخ یادوں کا تلخ ثمرہ ہیں مگر ہندوستان کے فرقہ پرست اب بھی سبق حاصل نہیں کر رہے ہیں۔

سے کے مابین کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس فرق و امتیاز کے باوجود سب انسان، انسانی حقوق کے یکساں حقدار ہیں، قرآن میں ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (حجرات،۱۳)

"اے انسانو! بیشک ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت (ایک ہی جوڑے) سے پیدا کیا اور تمھیں خاندانوں اور قبیلوں کی شکل دی۔ صرف اس لیے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، یقیناً تم میں زیادہ بزرگ وہ ہے جو زیادہ خدا ترس ہے۔"

اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَّلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ كُلُّكُمْ اَبْنَاءُ اٰدَمَ ــــــــــ (بخاری و مسلم)

"کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فوقیت نہیں (اے انسانو!) تم سب آدم کی اولاد ہو۔"

اِسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَلَوِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ كَاَنَّ رَاْسَهٗ زَبِيْبَةٌ (بخاری)

"(اے شرفائے عرب!) اپنے امیر کی بات سنو اور اطاعت کرو خواہ تم پر ایک حبشی غلام حاکم بنا دیا جائے جس کا سر کشمش جیسا ہو۔[1]"

---

[1] جس دین نے اتنے صریح الفاظ میں اونچ نیچ کی نفی کی تھی اور جس کے حقیقی پیروؤں نے اس کا مثالی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، افسوس کہ بھارت میں اس کے نام لیوا دوسروں کی دیکھا دیکھی کسی نہ کسی درجہ میں اس مرض کا شکار ہو گئے اور نتیجہ ــــ سے دینِ توحید سے ان کی دوری اور مشرکانہ توہمات و اعمال میں پھنسنے کا۔

بے کرداری

کردار کا بنیادی سرچشمہ ایک ہی ہے اور وہ ہے خدا سے تعلق اور یہ بات گزشتہ باب میں بخوبی واضح ہو چکی ہے کہ شرک خدا سے انسان کا تعلق مضبوط نہیں کمزور کرتا ہے بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں انسان کو خالق خدا سے کاٹ کر مخلوق خداؤں سے جوڑ دیتا ہے، خدا سے تعلق کردار کا واحد سرچشمہ ہے اور جب یہ سرچشمہ ہی سوکھ جائے تو کردار کہاں سے پیدا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ شرک کردار کی تعمیر نہیں کرتا، بے کرداری پیدا کرتا ہے۔

اس بنیادی پہلو سے قطعِ نظر چند پہلو اور ہیں اور ہم یہاں ان پر مختصراً روشنی ڈالیں گے۔

ایک پہلو یہ ہے کہ شرک اختیار کر کے انسان عزتِ نفس کھو بیٹھتا ہے، جس شخص کا سر اپنے جیسی یا اپنے سے کم تر مخلوق کے آگے جھکتا ہو اس میں عزتِ نفس کیونکر باقی رہ سکتی ہے اور عزتِ نفس ہی وہ چیز ہے جو سیرت و کردار کی بنیاد ہے، موحد خدا کے آگے اپنا سر جھکاتا ہے ــــ اور خدا اس کا مستحق ہے کہ اس کے آگے سر جھکایا جائے، اور پھر کسی اور کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیتا ہے۔ یہ عزتِ نفس، جو توحید سے پیدا ہوتی ہے، شرک اور الحاد کے پیرو اس سے قطعاً محروم ہیں ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات (اقبالؒ)

جو سر جانوروں اور پتھروں کے آگے جُھک سکتا ہو وہ لالچ، خوف، خوشامد یا کسی بھی جذبے سے کسی انسان کے آگے کیوں نہیں جھک سکتا اور اس "جھکاؤ" کے ساتھ کردار کی توقع فضول ہے، کردار کس چیز کا نام ہے؟ اس کی تشریح شیخ سعدیؒ کے اس قطعہ سے ہوتی ہے ؎

موحد کہ در پائے ریزی زرش   وگر تیغ ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نہ باشد زکس   ہمیں است مبنیٔ توحید و بس

ایک پہلو یہ ہے کہ خوف کے جذبے کے تحت انسان بہت سی برائیوں سے باز رہتا ہے، سماج کا خوف کچھ برائیوں سے بچاتا ہے حکومت کی سزا کا خوف بعض برائیوں کے کرنے میں مانع بن جاتا ہے، لیکن سب سے زیادہ موثر اور ہمہ گیر خوفِ خدا کا خوف ہے، ایک ایسے خدا کا خوف، جس کی طاقت بے پناہ ہے، جس کی گرفت سے انسان نکل نہیں سکتا، جس کی نظر سے جرائم چھپ نہیں سکتے، جو دل و دماغ میں پیدا ہونے والے ناپاک ارادوں کو انسان سے پہلے جانتا ہے۔ جس کی عدالت میں سب کو حاضر ہونا ہے، جس کا انصاف بے لاگ ہے، جس کے یہاں رشوت، زور، دھاندلی اور سفارش جیسی چیزیں نہیں چلتیں۔ جس کی سزا ہولناک اور قطعاً ناقابلِ برداشت ہے اور جس کی جزا بے پایاں اور ناقابلِ تصور ہے! تاریخ شاہد ہے کہ اس عقیدے اور خدا کے اس خوف نے بگڑی سے بگڑی قوم کو اعلیٰ سے اعلیٰ سیرت و کردار بخشا ہے اور نازک سے نازک مواقع پر انسان کو پھسلنے سے بچایا ہے۔

شرک خوفِ الٰہی کے اس جذبے کو سرد کر دیتا ہے۔ مشرک کو یقین ہوتا ہے کہ جن بزرگوں اور جن دیوتاؤں سے وہ عقیدت رکھتا ہے اور جن پر وہ نذر و نیاز چڑھاتا ہے وہ خدا کی گرفت سے اسے بچالیں گے، جب دوسرے انسان مجرموں کے کٹہرے میں خدا کے حضور کھڑے جوابدہی کر رہے ہوں گے، وہ گناہوں میں لت پت ہونے کے باوجود اپنے معبودوں کے سایۂ عاطفت میں ہوگا اور بالکل محفوظ ہوگا، یہ معبود، یہ مشکل کشا، یہ حاجت روا اور بزرگ دنیا و آخرت دونوں میں اپنے عقیدت مندوں کو خدا کے عذاب سے بچانے کی طاقت رکھتے ہیں اور ضرور بچا لیتے ہیں۔

آپ ہی بتائیں کہ اس کے بعد خدا کا خوف کیسے باقی رہ سکتا ہے اور خدا کا خوف اُٹھ جانے کے بعد کون سی طاقت انسان کو برائیوں سے بچا سکتی ہے شرک کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان گناہوں میں جری ہو جاتا ہے اور بدکرداری کو اپنا شیوہ بنا لیتا ہے[1]۔

بے کرداری کی ایک اور وجہ مخلوق خداؤں کی بے کرداری بلکہ بدکرداری ہے۔ مشرکانہ نظام میں مخلوق خداؤں کا کردار اتنا گھٹیا، اتنا گندہ اور برائیوں سے اتنا لبریز ہوتا ہے کہ بُرے سے بُرے اور گندے سے گندے آدمی کا نہیں ہوتا۔ مخلوق خداؤں کی مقدس داستان ہائے حیات فحش اور گندے سے گندے کوک شاستر سے زیادہ گندی ہوتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، اس سے یہاں بحث نہیں، لیکن حقیقتِ واقعہ یہی ہے، لیکن یہی چیز اور قوموں کو بدکرداری کے عمیق گڑھے میں گرا دیتی ہے۔

خدا کے بارے میں انسان کا تصور یہ ہے کہ وہ انسان سے اعلیٰ کوئی آئیڈیل شئے ہے، جب یہی آئیڈیل شئے برائیوں میں لت پت ہو تو انسان برائیوں سے لت پت کیوں نہ ہو؟ وہ آئیڈیل کی تقلید کیوں نہ کرے؟ یہی بات ہے جسے افلاطون نے اپنی معرکۃ آرا تصنیف "ریاست" میں بڑے شد و مد سے بار بار دہرایا ہے۔ صرف دو تین اقتباس ملاحظہ ہوں:

"اگر نوجوان لوگ دیوتاؤں کے متعلق اس طرح کی روایتیں سنیں گے تو بجائے اس کے کہ ان کی حماقت پر ہنسیں، ان پر بالکل دوسرا اثر مرتب ہوگا۔ وہ سمجھیں گے کہ جب دیوتاؤں کا یہ حال ہے

---

[1] مسلمانوں میں بدکرداری کے عام ہونے کی بڑی وجہ یہی غیر اسلامی اور غیر موحدانہ تصور ہے کہ فلاں اور فلاں بزرگ، خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو باب سابق۔

تو پھر انسان کے لیے یہ حرکات کیسے باعث ذلت ہو سکتی ہیں؟" (صفحہ ۱۴۳)

"اس کے علاوہ سننے والوں پر ان قصوں کا کتنا برا اثر پڑے گا! کیونکہ ہر شخص افعالِ شنیعہ کا ارتکاب کے بعد یہ عذر پیش کر سکتا ہے کہ اس قسم کے افعال تو دیوتاؤں کی اولاد اور زیؔس کے اعزہ تک سے سرزد ہوئے ہیں۔" (صفحہ ۱۴۴)

"تو پھر اس قسم کے تمام قصوں کو ہم اپنی ریاست میں ممنوع قرار دیں گے کیوں کہ کمسن اور جوان آدمیوں کے دل میں ہرگز یہ خیال پیدا نہ ہونا چاہیے کہ سخت سے سخت جرم کے ارتکاب میں بھی کچھ زیادہ برائی نہیں ہے اور وہ اپنے باپ تک کو اذیت پہنچانے میں صرف ایک عظیم ترین دیوتا کے طرزِ عمل کی اتباع کرتے ہیں۔" (صفحہ ۱۴۴)

اس کے برعکس توحید کا تصور یہ ہے کہ خدا ہر نقص اور برائی سے پاک اور جمیع صفاتِ کمال سے متصف اور ان کا سرچشمہ ہے اور موحدین اسی آئیڈیل (مثالی ہستی) کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور یہ چیز تعمیرِ کردار میں ان کے لیے معاون ثابت ہوتی ہے۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ شرک کی بنیاد "حق و صداقت" پر نہیں ہے، کسی مخلوق میں خدائی صفات نہیں ہوتیں اور نہیں ہو سکتیں، وہ محیر العقول داستانیں بھی صحیح نہیں ہیں جو مخلوق خداؤں کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، نہ ان فحش قصوں میں کوئی صداقت ہے، جو "مخلوق خداؤں" کی زندگیوں کا جزوِ لازم بن گئے ہیں، ان میں سے کوئی چیز نہ عقل سے ثابت ہے نہ تاریخ کی مستند روایات

ﻪ یونان کا سب سے بڑا دیوتا، جس سے بہت ہی گندے قصے منسوب ہیں۔

ہے، یہ سب من گھڑت افسانے ہیں جو عوام کو فریب دینے کے لیے کچھ لوگ گھڑتے ہیں اور کچھ لوگ اپنی سادہ لوحی سے اُن پر یقین کر لیتے ہیں۔ یہ ساری روایات خود ہی پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ان میں صداقت نام کو نہیں ہے، یونان کا سب سے بلند پایہ فلسفی افلاطون یونانی میتھالوجی کی داستانوں کو بیان کر کے بار بار اسی رائے کا اظہار کرتا ہے، ایک جگہ وہ صاف صاف کہتا ہے:

"یہ تمام کی تمام روایتیں سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔"

(ریاست صفحہ ۱۱۴)

سوامی دیانند جی ہندوستان میں پھیلے ہوئے مشرکانہ خیالات اور قصوں کے بارے میں کہتے ہیں:

"جھوٹے اقوال والی کتابیں رشی منیوں کے نام سے تصنیف کیں اور انھیں کے نام سے سناتے رہے ہے۔"[1]

(ستیارتھ پرکاش، باب ۱۱ صفحہ ۲۹۵)

قرآن مجید شرک کو کذب وافترا قرار دیتا ہے اور کذب وافترا بھی اللہ پر اور وہ بھی لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے۔ شرک پر قرآن مجید کی بنیادی تنقید یہی ہے وہ بار بار کہتا ہے کہ یہ ساری باتیں من گھڑت ہیں، خدا نے اپنی الوہیت میں کسی مخلوق کو شریک نہیں کیا، نہ تمھارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے، پھر تم خدا پر کیوں جھوٹ باندھتے ہو؟

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ

---

[1] اس مختصر جملے کی تشریح کے لیے ستیارتھ پرکاش کے باب ۱۱، ۱۲ ملاحظہ ہوں جو تقریباً پونے تین سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں ان صفحات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرک میں کس قدر جھوٹ ہے۔

بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ (انعام، ۱۴۴)

تو اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر (عمداً) جھوٹ باندھے تاکہ علم نہ رکھنے کے باوجود لوگوں کو (صحیح راہ سے) بھٹکا ئے!

مذہب تعمیر کردار کا موثر ترین، بلکہ اب تک کے تجربے کی رُو سے ایک ہی کامیاب ذریعہ ہے اور مذہبی پیشوا اس اہم کام کے ذمہ دار مذہبی تعلیمات کے علاوہ خود مذہبی پیشواؤں کا اعلیٰ کردار تعمیرِ سیرت میں بڑا معاون ثابت ہوتا ہے لیکن مذہبی پیشوا ہی جھوٹ تصنیف کرنے لگیں اور مذہب کی بنیاد جھوٹ اور مکر و فریب پر رکھیں تو کردار کہاں سے اور کیسے جنم لے گا! کردار حق و صداقت کو خلوصِ دل اور ظاہر و باطن کی یکسانی کے ساتھ اپنانے سے پیدا ہوتا ہے اور جھوٹ اور مکر و فریب کو اپنانے سے اپنی موت آپ مر جاتا ہے چہ جائیکہ جھوٹ کو بنیاد بنا کر اس پر ریاکاری کی طلسماتی عمارت کھڑی کی جائے۔ اگر مذہبی پیشوا ایسے کردار، ریاکار اور دروغ گو ہوں گے تو پوری قوم اسی شاہراہِ ہلاکت پر سرپٹ دوڑتی چلی جائے گی، دین بھی تصنیف ہو گا، تاریخ بھی گھڑی جائے گی، انفرادی و اجتماعی بداخلاقیوں کا بھی زور ہو گا، اور سیاست میں بھی دروغ گوئی، مکر و فریب اور عہد شکنی کا دور دورہ ہو گا، غرض جھوٹ، مکر و فریب اور بدکرداری کا طوفانِ عظیم امنڈ آئے گا اور پھر دو باتوں میں سے ایک بات ہو کر رہے گی یا تو لوگ اس متعفن زندگی سے گھبرا اٹھیں گے اور مذہب سے بیزار ہو کر الحاد کی راہ لیں گے۔ جیسا کہ مشرق و مغرب میں بہت سے لوگوں نے کیا ہے یا پوری قوم اپنی بربادیوں سمیت ہلاکت و بربادی کے عمیق گڑھے میں جا گرے گی!

آج کے تعلیم یافتہ اور سمجھ دار افراد مذہب سے روز بروز زیادہ سے زیادہ متنفر ہوتے چلے جا رہے ہیں، صرف اس لیے کہ وہ مذہب کو جھوٹ کی پوٹ اور اہلِ مذاہب کو بے کرداری و بدکرداری کا مجسمہ تصور کرتے ہیں

کاش اہلِ مذاہب کو عقل آتی، وہ جھوٹ کے ہر شائبہ اور بدکرداری کے ہر داغ دھبے سے اپنے دامن کو پاک کر لیتے اور پھر دیکھتے کہ دنیا کس تیزی سے مذہب کی طرف کھنچتی ہے!

کائنات کی سب سے بڑی صداقت یہ ہے کہ خدا کائنات کا خالق، پروردگار اور فرمانروا ہے، فرمانروائی و الوہیت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور وہی پرستش و بندگی کا مستحق ہے، جو لوگ صدقِ دل سے اس سچائی کو قبول کر لیتے ہیں ان کی پوری زندگی سچائی اور کردار کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے، وہ ظاہر و باطن سے اس خدا کے بندے بن جاتے ہیں جو ظاہر و باطن دونوں کو دیکھ رہا ہے اور جو صداقت، حسنِ عمل اور کردار کو محبوب رکھتا ہے اور بدکرداری، مکروفریب اور ریاکاری پر بدترین سزا دیتا ہے:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۝ (النساء ۱۲۳، ۱۲۴)

"(اے مسلمانو!) نہ تمہاری جھوٹی خوش فہمیوں سے کچھ ہوتا ہے اور نہ اہلِ کتاب کی خوش فہمیوں سے، جو برا کام کرے گا وہ اس کی سزا بھگتے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے سوا عذاب سے کوئی بچانے والا نہ پائے گا، اور جو لوگ نیک کام کریں گے۔ مرد ہوں یا عورتیں۔ بشرطیکہ وہ مومن ہوں تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہ ہوگا۔"

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ (بقرہ ۱۰)

"اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے کیونکہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔"

خوف و یاس اور احساس کمتری

الحاد کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کائنات کا کوئی خالق و منتظم نہیں، نہ کسی باشعور ہستی کا ارادہ واقعات و حوادث کے پیچھے کام کر رہا ہے، یہاں صرف اندھی بہری مادی طاقتیں ہیں اور قوانینِ فطرت کا جبری نظام ہے جو حالات زمانہ پر حکمرانی کر رہا ہے۔

شرک کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بے شمار مادی و غیر مادی خیالی و وہمی طاقتیں ہیں جو کائنات اور انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی اور اس کی قسمت و زندگی کے بنانے اور بگاڑنے میں فیصلہ کن پارٹ ادا کرتی ہیں۔

توحید کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ خدا کائنات کا خالق و منتظم ہے، اسی کا ارادہ کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے، زندگی اور موت، نفع اور نقصان، عزت اور ذلت، خوش قسمتی اور بد قسمتی، سب کچھ خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے، اس کے سوا کسی کے پاس کوئی طاقت نہیں، کوئی نفع و نقصان پہنچانے کا یارا نہیں رکھتا، جو کچھ ہے خدا کے ہاتھ میں ہے اور کسی کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے

یہ ہیں تین مختلف و متضاد نقطہ ہائے نظر اور یہ انسانی قلب و دماغ پر مختلف و متضاد اثرات ڈالتے ہیں۔

ملحد وہمی و خیالی چیزوں سے نہیں ڈرتا، وہ ٹھوس مادی حقائق کو اہمیت دیتا ہے، وہ مادی طاقت کے آگے جھکتا اور اسی سے خوف کھاتا ہے وہ مادی تدابیر اور مادی ذرائع و وسائل پر اعتماد کرتا ہے اور جہاں یہ ذرائع و وسائل اور یہ تدابیر اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، اس کے خوف و یاس کی کوئی حد نہیں رہتی۔

مشرک مادی طاقتوں سے تو ڈرتا ہی ہے، اس کے لیے ہر جانور، ہر درخت، ہر کیڑا اور ہر پتھر خدا ہے اور ہر خدا کے ہاتھ میں اس کی قسمت،

اس کی زندگی اور اس کا نفع اور نقصان ہے۔ ایسا انسان اگر وہم پرستی، بزدلی اور خوف وہراس کا مجسمہ نہ ہو تو اور کیا ہوگا، قرآن مجید اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ (آل عمران ۱۵۱)

"ہم اہلِ کفر کے دلوں میں خوف وہراس ڈال دیں گے کیونکہ انھوں نے اللہ کے ساتھ کچھ ہستیوں کو شریک ٹھہرایا حالانکہ اللہ نے ان کے (شریک ہونے) کی کوئی سند نہیں اتاری۔"

موحد صرف خدا سے ڈرتا ہے، وہ نہ وہم پرست ہوتا ہے، نہ ڈرپوک اور بزدل، وہمی وخیالی چیزوں سے ڈرنا تو درکنار، وہ بڑی سے بڑی مادی طاقت سے بھی نہیں ڈرتا، اسے یقین ہوتا ہے کہ سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے اور کسی کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے، وہ موت سے بھی خوف نہیں کھاتا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ موت بھی خدا ہی کے ہاتھ میں ہے، پھر موت اس کے نزدیک ایک دروازہ ہے جس سے گزر کر وہ اس محبوبِ حقیقی سے جا ملتا ہے جس کی بندگی ورضا جوئی میں وہ لگا ہوا ہے اور جو اسے اس کی وفاداری اور حسنِ عمل کے صلہ میں ابدی زندگی، جنت کی لازوال اور بے پایاں نعمتوں اور اپنی رضا، اپنے قرب اور اپنے دیدار سے سرفراز فرمائے گا، اس یقین کے باعث وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ ہی نہیں کرتا بلکہ ذوق وشوق کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتا ہے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست (اقبالؒ)

موحد ~~سارے~~ اسباب ~~پر تکیہ~~ کر لیتا ہے اور مادی ذرائع و وسائل اختیار کرنے میں ذرہ برابر بھی غفلت نہیں کرتا لیکن یہ اس کے خدا کا حکم ہے، لیکن اس کا اصل

بھروسہ اس خدا پر ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں ساری کائنات کی زمام ہے اور جو تمام قوتوں سے بڑھ کر صاحبِ قوت بلکہ تمام قوتوں کا سرچشمہ ہے:

اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (بقرہ، ۱۶۵) "قوت ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے۔"

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ (آل عمران، ۱۶۰)

"اور اللہ ہی پر اہلِ ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے۔"

وہ مادی ذرائع و وسائل سے محروم ہونے کے باوجود نہ مایوس ہوتا ہے اور نہ بڑی سے بڑی مادی طاقت سے خائف، وہ اللہ کی رضا جوئی کی راہ اختیار کرتا ہے اور اس یقین سے سرشار ہوتا ہے کہ خدا اس کے ساتھ ہے، وہ اس کی مشکلات کو خود ہی آسان فرمائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ○ (النحل ۱۲۸)

"یقیناً اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو خدا ترس اور نیکوکار ہیں۔"

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ○ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ○

(طلاق ۲، ۳)

"اور جو خدا ترسی کی روش اختیار کرے گا اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کی راہ پیدا فرمائے گا اور اسے ان طریقوں سے رزق دے گا جن کا اسے گمان نہ ہو گا اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے گا تو اللہ اس کے لیے کافی ہے۔ یقیناً اللہ اپنے فیصلے کو نافذ کر کے رہتا ہے، البتہ اس نے ہر چیز کے لیے اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔"

ایسے شخص کی امید و بے خوفی اور ایسے شخص کی قوت و عظمت کا کیا

ٹھکانہ ہے، مشرک اللہ سے اس طرح کا تعلق نہیں رکھتا اس لیے وہ بہت جلد مایوس ہو جاتا ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز سے ڈرتا اور کانپتا ہے۔ امید اور بے خوفی وہ عظیم نعمتیں ہیں جو توحید کو اپنانے کے نتیجہ میں انسان کو آپ سے آپ حاصل ہوتی ہیں اور مایوسی اور خوف وہراس وہ مہلک روگ ہیں جو شرک میں مبتلا ہونے کے نتیجہ میں آدمی کو لاحق ہوتے ہیں۔

شرک اپنے ماننے والوں کو ایک اور ہولناک تحفہ دیتا ہے اور وہ احساسِ کمتری (Inferiority complex) ہے یہ معلوم ہے کہ شرک کے پیچھے کوئی استدلال نہیں ہوتا۔ جو شخص استدلال کے بغیر کسی روش پر مصر ہو وہ لازماً احساسِ کمتری کا شکار ہوتا ہے۔ یہ احساسِ کمتری اس کے اندر کئی خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ اس سے جھوٹا احساسِ برتری ———— (Superiority complex) جنم لیتا ہے، وہ ڈینگیں مارنے دوسروں کو حقیر و ذلیل سمجھنے اور اپنے کو برتر ثابت کرنے کے چکر میں پھنس جاتا ہے، وہ خیال کرتا ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں کوئی خوبی اور کوئی علمی یا عملی برتری موجود ہے وہ اس کی تہذیب، اس کے مذہب اور اس کے اسلاف کے علمی کارناموں کا ثمرہ ہے اور اس زعمِ باطل کو صحیح ثابت کرنے کے لیے نہایت مضحکہ خیز حرکتیں کرتا ہے، وہ تاریخ سازی کرتا ہے، وہ دوسری قوموں کی تمام خوبیاں اپنے اندر اور اپنی ساری خرابیاں دوسروں میں ثابت کرنے کی پیہم کوشش میں لگا رہتا ہے، وہ دوسری قوموں کے ماضی کو بھیانک اور شرمناک روپ میں پیش کرتا اور اپنی تاریخ کو حسن وجمال کا پیکر بخشتا ہے اور ان دونوں مقاصد کے لیے بے دریغ جھوٹ کے طومار باندھتا ہے، لیکن یہ سب کچھ کرنے کے باوجود اس کا احساس کمتری اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ وہ اپنی استدلالی کمزوری کو محسوس کرتا ہے چنانچہ طاقت واقتدار پاتے ہی وہ اس کمزوری کو طاقت کے سہارے

دور کرنے کی جدوجہد میں لگ جاتا ہے، وہ موقع پاتے ہی ظلم و تشدد کی راہ اختیار کرتا ہے، ادھر بے جا خوف اس کے سامنے نئے نئے دشمن لا کھڑا کرتا ہے، وہ طاقتور ہوتے ہوئے بھی ڈرتا اور احساس کمتری میں مبتلا ہوتا ہے۔ نتیجۃً وہ ظلم و بربریت کے ایسے بدترین مقام پر پہنچ جاتا ہے جس سے پست تر کوئی مقام نہیں ہوتا، وہ علی الاعلان ایسے وحشیانہ و بہیمانہ اعمال کرتا ہے جن سے وحشیوں اور درندوں کو بھی شرم آ جائے۔ یہ ظلم و تشدد اجنبیوں تک بھی محدود نہیں رہتا۔ جب کسی انسان کے منہ کو انسانی خون لگ جاتا ہے وہ بھی خوف و ہراس اور احساس کمتری کے احساسات کے تحت تو وہ غیروں سے گزر کر بہت جلد اپنوں کو بھنبھوڑنے لگتا ہے، یہی نہیں، وہ اپنی اور اپنی قوم کی صلاحیتوں کو شرک و کفر، بدکاری و مکر و فریب اور ظلم و تشدد میں لگا کر اپنی قوم پر اور خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے، انہی تمام وجوہ سے قرآن شرک کو ظلمِ عظیم قرار دیتا ہے:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ ——— (لقمان، ۱۳)

"شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔"

انتشارِ فکر و عمل

توحید صرف ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے، وہ انسانی سماج اور پوری نوعِ انسانی کو وحدتِ فکر و عمل بخشنے اور اسے متحد کرنے کا واحد ذریعہ بھی ہے۔ توحید کو اپنانے کے بعد سماج کی محبت و عقیدت کا مرکز خدا بن جاتا ہے اور یہ محبت اس مرکز سے وابستہ تمام انسانوں کو ایک مضبوط رشتہ میں پرو دیتی ہے، وہ ایک خدا کے بندے، خدا کے ایک ہی دین کے پیرو، ایک ہی قانون کے متبع اور ایک ہی منزل کی طرف سرگرمِ سفر ہو جاتے ہیں فطری اختلافات کے باوجود، ہر دو انسانوں میں فطرتاً اور طبعاً ہوتے ہیں، ان کے

مابین کلمۂ جامعہ ہوتا ہے، ان کی فکری بنیادیں یکساں ہوتی ہیں، وہ متفقہ اخلاقی اقدار کو ماننے والے ہوتے ہیں جو انہیں ان کے خدا سے حاصل ہوتے ہیں اور خدا کا دین ان کی زندگی کو انتشار سے بچا کر تنظیم کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ پھر یہی دین مختلف افراد، اصناف، طبقات اور اقوام کو ایک عالمگیر انسانی برادری میں تبدیل کر دیتا ہے جس کا ہر فرد دوسرے کا بھائی ہوتا ہے اور جسے کالے گورے مشرقی، مغربی، عجمی، عربی، امیر، غریب اور مزدور و سرمایہ دار کے اختلافات منتشر نہیں کرتے بلکہ وحدتِ کلمہ اور وحدتِ دین انہیں "جسمِ واحد" اور "بنیانِ مرصوص" بنا دیتے ہیں۔[1]

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (حجرات، ۱۰)

"مومن آپس میں بھائی بھائی ہی ہیں۔"

توحید سے محروم ہونے کے بعد یہ وحدتِ فکر و عمل ختم ہو جاتی ہے الحاد کو اختیار کرنے کے بعد انسان سماج تمام دینی و اخلاقی قدروں سے محروم ہو جاتا ہے۔ جنہیں انسانیت، خدا اور مذہب کے نام پر تسلیم کرتی رہی ہے، خدا کا انکار کرنے کے بعد ہر چیز قابلِ غور بن جاتی ہے اور ہر پرانی اقدار کا انکار کر دیا جاتا ہے، خدا کے دین کے بجائے، عقل ــــ ہر انسان کی عقل ــــ غلط اور صحیح کا تنہا معیار بن جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی قدر اور کوئی اصول مسلّم نہیں رہتا اور فکری انارکی جنم لیتی ہے، فکری انتشار سے عملی انتشار رونما ہوتا ہے اور انسانیت بے شمار مختلف الخیال ٹولیوں میں بٹ جاتی ہے، اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت کے نتیجہ میں خود غرضی، مفاد پرستی اور ظلم و تشدد کو فروغ ہوتا ہے اور اس سے انتشار و افتراق و تصادم میں تبدیل ہو جاتا ہے اور قوم قوم سے، طبقہ طبقہ سے، صنف صنف سے اور فرد فرد سے

[1] مسلمانوں کا موجودہ انتشار توحید اور دینِ توحید سے ان کی دوری کا نتیجہ ہے اور بس!

دست وگریباں ہونے لگتا ہے اور مکمل فکری وعملی انارکی رونما ہو جاتی ہے۔

شرک انتشار پیدا کرنے کے معاملہ میں الحاد سے کم نہیں، کچھ بڑھ کر ہی ہے۔ شرک انسان کی محبت وعقیدت کے بے شمار مرکز بنا دیتا ہے ایک مرکز سے انسانوں کی ایک ٹولی وابستہ ہوتی ہے اور دوسرے مرکز سے دوسری، جتنے خدا بڑھتے جاتے ہیں اتنا ہی انتشار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایسا وقت بھی آتا ہے جب کہ ہر خاندان کا خدا الگ ہوتا ہے۔ الحاد میں تو عقل غلط اور صحیح کا معیار ہوتی ہے، لیکن شرک میں یہ مقام انسان کے وہم وخیال کو حاصل ہوتا ہے اور وہم وخیال کی برکت سے انتشار کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جاتا ہے کیوں کہ وہم وخیال کے لیے استدلال اور معقولیت کی حد بندی بھی نہیں رہتی۔ وہم وخیال انسانوں کو کس حد تک انتشارِ فکر وعمل میں مبتلا کر دیتے ہیں اس کا اندازہ مختلف ادیانِ شرک کی میتھالوجی کے اجمالی مطالعہ ہی سے ہر انسان کو ہو سکتا ہے۔ عالمگیر برادری تو درکنار کہ اس کا تصور بھی باقی نہیں رہتا۔ شرک ایک ملک کے رہنے والوں کو بھی ایسے مقام پر لا کھڑا کرتا ہے جب کہ ان کے درمیان کوئی شے مشترک نہیں رہتی، ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کی کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی اور کسی قوم کی دشمنی کے سوا انھیں متحد کرنے کے لیے کوئی کلمۂ جامعہ نہیں رہتا! کتنی دردناک ہے یہ صورتِ حال! کتنا ہولناک ہے شرک کا یہ تحفہ!

باب یازدہم

اسلام کا تصوّرِ توحید

اللہ ہی خالق ہے

کائنات اگر پیدا ہوئی ہے اور یقیناً پیدا ہوئی ہے کیونکہ وہ ازلی وابدی نہیں ہے۔ تو بہر حال اس کا ایک خالق ہونا چاہیے۔ اس پر ان تمام لوگوں کا اتفاق ہے جو کائنات کی تخلیق کے قائل ہیں۔ اختلاف اس میں ہے کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے یا خدا کی مخلوقات نے اس کی تخلیق کی ہے؟ عقل پہلی بات کی شہادت دیتی ہے کیوں کہ ایک موجود بالذات ہستی ہی دوسرے کو وجود بخش سکتی ہے۔

بعض مشرکانہ مذاہب کسی عقلی ثبوت کے بغیر اس بات کے قائل ہیں کہ مخلوقات نے کائنات کی تخلیق کی ہے۔ منوسمرتی میں ہے:

"یہ سب جگت پہلے پرکرتی میں لین تھا۔ اس کا کچھ نشان نہ تھا۔ پرماتما کے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ اپنے بدن سے ایک قسم کی خلقت پیدا کرنی چاہیے تو اس نے پہلے پانی کو پیدا کیا۔ پھر اس پانی میں بیج ڈالا۔ تب وہ بیج مثل طلا و آفتاب کے بصورت بیضہ بن گیا۔ پھر اس بیضہ سے برہما جو تمام مخلوقات کے پیدا کرنے

والے ہیں، آپ سے آپ پیدا ہوئے۔ برہمانے اس انڈے میں ایک برس تک رہ کر اور پرماتما کا دھیان کر کے انڈے کے دو ٹکڑے کیے۔ ان ٹکڑوں سے برہمانے سورگ اور پرتھوی کو بنایا، پھر ان دونوں کے بیچ آکاش، آٹھوں سمت اور ساگر سمندر بنایا۔ پھر برہمانے اپنے قالب کے دو حصے کیے، نصف سے صورت مرد اور نصف سے صورت عورت ہوئی۔ ان دونوں کے ملنے سے براٹ شخص کو پیدا کیا۔ منوجی کہتے ہیں کہ اس شخص براٹ نے عبادت کر کے جس کو بنایا وہ میں ہی ہوں اور میں ہی سب کا پیدا کرنے والا ہوں۔ پھر میں نے دنیا کو پیدا کرنے کی خواہش میں سخت عبادت کر کے دس رشیوں کو جو پرجا پتی ہیں، پیدا کیا۔ ان رشیوں نے سات پُرجلال منوؤں کو دیوتاؤں کو اور دیوتاؤں کے مقامات یعنی سورگ اور مہاپرتاپی بڑے بڑے رشیوں کو بنایا۔ برہماجی سے جو من پیدا ہوئے ان کی نسل سے چھ من اور بھی ہیں۔ ان مہاتیجسوی مہاتماؤں نے اپنے اپنے اختیار سے اپنی اپنی خلقت کو پیدا کیا۔"

(ادھیائے ۱)

اس اقتباس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے خالق بہت سے ہیں لیکن یہ بالکل واضح نہیں ہوتا کہ کس خالق نے کیا پیدا کیا۔ بہر حال منوسمرتی کی رو سے خدا تنہا خالق نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ صحیح تر تخلیق میں خدا کا برائے نام ہی دخل ہے۔

یہ ایک نقطۂ نظر ہے، دوسرا نقطۂ نظر سوامی دیانند سرسوتی کا ہے، فرماتے ہیں:

"اس کائنات کو اس علت فاعلی یعنی پرماتما نے پیدا کیا ہے مگر اس کی علت مادی پرکرتی ہے۔ ایشور، جیو اور کائنات کی علت مادی پرکرتی) یہ تین چیزیں ازلی ہیں۔" (ستیارتھ پرکاش، باب ۸)

معلوم ہوا کہ تین چیزیں ازلی ہیں، مگر آگے چل کر وہ فرماتے ہیں:

"اسی طرح پیدائشِ عالم سے پیشتر پرمیشور، پرکرتی، کال اور آکاش اور نیز جیو، جو ازلی ہیں، موجود ہوتے ہیں، ان سے دنیا کی پیدائش ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو دنیا بھی نہ ہو۔"

(ستیارتھ پرکاش باب ۸ صفحہ ۴۲۳، ۴۲۵)

گویا پانچ چیزیں ازلی ہیں جن سے کائنات بنی ہے، مزید فرماتے ہیں:

"علّت فاعلی دو قسم کی ہے، ایک تمام کائناتِ علّت سے معلول بنانے والا اور مقدم علّت فاعلی پرماتما ہے، دوسرا پرمیشور کی کائنات میں سے اشیا کو لے کر کئی طریقے سے مختلف چیزیں بنانے والا عام علتِ فاعلی جیو ہے۔"

(باب ۸ صہ ۲۲)

گویا خدا لاشریک صانع بھی نہیں۔

"کسی معلول کی ابتدا میں تین (فاعلی مادّی یا علّت آلی) ضرور ہوتی ہیں جیسے کپڑا بنانے سے پہلے جولاہا، روئی کا سوت اور نلی وغیرہ موجود ہوں تو کپڑا بنا جاتا ہے۔ اسی طرح پیدائشِ عالم سے پیشتر پرمیشور، پرکرتی ... الخ (عبارت مذکورہ بالا باب ۸ صفحہ ۲۲۳)

اس نقطۂ نظر میں خدا کو مجبور و محتاج مخلوق پر قیاس کیا گیا ہے۔ سامان اور آلات کے بغیر انسان کچھ نہیں بنا سکتا۔ اسی طرح خدا بھی نہیں بنا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ازلی و ابدی ماننا تو ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بغیر وجود کا یہ سارا ہنگامہ عدمِ محض ہو جاتا ہے، اس کے ماسوا اور کسی کو ازلی ماننے کی ضرورت اور نہ اس کا کوئی ثبوت۔ پھر یہ سلسلہ کہیں رکنے میں نہیں آتا۔ تین ازلی وجود مان لیجیے پھر انہیں پانچ کر لیجیے اسی طرح بڑھاتے چلے جائیے۔

اسلام کی رو سے خدا ہر شئے کا خالق ہے:

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ (انعام ۱۰۱)

"اس (خدا) نے ہر شے کو پیدا کیا۔"

یعنی خالق صرف وہ ہے، باقی سب مخلوق ہیں۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ٥ (بقرہ، ۱۱۷)

"آسمانوں اور زمین کا بدیع (موجد) اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ فرماتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔"

"آسمانوں اور زمین کا بدیع" یعنی اس نے کسی ذریعے اور نمونے کے بغیر کائنات بنائی، وہ کہتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے یعنی وہ کسی ذریعہ، آلہ یا مادّہ کا محتاج نہیں اور وہی تخلیق کے لیے کافی ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهٗ شَيْءٌ

"اللہ تھا اور اس کے ساتھ کچھ نہ تھا۔"

یعنی ازلی صرف وہ ہے۔ مادّہ، روح اور کائنات کی ہر چیز حادث ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ٥ (نحل، ۲۰)

"اور جنھیں وہ (مشرکین) اللہ کے سوا پکارتے (پوجتے) ہیں وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔"

یعنی جن کو لوگوں نے دیوتا بنا رکھا ہے ان میں سے کوئی خالق نہیں، سب مخلوق ہیں۔ کائنات میں جو کمال صنعت، غیر معمولی حکمت، جو ہمہ گیر منصوبہ بندی اور جو اعلیٰ نظم و ربط ہے اور ان امور کا اعتراف کرنے پر سائنس کا ہر طالب علم مجبور ہے، وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ کائنات ایک ہی قادرِ مطلق خالق کی قدرت و حکمت کا کرشمہ ہے۔

اللہ ہی مالک ہے

کائنات اور اس کی ہر شئے اللہ کی تخلیق ہے اس لیے وہی کائنات

اور اس کی تمام اشیاء کا مالک ہے، نہ کوئی شئے کسی اور کی تخلیق ہے، نہ کوئی کائنات اور اس کی کسی شئے کا مالک۔

لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط (بقرہ ۲۸۴)

"اللہ ہی کی ملک ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے"۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (فاتحہ ۱)

"شکر و ثنا اللہ کے لیے جو رب ہے کائنات کا"۔

"رب" مالک، پروردگار اور فرماں روا کو کہتے ہیں۔ اللہ کائنات کا رب ہے۔ اس مفہوم کی آیت سے قرآن مجید کا آغاز ہوتا ہے۔ اور یہی بات قرآن مجید میں بار بار بہت زیادہ دہرائی گئی ہے۔ اللہ کے لیے سب سے زیادہ "رب" ہی کی صفت کا ذکر ہوا ہے۔

مشرکین جن ہستیوں کو پوجتے ہیں ان میں سے کوئی ذرہ برابر چیز کا مالک نہیں ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ج لَا یَمْلِکُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ (سبا ۲۲)

"(اے نبی!) کہو جن کو تم اللہ کے سوا (خدا) گمان کرتے ہو انھیں پکار کر دیکھو، وہ آسمان و زمین میں ذرہ برابر چیز کے مالک نہیں"۔

مشرکانہ مذاہب میں اللہ کو لاشریک مالک نہیں مانا جاتا۔ ان کی دیومالا کی رو سے زمین کا دیوتا کوئی ہوتا ہے اور آسمان کا کوئی اور، سورج کا دیوتا کوئی اور ہوتا ہے اور بارش کا کوئی اور، وعلیٰ ہذا القیاس، یہ بات تمام مشرکانہ مذاہب میں مشترک ہے۔ البتہ ہر مذہب میں الگ الگ دیوتا ہوتے ہیں۔ نیز وہ گھٹتے بڑھتے اور بدلتے رہتے ہیں۔ سوامی شردھانند ویدک دیوتاؤں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ان تین دنیاؤں میں تین سردار دیوتا ہیں۔ ساوتری یا سوریہ (سورج) ملکوتی دنیا کا خدا ہے۔ اندر یا وایو (ہوا) درمیانی خلا کا خدا ہے اور اگنی (آگ) عالمِ سفلی کا خدا ہے۔ یہ تین خدا پھر ضرب پاکر تینتیس ۳۳ بن جاتے ہیں، پھر دنیا میں گیارہ خدا، یہ تینتیس ۳۳ دیوتا پھر بڑھ کر تین ہزار تین سو انتالیس دیوتا ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ تعداد تینتیس کروڑ تک پہنچ جاتی ہے۔"

(Cultural Heritage of India) ·P·9·8)

ان دیوتاؤں کے مالک ہونے کا ثبوت آپ چاہیں تو کوئی ثبوت آپ کو نہ مل سکے گا۔ یہی نہیں آپ ان کے وجود کا پتہ بھی نہ پاسکیں گے۔

اللہ ہی فرماں روا ہے

اللہ کائنات کا خالق ہے اور وہی کائنات کا مالک ہے، اگر یہ دونوں باتیں صحیح ہیں اور ان کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ تو پھر یہ بات بھی صحیح ہے کہ وہی کائنات کا فرماں روا ہے اور اسی کو فرماں روائی کا حق پہنچتا ہے جو اس کائنات کا خالق ہے اسی میں اتنی قدرت ہو سکتی ہے اور ہے کہ وہ اس ناپیدا کنار کائنات کا نظم سنبھال لے اور کائنات کی اعلیٰ تدبیر، اس کا محکم نظم اور اس کی بے مثال منصوبہ بندی اس بات کی شاہد ہیں کہ اس کا انتظام ایک ہی علیم و قدیر ہستی کے مضبوط ہاتھ میں ہے:

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝ (اعراف،۵۴)

"یقیناً تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ[6] دنوں (ادوار) میں پیدا کیا، پھر تخت (فرمانروائی) پر متمکن ہوا، وہ رات کو دن سے ڈھانپ دیتا ہے کہ دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے اور سورج، چاند اور تاروں کو پیدا کیا کہ وہ سب اس کے تابع فرمان ہیں۔ سنو! اسی کے لیے ہے تخلیق اور اسی کے لیے حکمرانی ہے! بہت خوبیوں اور عظمت و قدرت والا ہے اللہ کائنات کا رب۔"

"تختِ فرمانروائی پر متمکن ہوا" یعنی وہ کائنات کو پیدا کر کے نہ گوشہ نشین ہو گیا نہ اسے دوسروں کے حوالے کر دیا۔ اس نے فرمانروائی کی زمام اپنے ہاتھ میں لی اور کائنات کا نظم فرمانے لگا۔ "سنو! اسی کے لیے ہے تخلیق اور اسی کے لیے ہے حکمرانی" یعنی خالق وہی ہے اس لیے وہی فرمانروا ہے اور فرمانروائی اسی کو زیب دیتی ہے۔ سورۂ سجدہ میں ہے:

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ (سجدہ ۵)

"وہ تدبیرِ امر (انتظام) فرماتا ہے آسمان سے زمین تک"،

یعنی کائنات کا فرمانروا صرف اللہ ہے اس کے علاوہ یہاں کسی کا حکم نہیں چلتا۔

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ مِنَ الذُّلِّ ـــــ (اسراء ۱۱۱)

"اس کے اقتدار میں کوئی شریک نہیں، نہ وہ کمزور ہے کہ اس کا کوئی دستگیر ہو۔"

یعنی وہ کمزور نہیں ہے کہ کسی کو اپنے اختیارات میں شریک کرے اور اس سے مدد لے ـــ خدا کائنات ہی کا نہیں، نوعِ انسان کا بھی مقتدرِ اعلیٰ و فرماں روا ہے۔

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ إِلَٰهِ النَّاسِ ۝

(ناس ۱تا۳)

"کہو! میں پناہ لیتا ہوں انسانوں کے رب کی انسانوں کے بادشاہ کی، انسانوں کے خدا کی۔"

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ـــــ (یوسف، ۴۰)

"حکم (حاکمیت) اللہ ہی کے لیے ہے اس کے سوا کسی کے لیے نہیں۔"

علم سیاست کی رو سے مقتدر اعلیٰ (Sovereign) میں جو اوصاف ناگزیر ہیں وہ سب کے سب خدا میں پائے جاتے ہیں۔ اللہ کا اقتدار ذاتی ہے، غیر محدود ہے، ناقابلِ انتقال ہے، اس کی دانش بے خطا اور اس کا علم کامل ہے۔ یہ خدا کی صفات ہیں اور ان میں سے کوئی صفت خدا کے علاوہ کسی فرد یا مجموعۂ افراد میں نہیں پائی جاتی، حالانکہ ان صفات کے بغیر اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

جن انسانوں کو دنیا میں حکومت کرنے کا موقع ملتا ہے اللہ کے دینے سے ملتا ہے اور جب وہ چاہتا ہے انھیں تختِ فرمانروائی سے اتار دیتا ہے۔

قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ (آل عمران، ۲۶)

"کہو! اے اللہ! اقتدار و بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے حکومت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے۔"

انسان کی حیثیت زمین میں مالک و فرماں روا کی نہیں، اللہ کے نائب کی ہے، اللہ نے خلافت بخش کر اس کا امتحان لیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

(انعام، ۱۶۵) ـــــ "اور وہ (اللہ) ہی ہے جس نے تمہیں زمین پر (اپنا) خلیفہ (نائب) بنایا اور تم میں سے ایک کا درجہ دوسرے پر بلند کیا تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تمہیں آزمائے، یقیناً تمہارا رب (باغیوں کے لیے) جلد عذاب دینے والا اور (وفاداروں کے لیے) مغفرت فرمانے والا مہربان ہے۔"

مشرکانہ مذاہب میں خدا کو کائنات کا فرمانروا مانا جاتا ہے مگر لاشریک فرمانروا نہیں، زمین سے آسمان تک بے شمار دیوتا ہوتے ہیں جو کائنات کے مختلف حصوں کے فرماں روا سمجھے جاتے ہیں اور ان کی فرمانروائی سے خدا کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ ڈاکٹر جادو ناتھ سنہا فرماتے ہیں:

"وید مذہبی فکر کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فطرت کے عظیم و برتر، خوب صورت اور نفع بخش پہلوؤں کو شخصی اور مجسم خیال کر لیا گیا اور انھیں دیوتا قرار دے دیا گیا ... یہ دیوتا ہیں جو فطرت کے مختلف مظاہر پر حکومت کرتے ہیں۔ یہ فطرت کے مظاہر نہیں ہیں۔ یہ مؤثر فوق الفطری ہستیاں ہیں جو فطرت کے مظاہر پر حکمراں ہیں۔"

A History of Indian Philosophy Vol I. P. 1 ـــ

سوامی شردھانند کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔ حوالے کے آخر میں وہ فرماتے ہیں:

"یہ تینتیس دیوتا پھر بڑھ کر تین ہزار تین سو انتالیس دیوتا بن جاتے

ہیں۔ جیسا کہ ہم رگ وید میں پڑھتے ہیں، اس کے بعد یہ تعداد بڑھ کر تینتیس کروڑ تک پہنچ جاتی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ دیوتاؤں کی بے شمار تعداد زندگی اور فطرت دونوں پر حکومت کر رہی ہے۔"

(The cultural Heritage of India) (P. 509)

دیوتاؤں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور ان کے حدود اقتدار گڈمڈ ہوتے جاتے ہیں۔ پھر ان خداؤں کی آپس میں ہولناک جنگیں ہوتی ہیں جن کی تفصیلات سے ہر مشرکانہ مذہب کی دیومالا پُر ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کچھ اور دیوتا ہوتے اور ان کے ہاتھ میں کائنات کا نظم ہوتا تو ان کے اختلافات سے نظام کائنات درہم برہم ہو جاتا۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ (انبیاء، ۲۲)

"اگر اُن (زمین و آسمان) میں اللہ کے سوا اور خدا ہوتے تو زمین و آسمان تباہ ہو جاتے پاک و برتر ہے اللہ تخت فرماں روائی کا مالک اس شرک سے جو یہ کہتے ہیں۔"

اللہ ہی پروردگار ہے

اللہ نے کائنات کو پیدا کیا ہے، وہی ہر چیز کا مالک ہے۔ وہی کائنات کا منتظم و فرماں روا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے اور اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں تو یہ بات بھی صحیح ہے کہ اللہ ہی ہر شے کا پالنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی پالنے والا نہیں، کوئی پالنہار نہیں۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (جاثیہ ۳۶)

"تو اللہ ہی کے لیے حمد ہے جو آسمانوں کا رب، زمین کا رب، کائنات کا رب ہے۔"

دنیا میں جو کچھ ہے خدا کا پیدا کیا ہوا اور اسی کی ملک ہے، اس لیے جس کسی کو جو کچھ ملتا ہے اسی کے دینے سے ملتا ہے:

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ، ۲۱، ۲۲)

"اے انسانو! اپنے رب کی بندگی کرو جس نے تمھیں پیدا کیا۔ اور تم سے پہلے کے لوگوں کو بھی امید ہے کہ تم تقویٰ اختیار کرو گے، جس نے تمھارے لیے زمین کو فرش بنایا اور آسمان کو چھت اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے پھلوں کو پیدا کیا اور انھیں تمھارا رزق بنایا تو تم اللہ کی (ربوبیت) میں کسی کو شریک نہ بناؤ جانتے بوجھتے۔"

اللہ کائنات کا نظم چلا رہا ہے اور اس نے یہ نظام اس طرح بنایا ہے کہ اس سے انسان کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِىَ فِى الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۚ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراہیم ۳۲-۳۴)

"اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے پھل پیدا کیے اور انھیں تمہارا رزق بنایا اور جہاز کو تمہاری منفعت کے لیے مسخر کیا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے رواں دواں ہو اور تمہاری منفعت کے لیے دریاؤں کو مسخر کیا اور سورج اور چاند کو تمہاری منفعت کیلیے مسخر کیا جو مسلسل اپنے کام میں لگے ہیں اور رات اور دن کو تمہاری منفعت کے لیے مسخر کیا اور تمھیں وہ سب کچھ بخشا جو تم نے مانگا اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرو تو ان کا احاطہ کر سکو گے۔"

اللہ ہی ہے جو انسان کو سامانِ زیست فراہم کرتا ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ ——— (یونس، ۳۱)

"پوچھو! کون ہے جو تمہیں آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے۔ اور کون ہے جو (کائنات کا) نظم چلاتا ہے وہ یقیناً کہیں گے، اللہ"

رزق کی کمی بیشی بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّىْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (سبا ۳۶)

کہو! یقیناً میرا رب جس کو چاہتا ہے، رزق کشادہ فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔"

دولت و خوشحالی وہی دیتا ہے:

وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ۝

(نجم، ۴۸، ۴۹)

"اور بے شک اسی (خدا ہی) نے دولت بخشی اور سرمایہ والا بنایا اور یقیناً وہی شعریٰ کا رب ہے۔"

عرب کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ شعریٰ ستارے کے طلوع سے زرخیزی وخوش حالی وابستہ ہے جس طرح ہندوستان کے مشرکانہ عقیدہ رکھنے والے ستاروں اور نچھتروں کے بارے میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ دولت وخوش حالی اللہ کے ہاتھ میں ہے جو کائنات کا اور خود شعریٰ کا مالک ہے۔ ستاروں اور نچھتروں کے ہاتھ میں نہیں۔

اگر وہ نہ دے تو سامانِ زیست بخشنے والا کوئی نہیں۔

أَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ (ملک، ۲۱)

"یا کون ہے جو تمہیں رزق دے گا اگر وہ (خدا) اپنا رزق روک دے۔"

بارش، جس سے زندگی وزرخیزی وابستہ ہے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ (انعام، ۹۹)

"اور وہ (خدا) وہ ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا تو ہم (خدا) نے اس سے ہر چیز کی روئیدگی وسرسبزی پیدا کی۔"

زمین میں پانی کے ذخیرے اسی نے بنائے جن سے نباتات کی زندگی وابستہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ (زمر، ۲۱) "کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا تو اسے چشموں اور سوتوں کی شکل میں زمین میں رواں دواں کر دیا پھر اس سے وہ رنگ برنگی کھیتی پیدا کرتا ہے۔"

عزت اور حکومت بھی وہی بخشتا ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ

وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ
تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط (آل عمران، ۲۶)

"کہو! اے اللہ! حکومت و فرماں روائی کے مالک! تو جسے چاہتا ہے حکومت بخشتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے، تمام نعمتیں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں۔"

اولاد بھی وہی دیتا ہے:

يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ٥
اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ط

(شوریٰ، ۴۹، ۵۰) "وہ (خدا) جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے یا انہیں لڑکے اور لڑکیاں دونوں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے۔"

صحت و تندرستی بھی اسی کے ہاتھ میں ہے:

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ٥ (شعراء، ۸۱)

"اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا بخشتا ہے۔"

علم کا سرچشمہ بھی وہی ہے، جسے جو کچھ علم ملتا ہے اُسی سے ملتا ہے:

اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ (احقاف ۲۳)

"علم تو صرف اللہ کے پاس ہے۔"

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ٥ (علق، ۵)

"اس (خدا) نے انسان کو سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا۔"

غرض انسان کے پاس جو نعمت بھی ہے اللہ ہی کی دی ہوئی ہے۔

وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (نحل، ۵۳)

"تمہارے پاس جو نعمت بھی ہے، اللہ ہی کی جانب سے ہے"۔

اسلام کے عقیدے کے برعکس مشرکانہ مذاہب میں خالق کوئی ہوتا ہے، پروردگار کوئی دولت کسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے، بارش کسی اور کے ہاتھ میں، خوش حالی و زرخیزی کا دیوتا کوئی اور ہوتا ہے، اولاد اور صحت کا کوئی اور، غرض جتنے کام اور جتنی ضرورتیں اتنے ہی دیوتا، ہندو مت کی رو سے کائنات کا خالق برہما ہے۔ ہلاکت کا دیوتا شیو ہے اور پالنہار وشنو، دولت کی دیوی لکشمی ہے۔ بارش کا دیوتا اِندر ہے اور علم کی دیوی سرسوتی۔ اس طرح وشنو کو پالنہار ماننے کے باوجود ہر ضرورت کے لیے الگ الگ دیوتا ہیں۔ منوسمرتی میں ان سب سے الگ ہے:

"برہما جی سے جو من پیدا ہوئے ان کی نسل میں چھ من اور بھی ہیں۔ ان مہاتیجسوی مہاتماؤں نے اپنے اپنے اختیار سے اپنی اپنی خلقت کو پیدا کیا، ان کے نام یہ ہیں: سوار وچش، اوتم، تامس، ریوت، چاکشش، ویوست، سوایمبھو وغیرہ ساتوں مُن جو بڑے تیجوان ہیں، وے اپنے اپنے اختیار سے تمام مخلوقات ساکن و متحرک کو پیدا کر کے پالنے لگے"۔

(ادھیائے ۱، ۶۲-۶۲، ۶۲)

گویا بہت سے خالق ہیں اور وہ سب کے سب پروردگار ہیں۔

اللہ ہی حاجت روا ہے

اللہ خالق ہے، وہی مالک ہے، وہی فرماں روا ہے، وہی پروردگار ہے اور سب کچھ اسی کے پاس ہے، اس لیے وہی حاجت روا اور مشکلکشا ہے

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ
يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ط ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط (نمل، ۶۲)

"یا کون ہے جو مصیبت زدہ (کی پکار) کا جواب دیتا ہے، اور مصیبت دور کر دیتا ہے اور تمھیں زمین میں (اپنا) خلیفہ بناتا ہے؟ کیا ہے کوئی اور خدا اللہ کے ساتھ؟"

اللہ کے سوا سب بندے اور اللہ کے محتاج ہیں، اس لیے حاجت روائی اللہ ہی کر سکتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ
فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (اعراف ۱۹۴)

"اللہ کے سوا جنھیں تم پکارتے (اور پوجتے) ہو وہ سب کے سب تمھیں جیسے (اللہ کے) بندے (اور محتاج) ہیں تو تم انھیں پکار کر دیکھو وہ تمھاری پکار پر لبیک کہیں اگر تم سچے ہو۔"

جو مخلوق ہیں، خالق نہیں، وہ اپنی زندگی تک کے لیے خدا کے محتاج ہیں۔ وہ تمھاری کیا، خود اپنی مدد نہیں کر سکتے۔

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ وَلَا
يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ۝ (اعراف ۱۹۱، ۱۹۲)

"کیا (خدا کے ساتھ) ان کو شریک کرتے ہیں۔ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ وہی پیدا کیے جاتے ہیں، وہ ان (پرستاروں) کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ہی۔"

خدا تک اپنی آواز کو پہنچانے کے لیے کسی واسطے یا سفارش کی ضرورت نہیں، وہ ہر انسان سے قریب ہے اور خود ہر ایک کی دعا سنتا اور خود ہی حاجت روائی کرتا ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ط اُجِيْبُ دَعْوَةَ
الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (بقرہ، ۱۸۶)

"اور جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں پوچھیں تو بے شک میں (ان سے) قریب ہوں، میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ پکارتا ہے۔

اس کے برعکس فرضی معبودوں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ کون انھیں پکار رہا ہے:

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝

(احقاف، ۵) "اور ان سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ کے سوا ایسے معبودوں کو پکارتے ہیں جو قیامت تک ان کی پکار پر لبیک نہیں کہہ سکتے، وہ تو ان کی دعا سے بے خبر ہیں"

اللہ کے سوا دوسرے فرضی معبودوں کو پکارنے کا کوئی حاصل نہیں۔

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝ (رعد: ۱۴)

"اللہ ہی کی پکار حق ہے، اس کے سوا جنھیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی پکار پر ذرا بھی لبیک نہیں کہہ سکتے مگر اتنا ہی جیسے کوئی شخص پانی کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے کہ پانی اس کے منھ میں پہنچ جائے، لیکن پانی اس کے منھ میں پہنچنے کا نہیں، اور کافروں کی دعا تو اکارت ہی جاتی ہے۔"

رہے بت تو ان کی طرف حاجت روائی کے لیے رجوع کرنا تو حماقت کے سوا کچھ نہیں!

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْھُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْہُ ؕ (ج ۳ ، ۷)

"اللہ کے سوا تم جنھیں پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کرسکتے اگرچہ وہ سب اس کے لیے جمع ہو کر زور لگالیں اور اگر مکھی ان (کے چڑھاوے میں) سے کچھ چھین لے تو وہ اس سے واپس نہیں لے سکتے۔"

مختصر یہ کہ کائنات میں جو کچھ ہے، اللہ کا ہے، اسی کے پاس زمین و آسمان کے خزانے ہیں۔

وَلِلّٰہِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (منافقون ۷)

جس کسی کو جو کچھ ملتا ہے اسی کے دینے سے ملتا ہے اس لیے وہی حاجت روا اور مشکل کشا ہے اور وہی حاجت روائی کرسکتا ہے۔

یہ ہے اسلام کا نقطۂ نظر۔ اس کے برخلاف مشرکانہ مذاہب میں بیشمار حاجت روا و فرمانروا ہوتے ہیں۔ خیالی و فرضی دیوتاؤں کا جمِ غفیر ہوتا ہے جسے حاجت روائی کے لیے گھڑ لیا جاتا ہے۔ سورج، چاند، تارے، آسمان، زمین، دریا، پہاڑ، جانور، سانپ، بچھو، درخت، پیر، فقیر، قبر، استھان، بت، سمادھی، غرض دنیا کی ہر چھوٹی بڑی اور حقیر و ذلیل شے کے ہاتھ میں انسان کی قسمت ہوتی ہے اور وہ ان سے ڈرتا، حاجت روائی کے لیے ان کی طرف رجوع کرتا ہے، ان کے آگے ہاتھ پھیلاتا اور ذلت سے ان کے سامنے ناک رگڑتا ہے، آہ انسان کی قسمت!

اللہ ہی خدا ہے

خدا یا معبود اس ہستی کو کہتے ہیں جو:

- فوق الفطری طاقت کا مالک ہو۔
- کائنات یا اس کے کسی جزء کا نظم اس کے ہاتھ میں ہو۔
- حاجت روا و مشکل کشا ہو۔
- اس سے دعائیں مانگی جاتی ہوں۔
- پرستش و بندگی کا مستحق ہو۔

معبود یا الٰہ کے مفہوم کے ان تمام پہلوؤں کے لحاظ سے اللہ ہی خدا ہے۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ط (نساء ۸۷)

" اللہ ہی خدا ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں "

اللہ خالق ہے، باقی سب مخلوق اور محتاج و بے بس ہیں۔ ظاہر ہے کہ مخلوق و محتاج خدا نہیں ہو سکتا۔

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ خَلَقُوْا کَخَلْقِہٖ فَتَشَابَہَ الْخَلْقُ عَلَیْہِمْ ط قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ ۝ (رعد ۱۶)

" یا کیا انھوں نے اللہ کے ایسے شریک ٹھہرائے ہیں جنھوں نے خدا کی طرح تخلیق کی ہے تو تخلیق ان پر مشتبہ ہو گئی۔ کہو اللہ ہر شے کا خالق ہے اور وہ واحد خدا ہے، ہر ایک پر کنٹرول کرنے والا "

ہر چیز اللہ کی مملوک اور تابع فرمان ہے:

وَلَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوْنَ ۝

(روم ۲۶) " اسی کی ملکیت میں ہیں آسمانوں اور زمین کی ساری ہستیاں، ہر ایک اسی کے تابع ہیں "

اور مملوک و محکوم مالک و خدا نہیں بن سکتا۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ط هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ
اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ
تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ط (روم، ۲۸)

"اللہ نے تمہارے (سمجھانے کے) لیے ایک مثال دی ہے خود تمہاری ذات کی، کیا تمہارے غلاموں میں سے کوئی ان چیزوں میں جو ہم نے تمہیں بخشی ہیں تمہارا شریک ہوتا ہے کہ وہ اور تم ان میں برابر ہو اور ان سے اس طرح ڈرتے ہو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے ڈرتے ہو۔"

اللہ کائنات کا فرماں روا ہے، اس کے سوا کائنات کے نظم میں کسی کو دخل نہیں۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (زمر ۴۴)

"اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی فرماں روائی۔"

اللہ ہی کے ہاتھ میں زمین و آسمان کے خزانے ہیں، اس لیے وہی حاجت روا ہے:

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (زمر، ۶۳)

"اسی کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین (کے خزانوں) کی کنجیاں ہیں۔"

ذاتی زندگی اسی کی ہے، دوسروں کی زندگی، اسی کے سہارے قائم ہے اس لیے وہی خدا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ج (بقرہ ۲۵۵)

"اللہ ہی خدا ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ (بذاتِ خود) زندہ ہے، قیوم ہے (کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے)۔"

آسمان ہو یا زمین، ہر جگہ ایک ہی خدا ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں:

وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ط (زخرف ۸۴)

"اور وہ (اللہ) وہ ہے جو آسمانوں میں بھی خدا ہے اور زمین بھی خدا ہے"

لوگوں نے خداؤں اور دیوتاؤں کی جو لمبی چوڑی فہرست تیار کر رکھی ہے وہ وہم و تخیل کی کارسازی ہے، یہ حقیقی ہستیاں نہیں ہیں اور یہ تو خدا نہیں ہیں:

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ط (یوسف ۴۰)

"اللہ کے سوا جنھیں تم معبود بناتے ہو وہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان (کی خدائی) کی کوئی سند نہیں اتاری"

کائنات کے چپہ چپہ پر اللہ کی نظر ہے مگر خدا تک کو معلوم نہیں کہ اس کا کوئی شریک بھی ہے:

قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ط سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (یونس ۱۸)

"کہو کیا تم اللہ کو ایسی ہستیوں کا پتہ دے رہے ہو، جن کے آسمانوں اور زمین میں موجود ہونے کا خدا تک کو علم نہیں، پاک و برتر ہے اللہ اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں"

انسان کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے، اس کا سر خدا کے آگے تو جھکنا چاہیے:

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (جن ۱۸)

"اور یہ کہ سجدے (سب کے سب) اللہ کے لیے ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو"

سجدہ مخلوقات کو نہیں، مخلوقات کے خالق کو کرنا چاہیے:

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ (حٰم سجدہ ۳۷)

"نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو، اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے"

انسان اللہ کے سوا کسی کا بندہ نہیں۔ اس لیے اسے اللہ ہی کی بندگی کرنی چاہیے یہی اس کا حکم ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (اسراء، ۲۳)

"اور تمہارے رب نے قطعی حکم دیا ہے کہ اس کی بندگی کرو اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو"

نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے انبیاء علیہم السلام جو دین لائے تھے اس کی بنیاد یہ تھی۔

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ (ہود، ۲۶)

"اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو"

مشرکانہ مذاہب میں خداؤں کی کمی نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے آسمان تک دیوتا ہی دیوتا ہیں۔ ہر چھوٹی بڑی چیز دیوتا بنالی جاتی ہے اور مشرک انسان بے تامل اس کے آگے سر جھکا دیتا ہے حتیٰ کہ خود اپنے ہاتھ سے بت تراشتا ہے اور خود ہی ان مجبور و بے بس پتھر کے ٹکڑوں کو خدا سمجھ کر ان کے آگے سربسجود ہو جاتا ہے۔

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝ (صافات ۹۵)

"(ابراہیم نے) کہا کیا تم پوجتے ہو انھیں جن کو خود گھڑتے ہو؟"

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ

(اعراف، ۱۹۵)

"کیا ان (بتوں) کے پیر ہیں جن سے وہ چلتے ہوں یا ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہوں یا آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہوں یا کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں؟"

ہاتھ ہی سے نہیں، انسان نے اپنے وہم و خیال سے بھی بے شمار دیوتا گھڑ لیے۔ ان کے نام، قوتیں، اختیارات، معجزانہ کرشمے، زندگی کے حالات شکلیں، سب تصنیف کر ڈالیں اور پھر پورے اطمینانِ قلب اور خشوع کے ساتھ اپنی خیالی مخلوقات کو پوجنے لگا۔ ڈاکٹر جادونا تھ سنہا ویدک دیوتاؤں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فطرت کے عظیم و برتر، خوبصورت اور نفع بخش پہلوؤں کو شخصی اور مجسم خیال کیا گیا اور انھیں دیوتا قرار دے دیا گیا۔ یہ مظاہرِ فطرت نہیں ہیں، یہ مؤثر فوق الفطری ہستیاں ہیں جو مظاہرِ فطرت پر حکمراں ہیں۔ انھیں بھجن، پوجا پاٹ، چڑھاوے، نذر و نیاز اور قربانی سے بہ آسانی خوش کیا جا سکتا ہے۔ یہ دنیوی خوشحالی، دانائی اور اخلاقی اوصاف بخشتے ہیں۔ جنگوں میں ان سے فتح ملتی ہے، یہ دولت، طویل عمر، بیٹے پوتے اور مسرت دیتے ہیں (ان دیوتاؤں میں) آگ کا دیوتا اگنی ہے۔ سورج (سوریہ) ہے۔ پَو (اوشا) ہے، زمین (پرتھوی) ہے، آسمان (دیاؤس) ہے، روشن آسمان اور دن (مترا) ہے، تاریک آسمان اور رات (وَرُن) ہے، برسنے والا بادل (پرجنیہ) ہے، طوفان (ماروت) ہے، ہوا (وایو، وات) ہے، صبح کا سورج (ساوتری) ہے، یہ اور اسی طرح کے دوسرے دیوتاؤں کی (ویدوں میں) نشان دہی کی گئی ہے۔"

A History of Indian Philosophy ...P.P.1.2)

سوامی وویکانند "ویدوں کا ہندو مت" کے زیرِ عنوان فرماتے ہیں:

"ویدوں کے بالکل آغاز میں ہی ہم بہت ہی نرالا تصور پاتے ہیں۔ یہ منتر بہت سے دیوتاؤں کی شان میں گائے گئے ہیں۔ دیوتا جنھیں دیو درخشاں ہستی کہا جاتا ہے، ان کی تعداد بہت ہے ایک کا نام اندر ہے دوسرے کا نام ورن، ایک اور متر ہے پرجنیہ ہے اور اسی طرح اور متعدد دیومالائی و مجازی صورتیں ایک دوسرے کے بعد ہمارے سامنے آتی ہیں۔"

(Hindulsm) p. 19)

یہ لَے یہاں تک بڑھتی ہے کہ حقیر و ذلیل چیزیں بھی خدا بنالی جاتی ہیں۔ مردانہ اور زنانہ اعضائے تناسل کی پرستش مذہب کا جزو بن جاتی ہے اور اعضا کی فوق الفطری قوتوں اور معجزانہ کارناموں کی داستانیں تک تصنیف ہو جاتی ہیں[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ شرک میں مبتلا ہونے کے بعد انسان جہالت، وہم پرستی اور ذلت کے عمیق گڑھے میں گر جاتا ہے اور اس کی گراوٹ کسی حد پر نہیں رکتی۔

وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ ۝ (حج ۳۱)

"اور جو کوئی اللہ کے ساتھ (دوسروں کو) شریک کرے تو گویا وہ آسمان سے گرا تو یا تو پرندے اسے اچک لے جائیں گے یا آندھی اسے دور دراز اور گہری جگہ میں پھینک دے گی۔"

اللہ ہی قانون دینے والا ہے

اللہ کائنات کا اور انسان کا مالک و فرمانروا ہے اس لیے اسے انسان کو

---

[1] شیولنگ کی معجزانہ قوتوں کی داستانیں اور اس کی پوجا اسی ذیل کی چیزیں ہیں۔

حکم دینے اور اس کے لیے قانون بنانے کا حق ہے اس کے سوا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ (یوسف۔۴۰)

"حکم صرف اللہ کے لیے ہے کسی اور کے لیے نہیں اس نے حکم دیا ہے کہ اس کی بندگی کرو، کسی اور کی نہ کرو۔"

عبادت یا بندگی کے مفہوم میں پرستش و غلامی دونوں داخل ہیں۔ اللہ کی پرستش بھی کرنی ہے اور اس کا بندہ بن کر بھی رہنا ہے۔ بندہ و غلام کا کام یہ ہے کہ مالک کی مرضی پر چلے، اس کا حکم مانے اور کسی کا حکم نہ مانے۔ گویا خود اللہ کی عبادت کے اندر یہ مفہوم شامل ہے کہ اللہ ہی کا قانون صحیح ہے جس کی انسان کو پیروی کرنی چاہیے۔ باقی سارے قوانین غلط ہیں:

اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ؕ (اعراف۔۳)

"تمہارے رب کی طرف سے جو (قانون) اترا ہے اس کی پیروی کرو، اس کے سوا دوسرے کارسازوں (خداؤں) کی پیروی نہ کرو۔"

گویا خدا کی اطاعت سے بے نیاز ہو کر کسی قانون کو ماننا اور اس کی پیروی کرنا شرک ہے۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ (شوریٰ۔۲۱)

"یا کیا ان کے لیے (خدا کی خدائی میں) کچھ شریک ہیں جنھوں نے تمہارے لیے وہ دین بنایا جس کی اجازت اللہ نے نہیں دی۔"

ہیں اور انسان کے لیے بنائی ہیں، اللہ

تو ان نعمتوں کے استعمال کے سلسلے میں پابندی لگا سکتا ہے اور یہ بھی بتا سکتا ہے کہ کون سی چیز قابلِ استعمال نہیں ہے، اس کے سوا کسی کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ انسان پر اللہ کی دی ہوئی نعمتوں پر پابندی لگائے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط (اعراف، ۳۲)

"(اے نبی!) کہو کس نے اللہ کی زینت کو حرام کر دیا جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی تھی اور کس نے (خدا کی بخشی ہوئی) پاک چیزوں کو حرام کر دیا"

قرآن نے یہود و نصاریٰ کی فردِ جرم سناتے ہوئے کہا:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ج وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ج لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ o

(توبہ ۳۱) "انھوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور مسیح بن مریم کو بھی۔ حالانکہ انھیں صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کی عبادت کریں اس کے سوا کوئی خدا نہیں، پاک ہے وہ اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں"

عدی بن حاتمؓ نے جو مسیحیت سے اسلام لائے تھے، اس آیت کو سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، ہم نے علماء و مشائخ کی کبھی پرستش نہیں کی، آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے جسے حلال قرار دیا تم نے اسے حلال سمجھا اور جسے انھوں نے حرام قرار دیا تم نے بھی اسے حرام سمجھ لیا۔ انھوں نے کہا، ایسا تو ہے، آپ نے فرمایا بس یہی انھیں رب بنانا ہے (ترمذی) حقیقت یہ ہے کہ کسی کو قانون سازی

کا حق دینے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اسے مقتدرِ اعلیٰ مان لیا اور خدا کے علاوہ کسی کو مقتدرِ اعلیٰ (Sovereign) ماننا شرک ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۭ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝ (یونس ۵۹)

"(اے نبی!) کہو، ذرا بتاؤ تو اللہ نے تمہارے لیے جو سامانِ زیست اتارا تم نے اس میں سے کچھ کو حرام قرار دیا اور کچھ کو حلال، کیا اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی یا تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو؟"

البتہ جو قانون سازی خدا کو قانون ساز مان کر اس کے قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے اس کے قانون کے تحت ہو، وہ شرک کی تعریف میں نہیں آتی اور جائز ہے کیوں کہ اس کی حیثیت قانونِ الٰہی کی تشریح یا انطباق کی ہے۔

مشرکانہ مذاہب ہوں یا ملحدانہ اور لادین نظام ہائے حیات ان سب میں انسان کو مقتدرِ اعلیٰ اور قانون ساز تسلیم کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شرک ہے۔

زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے

اللہ خالق، مالک، فرماں روا، پروردگار اور خدا ہے اور ان صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں، اگر یہ صحیح ہے، اور یقیناً صحیح ہے، تو اس میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں کہ زندگی اور موت اسی کے ہاتھ میں ہے اور کسی کے ہاتھ میں نہیں۔

اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ (اعراف ۱۵۸)

"اللہ وہ ہے جس کے لیے فرماں روائی آسمانوں اور زمین کی،
اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت
دیتا ہے۔"

موت کا وقت مقرر ہے اور وہ اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آسکتی۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا
مُّؤَجَّلًا ۭ (آل عمران، ۱۴۵)

"اور کسی شخص کو موت نہیں آسکتی جب تک اللہ کا حکم نہ ہو، یہ
موت ایک مقدر شے ہے جس کا وقت مقرر ہے۔"

انسان اللہ تعالیٰ سے بغاوت کی جرأت کرتا ہے حالانکہ اس کی زندگی و
موت دونوں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ
يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ؁ (البقرہ، ۲۸)

"تم اللہ کی اطاعت سے کیسے انکار کرتے ہو حالانکہ تم معدوم
تھے تو اس نے تمہیں زندگی بخشی پھر وہ تمہیں موت دے گا پھر
وہ تمہیں زندہ کرے گا، پھر تم اسی کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔"

توحید کا یہ تصور اگر ذہن میں بیٹھ جائے تو انسان کی طاقت ناقابلِ تسخیر
ہو جاتی ہے وہ صرف اللہ سے ڈرتا ہے، اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْ
هُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ؁
(آل عمران، ۱۷۳) "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے لوگوں نے
کہا کہ لوگوں نے تمہارے (اوپر حملہ کرنے کے) لیے (بہت ساز و
سامان) جمع کیا ہے تو تم ان سے ڈرو تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا
اور انھوں نے کہا ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین

کارساز ہے۔"

اس کے برعکس شرک انسان کو بزدل بناتا ہے، مشرک دنیا کی چھوٹی بڑی ہر چیز ہی سے نہیں، وہمی و خیالی چیزوں سے بھی ڈرتا ہے۔ موت اسے ہر طرف ناچتی نظر آتی ہے:

سَنُلْقِىْ فِىْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا ج (آل عمران، ۱۵۱)

"ہم اہلِ کفر کے دلوں میں خوف پیدا کر دیں گے۔ کیونکہ انھوں نے اللہ کے ساتھ ان ہستیوں کو شریک بنا لیا ہے جن کی دخلی کی سند اللہ نے نہیں اتاری۔"

نفع اور نقصان اللہ کے ہاتھ میں ہے

اللہ کے مالک، فرماں روا، پروردگار، حاجت روا اور خدا ہونے کا کھلا مطلب یہ ہے کہ نفع اور نقصان سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے، کسی اور کے ہاتھ میں نہیں:

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ط (مائدہ، ۷۶)

"کہو، کیا اللہ کے سوا تم ایسی ہستیوں کی بندگی کرتے ہو جن کے ہاتھ میں تمہارا نفع نقصان کچھ بھی نہیں ہے۔"

ان معبودانِ باطل کے ہاتھ میں اپنا نفع نقصان بھی نہیں:

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ٥ (فرقان، ۳)

"اور انھوں نے اللہ کے سوا (دوسرے) خدا بنا رکھے ہیں جو کچھ

بھی پیدا نہیں کرتے اور خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں اپنا نفع نقصان بھی نہیں ہے، نہ موت، زندگی اور دوبارہ اٹھایا جانا ان کے بس میں ہے۔"

انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر اللہ کا مقرب بندہ اور کون ہو سکتا ہے، مگر وہ بھی کسی کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ سردارِ انبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی کہلوایا گیا:

قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝ (جن، ۲۱)

"(اے نبی!) کہو میرے ہاتھ میں تمہارا نفع ہے نہ نقصان۔"

اپنا نفع و نقصان بھی ان کے ہاتھ میں نہیں ہے:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ (اعراف، ۱۸۸)

"کہو! میرے اختیار میں میرا نفع ہے نہ نقصان، بجز اس کے جو اللہ چاہے (کہ وہی ہو گا)۔"

اللہ مصیبت دے تو کوئی اور دور کرنے والا نہیں اور نعمت دے تو کوئی اسے روکنے والا نہیں۔

وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ (یونس، ۱۰۷)

"اور اگر وہ تمہیں کوئی مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اسے دور کر سکے اور اگر وہ کوئی نعمت دینا چاہے تو اس کی بخشش کو کوئی ہٹانے والا نہیں۔"

اللہ کی گرفت سے کوئی بچانے والا نہیں، سرورِ انبیاء کی زبانی کہلوایا گیا:

قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّ لَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝ (جن، ۲۲)

"(اے نبی!) کہو! بے شک مجھے اللہ (کی گرفت) سے بچانے

والا نہیں اور اس کے سوا میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔"

جامع ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَإِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَىٰ أَنْ يَنْفَعُوكَ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكَ وَلَوِ اجْتَمَعُوا عَلَىٰ أَنْ يَضُرُّوكَ لَمْ يَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ۔

"اور جب مانگو تو اللہ سے مانگو اور مدد چاہو تو اللہ سے چاہو اور یقین رکھو کہ اگر سب لوگ مل کر تمہیں کوئی فائدہ پہنچانا چاہیں تو ہرگز نہ پہنچا سکیں گے مگر جتنا کہ اللہ نے تیرے حق میں لکھ دیا ہے اور اگر سارے لوگ اکٹھا ہو کر تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو ہرگز نقصان نہ پہنچا سکیں گے مگر جتنا کہ اللہ نے تمہارے حصہ میں لکھ دیا ہے۔"

اس لیے مومن کو صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے، کسی اور سے نہیں۔

إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ (آل عمران، ۱۷۵)

"یہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں کو خوف میں مبتلا رکھتا ہے تو تم ان (شیطان کے دوستوں) سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔"

یعنی مومن اللہ سے ڈرتا ہے اور کسی سے نہیں ڈرتا، اس کے برعکس شیطان کے فریب میں آ کر شرک کرنے والا ہر چیز سے ڈرتا ہے اور مستقل طور پر خوف کا شکار رہتا ہے۔

اللہ ہی عالم کل ہے

اللہ نے دنیا کی ہر شے کو پیدا کیا ہے، اس لیے وہ ہر شے کو جانتا ہے:

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝
اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝ (ملک ۱۳، ۱۴)

"اور تم بات آہستہ سے کرو یا زور سے (وہ سب سنتا ہے) یقیناً وہ دل کے ارادوں سے باخبر ہے۔ کیا نہ جانے گا وہ جس نے پیدا کیا اور وہ باریک بین اور ہر چیز سے باخبر ہے"

اللہ کا اقتدار کائنات کی ایک ایک شئے پر ہے، اس لیے اس کے علم سے کوئی شئے مخفی نہیں، وہ نہ سوتا ہے، نہ تھکتا ہے کہ نظمِ حکومت میں خلل پڑے یا کوئی چیز نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــــُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝ (بقرہ ۲۵۵)

"اللہ ہی خدا ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، زندہ ہے قیوم (کائنات کو سنبھالے ہوئے) ہے اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند، اسی کی ملکیت میں ہیں زمین و آسمان کی تمام چیزیں، کون ہے جو اس کے حضور سفارش کرے، اس کی اجازت کے بغیر وہ جانتا ہے ان تمام چیزوں کو جو ان کے سامنے ہیں اور انھیں بھی جو ان کے پیچھے ہیں اور وہ اللہ کے علم میں سے کچھ بھی نہیں پا سکتے مگر جتنا اللہ چاہے۔ اس کی کرسی (اقتدار) آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے اور وہ اس کی نگہبانی سے نہیں تھکتا وہ بلند اور صاحبِ عظمت و کبریائی ہے"

وہی سب کی پرورش کرتا ہے، ضروریات پوری کرتا ہے اس لیے وہ سب کچھ جانتا ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○ (ہود: ۶)

"زمین پر جو بھی جاندار ہے۔ اللہ کے ذمے اس کا سامانِ زیست ہے اور وہ اس کے مستقل اور عارضی ٹھکانے کو جانتا ہے، ہر چیز (اللہ کے) واضح ریکارڈ میں ہے۔"

انسان سمیت مخلوقات کا علم بہت تھوڑا ہے، کائنات کی بے شمار اشیاء ان کے حواس اور علم سے ماوراء ہیں، یہ ان کے لیے غیب کی حیثیت رکھتا ہے جسے صرف خدا جانتا ہے:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○ (انعام ۵۹)

"اور اسی کے پاس ہیں غیب کی کنجیاں انھیں کوئی نہیں جانتا مگر صرف وہ۔ وہ خشکی اور تری کی ہر شے کو جانتا ہے، جو پتہ بھی گرتا ہے اسے جانتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ گرتا ہے اور جو تر یا خشک چیز گرتی ہے وہ سب (اللہ کے) واضح ریکارڈ میں ہے۔"

علمِ غیب، انبیاء کو بھی حاصل نہیں، سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی کہلایا گیا:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ (انعام ۵۰)

(اے نبی!) کہو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں نہ میں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔"

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۛۚ (اعراف ۱۸۸)

"اور اگر میں غیب کا علم رکھتا ہوتا تو بہت سے فائدے حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔"

علم غیب کی چند خاص باتوں کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح کیا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ (لقمٰن، ۳۴)

"یقیناً اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے، وہی بارش نازل فرماتا ہے، ماں کے پیٹ میں کیا ہے، اسے بھی جانتا ہے، کسی شخص کو نہیں معلوم کہ وہ کل کیا کرے گا اور نہ یہ معلوم کہ کس سرزمین میں اسے موت آئے گی۔ یقیناً اللہ علیم و خبیر ہے (سب کچھ جانتا ہے)"

اور صحیح بخاری میں ہے کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا:

مَنْ اَخْبَرَكَ اَنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْلَمُ الْخَمْسَ الَّتِيْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ الْاٰيَةَ فَقَدْ اَعْظَمَ الْفِرْيَةَ

"جو شخص تم سے یہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ پانچ چیزیں جانتے تھے جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ (مذکورہ بالا آیت) میں کیا ہے تو اس نے بہت بڑا جھوٹ بولا۔"

اور صحیح بخاری ہی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَاللّٰہِ لَا اَدْرِیْ وَاللّٰہِ لَا اَدْرِیْ وَ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ

"بخدا میں نہیں جانتا، بخدا میں نہیں جانتا حالانکہ میں اللہ کا رسول ہوں کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا؟"

مشرکانہ توہمات میں مبتلا لوگ خیال کرتے کہ قسمت، مستقبل یا الفاظ دیگر غیب کا علم نجومیوں، پیروں، فقیروں اور سادھوؤں کو ہے حالانکہ غیب کا علم صرف اللہ کو ہے، البتہ وہ اس علم میں سے اپنے نبیوں کو جتنا چاہے دے دیتا ہے۔

عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (جن، ۲۶، ۲۷)

"اللہ عالم الغیب ہے، وہ اپنے غیب سے کسی کو باخبر نہیں کرتا بجز رسولوں کے جنھیں وہ منتخب فرماتا ہے۔"

لیکن سارا علمِ غیب کسی کو بھی حاصل نہیں:

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ ط

(نمل، ۶۵) "(اے نبی!) کہو، آسمانوں اور زمین میں جو ہستیاں ہیں ان میں سے کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا بجز اللہ کے۔"

اللہ کا کوئی ہمسر نہیں

اللہ خالق ہے، سب مخلوق ہیں۔ اللہ مالک ہے، سب مملوک ہیں، اللہ فرماں روا ہے سب رعیت ہیں۔ اللہ پروردگار ہے، سب پرورده ہیں۔ اللہ حاجت روا ہے، سب محتاج ہیں، اللہ خدا ہے، سب بندے ہیں۔ اللہ عالمِ کل ہے، اوروں کا علم بہت تھوڑا ہے اس لیے کائنات کی کوئی

شئے اللہ کی ہمسر ہو سکتی ہے اور نہ ہے:

وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝ (اخلاص، ۴)

"اور کوئی اس کے برابر کا نہیں"

اللہ کی مانند کوئی نہیں، وہ اپنی شان میں یکتا ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ج (شوریٰ، ۱۱) "اس کی طرح کوئی شئے نہیں"

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ (اخلاص، ۱) "کہو، وہ اللہ یکتا ہے"

شرک کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ خدا کو مخلوق پر قیاس کرتا ہے اور مخلوق کو خدا پر، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا میں مخلوق کی صفات مان لی جاتی ہیں اور مخلوق میں خدا کی۔ مخلوق کی طرح دیوتاؤں کے بھی ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک، منھ، سر، پیٹ، اعضائے تناسل فرض کر لیے جاتے ہیں، اس فرق کے ساتھ ان کے بہت سے ہاتھ پیر اور سر وغیرہ ہوتے ہیں۔ مخلوق کی طرح ان کی بھی شہوانی خواہش ہوتی ہے۔ البتہ ان کی خواہش بہت زبردست ہوتی ہے، وہ انسانوں کی طرح ایک دوسرے سے حسد، بغض، کینہ اور عداوت رکھتے ہیں، آپس میں لڑتے بھی ہیں، دھوکا بھی دیتے ہیں، جیتتے بھی ہیں اور ہار بھی جاتے ہیں، نشے کے بھی شائق ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ پی کر بہک بھی جاتے ہیں۔ سوامی وویکانند فرماتے ہیں:

"یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سوم رس نشہ آور ہوتا ہے۔ اس رس کو آریہ اندر اور دوسرے دیوتاؤں پر چڑھاتے ہیں اور یہ دیوتا خود بھی اس کو پیتے تھے۔ بعض اوقات آریہ اسے کچھ زیادہ پی جاتے تھے اور اسی طرح ان کے دیوتا بھی۔ اندر بھی بعض اوقات نشے میں پایا گیا۔ ایسی عبارتیں بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اندر نے ایک بار سوم رس اتنا زیادہ پی لیا کہ وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا" (Hinduism) p. 21)

اسی طرح مخلوقات میں خدائی طاقت، خدائی علم اور خدائی صفات فرض کر لی جاتی ہیں۔ حالانکہ خدا خالق ہے اور باقی سب مخلوق اور خالق کو مخلوق اور مخلوق کو خالق پر قیاس نہیں کیا جا سکتا:

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ (نحل، ۱۷)

"تو کیا جو پیدا کرتا ہے وہ اس کی طرح ہو سکتا ہے جو پیدا نہیں کرتا۔"

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ (نحل، ۷۴)

"اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو (اللہ کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو)"

اللہ کے بیوی نہیں

میاں بیوی کا تعلق وہاں ہوتا ہے جہاں کم از کم تین باتیں ہوں:

۱ : ایک ہستی دوسری ہستی کی محتاج ہو۔

۲ : شہوانی خواہش موجود ہو اور اس نے ازدواجی تعلق کے لیے مجبور کر دیا ہو۔

۳ : میاں بیوی دونوں ہم جنس ہوں۔

اللہ تعالیٰ میں ان میں سے کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ اللہ کسی کا محتاج نہیں، نہ احتیاج اس کے شایانِ شان ہے، نہ خالق مخلوق کا محتاج ہو سکتا ہے۔

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ (محمد، ۳۸)

"اللہ (ہر چیز سے) بے نیاز ہے اور تم سب (اس کے) محتاج ہو۔"

اللہ میں شہوانی خواہش نہیں، اللہ ہر خواہش سے ماوراء ہے اور شہوانی خواہش تو بہت بڑی کمزوری ہے، جب تک اس خواہش کی تسکین نہیں ہوتی، صاحبِ خواہش کو چین نہیں آتا اس میں بسا اوقات صاحبِ خواہش

اندھا ہو جاتا ہے اور فعل وغیرہ کھو بیٹھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کمزوری سے پاک ہے، کمزوری اس کے شایانِ شان نہیں:

إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ۝ (ذاریات، ۵۸)

"یقیناً اللہ ہی رزاق ہے، صاحبِ قوت ہے، محکم ہے"

هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ (حشر، ۲۳)

"وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہی خدا ہے فرمانروا ہے (عیوب سے) پاک ہے، سراپا سلامتی ہے۔ پناہ دینے والا ہے، نگراں ہے (سب پر) غالب زبردست ہے۔ رسائی سے بالاتر ہے عظمت و کبریائی والا ہے۔ اللہ شرک سے پاک ہے جو یہ کرتے ہیں"

کوئی شے اللہ کی ہمسر نہیں، مخلوق خالق کی ہم جنس نہیں اس لیے اللہ کے بیوی نہیں:

وَأَنَّهُ تَعَالَىٰ جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا ۝ (جن ۳)

"اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے اس نے کسی کو بیوی بنایا نہ کسی کو اولاد"

مشرکانہ مذاہب کی میتھالوجی میں دیوتاؤں کے ازدواجی تعلقات کی تفصیلات ملتی ہیں۔ کیونکہ تقریباً ہر دیوتا کی بیوی ہوتی ہے، لیکن دیوتاؤں کی بے پناہ شہوانی خواہش بیوی سے نہیں بجھتی، چنانچہ وہ پوری دنیا میں دوڑ لگاتے ہیں اور عیاشی کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے حتیٰ کہ بیٹی اور بہن کو بھی نہیں چھوڑتے۔ اس سلسلے میں خدائی طاقت ان کے کام آتی ہے اور اس سے بھی کام نہیں چلتا تو دھوکا اور مکر و فریب کے

ہتھیاروں سے کام نکالا جاتا ہے۔ اس طرح کے قصوں سے ہر مشرکانہ مذہب کی میتھالوجی پُر ہے۔ شاید ہی کوئی دیوتا ہو جس کی زندگی اس کمزوری سے پاک ہو۱

اللہ کے بیٹا بیٹی نہیں

بیٹا بیٹی کا تصور بیوی اور شہوانی تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا نہ شہوانی خواہش رکھتا ہے نہ اس کے بیوی ہے، اس لیے اولاد کیسی؟ پھر وہ خالق ہے اور سب مخلوق، مخلوق اس کی اولاد نہیں ہو سکتی۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ج ــــ (انعام، ۱۰۱)

"آسمانوں اور زمین کا موجد اس کے اولاد کہاں سے ہوگی، جب کہ اس کے کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے"

اللہ کی اولاد خدا ہو نہیں سکتی کیوں کہ جو پیدا ہوا وہ خدا نہیں ہو سکتا اور مخلوق بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ اولاد کا ہم جنس ہونا ضروری ہے اور مخلوق خالق کی ہم جنس نہیں۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ (انعام، ۱۰۰)

"اور انھوں نے اللہ کی خدائی میں جنوں کو شریک بنایا حالانکہ خدا نے انھیں پیدا کیا ہے اور علم کے بغیر خدا کے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیے، اللہ پاک و برتر ہے اس بات سے جو یہ بیان کرتے ہیں"

---

۱ ہندومت کی میتھالوجی کو جاننے کے لیے مختلف "پرانوں" کا مطالعہ کرنا چاہیے یہ پران دیوتاؤں کی شہوانی حرکات کی تفصیلات سے پُر ہیں۔

"علم کے بغیر" یعنی خدا کی اولاد ہے، اس عقیدے کے پیچھے کوئی دلیل، سند یا علم نہیں، یہ اٹکل پچو کی باتیں ہیں۔ "اللہ پاک و برتر ہے" یعنی اولاد کا ہونا تصورِ الوہیت کے منافی ہے، اولاد مخلوق کو زیب دیتی ہے خدا کو نہیں۔

سب لوگ اللہ کے بندے ہیں، بندے اولاد کا مقام کیوں کر حاصل کر سکتے ہیں:

وَمَا یَنۡۢبَغِیۡ لِلرَّحۡمٰنِ اَنۡ یَّتَّخِذَ وَلَدًا ؕ اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا ؕ (مریم، ۹۲، ۹۳)

"اور یہ بات رحمٰن (اللہ) کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ اولاد اختیار کرے، آسمانوں اور زمین میں جو ہستیاں بھی ہیں سب بندہ بن کر رحمٰن (اللہ) کے حضور حاضر ہوں گی"

انسان کو اولاد کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد اس کی نسل باقی رہے۔ اس کے نامکمل کام پورے ہوں اور اس کے مال و جائداد کا کوئی وارث ہو۔ اللہ زندہ جاوید ہے، اسے نسل چلانے کی ضرورت، نہ وارث کی حاجت، نہ مددگار کی ضرورت۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے:

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبۡحٰنَهٗ ؕ هُوَ الۡغَنِیُّ ؕ (یونس ۶۸)

"انھوں نے کہا، اللہ نے اولاد بنائی ہے، پاک و برتر ہے اللہ اس سے، وہ بے نیاز ہے"

وہ قادرِ مطلق ہے، اس کا ارادہ ہی ہر کام کی تکمیل کا ضامن ہے اسے اولاد کی ضرورت نہیں:

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنۡ یَّتَّخِذَ مِنۡ وَّلَدٍ ۙ سُبۡحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَیَكُوۡنُ ؕ (مریم، ۳۵)

"اللہ کے شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی کو اولاد بنائے وہ پاک و برتر ہے (اس سے) جب وہ کسی امر کا فیصلہ فرماتا ہے تو اس سے بس یہ کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے"

اللہ بھی کسی کی اولاد نہیں۔ کیونکہ جو پیدا ہوا ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ○ (اخلاص ۳)

"اس (اللہ) کی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد"

تمام مشرکانہ مذاہب میں باپ خدا، اور بیٹا اور بیٹی خدا ہوتے ہیں۔ اگر کسی دیوتا کے اولاد نہیں ہوتی تو وہ کسی کو متبنٰی بنالیتا ہے یا کسی اور طریقے سے اولاد حاصل کر لیتا ہے، شری گنیش کا قصہ اس کی واضح مثال ہے، یہ کیسے پیدا ہوئے۔ اس کے متعلق ہندو میتھالوجی میں متعدد روایتیں ہیں، لیکن مشہور روایت یہ ہے کہ انھیں پاربتی جی نے اپنے بدن کے میل سے بنایا تھا جب ان کے شوہر شیو جی نے غلطی سے ان کا سر کاٹ دیا تو ایک ہاتھی کے بچے کا سر ان کی گردن سے جوڑ دیا گیا۔

اللہ اوتار نہیں لیتا

جب لوگ مذہبی پیشواؤں کی عقیدت میں حد سے بڑھ جاتے ہیں تو انھیں خدائی صفات کا حامل بنا دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ جب کچھ اور بڑھتی ہے تو انھیں عین خدا قرار دے دیتے ہیں اور ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنے لگتے ہیں کہ خدا نے انسانی شکل میں اوتار لیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کے بیٹے نے انسانی روپ دھارن کر لیا۔ سری رام چندر جی اور سری کرشن جی کے بارے میں ہندوؤں کی عظیم اکثریت کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ وشنو کے اوتار ہیں۔ انسانی روپ میں خدا کے آنے کا نظریہ جب عام ہو جاتا ہے تو بات اور آگے بڑھتی ہے اور خدا حیوانات

کا روپ دھارن کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ خنزیر، سُور اور کچھوے کی صورت میں خدا کا اوتار لینا بیان کیا جاتا ہے۔ یہ اوتار دنیا سے ظلم، فساد اور لامذہبیت کو مٹانے آتے ہیں۔ یہ ہے اوتار واد کا عقیدہ۔

کیا یہ بات خدا کے شایانِ شان ہے کہ مخلوقات کی طرح ماں کے پیٹ میں رہے، پیدا ہو، پرورش کیا جائے، اس کے جسم ہو، کھائے پیئے، پیشاب پاخانہ کرے، اس کے بیوی بچے ہوں، وہ دکھ اٹھائے اور مصیبتیں سہے، اس کے انسانی یا حیوانی جذبات ہوں۔ پھر وہ مر جائے یا مار دیا جائے یا خودکشی کر لے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی خالقِ کائنات کے شایانِ شان نہیں۔ خدا مخلوق کی طرح نہیں کہ اس میں اسی کی طرح کی باتیں ہوں:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (شوریٰ، ۱۱) "اس جیسی کوئی چیز نہیں"

وہ نہ پیدا ہوا ہے نہ اس سے کوئی پیدا ہوا، وہ اپنی ذات وصفات میں یکتا اور سب سے بے نیاز ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (اخلاص)

"کہو وہ اللہ یکتا ہے، اللہ صمد ہے (سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج) نہ اس کے اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد اور کوئی اس کے برابر کا نہیں"

عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا یا خدا کے بیٹے کا اوتار مانتے تھے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ (مائدہ، ۱۷) "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ ہی مسیح بن مریم ہے"

قرآن مجید نے اس شرک پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ
ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا (مائدہ ۱۷)

"کہو! تو کون اللہ کو روک سکتا ہے۔ اگر وہ ارادہ کرے کہ مسیح بن مریم، ان کی ماں اور زمین کے سب افراد کو ہلاک کر دے اور اللہ ہی کے لیے ہے اقتدار آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے مابین ہے ان سب کا۔"

یعنی کہاں خدا جو مسیح بن مریم اور تمام افراد کو ہلاک کر سکتا ہے اور کہاں مسیح بن مریم جو خود ہلاک ہونے والے ہیں، پھر خدا مسیح بن مریم کی شکل میں اوتار کیسے لے سکتا ہے۔ پھر اللہ ساری کائنات کا فرمانروا اور خالق ہے، اسے اس طرح کی حرکتیں نہ زیب دیتی ہیں، نہ اسے اس کی ضرورت ہے۔

عیسٰی بن مریم کھاتے پیتے تھے اور جو کھاتا پیتا ہے وہ خدا نہیں ہو سکتا:

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ
الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ (مائدہ ۷۵)

"مسیح بن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ایک رسول ہیں ان سے قبل بھی رسول گزر چکے ہیں، ان کی ماں صدیقہ تھیں اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔"

اوتار اس لیے آتے ہیں کہ دنیا سے ظالموں کا ظلم ختم کر دیں، لیکن اتنے سے کام کے لیے کائنات کے مالک و فرماں روا کو انسان یا حیوانوں کی شکل اختیار کرنے کی کیا ضرورت! وہ کائنات کی کسی بھی قوت کو حکم دے سکتا ہے اور وہ ظالموں کو ختم کر سکتی ہے۔ وہ آئے بغیر ایسے شخص یا اشخاص کو ان کی ساری فوج اور طاقت کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے، پھر جب یہ کام وہ بہت آسانی سے اوتار لیے بغیر کر سکتا ہے اور کرتا ہی رہتا ہے تو

اسی کام کے لیے اسے ایسے کام کرنے کی کیا ضرورت جو کسی طرح اس کے شایانِ شان نہیں۔ آخر کون شخص بہ سلامتی ہوش وحواس یہ باور کر سکتا ہے کہ خالقِ کائنات مخلوق کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

اوتار کے آنے کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسانوں کی اصلاح ہو۔ لیکن اس کام کے لیے کائنات کے مالک و فرماں روا کے انسانی روپ میں آنے کی ضرورت نہیں، بہت سے انسان موجود ہیں، اللہ ان میں سے کسی کو منتخب فرما سکتا ہے کہ وہ لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچائے اور ان کی اصلاح وتربیت کا کام کرے اور یہی وہ کرتا بھی رہا ہے، اس نے لوگوں کی اصلاح کے لیے رسول بھیجے، یہ سارے رسول انسان تھے، خدا نہ تھے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ (انبیاء، ۷)

"ہم نے تم سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے سب کے سب آدمی تھے جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے۔"

خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی انسان تھے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰهُکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ج (کہف، ۱۱۰)

"کہو! میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہیں جیسا انسان ہوں۔ میرے پاس وحی آتی ہے کہ تمہارا ایک ہی خدا ہے۔"

اللہ کے حضور کوئی سفارشی نہیں

سفارش عام طور سے اس لیے کی جاتی ہے کہ مجرم کو جرم کی پاداش سے بچا لیا جائے یا کسی شخص کو وہ چیز دلوا دی جائے جس کا وہ مستحق نہیں ہے، یہ کھلی ہوئی بددیانتی ہے اور کسی باضمیر شخص سے یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ وہ اس طرح کی سفارش کرے گا یا قبول کرے گا، لیکن مشرکین اپنے دیوتاؤں

کے بارے میں یہ تصور رکھتے ہیں کہ وہ خدا کے حضور ان کی بے جا سفارش کر دیں گے یا خدا کی گرفت سے انھیں بچا لیں گے حالانکہ خدا کے یہاں اس طرح کی کسی سفارش یا سفارشی کا گزر نہیں ہے، وہ نہ کسی کا دباؤ قبول کرتا ہے نہ غلط فیصلے کرتا ہے، نہ اسے دھوکا دیا جا سکتا ہے، وہ اپنے علمِ کامل کی روشنی میں صحیح فیصلے فرماتا ہے:

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ۝ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ۝ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ (مومن ۱۸ تا ۲۰)

"(اللہ کے حضور) ظالموں (باغیوں) کا نہ کوئی دوست ہوگا، نہ سفارشی جس کی بات مان لی جائے، وہ آنکھوں کی مجرمانہ حرکتوں اور دلوں کے پوشیدہ ارادوں کو بھی جانتا ہے۔ اور وہ صحیح فیصلہ ہی فرماتا ہے اور جنھیں یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یقیناً اللہ (ہر بات کا) سننے والا اور (ہر بات کو) دیکھنے والا ہے۔"

اس آیت کا تعلق اصلاً کفار و مشرکین سے ہے۔ اب ان آیات پر غور کیجیے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ (بقرہ، ۲۵۴)

"اے ایمان لانے والو! جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی (کہ پیسہ کام دے) نہ دوستی ہوگی (کہ کام آئے) اور نہ سفارش چلے گی۔"

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ (انعام، ۵۱)

"اور اس (قرآن) کے ذریعہ لوگوں کو آگاہ کرو جو اس بات کا اندیشہ رکھتے ہیں کہ انھیں ان کے رب کے حضور اکٹھا کیا جائے گا، (اس وقت) اللہ کے سوا ان کا کوئی کارساز نہ ہوگا اور نہ (اس کے حضور) ان کا کوئی سفارشی"۔

معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان کے سلسلے میں بھی بے جا سفارش کارگر نہ ہوگی۔ سفارش اس لیے بھی کی جاتی ہے کہ حاکم کو صحیح حالات معلوم ہو جائیں اور وہ صحیح فیصلہ کر سکے لیکن اللہ کا علم ہر شے پر حاوی ہے، اسے کیا بتایا جائیگا۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ (بقرہ، ۲۵۵)

"کون ہے جو اس (اللہ) کے حضور سفارش کر سکے اس کی اجازت کے بغیر، وہ جانتا ہے ان کے سامنے اور ان کے پیچھے کے سب حالات کو اور وہ اس کے علم میں سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے سوا اس کے جو وہ چاہے"۔

یعنی اللہ سب کچھ جانتا ہے اور انسان بس اتنا جانتا ہے جتنا اللہ اسے علم بخشے، پھر انسان اس کے علم میں کیا اضافہ کرے گا اور سفارش کرے گا تو کیا کرے گا؟

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک روایت سے اس مسئلہ پر مزید روشنی پڑتی ہے:

"ابی ہریرہؓ سے مروی ہے کہ جب آیت "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" اتری تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رشتہ داروں

کو بلایا۔ عام طور پر بھی اور خاص طور پر بھی۔ پھر فرمایا "اے بنو کعب بن لوی! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ کیونکہ میں اللہ کے ہاں تمہارے کچھ بھی کام نہیں آسکتا۔ اے بنو مرہ بن کعب! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ میں اللہ کے ہاں تمہارے کچھ بھی کام نہیں آسکتا۔ اے بنو عبد شمس! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ میں اللہ کی گرفت سے تمہیں ذرا بھی نہیں بچا سکتا۔ اے بنو عبد مناف! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ میں اللہ کے عذاب سے تمہیں ذرا بھی نہیں بچا سکتا۔ اے بنو ہاشم! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ میں اللہ کی پکڑ سے تمہیں ذرا بھی نہیں بچا سکتا۔ اے بنو عبد المطلب! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ میں اللہ کے عذاب سے تمہیں ذرا بھی نہیں بچا سکتا۔ اے فاطمہ! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، تم میرے مال میں سے جتنا چاہے مانگ لو مگر میں اللہ کی گرفت سے تمہیں ذرا نہ بچا سکوں گا۔"

ہاں، اللہ سے بندوں کے لیے رحم و کرم کی درخواست کی جا سکتی ہے بشرطیکہ خدائی قانون کی رو سے ان بندوں کے لیے دعائے رحم کی گنجائش ہو۔ کافر و مشرک کے لیے دعائے مغفرت نہیں کی جا سکتی اور اللہ دعا کی اجازت بھی دے اور دعا کرنے والے کی بات اسے پسند بھی آئے۔ بس یہی دعائے رحم و مغفرت ہے جو اللہ کے نیک اور مقرب بندے آخرت میں گنہگار مومن بندوں کے لیے کریں گے، یہ دعا قبول ہو گی اور یہ بندے اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ یہی وہ شفاعت ہے جو اللہ کے حضور کی جا سکتی ہے اور جس کا قرآن مجید اور صحیح احادیث

میں ذکر ہے :

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ۝ (طٰہٰ ۱۰۹)

"آج کے دن سفارش فائدہ نہ دے گی سوائے اس شخص کی سفارش، کہ جسے رحمٰن اجازت دے اور اس کی بات پسند بھی کرے۔"

باب دوازدہم

توحید کے عملی تقاضے

توحید کی سچی شہادت دیجیے

اعمال کی بنیاد ایمان ویقین پر ہے۔ یقین نہ ہو تو عمل کے لیے جوش وولولہ پیدا نہیں ہوتا، نہ یکسوئی، استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ متعین راہ پر چلنے کی توفیق ملتی ہے، نہ مقصدِ حیات کے لیے مصیبتیں جھیلنے، قربانیاں دینے اور ان تھک جدوجہد کرنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ حالاں کہ یہی اوصاف ہیں جو کسی فرد یا گروہ کو بامِ عروج پر پہنچاتے ہیں اور ان ہی کا فقدان قوموں اور گروہوں کو ذلّت ونکبت کے عمیق گڑھے میں گرا دیتا ہے۔ غلامی بلاشبہ کسی فرد یا قوم کے لیے ایک عذاب ہے مگر اس سے بدترین عذاب یہ ہے کہ وہ بے یقینی کی دلدل میں پھنس جائے ؎

سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی (اقبال)

اس مہلک مرض میں مبتلا ہونے کے بعد انسان ـــــ غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والا انسان ـــــ مٹی کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو جاتا ہے، وہ نہ دنیا کے کام کا رہتا ہے اور نہ آخرت کے۔ یقین اور جوشِ عمل نہ ہو تو انسان میں رہ کیا جاتا ہے؟ ناکامی، ذلت، محکومی، خوف وہراس اور مایوسی۔ ایسے لوگوں کے

لیے منفرد ہیں، خواہ ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس کسی محکوم قوم میں اگر یقین کی غیر معمولی قوت پیدا ہو جائے تو وہ کمزور اور قلیل التعداد ہونے کے باوجود غلامی کی زنجیروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہے اور کر دیتی ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اقوام و ملل کی پوری تاریخ اور افریقہ و ایشیا کی کمزور اور محکوم قوموں کی گزشتہ اور حالیہ تحریکاتِ آزادی کی کامیابی اس حقیقت کی شاہدِ عدل ہیں اور آزادی ہی پر کیا موقوف ہے، زندگی کی ہمہ جہتی اور دشوار ترین جدوجہد میں کامرانی کے لیے جو اوصاف ناگزیر ہیں اُن میں اولین بنیادی اور ناگزیر ترین وصف یقینِ محکم ہی ہے۔ اسی سے انسان سراپا عمل بنتا ہے، اسی کے باعث وہ قربانیوں سے عظیم اور مسلسل قربانیوں کے لیے آمادہ رہتا ہے اور اسی سے اس کے قدموں کو استقامت نصیب ہوتی ہے اور یہی یقین ایک گروہ کے افراد کے دلوں کو اس طرح جوڑ دیتا ہے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی اور اپنے بھائی کے فدائی و جاں نثار بن جاتے ہیں ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

یہ ہے ایمان و یقین کی اہمیت! لیکن صحیح حقائق کے بجائے اگر غلط نظریات و عقاید پر یقین ہو جائے اور علم و عرفان کے بجائے جہالت و ضلالت دل میں گھر کر جائے تو یہی یقین افراد و قوم کی تباہی کا موجب بھی ہے، اس یقین سے انسان اندھا اور گمراہ ہو جاتا ہے۔ حق بات سننے کے لیے اس کے دل کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ وہ آنکھیں رکھتے ہوئے نہیں دیکھتا اور کان رکھتے ہوئے نہیں سنتا۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (اعراف، ۱۷۹)

"اور یقیناً ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے، بہت سے جنوں اور انسانوں کو، جن کے پاس دل ہیں مگر وہ اُن سے نہیں سمجھتے۔ آنکھیں ہیں مگر اُن سے نہیں دیکھتے، کان ہیں مگر اُن سے نہیں سنتے، یہ مویشیوں کی مانند بلکہ اُن سے زیادہ گم کردہ راہ ہیں، یہ لوگ سراپا غافل ہیں۔"

اس اندھے یقین کے باعث وہ زندگی کی تباہ کن راہوں پر چل کھڑا ہوتا ہے غلط نصب العین کے لیے جیتا اور مرتا ہے اور حق کے بجائے باطل کو روئے زمین پر غالب کرنے کے لیے اپنی صلاحیتیں اور ذرائع و وسائل جھونک دیتا ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی دنیا بھی تباہ ہو جاتی ہے اور آخرت بھی اور وہ دنیا کو بھی تباہی و بربادی کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔

مادی اعتبار سے حیرت انگیز ترقی کرنے، خلا میں پرواز کی طاقت پانے اور چاند پر کمند ڈالنے کے باوجود انسان کے مسائل اگر پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہولناک جنگ کی تباہ کاریوں کی وجہ صرف یہ ہے کہ آج کا ترقی یافتہ انسان غلط نظریات اور تباہ کن نظام ہائے حیات پر یقین کر بیٹھا ہے اور ان کے قیام و بقا کے لیے قربانیاں دے دے کر خود کو اور عالمِ انسانی کو تباہ و برباد کر رہا ہے۔ بے یقینی جتنی غلط ہے اس سے کہیں زیادہ غلط اندھا وشواش (Blind Faith) اور جاہلانہ اذعان و یقین ہے اور آج کی دنیا کی عظیم ترین اکثریت یا بے یقینی میں مبتلا ہے یا شرک و الحاد پر ایمان لائے ہوئے ہے اور آپ جانتے ہیں کہ شرک و الحاد نہ صرف یہ کہ غلط اور باطل

بلکہ نوع انسانی کے لیے مہلک و تباہ کن بھی ہیں۔

دنیا کی کامرانی ہو یا آخرت کی نجات و فلاح۔ دونوں کے لیے حق پر ایمان و یقین بنیادی اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر کامیابی کی راہ پر ایک قدم بھی نہیں اٹھ سکتا۔ یہ بنیاد صحیح طور پر رکھ دی جائے تو زندگی کی پوری عمارت صحیح طور پر اٹھتی ہے، بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی ہے اور نیچے سے اوپر تک محکم و استوار رہتی ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا۔ (ابراہیم، ۲۴)

"کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ نے کیسی مثال بیان فرمائی، کلمۂ طیبہ (توحید) کی مثال عمدہ و پاکیزہ درخت کی سی ہے جس کی جڑ (زمین میں) محکم ہو، جس کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوں اور جو ہر دم اپنے رب کے اذن سے پھل دیتا رہتا ہو۔"

شرک و الحاد کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان کی بنیاد پر جو عمارت اٹھے گی وہ ٹیڑھی بھی ہوگی اور کمزور بھی اور اپنے رہنے والوں سمیت کسی وقت بھی زمین پر آ رہے گی۔

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ (توبہ، ۱۰۹)

"تو کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی (زندگی کی) عمارت اللہ کے تقویٰ اور اس کی رضا پر اٹھائی یا وہ جس نے اپنی (زندگی کی) عمارت وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر (بے بنیاد نظریات یا بے یقینی) پر اٹھائی تو وہ اُس سمیت دوزخ کی آگ میں جا گری۔"

توحید پر ایمان نہ ہو تو انسان خدا کا بندہ نہیں بن سکتا، وہ شرک میں مبتلا ہونے سے نہیں بچ سکتا۔ وہ خدا کی بندگی نہ کرے گا تو مخلوق پرستی میں مبتلا ہوگا، وہ نفس کا بندہ بنے گا۔ شیطان کی بندگی کرے گا۔ اپنے جیسے انسانوں کی غلامی کا طوق اس کے گلے میں پڑے گا۔ اپنے سے کمتر درجہ کی مخلوقات۔ درخت، پتھر، دریا، پہاڑ، زمین، جانور، کیڑے، مکوڑے سے کے آگے سر عبودیت خم کرے گا۔ فرشتوں، جنوں اور دیوؤں کو معبود بنائے گا، اپنے ہاتھ سے بت تراشے گا اور اپنی قسمت اور دنیا کا اقتدارِ اعلیٰ ان کے حوالے کر دے گا۔ ایسے انسان کی دنیا تو تباہ ہوگی ہی، اس پر آخرت کی نجات کے دروازے بھی بند ہو گئے۔ یہ شخص کائنات کے مقتدرِ اعلیٰ کا باغی ہے، اس کی مغفرت کیونکر ہو سکتی ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ (النساء: ۴۸)

"اللہ اس بات کو معاف نہ فرمائے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اور اس سے کم تر درجہ کے گناہ کو، جس کے لیے چاہے گا معاف فرمائے گا۔"

ایمان کی اہمیت صرف اس لیے نہیں ہے کہ وہ یقین کا دوسرا نام ہے اور یقین عمل اور سعی و جہد کی بنیاد ہے۔ ایمان یقین کے ساتھ عمل بھی ہے۔ بنیادی اور اہم ترین عمل، ایک انسان سوچتا ہے، سمجھتا ہے، مختلف پہلوؤں اور دلیلوں کو تولتا ہے۔ بالآخر کسی نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے، پھر پورے عزم کے ساتھ اُسے اپناتا ہے۔ شعور کے ساتھ اُسے پوری زندگی کی اساس و بنیاد بناتا ہے اور اس بات کا اعتراف و اعلان بھی کرتا ہے، اب جا کر یقین ایمان کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص حقیقت کو پا لے اور اسے اس کا یقین بھی ہو جائے لیکن وہ کسی وجہ سے حقیقت کو قبول کرنے اور اسے زندگی کی

کی اساس بنانے پر آمادہ نہ ہو تو اس کا شمار اہلِ کفر میں ہوگا اور اس کا انجام وہی ہوگا جو اللہ کے باغیوں کا ہوتا ہے۔ قومِ فرعون کے بارے میں قرآن مجید نے کہا :

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ○ (نمل، ۱۴)

"اور انھوں نے ظلم و سرکشی کی راہ سے ہماری آیتوں کا انکار کیا حالانکہ اُن کے دل اُن پر یقین کر چکے تھے تو دیکھو مفسدوں کا انجام کیسا ہوا۔"

مردِ مومن توحید کو صرف قبول ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی بنیاد پر کچھ لوگوں سے کٹتا اور کچھ لوگوں سے جڑتا ہے، ایک اُمت سے نکلتا اور دوسری امت کا جز بنتا ہے اور اپنے ایمان کی خاطر عزیز ترین رشتوں کو توڑ کر رکھ دیتا ہے، جو ایسا نہ کرے قرآن اسے صاحبِ ایمان تسلیم نہیں کرتا۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ (مجادلہ، ۲۲)

"جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوں تم نہ پاؤ گے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہوں خواہ وہ اُن کے باپ، اُن کے بیٹے، اُن کے بھائی اور اُن کے خاندان ہی کے لوگ کیوں نہ ہوں۔"

وہ جب لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ۔ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں۔ کہتا ہے تو نفس سمیت غیر اللہ کی الوہیت و بندگی کا انکار کرتا اور اپنی پوری زندگی کو اللہ کی بندگی اور اس کے قانون کی والہانہ اطاعت میں دے دیتا ہے جو اپنے آپ کو خدا کی بندگی میں نہ دے قرآن اس کے دعوئے ایمان کو تسلیم نہیں کرتا :

وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِنْهُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ۝ (نور، ۴۷)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور رسول پر اور ہم نے (خدا و رسول کی) اطاعت قبول کی، پھر ان میں کا ایک گروہ اس کے بعد (خدا اور رسول کی اطاعت سے) منہ موڑتا ہے، ایسے لوگ سرے سے مومن نہیں ہیں۔

یہی نہیں، ایمان ہی کی بنیاد پر مومن کی صلح و جنگ ہوتی ہے اور وہ اپنے عقیدہ کے تقاضوں پر عزیز ترین مفادات ہی کو نہیں، جان و مال، اولاد، ہر چیز کو بے تامل قربان کر دیتا ہے، جو لوگ ایسے نہ ہوں قرآن ان کے ایمان کو باور نہیں کرتا۔

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ۝ إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ ۝ (توبہ، ۴۴، ۴۵)

"اور جو لوگ اللہ اور آخرت پر (سچ مچ) ایمان رکھتے ہیں وہ (اے نبی!) تم سے یہ درخواست نہیں کرتے کہ انھیں (راہ خدا میں) جان و مال سے جہاد کرنے سے معاف کر دیا جائے، اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ تم سے اس طرح کی درخواست تو وہی کرتے ہیں جن کا ایمان نہ اللہ پر ہے اور نہ آخرت پر (اس کے بجائے ان کے دلوں میں شکوک ہیں تو وہ ان شکوک میں غلطاں و پیچاں ہیں"۔

یہ ہے ایمان اور اس کی شہادت کی حقیقت! ظاہر ہے کہ یہ محض ایک قلبی کیفیت یا حرکت انسانی کا نام نہیں ہے، یہ بجائے خود ایک عمل ہے دنیا کا سب سے بڑا، سب سے اہم سب سے زیادہ دور رس انقلابی عمل ہے

چو می گویم مسلمانم بلرزم   کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را   (اقبالؒ)

توحید کا اولین تقاضا یہ ہے کہ یقین کی پوری گہرائی، عزم کی انتہائی پختگی اور مفہوم کے کامل شعور کے ساتھ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی شہادت دی جائے یہی اسلام کا نقطۂ آغاز ہے اور اسی پر آخرت کی نجات و فلاح منحصر ہے:

مَا مِنْ اَحَدٍ یَّشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ صِدْقًا مِّنْ قَلْبِہٖ اِلَّا حَرَّمَہُ اللّٰہُ عَلَی النَّارِ

(بخاری۔ مسلم) "جو شخص بھی اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور یہ گواہی سچے دل سے ہو، اللہ تعالیٰ اسے دوزخ پر حرام کر دے گا (دوزخ سے محفوظ رہے گا۔"

دینِ حق ـــــ اسلام ـــــ ایک وسیع اور جامع نظامِ زندگی ہے مگر اس کا خلاصہ دو باتوں میں آجاتا ہے، مردِ مومن توحید کی شہادت دے اور زندگی بھر اس پر جما رہے۔ حدیث میں ہے:

عَنْ سُفْیَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ الثَّقَفِیِّ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قُلْ لِّیْ فِی الْاِسْلَامِ قَوْلًا لَّآ اَسْئَلُ عَنْہُ اَحَدًا بَعْدَکَ قَالَ قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ ـــــ (مسلم)

"سفیان بن عبداللہ ثقفی سے مروی ہے، انھوں نے کہا، میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! اسلام کے بارے میں ایک ایسی (جامع) بات مجھے بتا دیجئے کہ آپ کے بعد کسی اور سے مجھے پوچھنا نہ پڑے، فرمایا کہو، میں اللہ پر ایمان لایا، پھر (اس پر) جم جاؤ۔"

توحید کی سچی شہادت کی یہی اہمیت ہے جس کے باعث اسے دین کی اولین اور اہم ترین بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

ارشاد ہے :

بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ (بخاری، مسلم)

"اسلام (کی عمارت) پانچ بنیادوں پر استوار ہے۔ گواہی دینا اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا"۔

اسلام میں عبادات کی غیر معمولی اہمیت ہے جیسا کہ مذکورہ بالا احادیث سے واضح ہوتا ہے، لیکن اسی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبادات سے بھی پہلے ایمان اور اس کی شہادت کا مقام ہے اور شہادت میں بھی اولین شے توحید کی شہادت ہے۔

توحید پر ایمان کیا ہے؟ ذیل میں ہم اس پر مختصراً روشنی ڈالیں گے:

اللہ کائنات کا لاشریک خالق ہے۔ باقی سب اس کی مخلوق ہیں، اللہ کائنات اور اس کی ہر شے کا مالک ہے اور باقی سب اس کے بندے اور مملوک ہیں۔ اللہ کائنات اور ہم سب انسانوں کا فرماں روا اور مقتدر اعلیٰ (Blind Faith) ہے اور باقی سب اس کی رعیت ہیں، زمین سے آسمان تک ہر شے کا رازق و پروردگار صرف وہ ہے اور سب کے سب اس کے محتاج و دستِ نگر ہیں، حاجت روا، مشکل کشا، فریادرس اور دست گیر صرف وہ ہے، باقی سب مجبور و بے بس ہیں، عزت، ذلت، دولت، حکومت، اولاد، رزق، صحت، بیماری، نفع، نقصان، زندگی، موت، قسمت اور مستقبل سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے اور کسی کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے دعاؤں کا وہی جواب دیتا ہے اور مرادیں وہی بر لاتا ہے۔ اس کے حضور کوئی سفارش

نہیں، وہ ہر ایک کی سنتا اور بطورِ خود ہر ایک کی ضرورت پوری کرتا ہے دنیا کی ہر شے کا اسے علم ہے اور ہمہ گیر علم اسی کو حاصل ہے، اس کے نہ بیوی ہے، نہ بیٹا بیٹی، نہ ہمسر و شریک، وہ ان تمام کمزوریوں سے پاک و برتر ہے، معبود صرف وہ ہے باقی سب بندے ہیں، پرستش، سجدہ، رکوع، قربانی، نذر، طواف، دعا اور عبادت کی جملہ اقسام اسی کے لیے ہیں اور کوئی ان کا مستحق نہیں، بندگی و غلامی اسی کی کی جانی چاہیے، اس کے سوا کسی کے لیے روا نہیں، وہی جائز قانون ساز اور اسی کا قانون صحیح قانون ہے، اس کے علاوہ ہر قانون غلط ہے۔ وہ انسانوں کی اصلاح اور ظلم و فساد کے استیصال کے لیے انسان یا حیوان کے روپ میں اوتار نہیں لیتا بلکہ انسانوں میں سے ایک بہترین انسان کو چنتا، اس کی تربیت کرتا، اس پر اپنا قانون نازل کرتا اور اصلاح اور ظلم و فساد کے استیصال پر اسے مامور و متعین فرماتا ہے۔ یہ ہے توحید کا صحیح تصور[1] اور کامل یقین اور قلب کے پورے انشراح کے ساتھ اسے قبول کرنے، زندگی کی اساس بنانے اور جرأت و عزم کے ساتھ اسے اپنانے کا اعلان کرنے کو ایمان باللہ یا توحید کی شہادت کہتے ہیں معمولی غور و فکر کے بعد آپ بہ آسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اس ایمان کے بعد زندگی وہ تبدیلیاں لازماً رونما ہونی چاہئیں جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں انھیں عین ایمان قرار دیا گیا ہے اور ان کے موجود نہ ہونے پر ایمان کے وجود ہی سے انکار کر دیا گیا ہے۔ یہ ہے توحید کا اولین اور بنیادی عملی تقاضا، یہ اگر موجود نہ ہو تو زندگی توحید کی اساس پر استوار نہیں ہو سکتی اور ناقص یا کمزور ہو تو زندگی کی پوری عمارت ناقص یا کمزور رہے گی۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو باب "اسلام کا تصورِ توحید"

پرستش صرف اللہ کی کیجیے

پچھلے صفحات میں یہ بات گزر چکی ہے کہ اللہ خالق ہے اور انسان مخلوق، اللہ مالک ہے اور انسان مملوک، اللہ مقتدرِ اعلیٰ و فرمانروا ہے اور انسان بندہ و رعیت، اللہ حاجت روا و مشکل کشا ہے اور انسان سراپا احتیاج، زندگی، موت، عزت، ذلت، دولت، حکومت، اولاد، صحت، مرض، رزق، نفع، نقصان، قسمت اور دنیا کی ہر نعمت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور انسان اس کے آگے بے بس و دستِ نگر۔ یہی نہیں، اللہ محسن و منعم بھی ہے وہ ہر آن اپنی نعمتوں کی بارش کر رہا ہے۔ انسان کا وجود، اس کے اعضا، اس کی صلاحیتیں اور قوتیں، اس کے ذرائع و وسائل اور زمین سے آسمان تک جو کچھ ہے اور جو بالواسطہ یا بلاواسطہ انسان کے کام کرتا ہے اور جن کی بدولت انسان جی رہا اور پل رہا ہے، وہ سب اللہ کی دین ہے۔ یہ ہے اللہ! ایک ایسی ہستی کے ساتھ انسان کا کیا تعلق ہونا چاہیے؟ یہی نا کہ وہ عاجزی و بندگی، عقیدت و محبت اور خوف و احتیاج کے عمیق ترین جذبات کے ساتھ اس کے آگے جھک جائے اور جو اس کا مالک و آقا اور مقتدرِ اعلیٰ و معبود ہے اسے عملاً مالک، مقتدرِ اعلیٰ اور معبود بنالے بس اسی کا نام پرستش و عبادت ہے۔ دست بستہ کھڑا ہونا، رکوع کرنا، سر زمین پر رکھ دینا، طواف کرنا، دعا مانگنا، قربانی کرنا، روزہ رکھنا، نذر ماننا، دان پُن کرنا، جپ اور ذکر کرنا، دھیان اور مراقبہ کرنا، مصیبت کے وقت دستگیری کے لیے پکارنا، پوجیہ، ان داتا، داتا، بھگوان، خداوند اور خدا کہنا، نمستے، نمسکار اور بندگی کے الفاظ استعمال کرنا، کسی بھی طرح پوجا کرنا، یہ سب عبادت کی مختلف شکلیں ہیں اور عبادت کی تمام شکلوں کا مستحق صرف اللہ ہے۔

پرستش عاجزی و نیازمندی کی انتہا ہے، یہ نہ اپنے سے کم تر درجہ کی مخلوقات کے لیے صحیح ہے، نہ برتر مخلوقات کے لیے، کوئی پتھر، کوئی بُت، کوئی درخت، کوئی دریا، کوئی پہاڑ، کوئی جانور، کوئی قبر، کوئی استھان کوئی بزرگ، کوئی انسان، کوئی مذہبی پیشوا، کوئی جن، کوئی فرشتہ، کوئی مفروضہ دیوتا، کوئی ستارہ اور سیارہ، غرض کوئی مخلوق اس کی مستحق نہیں کہ آدمی اس کے آگے جھکے اور اسے اپنا مالک و معبود بنائے۔ اللہ کے سوا انسان کا، نہ کوئی خالق ہے نہ مالک، نہ پروردگار، نہ فرمانروا، نہ حاجت روا، نہ ان داتا نہ کائنات کا کوئی خالق ہے نہ مالک، نہ انسان کیوں اس کے آگے جھکے اور کیوں اس کی پرستش و عبادت کرے؟ کسی مخلوق کے آگے جھکنے سے آخر فائدہ بھی کیا؟ مخلوقات کے پاس دھرا کیا ہے۔ ہر مخلوق اللہ کے حضور بے بس و دست نگر، نفع، نقصان، زندگی، موت، ہر چیز میں اس کی محتاج، ہر ایک کی قسمت، ہر ایک کا مستقبل اور ہر ایک کی کامرانی و ناکامی اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ مخلوقات ہمارے ذرا بھی تو کام نہیں آسکتیں نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں، وہ ہمیں خدا کی گرفت اور خدا کے عذاب سے بھی تو نہیں بچا سکتیں، وہ تو خدا کے آگے بالکل مجبور و بے بس ہیں۔ پھر ان سے کیوں لو لگائیں، اُن کے آگے ہاتھ پھیلائیں، مصیبت کے وقت انھیں کیوں پکاریں، ان کے آگے کس لیے دست بستہ کھڑے ہوں اور سجدہ ریز ہوں؟ اللہ کے آگے تو انسان عاجز ہے، حقیر ہے، محتاج ہے، دست نگر ہے، بے بس ہے، اس کے آگے اگر وہ اپنی عاجزی و نیازمندی اور بندگی و احتیاج کا اظہار کرتا ہے تو حقیقت کے عین مطابق ہے، وہ اللہ کا بندہ ہی تو ہے، وہ اگر دست گیری کے لیے اللہ کے آگے ہاتھ پھیلاتا، مصیبت کے وقت اُسے پکارتا اور ضرورت پڑنے پر اس سے دعا کرتا ہے تو بالکل ٹھیک کرتا ہے، اللہ ہی تو حاجت روا، مشکل کشا، دست گیر اور فریاد رس ہے، وہ

اگر اس سے نہ مانگے گا تو کس سے مانگے گا اور مصیبت کے وقت اُسے نہ پکارے گا تو اور کسے پکارے گا مگر کسی مخلوق کے آگے تو وہ عاجز نہیں، کوئی مخلوق تو اس کی مالک و فرمانروا نہیں، کوئی مخلوق تو اس کی حاجت روا و مشکل کشا نہیں پھر وہ اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے عاجزی و نیازمندی کے ساتھ کیوں ان کے آگے جھکتا ہے، کیوں ان کے آگے ہاتھ پھیلاتا اور انھیں مصیبت کے وقت پکارتا ہے اور کیوں انھیں اپنا معبود اور خدا بناتا ہے، کیا یہ انتہائی حماقت و جہالت نہیں؟ کیا یہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو ذلیل کرنا اور اپنی خودی کو خود اپنے ہاتھ سے ملیا میٹ کرنا نہیں ہے؟ کیا یہ پستی و بے کرداری کا انتہائی گھناؤنا مظاہرہ نہیں جب کہ اس کا حاصل کچھ بھی نہ ہو؟ شرک سب سے بڑی جہالت، سب سے بڑی حماقت اور سب سے بڑی پستی و ذلت ہے۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (حج ۳۱)

"اور جو شرک کرتا ہے گویا وہ آسمان سے زمین پر آ گرا۔"

شرک حماقت و جہالت اور پستی و ذلت ہی نہیں، ناشکری اور احسان فراموشی بھی ہے، انسان کو سب کچھ اللہ نے دیا ہے، وہ بغیر مانگے انسان کو وہ سب کچھ دے رہا ہے جس کی کسی پہلو سے اسے ضرورت ہو، اس نے انسان کی ضروریات کے لیے زمین کو اپنی نعمتوں کے خزانوں سے مالا مال کر دیا ہے، کائنات کو اس کی خدمت کے لیے مصروف عمل رکھا ہے اور زمین و آسمان کی بے شمار چیزوں کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ مگر انسان ایسے محسن و منعم خدا کو بھول کر اس کی دی ہوئی نعمتوں، اس کے پیدا کیے ہوئے دل، دماغ جسم اور سر کو اس کی مخلوقات کے آگے جھکا رہا ہے، ان کی پرستش و بندگی میں لگا ہوا ہے اور ان سب چیزوں کو لگا رہا ہے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی نہ اس کا خالق و مالک ہے، نہ حاکم و فرمانروا، نہ پروردگار و محسن، وہ سب کچھ پاتا

تو خدا سے ہے اور انتہائی عقیدت و محبت اور عاجزی کے ساتھ شکر ادا کرتا ہے اور ان کا جو اُسے کچھ نہیں دیتے۔ کیا یہ احسان فراموشی نہیں ہے؛ دنیا میں ایک انسان دوسرے انسان پر کوئی احسان کرتا ہے تو اس کی ناشکری کرنے والے کو ہم احسان فراموش کہتے اور ایسے انسان کو انسانیت سے گرا ہوا سمجھتے ہیں، حالانکہ کوئی انسان کسی انسان کو کہاں سے دیتا ہے، وہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں میں سے کوئی نعمت خدا ہی کی توفیق سے دیتا ہے پھر جو شخص اُس خدا کی ناشکری کرے جو محسنِ حقیقی ہے، جو سب کچھ اپنے ہی پاس سے دیتا ہے، جو ہر آن اپنی نعمتوں کی بارش کرتا رہتا ہے اور جس کے احسانات اور نعمتوں ہی کے بل پر انسان جی رہا اور پل رہا ہے کیا ایسا شخص دنیا کا سب سے بڑا ناشکرا نہیں ہے اور کیا اسے انتہائی بے کردار اور انسانیت سے بدرجہ گرا ہوا تصور نہ کرنا چاہیے:

إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ ۝ (ابراہیم ۳۴)

"انسان بڑا ہی ظالم اور بڑا ہی ناشکرا ہے۔"

شرک احسان فراموشی و ناشکری ہی نہیں، ظلم بھی ہے، دنیا کی ہر شے کی طرح انسان کا وجود اور اس کے اعضاء بھی اللہ ہی کی بندگی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اور پوری کائنات کی طرح تکوینی امور میں یہ سب اللہ کی بندگی و اطاعت ہی کر رہے ہیں، آنکھ دیکھنے پر مامور ہے اور وہ دیکھتی ہے، کان سننے کے لیے تخلیق کیا گیا ہے اور وہ سنتا ہے، دماغ سوچنے اور جسم پر کنٹرول کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور وہ اپنے مقرر کردہ فرائض انجام دیتا ہے، یہی حال بدن کے چھوٹے بڑے ہر عضو اور عضو کے ہر حصہ کا ہے، وہ بلاشرکتِ غیرے صرف اللہ کی بندگی پر مامور اور اللہ کی بندگی میں مصروف ہیں۔ مگر ظالم و جاہل انسان ان اعضاء کی فطرت کے خلاف انھیں غیر اللہ کی پرستش و بندگی میں لگاتا ہے۔ دل میں غیر اللہ کے لیے عاجزی و نیازمندی کے جذبات رکھتا

ہے، دماغ میں مشرکانہ افکار و تصورات رکھتا ہے، سر ان کے آگے جھکاتا ہے ہاتھ ان کے آگے پھیلاتا ہے، قدموں سے ان کی طرف چل کر جاتا ہے، ناک ان کے آگے رگڑتا ہے، زبان سے ان کا ذکر اور ان کی حمد کرتا ہے اور خدا کے بنائے ہوئے اعضاء کے ساتھ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں میں سے بھی غیراللہ کے آستانوں پر چڑھاتا ہے، کیا یہ ظلم نہیں ہے؟ اپنے وجود، اپنے اعضاء اور دنیا کی چیزوں کو ان کی فطرت کے خلاف استعمال کرنا اور استعمال کرتے رہنا، ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ تو ظلم عظیم ہے۔ یہ تو دنیا و آخرت میں ان کی تباہی بربادی کا موجب ہے۔ شرک کی راہ اختیار کرنے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ انسان اور نظام کائنات اور انسانی اعضا کی فطرت اور ان کے اختیاری عمل میں تصادم رونما ہو جائے اور وہ انسان کو اور اس کے وجود کو تباہ کر کے رکھ دے۔ مشرک انسان اپنے اوپر یہ تباہی خود لاتا ہے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ مشرک سب سے بڑا ظلم ہے۔

شرک ظلم ہی نہیں، سرکشی و بغاوت بھی ہے، آپ کسی جائیداد کی ملکیت میں اس کے اصل مالک کے ساتھ دوسروں کو، جن کا اس جائیداد میں کوئی حصہ نہیں ہے شریک ٹھہرانے لگیں اور ان کے ساتھ وہی رویہ اختیار کرنے جو جائیداد کے مالک کے ساتھ کیا جاتا ہے تو آپ کا یہ فعل ناانصافی ہی نہیں سازش اور دشمنی پر بھی محمول کیا جائے گا، آپ کسی ملک کے جائز اور آئینی فرمانروا کے بجائے کسی اور کو اس کا فرمانروا تسلیم کر لیں اور اس ملک کے شہری اور جائز فرمانروا کی رعیت ہوتے ہوئے ناجائز فرمانروا کی تابعداری قبول کر لیں یا خود فرمانروائی کے داعی بن جائیں تو اسے سرکشی ہی نہیں صریح بغاوت تصور کیا جائے گا اور آپ کو وہی سزا دی جائے گی جو کسی باغی کو دی جاتی ہے، ٹھیک یہی حال شرک کا ہے، اللہ کائنات اور اس کی ایک ایک شے کا لاشریک خالق و مالک ہے، لیکن مشرکین کا خیال ہے کہ کائنات

سے کہ فلاں فلاں حصوں کے فلاں فلاں دیوتا مالک ہیں اور ان کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ زمین کے فلاں فلاں قطعات کے فلاں فلاں راجہ مالک ہیں اور وہ انھیں ان داتا، بھگوان، پوجیہ، سوامی، نہ جانے کیا کیا کہنے لگتے ہیں اور ان کے آگے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ اپنی زندگی اور اپنے ذرائع و وسائل کا مالک خود اپنے آپ کو سمجھتے ہیں اور یہاں خود اپنی مرضی چلاتے ہیں۔ اللہ کائنات کا خالق و مالک ہی نہیں، لا شریک مقتدرِ اعلیٰ و فرمانروا بھی ہے مگر مشرکین کا تصور یہ ہے کہ سورج کا دیوتا کوئی اور ہے، چاند کا کوئی اور، ستاروں کا کوئی اور بارش کا کوئی اور، اور ہواؤں کا کوئی اور۔ اس طرح کائنات کی پوری مملکت کے حصے بخرے ہو جاتے ہیں اور خدا کی مالکیت و فرمانروائی کے لیے کچھ بھی نہیں بچتا، لے دے کر زمین رہ جاتی ہے اسے مشرکین مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ مشرک انسان کا اپنا نفس اور اپنا وجود رہ جاتا ہے اس کا مختار وہ خود اپنے آپ کو سمجھتا ہے اور پھر دیوتاؤں کے لیے پرستش، بادشاہوں کے لیے بندگی و اطاعت اور نفس کی خواہشات کی پیروی کا چکر شروع ہو جاتا ہے جو زندگی کی آخری سانس تک چلتا ہے، کیا یہ خدا کی رعیت ہوتے، اس کی مملکت میں بستے اور اس کے سہارے جیتے ہوئے اس سے کھلی ہوئی بغاوت نہیں ہے؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو یہ ناقابلِ معافی جرم ہے اور اس کی شدید ترین سزا مشرک کو مل کر رہے گی۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (نساء ۴۸)

"یقیناً اس جرم کو اللہ معاف نہ فرمائے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اور اس سے کمتر درجہ کے گناہ کو جس کے لیے چاہے گا معاف فرما دے گا۔"

شرک سرکشی و بغاوت ہی نہیں، اللہ کی توہین بھی ہے، مشرکین مخلوق کو

خالق کا مملوک کو مالک کا، بندہ کو معبود کا، رعیت کو فرمانروا کا اور محتاج وبے بس کو غنی اور حاجت روا کا ہمسر ٹھہراتے ہیں، مخلوقات کو خدا کے اقتدارِ اعلیٰ میں ساجھی اور خدا کی مخصوص صفات سے متصف قرار دیتے ہیں۔ انھیں خدا کی طرح علیم وخبیر، سمیع وبصیر، حاضر وناظر، مجیب الدعوات، غوث ومغیث اور فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ مانتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اللہ کی مخلوقات اور بندوں کو اس کے برابر لا کھڑا کر دیتے ہیں اور ان مخلوقات کے ساتھ عقیدت، بندگی اور پرستش کا وہ رویہ اختیار کرتے ہیں جو بندے کو اپنے خدا ہی کے ساتھ اختیار کرنا چاہیے۔ پھر وہ اللہ کی مقدس ومنزہ ذات کو مخلوقات کی ناقص صفات سے داغدار بناتے ہیں، اسے انسانی حاکموں کی طرح کمزور تصور کرتے ہیں جو تنہا حکومت نہیں کر سکتے اور اعوان وانصار کے محتاج ہوتے ہیں اور پھر دیوتاؤں کی ایک طویل فہرست تیار ہو جاتی ہے۔ جن میں سے ہر ایک کائنات کے ایک حصہ کا خود مختار فرمانروا ہوتا ہے۔ یہ دیوتا آپس میں بھی اور فرمانروائے کائنات سے بھی لڑتے رہتے ہیں۔ وہ خدا کو مخلوق کی طرح محتاج و دستِ نگر تصور کرتے ہیں اور وہ بھی خود اسی کی پیدا کی ہوئی مخلوقات کا جنھیں وہ ہر دم پال رہا ہے اور جو زندہ رہنے کے لیے خدا کے محتاج و دستِ نگر ہیں، وہ انسان وحیوان کی طرح خدا کو بھی شہوانی قوت کے ہاتھوں مجبور پاتے ہیں اور اس کے بھی بیوی بچے، بیٹے، بیٹیاں ہوتی ہیں، یہی نہیں، اُن کی نظر میں خدا کی طرح اس کی شہوانی قوت بھی زبردست اور بے پناہ ہوتی ہے۔ حتیٰ اس کی عیاشی وبدکاری سے اس کے پرستاروں اور اس کے اعزہ اور اولاد کو پناہ نہیں ملتی۔ وہ اسے خوشامدی اور بد دیانت بھی سمجھتے ہیں کہ سفارش کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا اور پھر وہ بزرگوں، دیوتاؤں، جنوں اور فرشتوں کو اس کے حضور سفارشی ٹھہراتے اور انھیں راضی کرنے کے لیے پرستش، نذر و نیاز، چڑھاوے، قربانی، غرض عبودیت کی ہر رسم ادا کرتے ہیں، وہ اسے جاہل

بھی خیال کرتے ہیں کہ دوسرے کے بتلائے بغیر اُسے صحیح صورت حال کا علم نہیں ہوتا اور دیوتا بھی تصور کرتے ہیں کہ بزرگوں اور دیوتاؤں کے دباؤ میں آ کر غلط اور نا منصفانہ کام بھی کر بیٹھتا ہے۔ پھر ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اللہ کو انسانوں کی اصلاح اور ظلم و فساد کے انسداد کے لیے انسان یا حیوان کے روپ میں خود آنا پڑتا ہے اور پیدائش، بیماری، دُکھ، قتل و غارت، موت، خودکشی ہر طرح کے مصائب و مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ ہے اللہ کا وہ نقشہ جو مشرکانہ عقائد و تصورات کے تحت بنتا ہے، کیا اس سے بڑھ کر اللہ کی کوئی توہین ہو سکتی ہے:

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ○ اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ○ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○ (حج ۴۷، ۷۶)

"انھوں (مشرکین) نے اللہ کا مرتبہ صحیح طور سے نہیں پہچانا (کہ اس کے اقتدار میں دوسروں کو شریک کر دیا) بے شک اللہ صاحبِ قوت اور زبردست و غالب ہے (کمزور نہیں کہ معاونین کا محتاج ہو) اللہ فرشتوں میں سے پیامبر چنتا ہے اور انسانوں میں سے (یہ لوگ نہ خدا ہیں نہ خدا کے اوتار بلکہ پیغامبر ہیں) بلاشبہ اللہ (ہر بات کا) سننے والا (ہر چیز کا) دیکھنے والا ہے۔ وہ انسانوں کے سامنے کی چیزوں کو بھی جانتا ہے اور ان چیزوں کو بھی جو ان کی نگاہ سے اوجھل ہیں (اس کے حضور سفارش کی ضرورت نہیں) اور اللہ کی طرف سارے معاملات لوٹائے جاتے ہیں (اللہ ہی سارے معاملات کا فیصلہ فرماتا ہے۔ کسی اور کا اس میں دخل نہیں۔)"

مشرکین مکہ اور عیسائی خدا کے لیے اولاد کے قائل تھے۔ اللہ تعالیٰ اس

کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے :

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ○ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ○
تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ
الْجِبَالُ هَدًّا ○ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ○ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ
أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ○ إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ○
لَقَدْ أَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ○ وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ فَرْدًا ○ (مریم ۸۸ تا ۹۵)

"اور انھوں نے کہا کہ رحمٰن (خدا) نے بیٹا بیٹی بنائے ہیں (اے مشرکو!) سخت بے ہودہ بات ہے جو تم گھڑ کر لائے ہو، قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں اس بات سے کہ ان لوگوں نے رحمٰن (خدا) کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا۔ رحمٰن کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا، بیٹی بنائے (زمین اور آسمانوں کے اندر جو لوگ بھی ہیں سب اس کے حضور بندے کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں، وہ ان کو محیط ہے اور اس نے ان سب کا شمار کر رکھا ہے اور سب قیامت کے روز فرداً فرداً اس کے سامنے حاضر ہوں گے"۔

شرک کی یہی سنگینی ہے جس کے باعث اللہ نے بندوں کو اس کے خطرے سے بچانے کے لیے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری کیا، یہ نبی ابتدائے آفرینش سے ہر قوم اور ہر ملک میں آتے رہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی، اور آخری کڑی تھے۔ ان سب انبیاء کا بنیادی پیغام اور ان کی دعوت کا مرکزی نقطہ ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ اللہ کی عبادت و پرستش و بندگی کرو اور اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ــــــ (انبیاء، ۲۵)

اور (اے محمدؐ!) ہم نے تم سے قبل جو رسول بھی بھیجے ان سب کی طرف یہی وحی بھیجتے رہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے تو (اے انسانو!) تم میری ہی عبادت کرو۔"

اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی پیغام کے ساتھ بھیجا گیا:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا ۝

(انعام، ۱۵۱) "(اے محمدؐ!) ان سے کہو، آؤ میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں لگائی ہیں یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔"

شرک کی یہی سنگینی اور توحید کی یہی اہمیت ہے جس کے باعث اسلام۔ دینِ توحید۔ نے تصور و عمل دونوں میں شرک کے ایک ایک شائبہ کی صاف و صریح الفاظ میں نشاندہی کی اور ان تمام رخنوں کو بند کیا جہاں سے شرک گھس سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کا بہت بڑا حصہ شرک کی تردید و تفصیل اور توحید کے اثبات و وضاحت پر مشتمل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں توحید پر مزید روشنی ڈالی ہے اور اسے بالکل نکھار کر رکھ دیا ہے اور یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ قرآن و حدیث سے زیادہ واضح، مکمل اور جامع توحید کا بیان دنیا کی کسی بھی کتاب میں موجود نہیں ہے۔

تصورِ توحید کو قرآن و حدیث میں کس طرح واضح کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل ہم گزشتہ باب "اسلام کا تصورِ توحید" میں بیان کر چکے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے ہم موجودہ باب میں صرف عمل کے پہلو سے شرک کی نشاندہی کریں گے۔

اسلام نے نہ صرف یہ کہ پرستش کی تمام شکلوں ــــ دست بستہ کھڑا ہونا، رکوع کرنا، زمین پر سر رکھ دینا، طواف کرنا، نذر ماننا، دعا کرنا، روزہ رکھنا، قربانی

کرنا، جپ اور ورد کرنا، دھیان اور مراقبہ کرنا، مصیبت کے وقت پکارنا، دان پُن کرنا، چڑھاوا چڑھانا کو اللہ کے لیے مخصوص اور غیر اللہ کے لیے ممنوع قرار دے دیا، بلکہ اُن چیزوں کو بھی جو پرستش کی نیت سے نہیں، محض تعظیم کی غرض سے کی جاتی تھیں لیکن صورۃً پرستش کے مشابہ تھیں، ممنوع قرار دے دیا۔ مثلاً سجدۂ تعظیمی، عہدنامۂ عتیق میں توحید کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے اور غیر اللہ کے لیے سجدہ یا کسی بھی عبادت کو شدید ممانعت ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی شریعت کے بنیادی احکام میں سے اولین احکام یہ تھے:

"میرے حضور تو غیروں کو معبود نہ ماننا، تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر، یا زمین کے نیچے پانی میں ہے، تو اُن کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ اُن کی عبادت کرنا، کیوں کہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں" (خروج، باب ۲۰، ۳ تا ۵)

مگر عہد نامۂ عتیق ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ خاطر یا تعظیم کے لیے جھکنا اور سجدہ کرنا نہ صرف جائز بلکہ انبیاءؑ تک کا معمول تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کا ذکر کرتے ہوئے ہے:

"اور کیا دیکھتا ہے کہ تین مرد اس کے سامنے کھڑے ہیں، وہ اُن کو دیکھ کر خیمہ کے دروازے سے اُن سے ملنے کو دوڑا اور زمین تک جھکا" (پیدائش، باب ۱۸، ۲)

اور حضرت لوطؑ کے بیان میں ہے:

"اور لوط انھیں دیکھ کر ان کے استقبال کے لیے اُٹھا اور اپنا سر زمین تک جھکایا" (پیدائش، باب ۱۹، ۱)

اور حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے تذکرہ میں ہے:

"اور جب یوسفؑ گھر میں آیا تو وہ ہدیہ جو اُن کے ہاتھ میں تھا بھیتر

لائے اور اس کے لیے سجدے کو زمین پر گرے۔"

(پیدائش، ۴۳، ۲۶)

لیکن شریعت محمدیؐ نے غیر اللہ کی تعظیم یا خاطر کے لیے جھکنے اور سجدہ کرنے کو صاف و صریح الفاظ میں منع کر دیا۔ حدیث میں ہے:

عَنْ قَيْسِ بْنِ سَعْدٍؓ قَالَ أَتَيْتُ الْحِيْرَةَ فَرَأَيْتُهُمْ يَسْجُدُوْنَ لِمَرْزُبَانٍ لَّهُمْ فَقُلْتُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَقُّ أَنْ يُّسْجَدَ لَهٗ فَأَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ إِنِّيْ أَتَيْتُ الْحِيْرَةَ فَرَأَيْتُهُمْ يَسْجُدُوْنَ لِمَرْزُبَانٍ لَّهُمْ فَأَنْتَ أَحَقُّ أَنْ نَّسْجُدَ لَكَ فَقَالَ لِيْ أَرَأَيْتَ لَوْ مَرَرْتَ بِقَبْرِيْ أَكُنْتَ تَسْجُدُ لَهٗ فَقُلْتُ لَا فَقَالَ لَا تَفْعَلُوْا (ابوداود، مشکوٰۃ)

"قیس بن سعدؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا، میں حیرہ میں گیا تو میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں تو میں نے کہا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کے زیادہ حق دار ہیں تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میں حیرہ گیا تھا تو میں نے وہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں تو آپ اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں آپؐ نے فرمایا، کیا خیال ہے تمھارا اگر تم میری قبر کے پاس سے گزرتے تو کیا اس کے آگے سجدہ کرتے، میں نے کہا، نہیں آپ نے فرمایا تو مجھے بھی سجدہ نہ کرو۔"

یعنی جس طرح میری قبر پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہے اس طرح میرے آگے بھی جائز نہیں۔

نہ صرف یہ کہ آپ نے تعظیم کے لیے جھکنے اور سجدہ کرنے کو منع فرما دیا بلکہ تعظیم کے لیے کھڑے ہونے کی بھی ممانعت فرمائی۔ حدیث میں ہے کہ آپؐ

نے فرمایا :

مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَّتَمَثَّلَ لَہُ الرِّجَالُ قِیَامًا فَلْیَتَبَوَّءْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ

(ترمذی، ابوداؤد، احمد) "جس شخص کو اچھا لگتا ہو کہ لوگ اس کے آگے تصویر کی طرح (باادب) کھڑے ہوں وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے"

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَؓ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مُتَّکِئًا عَلٰی عَصًا فَقُمْنَا لَہٗ فَقَالَ لَا تَقُوْمُوْا کَمَا یَقُوْمُ الْاَعَاجِمُ یُعَظِّمُ بَعْضُھَا بَعْضًا (ابوداؤد)

"ابو امامہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لاٹھی کو ٹیکتے ہوئے باہر تشریف لائے تو ہم اُن (کی تعظیم) کے لیے کھڑے ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کھڑے نہ ہو جس طرح عجم کے لوگ ایک دوسرے کی تعظیم کرنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں"

مذہبی پیشواؤں کو عموماً اور انبیاء علیہم السلام کو خصوصاً خدائی صفات سے متصف قرار دیا گیا اور بعض پسندیدہ ... [illegible]

اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے الفاظ میں اس طرح واضح فرمایا:

لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُہٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ (بخاری ہسلم)

"میرے مرتبہ کو حد سے نہ بڑھاؤ جس طرح کہ عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم کو حد سے بڑھایا (خدا بنا دیا) کیوں کہ میں تو صرف اس کا بندہ ہوں تو تم مجھے بھی کہو کہ میں اس کا بندہ اور رسول ہوں"

ایمان کی شہادت پردین کی بنیاد ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

"یہ کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں"

اسی شہادت کو نماز کا جزء بنا دیا گیا، ہر مومن دن میں بار بار شہادت دیتا ہے:

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ

"میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور اس بات کی کہ محمدؐ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں"

اس سلسلہ میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک اہتمام فرمایا کہ اپنے آپ کو سید (سردار) کہلانا پسند نہیں کیا حدیث میں ہے:

عَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ شِخِّیْرٍ قَالَ انْطَلَقْتُ فِیْ وَفْدِ بَنِیْ عَامِرٍ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْنَا اَنْتَ سَیِّدُنَا فَقَالَ السَّیِّدُ اللّٰہُ فَقُلْنَا وَاَفْضَلُنَا فَضْلًا وَاَعْظَمُنَا طَوْلًا فَقَالَ قُوْلُوْا قَوْلَکُمْ اَوْ بَعْضَ قَوْلِکُمْ وَلَا یَسْتَجْرِیَنَّکُمُ الشَّیْطَانُ (ابوداؤد، مشکوٰۃ)

"مطرف بن عبداللہ بن شخیر رضہ سے مروی ہے انھوں نے فرمایا کہ میں بنی عامر کے وفد میں شامل ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

پاس حاضر ہوا، ہم نے کہا کہ آپ ہمارے سردار ہیں، آپ نے فرمایا سردار تو اللہ ہی ہے، ہم نے کہا، آپ ہم سے بزرگی میں بڑے ہیں اور زیادہ سخی ہیں، آپ نے فرمایا۔ ہاں یہ بات کہو یا اس میں سے کچھ بات کہو اور دیکھو کہیں تمھیں شیطان (توحید کے معاملہ میں) جری نہ بنا دے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کو اس معنی میں "سردار" فرمایا کہ وہ ساری کائنات کا لاشریک حاکم و فرمانروا ہے اور "سردار" کے لفظ کا استعمال اسی لیے پسند نہ فرمایا کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ کائنات کے اقتدار میں آپ کا کوئی حصہ ہے یا آپ کائنات میں متصرف ہیں۔

اسی وجہ سے آپ نے غیر اللہ کی طرف "عبد" (بندے) کے لفظ کی نسبت ممنوع قرار دے دی، حتیٰ کہ آقاؤں کو بھی منع فرما دیا کہ وہ اپنے زرخرید غلاموں کو اپنا غلام نہ کہیں:

لَا يَقُولَنَّ اَحَدُكُمْ عَبْدِي وَاَمَتِي كُلُّكُمْ عَبِيْدُ اللّٰهِ، وَكُلُّ نِسَاءِكُمْ اِمَاءُ اللّٰهِ وَلٰكِنْ لِيَقُلْ غُلَامِي وَجَارِيَتِي وَلَا يَقُلِ الْعَبْدُ رَبِّي وَلٰكِنْ لِيَقُلْ سَيِّدِي (مسلم)

"تم میں سے کوئی شخص (اپنے غلام اور باندی کو) میرا غلام اور میری باندی نہ کہے، تم سب اللہ کے بندے اور غلام ہو اور تمھاری سب عورتیں اللہ کی بندیاں، بلکہ یوں کہو، میرا چھوکرا، میری چھوکری اور غلام (اپنے آقا کو) میرا رب (مالک) نہ کہے بلکہ میرا سردار کہے۔"

یہ سب توحید کی تکمیل اور شرک کے ایک ایک رخنے کو بند کرنے کے لیے ہے، اسی ذیل کی ایک چیز یہ ہے کہ آپ نے غیر اللہ کی قسم کھانے کی ممانعت فرمائی:

اِنَّ اللّٰهَ يَنْهَاكُمْ اَنْ تَحْلِفُوْا بِآبَائِكُمْ مَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللّٰهِ اَوْ لِيَصْمُتْ (بخاری، مسلم)

"اللہ تمہیں اس بات سے منع فرماتا ہے کہ تم اپنے باپوں کی قسم کھاؤ، جسے قسم کھانا ہو وہ اللہ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے"۔

مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ اَشْرَكَ (ترمذی، مشکوٰۃ)

"جس نے اللہ کے علاوہ کسی اور کی قسم کھائی اس نے شرک کیا"۔

مذہبی پیشواؤں کے انتقال کے بعد ان کی قبریں پرستش و عبودیت کا مرکز بن جاتی ہیں، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف و صریح الفاظ میں قبر پرستی کی ممانعت مذمت فرمائی:

اَلَا وَ اِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِهِمْ وَصَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ اِنِّیْ اَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ۔ (مسلم)

"سنو! تم میں سے پہلے کے لوگ اپنے انبیا اور صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے تو تم قبروں کو سجدہ گاہ نہ بناؤ، (ان پر سجدہ نہ کرو) میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں"۔

اپنی قبر کے بارے میں آپ نے اللہ سے دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا يُّعْبَدُ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى قَوْمٍ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِهِمْ مَسَاجِدَ۔ (مالک)

"اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنانا جس کی پوجا کی جاتی ہے، اللہ کا غصہ ان لوگوں پر بہت سخت ہے جنھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا"۔

یہی نہیں آپؐ نے ان تمام امور کو منع فرما دیا جو قبر پرستی میں مددگار بنتے ہیں۔ مثلاً آپؐ نے قبروں پر جمع ہو کر عرس کرنے سے روک دیا، آپؐ نے خود اپنی قبر کے بارے میں فرمایا:

لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِيْدًا وَصَلُّوْا عَلَیَّ فَاِنَّ صَلٰوتَكُمْ تَبْلُغُنِیْ حَيْثُ كُنْتُمْ۔ (نسائی)

"میری قبر پر (جمع ہو کر) عید (سالانہ تقریب) نہ مناؤ اور جہاں ہو وہیں سے) مجھ پر درود بھیجو کیونکہ کہیں ہو تمھاری درود مجھے پہنچ جاتی ہے۔"

آپؐ نے قبروں کو اونچا کرنے سے منع فرمایا اور اونچی قبروں کو برابر کرنے کا حکم دیا:

عَنْ اَبِی الْھَیَّاجِ الْاَسَدِیِّ قَالَ قَالَ لِیْ عَلِیٌّ اَلَا اَبْعَثُكَ عَلٰی مَا بَعَثَنِیْ عَلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَّا تَدَعَ تِمْثَالًا اِلَّا طَمَسْتَہٗ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا اِلَّا سَوَّیْتَہٗ (مسلم)

"ابو الہیاج اسدی سے مروی ہے کہ ان سے حضرت علیؓ نے فرمایا کیا میں تمھیں اس مہم پر نہ بھیجوں جس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا یہ کہ تم جس تصویر کو پاؤ اسے مٹا ڈالو اور جو قبر اونچی پاؤ اسے برابر کر دو۔"

آپؐ نے قبروں کو پختہ کرنے اور اُن پر مقبرہ تعمیر کرنے کی بھی ممانعت کی:

عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ یُّبْنٰی عَلَیْہِ وَاَنْ یُّقْعَدَ عَلَیْہِ (مسلم)

"جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ قبر کو پختہ کیا جائے، اس پر عمارت تعمیر کی جائے اور اس پر بیٹھا جائے۔"

شروع شروع میں آپؐ نے قبرستان جانے سے منع فرمایا تھا پھر جب توحید اچھی طرح لوگوں کے دل و دماغ پر رچ بس گئی تو آپؐ نے قبرستان جانے کی اجازت دے دی:

کُنْتُ نَھَیْتُکُمْ عَنْ زِیَارَۃِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْھَا فَاِنَّھَا تُذَکِّرُ الْاٰخِرَۃَ (ترمذی، مسلم)

"میں نے تمہیں قبرستان جانے سے روکا تھا تو اب تم جا سکتے ہو، کیونکہ قبروں کو دیکھنے سے آخرت یاد آتی ہے۔"

آپؐ نے قبرستان میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا، مبادا کوئی شخص یہ نہ سمجھ لے کہ اصحاب قبور کی پرستش کی جا رہی ہے:

اَلْاَرْضُ کُلُّهَا مَسْجِدٌ اِلَّا الْمَقْبَرَةَ وَالْحَمَّامَ (ابوداؤد، ترمذی، دارمی)

"زمین ساری کی ساری مسجد ہے بجز قبرستان اور حمام کے۔"

اسی غرض سے آپؐ نے قبر کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی:

لَا تَجْلِسُوْا عَلَى الْقُبُوْرِ وَلَا تُصَلُّوْا اِلَيْهَا (مسلم)

"نہ تو قبر پر بیٹھو اور نہ اس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھو۔"

مذہبی پیشواؤں کی وفات کے بعد ان کی تصویریں اور ان کے بت جو یادگار کے طور پر بنا لیے جاتے تھے، پرستش و عقیدت کا مرکز بنتے تھے، آپؐ نے اس کی شدید ترین مذمت کی:

عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا اَنَّ اُمَّ سَلَمَةَ ذَكَرَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَنِيْسَةً رَاَتْهَا بِاَرْضِ الْحَبَشَةِ وَمَا فِيْهَا مِنَ الصُّوَرِ فَقَالَ اُولٰٓئِكَ اِذَا مَاتَ فِيْهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهٖ مَسْجِدًا وَصَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ اُولٰٓئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ (بخاری، مسلم)

"عائشہؓ سے مروی ہے کہ ام سلمہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک گرجا کا تذکرہ کیا جسے انھوں نے سرزمین حبشہ میں دیکھا تھا اور جو تصویریں اس میں دیکھی تھیں ان کا ذکر بھی کیا، آپؐ نے فرمایا ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب ان میں کوئی نیک آدمی مرتا ہے تو اس کی قبر پر ایک عبادت گاہ بنا لیتے ہیں اور اس میں اس طرح کی تصویریں بناتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں۔"

آج بھی مذہبی وسیاسی پیشواؤں کی تصویریں، بت اور اسٹیچو شرک اور شخصیت پرستی کا مرکز بنے ہوئے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فتنے کا سدِ باب کرنے کے لیے جانداروں کی تصویر کشی ہی کی ممانعت فرمادی۔ حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

مَنْ صَوَّرَ صُوْرَةً فَإِنَّ اللّٰهَ مُعَذِّبُهُ حَتّٰى يَنْفُخَ فِيْهِ الرُّوْحَ وَلَيْسَ بِنَافِخٍ فِيْهِ أَبَدًا (بخاری)

”جس نے تصویر بنائی تو اللہ اس کو عذاب دیتا رہے گا اس وقت تک جب تک وہ اس میں روح نہ ڈال دے اور وہ اس میں کبھی بھی روح نہیں ڈال سکتا۔“

تصویر کشی ہی نہیں، آپؐ نے گھر میں جانداروں کی تصویریں رکھنے کی بھی ممانعت فرمائی:

إِنَّ الْبَيْتَ الَّذِيْ فِيْهِ الصُّوَرُ لَا تَدْخُلُهُ الْمَلَائِكَةُ (بخاری)

”جس گھر میں تصویریں ہوں اس میں فرشتے نہیں آتے۔“

بہت سے لوگ ستاروں سے قسمت کو وابستہ سمجھتے اور نجومیوں سے مستقبل کا حال پوچھتے پھرتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شرک قرار دیا:

عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيِّ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةَ الصُّبْحِ بِالْحُدَيْبِيَةِ عَلٰى أَثَرِ سَمَاءٍ كَانَتْ مِنَ اللَّيْلِ فَلَمَّا انْصَرَفَ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ قَالَ قَالَ أَصْبَحَ مِنْ عِبَادِيْ مُؤْمِنٌ بِيْ وَكَافِرٌ فَأَمَّا مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهِ فَذٰلِكَ مُؤْمِنٌ بِيْ وَكَافِرٌ بِالْكَوَاكِبِ وَأَمَّا مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا فَذٰلِكَ كَافِرٌ بِيْ وَمُؤْمِنٌ بِالْكَوَاكِبِ (بخاری و مسلم)

”زید بن خالد الجہنیؓ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حدیبیہ میں صبح کی نماز پڑھائی اور اس سے پہلے رات کو بارش ہو چکی تھی تو جب آپ نماز پڑھا کر پلٹے تو آپؐ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، کچھ جانتے ہو کہ تمھارے رب نے کیا فرمایا انھوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو (اس بات کا) زیادہ علم ہے۔ آپؐ نے فرمایا، اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندوں میں سے کچھ صاحب ایمان ہوئے اور کچھ کافر ہوئے تو جن لوگوں نے یہ کہا کہ بارش اللہ کے فضل اور رحمت سے ہوئی۔ وہ مجھ پر ایمان رکھتا ہے اور ستاروں (کی تاثیر) کا منکر ہے اور جس نے یہ کہا کہ ہمارے ہاں بارش فلاں اور فلاں نچھتر کے باعث ہوئی ہے وہ میرا منکر اور ستاروں پر ایمان رکھنے والا ہے"۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَأَلَ أُنَاسٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْكُهَّانِ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّهُمْ لَيْسُوْا بِشَيْءٍ (بخاری، مسلم)

"عائشہؓ سے مروی ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کاہنوں (غیب کی خبریں بتانے والوں) کے بارے میں پوچھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ کچھ بھی نہیں ہیں (غیب داں نہیں ہیں)"۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص نجومی اور غیب کی خبریں بتانے والے کے پاس جائے اور اس سے کچھ پوچھے، اس کی چالیس روز کی نماز قبول نہ ہو گی (مسلم) کیوں کہ نماز اور دوسری تمام عبادات، پرستش و بندگی اللہ کے لیے خالص کرنے کے لیے ہیں اور اس نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اللہ کے سوا دوسروں کو اپنی قسمت کا مالک یا غیب داں سمجھتا ہے اور اس نے اپنی عبادات کو خود باطل کر دیا۔

بدشگونی بھی شرک ہے کیونکہ مصیبت و راحت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے:

وَالْعِيَافَةُ وَالطَّرْقُ وَالطِّيَرَةُ مِنَ الْجِبْتِ (ابوداؤد)

شگون کے لیے جانور اڑانا، فال نکالنے کے لیے کچھ ڈالنا اور کسی طرح کا شگون مشرکانہ کاموں میں سے ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لَا عَدْوَى وَلَا طِيَرَةَ وَلَا هَامَةَ وَلَا صَفَرَ وَفِرَّ مِنَ الْمَجْذُومِ كَمَا تَفِرُّ مِنَ الْأَسَدِ (بخاری)

"نہ بیماری کی چھوت کوئی چیز ہے، نہ شگون، نہ اُلو میں کوئی چیز ہے نہ صفر منحوس ہے اور کوڑھی سے بھاگو جیسے تم شیر سے بھاگتے ہو۔" اُلو کو لوگ منحوس سمجھتے ہیں عرب میں یہ بھی مشہور تھا کہ کسی مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے تو اس کی کھوپڑی سے اُلو نکلتا ہے اور وہ تباہی پھیلاتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا، یہ سب غلط ہے۔ عرب کے لوگ صفر کے مہینے کو منحوس سمجھتے تھے، آپؐ نے فرمایا، یہ بھی غلط ہے، کوئی مہینہ اور کوئی دن منحوس نہیں۔ "بیماری کی چھوت کوئی چیز نہیں"، اس میں طبعی اسباب کے تحت تعدیہ کی نفی نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اور احادیث سے واضح ہوتا ہے، یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ بیماری اگر لگتی ہے تو اسی کے حکم کے تحت ورنہ نہیں لگتی۔ اسی لیے آپؐ نے خود فرمایا کہ "کوڑھی سے بھاگو جس طرح تم شیر سے بھاگتے ہو۔" یعنی یہ یقین رکھتے ہوئے کہ مرض اور صحت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے احتیاطی تدابیر بہرحال اختیار کرو۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ نفع نقصان اور زندگی و موت اللہ کے ہاتھ میں ہے لوگ خیالی چیزوں تک سے ڈرتے ہیں مثلاً بھوت، چڑیل، آپؐ نے ان کی نفی فرمائی:

لَا عَدْوَى وَلَا صَفَرَ وَلَا غُولَ (مسلم)

"نہ چھوت کوئی چیز ہے، نہ صفر میں کوئی نحوست ہے نہ بھوت اور چڑیل کوئی چیز ہے۔"

شرک کی ایک اہم قسم یہ ہے کہ لوگ مصیبت و ضرورت کے وقت دیوتاؤں بزرگوں، پیروں، شہیدوں اور نبیوں کو پکارتے اور ان سے دعائیں کرتے ہیں قرآن و حدیث نے اسے صاف و صریح الفاظ میں شرک قرار دیا اور بتایا کہ اس دعا کوئی حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ کے سوا کسی کو نفع پہنچانے کی طاقت ہے نہ نقصان پہنچانے کی، دعا اللہ ہی سے کرنا صحیح ہے:

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُم بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝ (رعد، ۱۴)

"دعا کرنا اللہ ہی سے صحیح ہے اور جنھیں یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ ان کی پکار کا ذرا بھی جواب نہیں دے سکتے مگر جیسے کوئی اپنی دونوں ہتھیلیوں کو پانی کی طرف پھیلا دے کہ وہ اس کے منھ میں پہنچ جائے اور وہ ہرگز نہیں پہنچنے کا، اور کافروں کی دعا تو اکارت ہی جاتی ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، احمد)

"دعا عین عبادت ہے۔"

ظاہر ہے کہ اس صورت میں دعا اللہ کے سوا کسی سے کرنا صحیح نہ ہوگی۔ کیونکہ عبادت اللہ کے لیے مخصوص ہے اور جتنی زیادہ اللہ سے دعا کی جائے گی اتنی ہی عبادت ہوگی۔

اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً (اعراف، ۵۵)

"پکارو اپنے رب کو گڑگڑا گڑگڑا کر چپ چپ کر۔"

لِيَسْئَلْ اَحَدُكُمْ رَبَّهٗ حَاجَتَهٗ كُلَّهَا حَتّٰى يَسْئَالَهُ الْمِلْحَ وَحَتّٰى يَسْئَلَهٗ شِسْعَ نَعْلِهٖ اِذَا انْقَطَعَ۔ (ترمذی، مشکوٰۃ)

"تم میں سے ہر کسی کو اپنے رب سے اپنی ضرورت کی سب چیزیں مانگنی چاہئیں، حتیٰ کہ نمک بھی اس سے مانگے اور جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اس سے مانگے۔"

توحید کی روح یہ ہے کہ انسان غیر اللہ سے بے نیاز ہو کر اللہ کے آگے سراپا نیاز، سراپا احتیاج اور سراپا تضرع و خشوع بن جائے اسی واسطے اسلام میں تکبر کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کائنات میں بڑائی اور کبریائی صرف اللہ کے لیے، باقی سب اللہ کے بندے اور غلام ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِیْ وَالْعَظَمَةُ اِزَارِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ وَاحِدًا مِّنْهُمَا اَدْخَلْتُهُ النَّارَ۔ (مسلم)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میری ازار تو جو کوئی ان میں سے کسی کو مجھ سے چھیننا چاہے گا میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اَحَدٌ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ كِبْرٍ (مسلم) "جنت میں وہ شخص داخل نہ ہو گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہو گا۔"

ایمان کی شہادت کے بعد عبادات، خصوصاً نماز کا، دین میں اسی واسطے غیر معمولی مقام ہے کہ وہ انسان کا تعلق اللہ سے جوڑتے، اس کے دل سے غیر اللہ کی عقیدت و کبریائی نکالتے، خدا کی عظمت و الوہیت کا نقش جمانے اور خشوع و خضوع اور تضرع و مسکنت پیدا کرنے کا بہترین نسخہ ہیں:

صرف اللہ کی بندگی کیجیے

مذہب (Religion) کا نام آتے ہی ذہن چند عقائد اور کچھ رسوم پرستش کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ مذہب کی کائنات بس یہی کچھ ہے، اس کا دائرہ کچھ اور وسیع ہوا تو نکاح و طلاق کا ایک خاص انداز اور کچھ معروف اخلاقی اصول اس کے اندر اور آجاتے ہیں، یہ بات کہ مذہب کا دائرہ پوری زندگی کو محیط ہو اور انسان زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی معاملات میں اللہ کی بندگی و غلامی کرے۔ جدید ذہن مذہب کے اس تصور سے نا آشنا ہے۔ تو کیا مذہب کا محدود تصور صحیح ہے یا جدید ذہن کسی غلطی کا شکار ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ مذہب کا یہ تصور یورپ سے دنیا میں پھیلا اور یورپ کو یہ تصور مسیحیت نے دیا اور مسیحیت کو سینٹ پال اور اس کے متبعین نے اور انھوں نے یہ تصور حضرت عیسیٰؑ کے ایک جملہ سے اخذ کیا اور وہ یہ ہے:

"جو قیصر کا ہے قیصر کو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو ادا کر دو۔"

اس کا مطلب انھوں نے یہ نکالا کہ خدا کی پرستش کرو اور حاکم وقت کی اطاعت۔ حالانکہ خود ان الفاظ سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ بائبل کی پوری عبارت یوں ہے:

"اس وقت فریسیوں[1] نے جا کر مشورہ کیا کہ اُسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں۔ پس انھوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں[2] کے ساتھ اس کے پاس بھیجا اور انھوں نے کہا اے استاد! ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پروا نہیں کرتا کیونکہ تو کسی آدمی کا طرف دار نہیں، پس ہمیں بتا،

---

[1] یہودیوں کا ایک فرقہ [2] حکومت وقت کے کارندے۔

تو کیا سمجھتا ہے، قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے ان کی شرارت جان کر کہا، اے ریاکارو! مجھے کیوں آزماتے ہو! جزیہ کا سکہ مجھے دکھاؤ، وہ ایک دینار اس کے پاس لائے، اس نے ان سے کہا، یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انھوں نے اس سے کہا قیصر کا، اس پر اس نے کہا، پس جو قیصر کا ہے قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو، انھوں نے یہ سن کر تعجب کیا اور اسے چھوڑ کر چلے گئے۔" (متی باب ۲۲، ۱۵ تا ۲۲)

اس عبارت کا سرسری مطالعہ ہی بتاتا ہے کہ نہ سوال سادہ تھا اور نہ جواب ہی۔ درحقیقت یہ ایک سازش تھی جو حضرت مسیحؑ کے خلاف کی گئی تھی اور حضرت مسیحؑ اپنی ہوشمندی سے اس سازش سے بچ نکلے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہود کی متواتر بدکرداریوں، کوتاہیوں اور آپس کے نفاق کے نتیجہ میں ارضِ مقدس پر مشرک رومیوں کا اقتدار قائم ہو گیا تھا جن کے شاہنشاہ کا لقب قیصر تھا۔ قیصر کے اقتدارِ اعلیٰ کے تحت ارضِ مقدس کے ایک حصے پر یہود کی ایک نیم آزاد ریاست بھی قائم تھی۔ یہود کے عوام ہی نہیں، علماء و مشائخ بھی مشرک رومیوں کی حکومت کو تسلیم کرتے، اسے ٹیکس ادا کرتے، اس کی عدالتوں میں مقدمات لے جاتے اور اس کی وفاداری کا دم بھرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے، حالانکہ یہود کے اپنے عقیدے اور شریعت کی رو سے یہ پورا نظام باطل تھا جب حضرت مسیحؑ کا ظہور ہوا تو انھوں نے علمائے یہود کی بدکرداریوں پر شدید تنقید کی اور لوگوں کو "خدا کی بادشاہت" یعنی اقامتِ دین کی طرف بلایا۔ علمائے یہود نے پہلے تو انھیں مختلف مسائل میں الجھانا چاہا، لیکن جب وہ اس میں ناکام ہو گئے تو رومی حکومت کے آدمیوں سے یہ سوال کرایا کہ قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں۔ حضرت مسیحؑ اس کا جواب اگر یہ دیتے کہ روا ہے تو یہ اس

بات کا ثبوت ہوتا کہ وہ نظامِ باطل کو تسلیم کرتے ہیں اور اسے تسلیم کرتے ہی "خدا کی بادشاہت" کی دعوت اور اُن کی نبوت کی آپ سے آپ تردید ہو جاتی اور اگر جواب یہ ہوتا کہ روا نہیں ہے تو رومی حکومت کے آدمیوں کے سامنے حضرت مسیحؑ کے باغی ہونے کا اعلان ہو جاتا اور پھر ان کو سزائے موت دے دی جاتی۔ حضرت مسیحؑ نے ہاں یا نہ میں جواب دینے کے بجائے جزیہ کا دینار منگایا اور پوچھا کہ اس پر کس کی صورت اور نام ثبت ہے، انھوں نے کہا قیصر کا، حضرت مسیحؑ نے کہا "جو قیصر کا ہے قیصر کو جو خدا کا ہے خدا کو ادا کر دو۔" اس کا اصل مطلب تو یہ تھا کہ انسانی فرمانروا حقیقتۃً فرمانروا نہیں وہ صرف نام کے ہیں، ان کا نام انھیں واپس کر دو اور سونا چاندی جو خدا کا پیدا کیا ہوا ہے خدا کو دو لیکن اس کا ظاہری مطلب یہ تھا کہ قیصر کو جزیہ دیدو۔

مان لیجیے کہ ان الفاظ کا مطلب یہی ہے کہ قیصر کو ٹیکس دے دو، لیکن ان الفاظ سے یہ مطلب کیسے نکل آیا کہ نظامِ باطل کو حق تسلیم کر دو اور اپنی پوری زندگی اس کی اطاعت و وفاداری میں دے دو، اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ جب تک نظامِ باطل مسلط ہے اور تم اُسے ہٹا کر نظامِ حق قائم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو، اس وقت تک مجبوراً نظامِ باطل کو اس کا ٹیکس ادا کرو لیکن زندگی جو خدا کی بخشی ہوئی ہے وہ خدا کے حوالے کر دو۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک آدمی خدا کا انکار کر کے تو اس کی اطاعت سے انحراف کر سکتا ہے مگر اس کا اقرار کرنے کے بعد اس کی بندگی و غلامی سے بھاگ نہیں سکتا۔ جب خدا انسان کا خالق، مالک، پروردگار، حاجت روا اور قانون ساز ہے تو پھر اُس کے لیے ایک ہی راہ صحیح ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنی پوری زندگی میں اس کی بندگی و غلامی کرے اور بندہ ہے تو اس کا بندہ بن کر رہے۔ خدا انسان کے صرف سر کا مالک نہیں ہے بلکہ اس کے پورے وجود کا مالک ہے، اگر سر خدا کے آگے جھکتا ہے تو پورے وجود کو بھی اس کے آگے جھکنا

چاہیے، صلاحیتیں اور قوتیں بھی اس کی راہ میں صرف ہونی چاہئیں۔ کیونکہ وہ اسی کی بخشی ہوئی ہیں، چند منٹ نہیں، ساری عمر اس کی غلامی میں لگنی چاہیے کیونکہ پوری عمر اس کی عطا کی ہوئی ہے، قربانی کا ایک جانور اور خیرات کے چند سکے نہیں تمام ذرائع و وسائل اس کی مرضی کے مطابق خرچ ہونے چاہئیں کیونکہ وہ سب کے سب اسی کے دیئے ہوئے ہیں۔ یہی بات ہے جو قرآن مجید میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (انعام ۱۶۲، ۱۶۳)

(اے محمدؐ!) کہو یقیناً میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو کائنات کا مالک و آقا ہے اُس کا کوئی شریک نہیں، مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں سب سے پہلے اسلام لاتا (اطاعت قبول کرتا) ہوں۔"

یعنی نہ صرف پرستش، نہ صرف قربانی بلکہ انسان کا جینا اور مرنا بھی خالص اللہ کے لیے ہونا چاہیے، نہ عبادت میں کوئی شریک اور نہ زندگی اور موت میں۔ اس آیت میں نماز کے مقابلے میں زندگی ہے اور قربانی کے مقابلے میں موت، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم نے اللہ کی مالکیت و کبریائی کو تسلیم کر لیا، جب تم نے اس سے عہدِ بندگی باندھ لیا، جب تم نے اسے اپنا حاکم و فرمانروا مان لیا اور جب تم نے دل کے پورے خشوع کے ساتھ اپنے آپ کو اس کے حضور سجدہ میں ڈال دیا تو اب تمہارے پاس بچ کیا رہا تم نے تو خود اپنے وجود کو اس کے قدموں میں لا کر قربان کر دیا۔ اسی طرح اگر تم نے سمجھ کر قربانی کی تو تم نے اس بات کا عہد کیا کہ جس طرح تم جانور کو اللہ کی راہ میں قربان کر رہے ہو، اسی طرح تم اپنے مال، اپنی اولاد اور اپنی جان کو اس کی راہ میں قربان کر دو گے گویا تمہارا مرنا بھی اللہ کی راہ میں ہو گا، اب اگر تم

سجدہ اللہ کے آگے کرتے ہو اور اطاعت کسی اور کے قانون کی کرتے ہو تو تمہارا سجدہ جھوٹا ہے جس کے اندر کوئی معنویت نہیں۔ اسی طرح تم قربانی تو اللہ کی راہ میں کرتے ہو مگر اللہ کی راہ میں جان و مال قربان کرنے سے کتراتے ہو یا جان مال کسی اور کی راہ میں قربان کرتے ہو تو تمہاری قربانی اکارت گئی، تم نے جانور کا خون ناحق بہایا، یہ قربانی نہیں مذاق ہے۔

دینِ توحید — اسلام کا نام اسلام اسی لیے ہے کہ وہ انسانیت سے اللہ کے آگے مکمل سپردگی، کامل اطاعت اور والہانہ سرفروشی کا مطالبہ کرتا ہے کہ یہی اسلام کا لغوی و اصطلاحی مفہوم ہے اور اسی پر دنیا و آخرت کی فلاح کا دارومدار ہے۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (بقرہ، ۱۱۲)

(یہود و نصاریٰ) نہیں جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کردیں حسن و خوبی اور اخلاص کے ساتھ تو ایسے لوگوں کا ایمان کے رب کے پاس محفوظ ہے اور انھیں کسی طرح کا خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غم میں مبتلا ہوں گے۔"

یہی بات دوسرے الفاظ میں اس طرح فرمائی گئی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (بقرہ، ۲۰۸)

"اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے"

توحید پر ایمان لانے سے اللہ اور مردِ مومن میں جو معاہدہ ہوتا ہے، وہ قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ، ۱۱۱)

"یقیناً اللہ نے اہلِ ایمان سے ان کے جان و مال کو خرید لیا ہے اس معاوضہ میں کہ ان کے لیے جنت ہے"

یہاں نفس سے مراد آدمی کا پورا وجود ہے اور مال سے مراد اس کے تمام ذرائع و وسائل، اس معاہدہ کی تکمیل کی شکل صرف یہ ہے کہ اللہ کے قانون کی پیروی کی جائے اور اس کے سوا کسی کے قانون کی پیروی نہ کی جائے۔

اِتَّبِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖ اَوْلِیَآءَ (اعراف،۳)

"پیروی کرو اس قانون کی جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر اترا ہے اور اس کے سوا کسی کی پیروی کر کے اسے ولی و کارساز (خدا) نہ بناؤ"

اللہ کی رضا کو زندگی کا مقصود بنائیے

ہر شخص کسی نہ کسی کی خوشنودی کے لیے کام کرتا ہے، کوئی اپنے نفس کے لیے، کوئی اپنی بیوی یا شوہر کے لیے، کوئی اپنے خاندان کے لیے، کوئی اپنے افسر و آقا کے لیے، کوئی اپنے محبوب لیڈر اور پیشوا کے لیے اور کوئی اپنی قوم، ملک یا طبقہ کے لیے، لیکن مردِ مومن کا سب کچھ تو اللہ ہوتا ہے، خالق بھی، مالک بھی، آقا بھی، پالنہار بھی، مقتدرِ اعلیٰ و فرمانروا بھی، ملجا و ماویٰ بھی اور احسانات و انعامات کی بارش کرنے والا بھی، وہ یقین رکھتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے اللہ کا ہے، اللہ کا بخشا ہوا ہے اور اسی کے لیے ہے کہ اللہ کی رضا میں لگ جائے، وہ جب لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہتا ہے اور اپنے آپ کو اللہ کی بندگی میں دیتا ہے تو وہ یہ جان کر بندگی کی راہ اختیار کرتا ہے کہ اب وہ بندہ ہے اور بندہ کی اپنی مرضی کچھ نہیں ہوتی، وہ اپنے آقا کی مرضی کا پابند ہوتا ہے، نہیں، نہیں، اس کی زندگی کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو مالک کی مرضی میں گم کر دے اور اپنا سب کچھ قربان کر کے اُسے راضی کر لے، یہی بات قرآن مجید میں اس طرح بیان فرمائی گئی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (بقرہ، ۲۷)

"اور لوگوں میں کچھ لوگ (اہلِ ایمان) ایسے ہیں جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو فروخت کر دیتے ہیں۔"

یعنی اپنے پورے وجود اور اپنی تمام صلاحیتوں اور قوتوں کو اس مقصد میں کھپا دیتے ہیں کہ اُن کا خدا اُن سے راضی ہو جائے، یہی ان کی زندگی کا مقصد ہے اور یہی اُن کی سعی و جہد کا مرکز و محور۔

شرک یہی نہیں ہے کہ انسان غیر اللہ کی پرستش کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ کوئی نیک کام اللہ کی رضا کے بجائے کسی اور کی رضا کے لیے کرے یا اللہ کی رضا کے ساتھ کسی اور کی رضا کو بھی مقصود بنا لے، یہ ریا ہے اور اللہ کے یہاں دکھاوے اور نام و نمود کے کام نہ صرف یہ کہ مقبول نہیں، بلکہ اُن کا شمار مشرکانہ کاموں میں ہوتا ہے:

أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ مَعِيَ غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ۔ (مسلم)

"میں سب شرکاء سے زیادہ شرک سے بے نیاز ہوں جو شخص کوئی عمل کرتا ہے اور اس میں میرے ساتھ دوسرے کو بھی شریک کرتا ہے میں اسے اس کے شرک کے حوالے کر دیتا ہوں۔"

مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهِ وَمَنْ يُرَائِي يُرَائِي اللّٰهُ بِهِ (بخاری، مسلم)

"جو شخص نام کے لیے کام کرے گا اللہ اسے بدنام کرے گا اور جو دکھاوے کے لیے کرے گا اللہ اسے رسوا کرے گا۔"

ایک اور حدیث میں اخلاص کی اہمیت کو ذرا اور کھول کر بیان کیا گیا ہے:

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَرَأَيْتَ رَجُلًا غَزَا يَلْتَمِسُ الْأَجْرَ وَالذِّكْرَ مَالَهُ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا شَيْءَ لَهُ فَأَعَادَهَا

ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَيَقُوْلُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا شَیْئَ لَہٗ ثُمَّ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ لَا یَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ اِلَّا مَا کَانَ لَہٗ خَالِصًا وَابْتُغِیَ بِہٖ وَجْھُہٗ (ابوداؤد)

"ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا آپ کا کیا خیال ہے کہ ایک شخص جہاد کرتا ہے اور ثواب اور نام دونوں چاہتا ہے، اسے کیا ملے گا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اسے کچھ نہ ملے گا۔ اس شخص نے تین بار یہ سوال دہرایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر بار فرماتے رہے کہ اسے کچھ نہ ملے گا، پھر آپ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل وہی عمل قبول فرماتا ہے جو خالصۃً اللہ کے لیے ہو اور جس کا مقصود اسی کی رضا ہو۔"

اللہ کی رضا جوئی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ اللہ سے محبت ہو اور باقی ساری محبتیں اس کی محبت کے سامنے ماند پڑ جائیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (بقرہ، ۱۶۵)

"اور کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اللہ کے کچھ شریک بنا رکھے ہیں۔ جن سے وہ ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی کہ اللہ سے کرتے ہیں لیکن مومن تو سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔"

مومن وموحد وہ ہے جو اللہ کی رضا اور اس کی محبت کو ہر شے پر مقدم رکھے اور اس کی محبت و رضا کی خاطر ہر چیز کو بے تامل قربان کر دے، جو ایسا نہ کرے اُسے قرآن سچا مومن تسلیم نہیں کرتا:

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ

كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝ (توبہ ۲۴)

(اے نبیؐ!) کہو اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا کنبہ، وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، تجارت جس کے مندہ ہو جانے کا تمہیں ڈر ہے اور مکان جو تمہیں پسند ہیں، تمہیں زیادہ محبوب ہوں اللہ سے، اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ (عذاب) صادر فرمائے اور اللہ عہد شکن لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

اِن آیات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اللہ کی محبت کا مفہوم کیا ہے۔ اللہ کی محبت یہ ہے کہ انسان ہر مفاد، ہر رشتہ اور دنیا کی ہر شے کو قربان کر کے اللہ کی بندگی، اس کے رسول کی اطاعت اور دین کو قائم و غالب کرنے کے تقاضے پورے کرے۔

صرف اللہ سے ڈریے

دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا پیدا کرنے والا صرف اللہ ہے، اس کی مشیت اور علم کے بغیر کوئی چیز اور کوئی واقعہ وجود میں نہیں آسکتا۔ کائنات کا نظم بالکلیہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے اذن و اطلاع کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ زندگی و موت نفع و نقصان، عزت و ذلت، دولت و حکومت، ہر چیز خدا ہی کے ہاتھ میں ہے، کوئی کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اگر یہ سب باتیں صحیح ہیں اور ان کے صحیح ہونے میں شک کی گنجائش نہیں تو ان پر یقین رکھنے والا دل خدا کے خوف سے کس طرح خالی ہو سکتا ہے اور غیر اللہ کا خوف اس میں کس طرح جگہ پکڑ سکتا ہے:

إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ (آل عمران ۱۷۵) "یہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں کو خوفزدہ کرتا ہے تو تم ان سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو اگر تم صاحب ایمان ہو۔"

توحید اور خدا پرستی کی راہ میں بڑے بڑے خطرات آتے ہیں، لیکن مردِ مومن ان سے ڈرنے کے بجائے اپنے ایمان میں اور اپنے عزائم میں اور شدید ہو جاتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ (آل عمران، ۱۷۳)

"یہ وہ لوگ ہیں جب اُن سے لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے مقابلے کے لیے بہت ساز و سامان جمع کر رکھا ہے اس لیے ان سے ڈرو تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے کہا، ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے"

ایسا انسان اللہ کی نافرمانی سے بچنے کا پورا اہتمام کرتا ہے۔ وہ اللہ کے عذاب سے لرزتا رہتا ہے مگر مخلوقات سے نہیں ڈرتا، وہ مرنا گوارا کرتا ہے مگر اسلام وایمان کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا گوارا نہیں کرتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (آلِ عمران، ۱۰۲) "اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اس کی نافرمانی سے بچو جیسا کہ اس کا حق ہے اور تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو"

اسلام کی حالت میں اور اسلام کی راہ میں مرنا مومن کی سب سے بڑی تمنا ہوتی ہے۔

صرف اللہ پر بھروسہ رکھیے

قوت ساری کی ساری اللہ کے پاس ہے اور کسی کے پاس کوئی قوت نہیں۔

اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (بقرہ، ۱۶۵)

"یہ کہ قوت ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے"

دنیا میں جس کسی کو طاقت حاصل ہے اللہ ہی سے اور اللہ ہی کے بل پر حاصل ہے:

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ "کوئی تدبیر اور کوئی قوت نہیں مگر اللہ کے ساتھ۔"
دُنیا کی بڑی سے بڑی شے کمزور ہے اور اللہ زبردست غالب ہے:
اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ (حج ۴۰) "بے شک اللہ طاقتور اور ہر شے پر غالب ہے۔"
اللہ کا اقتدار پوری کائنات پر ہے اور سب محکوم و مجبور ہیں:
وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران ۱۸۹)
"اور آسمانوں اور زمین کا اقتدار اللہ ہی کے لیے ہے۔"
ہر چیز فنا ہونے والی ہے، صرف اللہ باقی رہنے والا ہے۔
كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝
(رحمٰن ۲۶، ۲۷) "زمین پر جو کچھ ہے سب فنا ہونے والا ہے اور تمہارے رب کی ذات باقی رہے گی جو بزرگی اور سخاوت والی ہے۔"
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (ابراہیم ۱۱) "اہلِ ایمان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔"

اس لیے مردِ مومن اللہ ہی پر بھروسہ کرتا ہے اور جب وہ اس پر بھروسہ کر کے اس کی راہ پر گامزن ہوتا ہے تو وہ اس کی مدد فرماتا اور اس کی مشکلات دور کرتا ہے:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۚ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ (طلاق ۲ تا ۳)
"اور جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اس کے لیے راہ نکالے گا اور اسے وہاں سے روزی دے گا جہاں اس کا گمان بھی نہ ہوگا اور جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اللہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فیصلے کو نافذ کر کے رہتا ہے البتہ اس نے ہر چیز کا ایک مقدور بنا رکھا ہے۔"

اسلامی نظامِ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مختصر کتابیں

۱۔ قرآن کی معاشی تعلیمات	سید ابوالاعلیٰ مودودی
۲۔ اسلام کا نظامِ حیات	〃
۳۔ تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	〃
۴۔ شہادتِ امام حسینؓ	〃
۵۔ مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل	
۶۔ ہدایات	
۷۔ اسلامی نظام اور مغربی لادینی جمہوریت	
۸۔ مسلم خواتین سے اسلام کے مطالبات	
۹۔ ذمیوں کے حقوق	
۱۰۔ سرورِ عالمؐ	〃
۱۱۔ اسلام، سرمایہ داری اور اشتراکیت	〃
۱۲۔ اسلامی نظمِ معیشت کے اصول و مقاصد	〃
۱۳۔ انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	〃
۱۴۔ ہمارے داخلی و خارجی مسائل	〃
۱۵۔ بیمۂ زندگی اسلامی نقطۂ نظر سے	نعیم صدیقی
۱۶۔ اسلام کی اقتصادی پالیسی	نجات اللہ صدیقی
۱۷۔ دنیائے اسلام کی موجودہ اسلامی تحریکیں	مولانا مسعود عالم ندوی
۱۸۔ ہم اس ملک میں کیا تغیرات چاہتے ہیں؟	امین احسن اصلاحی
۱۹۔ دعوت کی کامیابی کے شرائط	〃
۲۰۔ دین یا لادینیت	ڈاکٹر محمد ناصر

اسلام کے سیاسی نظام اور عالم اسلام پر معیاری کتب

۱۔ مسئلہ قومیت	سید ابوالاعلیٰ مودودی
۲۔ تحریک آزادی ہند اور مسلمان (اول)	"
۳۔ " " " " دوم	"
۴۔ اسلامی ریاست	"
۵۔ تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل	"
۶۔ خلافت و ملوکیت پر اعتراضات کا تجزیہ	ملک غلام علی
۷۔ نظام اسلامی مشاہیر اسلام کی نظر میں	خلیل احمد حامدی
۸۔ عالم اسلام اور اسکے افکار و مسائل	"
۹۔ سرخ اندھیروں میں	"
۱۰۔ معرکۂ فرعون و کلیم	اخلاق حسین
۱۱۔ اسلام اور اشتراکیت	صادق محمد احسن

اسلام کے معاشرتی نظام پر بلند پایہ کتب

۱۔ پردہ	سید ابوالاعلیٰ مودودی
۲۔ اسلامی تہذیب اور اسکے اصول و مبادی	"
۳۔ اسلام اور ضبط ولادت	"
۴۔ ضبط تولید کی شرعی حیثیت	مفتی محمد یوسف
۵۔ اسلامی تہذیب اور اسکے چند درخشاں پہلو	مصطفےٰ سباعی
۶۔ عورت اسلامی معاشرہ میں	جلال الدین انصر عمری

ہماری دیگر مطبوعات



اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ لاہور
3- کورٹ سٹریٹ ، لوئر مال ، لاہور (پاکستان)
www.islamicpak.com.pk
E-Mail: info@islamicpak.com.pk